کتابِ معرفت

معرفتِ ربانی کا ایک علمی اور فکری مطالعہ



مولانا وحید الدین خاں

Kitab-e-Marifat
by Maulana Wahiduddin Khan

First published 2012
Reprinted 2012

Goodword Books
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 9111-4182-7083, 4652-1511
Fax: 9111-4565-1771
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com
www.goodword.net

Islamic Vision Ltd.
434 Coventry Road, Small Heath
Birmingham B10 0UG, U.K.
Tel. 121-773-0137, Fax: 121-766-8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk
www.islamicvision.co.uk

Al-Risala Forum International
2665 Byberry Road, Bensalem, PA 19020, USA
Tel. 215-240-4298, Cell: 617-960-7156
email: cps@alrisala.org, www.alrisala.org

Printed in India

فہرست مضامین

دیباچہ

زیرنظر کتاب کا مشترک موضوع معرفت (realization of God) ہے۔ اِس کتاب میں معرفتِ خداوندی سے متعلق مختلف ابواب شامل کئے گئے ہیں۔ معرفت، دین کا خلاصہ ہے۔ معرفت، دین کا آغاز ہے اور معرفت، دین کا اختتام ہے۔ دین خداوندی میں معرفت کی حیثیت بیج (seed) کی ہے۔ جس طرح ایک بیج سے پورا درخت بنتا ہے، اِسی طرح معرفت سے انسان کی پوری زندگی تشکیل پاتی ہے۔ معرفت کے بغیر دین صرف ایک بے روح فارم (spiritless form) بن جاتا ہے۔ معرفت کے ساتھ دین گویا کہ ہرا بھرا درخت ہے اور معرفت کے بغیر دین صرف ایک سوکھا درخت۔ دین اگر جسم ہے تو معرفت اس کی روح (spirit) ہے۔

معرفت سے مراد معرفتِ حق ہے۔ حق کی معرفت ایک شعوری دریافت ہے، حق کی معرفت کسی قسم کی پُراسرار کیفیت کا نام نہیں۔ معرفت کسی انسان کو اندھیرے میں نہیں ملتی، بلکہ معرفت کسی انسان کو اُجالے میں ملتی ہے۔ معرفت کے حصول کا ذریعہ مراقبہ (meditation) نہیں، معرفت کے حصول کا صرف ایک ذریعہ ہے، اور وہ غور وفکر (contemplation) ہے۔ معرفت کوئی وجد (ecstasy) کی نوعیت کی چیز نہیں، معرفت تمام تر ایک شعوری واقعہ ہے، نہ کہ کوئی مجہول واقعہ۔

معرفت کا آغاز روحِ تجسس (seeking spirit) سے ہوتا ہے۔ تلاش ایک ذہنی سفر ہے۔ اگر آدمی کے اندر سنجیدگی (sincerity) ہو، اگر وہ اپنی تلاش کے معاملے میں حقیقی طور پر دیانت دار (honest) ہو، اگر اس کے اندر منفی سوچ (negative thinking) نہ پائی جاتی ہو، اگر وہ تعصّبات (prejudices) سے پوری طرح خالی ہو، اگر وہ پورے معنوں میں نفسیاتی پیچیدگیوں سے پاک روح (complex-free soul) بن چکا ہو تو اس کے لیے معرفت کا حصول اتنا ہی زیادہ یقینی بن جاتا ہے جتنا کہ سورج نکلنے کے بعد روشنی کا ظہور میں آنا۔

لیکن اِسی کے ساتھ حصولِ معرفت کی ایک اور لازمی شرط ہے، اور وہ دعا ہے۔ معرفت ایک

دوطرفہ معاملہ ہے۔ اِس معاملے میں انسان کی حیثیت معرفت پانے والے کی ہے اور خدا کی حیثیت معرفت دینے والے کی۔ گویا کہ یہ ففٹی ففٹی کا معاملہ ہے۔ خدا کے مدد کے بغیر انسان کو معرفت نہیں مل سکتی۔ انسان کی ہر کوشش اُس وقت تک بے نتیجہ رہے گی جب تک خدا کی مدد اس کے ساتھ شامل نہ ہوجائے۔ مزید یہ کہ دعا کسی مجموعۂ الفاظ کو دہرانے کا نام نہیں ہے۔ دعا درحقیقت دل کی تڑپ کا نام ہے۔ دعا ایک داخلی طوفان کا خارجی اظہار ہے— معرفت کے بغیر اسلام نہیں، اور دعا کے بغیر معرفت نہیں۔

نئی دہلی، 20 مارچ 2011 وحیدالدین

معرفتِ الٰہی

معرفت — مقصدِ انسانیت

علما نے معرفت کو واجبِ اوّل بتایا ہے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ معرفت مقصدِ انسانیت ہے۔ موت سے پہلے کی زندگی آغازِ معرفت کی زندگی ہے، اور موت کے بعد کی زندگی تکمیلِ معرفت کی زندگی۔ موجودہ دنیا میں ایک انسان ابتدائی دریافت کے درجے میں خدا کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ آخرت کی دنیا میں وہ کامل دریافت کے درجے میں خدا کی معرفت حاصل کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ معرفتِ خداوندی ایک فکری عمل (intellectual process) ہے۔ یہ فکری عمل موجودہ دنیا میں شروع ہوتا ہے اور پھر وہ ابدی طور پر آخرت کی دنیا میں جاری رہے گا۔

قرآن کی سورہ الذاریات میں بتایا گیا ہے کہ جن اور انس کو صرف اللہ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے (51:56)۔ اِس آیت میں عبادت سے مراد معرفتِ الٰہی ہے۔ آیت کی یہ تفسیر عبداللہ بن عباس اور علی بن ابی طالب کے قول پر مبنی ہے۔

یہی معرفتِ الٰہی جن وانس کا مقصدِ تخلیق ہے۔ اِس مقصد کا تقاضا تھا کہ جن وانس کو وہ صلاحیت کمال درجے میں عطا کی جائے جس کے ذریعے وہ اعلیٰ درجے میں معرفتِ خداوندی کو حاصل کرسکیں۔ چناں چہ جن وانس کو ایک طرف وہ اعلیٰ دماغی صلاحیت دی گئی جو اِس عظیم مقصد کے لیے مطلوب تھی۔ اور اِسی کے ساتھ خارجی اعتبار سے، اُن کو وہ وسائل دئے گئے جو اِس مقصد کی تکمیل میں مددگار بن سکیں۔

معرفت کے لفظی معنی ہیں — اِدراک (realisation)، یعنی کسی چیز کو کامل درجے میں پہچاننا۔ معرفت کو دوسرے لفظوں میں شعوری دریافت (intellectual discovery) کہہ سکتے ہیں۔ یہ دریافت کسی وقتی واقفیت کا نام نہیں ہے، یہ ایک لمبے سفر کا نام ہے۔

انسان کو جس خدا کی معرفت حاصل کرنا ہے، اس کی صفت قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ اگر تمام درخت قلم بنا دئے جائیں اور تمام موجود سمندروں اور مزید سات سمندروں کو روشنائی (ink)

بنا دیا جائے اور پھر خدا کے کلمات کو لکھنا شروع کیا جائے تو تمام سمندر ختم ہو جائیں گے، لیکن خدا کے کلمات ختم نہ ہوں گے (31: 27)۔ جس خدا کے کمالات اتنے زیادہ ہوں، اس کی دریافت ایک وقتی واقفیت نہیں ہوسکتی، یہ بلاشبہہ دریافت کا ایک لامتناہی سفر ہے جس کا آغاز تو متعین ہوسکتا ہے، لیکن اس کا اختتام متعین نہیں۔

خدا کی معرفت کا یہ مطلب نہیں کہ مراقبہ (meditation) کر کے تصور کی دنیا میں ذاتِ الٰہی کی جھلکیاں دیکھنے کی کوشش کی جائے۔ اِسی طرح وجد (ecstasy) بھی معرفت کے ہم معنیٰ نہیں۔ معرفت ایک اعلیٰ شعوری حالت ہے جو تخلیقاتِ الٰہیہ میں غور وفکر کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ قرآن کے مطابق، معرفت کی تعریف (definition) یہ ہے کہ ایک بندہ، رب العالمین کو اُن عظمتوں کے ساتھ دریافت کرے کہ وہی اُس کے لیے اس کی ساری محبتوں کا مرکز بن جائے (2: 165)، اور اس کی خشیت کے جذبات تمام تر اُسی کے ساتھ وابستہ ہو جائیں (9: 18)۔

محبت اور خشیت دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایک بندہ جب تدبر اور تفکر کے ذریعے خالقِ کائنات کو اس کی صفاتِ کمال کے ساتھ دریافت کرتا ہے تو اس کے دل میں بے پناہ حد تک اپنے رب کا اعتراف پیدا ہو جاتا ہے۔ اِسی کے ساتھ جب وہ اِس حقیقت کو دریافت کرتا ہے کہ دینے والا خدا ہے، اُس کے سوا کوئی اور دینے والا نہیں تو اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر میں خدا کی رحمتوں سے محروم ہو جاؤں تو زمین وآسمان میں میرا کوئی ٹھکانا نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسنِ تقویم (95: 5) کے ساتھ پیدا کیا۔ اس کو وہ تمام دماغی صلاحیت عطا کردی جس کے ذریعے وہ رب العالمین کی معرفت حاصل کرسکے۔ دوسری طرف، خارجی دنیا (nature) کے اندر معرفت کے تمام اَجزا مخفی صورت میں رکھ دئے۔ اب انسان کا یہ کام ہے کہ وہ معرفت کے اِن چھپے ہوئے اجزا کو دریافت کرے اور اعلیٰ معرفت کا تجربہ کر کے اپنے اندر ربانی شخصیت (divine personality) کی تعمیر کرے۔

ایمان، ایمان پلس

قرآن کی سورہ النساء میں کہا گیا ہے: یٰـأیھا الذین آمنوا، آمنوا (4:136) یعنی اے ایمان والو، ایمان لاؤ۔ ایمان کے بعد ایمان کیا ہے۔ اِس کا جواب خود قرآن کی اِس آیت میں موجود ہے: قالتِ الأعراب آمنّا، قُل لم تؤمنوا ولکن قوُلوا أسلمنا، ولمّا یدخل الإیمانُ في قلوبکم (49:14) یعنی اَعراب نے کہا کہ ہم ایمان لائے۔ اُن کو بتادو کہ تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یہ کہو کہ ہم اسلام لائے، اور ابھی تک ایمان تمھارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہوا۔

دونوں آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے بعد ایمان کا مطلب یہ ہے کہ ایمان باللّسان کے بعد اپنے ایمان کو داخلُ القلب ایمان بناؤ، وہ ایمان جو تمھاری پوری شخصیت میں شامل ہوجائے، جس طرح رنگ پانی کے اندر پوری طرح شامل ہوجاتا ہے (2:138) اِس بات کو دوسرے الفاظ میں، اِس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اپنے ایمان کو ایمان پلس (ایمان مزید) بناؤ، سادہ ایمان کو ایمانِ معرفت کے درجے تک پہنچاؤ۔ اِسی حقیقت کو قرآن میں اِزدیادِ ایمان (48:4) کہا گیا ہے۔ یعنی اپنے ایمان پر مزید ایمان کا اضافہ کرو۔ اِس ایمانِ مزید کے حصول کے دو ذریعے ہیں — آیاتِ وحی، اور آیاتِ کائنات۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سچے انسان کے لیے، آیاتِ وحی میں تدبر کرنا، معرفتِ حق (5:53) کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اِسی طرح، قرآن کے مطابق، آیاتِ کائنات میں غور وفکر کرنے سے تبیینِ حق (41:53) کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

قرآن اور حدیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان، یا معرفتِ حق کے دو درجے ہیں — ابتدائی معرفت، اور اعلیٰ معرفت۔ اِسی اعتبار سے، جنت کے بھی دو بڑے درجے ہیں (55:62)۔ اعلیٰ معرفت والوں کے لیے قرآن میں 'السابقون الأوّلون' (56:10) کا لفظ آیا ہے، اور ابتدائی معرفت والوں کے لیے 'أصحاب الیمین' (56:27) کا لفظ۔ معرفتِ حق کے یہی دو درجے ہیں، اِس کے سوا معرفت کا کوئی اور درجہ نہیں۔

ایمان ایک معرفت

قرآن کی سورہ الحجرات میں کچھ اہلِ ایمان کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے: **قالت الأعراب آمنا، قل لم تؤمنوا ولکن قولوا أسلمنا ولما یدخل الإیمان في قلوبکم** (49:14) یعنی اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ کہو کہ تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ ہم نے اسلام قبول کیا اور ابھی تک ایمان تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

دوسری طرف، قرآن کی سورہ المائدہ میں کچھ اور اہلِ ایمان کا ذکر اِس طرح کیا گیا ہے: اور جب وہ اُس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، اِس سبب سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ پکارا ٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہم ایمان لائے۔ پس تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ اور ہم کیوں نہ ایمان لائیں اللہ پر اور اُس حق پر جو ہمیں پہنچا ہے، جب کہ ہم یہ آرزو رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو صالح لوگوں کے ساتھ شامل کرلے۔ پس اللہ اُن کو اس قول کے بدلے میں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ اُن باغوں میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہی بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کا (5:83-85)

اِن دونوں آیتوں کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی حقیقت کیا ہے۔ وہ کون خوش نصیب لوگ ہیں جن کے ایمان کو اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت حاصل ہوگی اور وہ ابدی جنتوں میں داخل کیے جائیں گے، جہاں وہ کبھی نہ ختم ہونے والی خوشیوں اور راحتوں میں زندگی گزاریں گے۔

پہلی بات یہ کہ اللہ تعالیٰ کا مطلوب ایمان وہ ہے جو داخل القلب ایمان (49:14) ہو، صرف زبان سے ایمان کے کلمات ادا کر دینا وہ چیز نہیں جس کی بنا پر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے یہاں مومن یا صاحبِ ایمان شمار کیا جائے۔ زبان سے جو کلمۂ ایمان ادا کیا جاتا ہے، وہ درحقیقت آدمی کی طرف سے قبولیتِ ایمان کا ایک لفظی اظہار ہے۔

خدا کے نزدیک، اصل مطلوب ایمان یہ ہے کہ ایمان کی حقیقت دل کی گہرائیوں میں داخل

ہوجائے، وہ آدمی کے شعور کا سب سے زیادہ اہم حصہ بن جائے، اس کے ذریعہ آدمی کے اندر ربانی شخصیت کی تعمیر ہونے لگے۔

دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان معرفتِ حق کا دوسرا نام ہے۔ آدمی جب ایمان کو اور اپنے خالق کو صحیح طور پر پہچانے اور شعور کی گہرائیوں کے ساتھ وہ یہ جان لے کہ وہ صرف ایک عاجز بندہ ہے۔ ہر قسم کی بڑائیاں اور تمام قسم کے کمالات صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہیں، پھر یہ عمل اس کو اس حد تک متاثر کرے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے آگے ڈال دے، تو اسی گہرے ایمانی تجربے کا نام معرفت (realization) ہے، اور یہ معرفت، ایمان کا آغاز ہے۔ ایمان جب تک حق کی گہری معرفت نہ بنے، اللہ کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہیں۔

اِس عارفانہ ایمان کی ایک علامت یہ ہے کہ ایک آدمی کو اِس کا تجربہ ہوتا ہے کہ اس کی آنکھوں سے آنسو کا سیلاب بہہ پڑتا ہے۔ یہ تجربہ اس کی اندرونی شخصیت میں ایک زلزلہ پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے اندر ایک زبردست قسم کی روحانی ہلچل برپا ہوجاتی ہے۔ یہی گہرے آنسو گویا اس کے اندر برپا ہونے والے اس داخلی انقلاب کی تصدیق ہوتے ہیں۔ جس معرفت حق کے ساتھ آنسوؤں کی یہ تصدیق شامل نہ ہو، وہ معرفتِ حق، اللہ تعالیٰ کے یہاں معتبر نہیں۔

یہ ایمان کوئی سادہ بات نہیں، اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک کائناتی شہادت ہے۔ یہ حقائقِ خداوندی کو دیکھنے سے پہلے گویا اس کا مشاہدہ کر لینا ہے۔ یہ مجبورانہ اعتراف کا وقت آنے سے پہلے اس کا اختیارانہ اعتراف کرنا ہے۔ یہ اُس خداوند ذوالجلال کے حق میں اپنی گواہی درج کرنا ہے جس کی گواہی ہر لمحہ خدا کے مقدس فرشتے کائناتی سطح پر انجام دے رہے ہیں۔

ایمان دراصل دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دینے کا فیصلہ ہے۔ یہ دنیا کی نعمتوں کے مقابلے میں آخرت کی نعمتوں کا طالب بننا ہے۔ جو لوگ اپنے سارے دل اور اپنے سارے دماغ کے ساتھ اس طلب کا ثبوت دیں، وہی وہ روحیں ہیں جن کو جنت کے ابدی باغوں میں داخل کیا جائے گا، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہ کبھی اُس سے باہر آنے کی تمنا نہ کریں گے (17:108)۔

کلماتِ رب کی دریافت

معرفت کیا ہے۔ معرفت یہ ہے کہ انسان حالتِ غیب میں اپنے رب کو پہچانے، وہ دیکھے بغیر اس کو دیکھ لے۔ معرفت دراصل یہ ہے کہ آدمی کو خدا کی موجودگی کا حسّیاتی تجربہ ہونے لگے۔

ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے اور معرفت کے حصول کی بھی ایک قیمت ہے، وہ قیمت بنیادی طور پر یہ ہے کہ آدمی پردۂ التباس (element of doubt) کو پھاڑ کر حقیقت اعلیٰ کو دیکھ سکے۔ پردہ التباس کو پھاڑنے میں وہی شخص کامیاب ہوسکتا ہے جو اپنے آپ کو ہر قسم کے ڈسٹریکشن (distraction) سے بچائے، جو اپنے آپ کو کامل یکسوئی کے ساتھ معرفت کے حصول میں لگا دے۔ ڈسٹریکشن میں ہر وہ چیز شامل ہے جو آدمی کی توجہ کو مقصدِ اعلیٰ سے ہٹانے والی ہو۔ اِس میں ہر قسم کے منفی جذبات بھی شامل ہیں۔ مثلاً نفرت، تعصب، فخر، احساسِ برتری، اور خواہش کی پیروی، وغیرہ۔

انسان کو جو دماغ دیا گیا ہے، وہ بے پناہ صلاحیتوں کا حامل ہے، وہ کوئی عبث چیز نہیں ہے۔ وہ اِس لیے ہے کہ آدمی اپنے دماغ کو اَن فولڈ (unfold) کرے اور اس کو حقائقِ ربانی کی دریافت کے لیے استعمال کرے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ کلماتِ رب (31:27) اتنے زیادہ ہیں جن کی کوئی حد نہیں۔ اِسی کے ساتھ انسانی دماغ کے جو امکانات (potential) ہیں، وہ بھی لامحدود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک فرد کے دماغ میں جتنے پارٹکل ہوتے ہیں، وہ پوری کائنات میں موجود پارٹکل کے برابر ہیں۔ انسان کو یہ غیر معمولی صلاحیت اِس لیے دی گئی ہے کہ وہ اس کو استعمال کر کے معرفتِ اعلیٰ کو حاصل کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ جنت میں اہلِ جنت کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ (شغلِ فاکہ) یہ ہوگا کہ وہ لامحدود کلماتِ رب کو ابدی طور پر دریافت کرتے رہیں۔ موجودہ دنیا دراصل اِس لیے ہے کہ آدمی اپنے آپ کو جنت کے اِس لامحدود عمل کے لیے تیار (prepare) کرے۔ جنت کی سب سے بڑی خوشی حصول معرفت کی خوشی ہے۔ حصولِ معرفت کا یہ سفر جنت میں ابدی طور پر جاری رہے گا۔ اس کے علاوہ، جنت میں جو مادی نعمتیں ملیں گی، وہ دراصل ضیافتِ ربّانی کے طور پر ملیں گی (41:32)۔

توحید کا عقیدہ

توحید کا آغاز معرفت (realization) سے ہوتا ہے، یعنی خدا کو خالق و مالک کی حیثیت سے دریافت کرنا۔ کسی انسان کو جب خدا کی یہ معرفت حاصل ہوتی ہے تو اس کا حال کیا ہوتا ہے، اس کو قرآن میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''اور جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اِس سبب سے کہ ان کو حق کی معرفت حاصل ہوئی۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہم ایمان لائے۔ پس تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ اور ہم کیوں نہ ایمان لائیں اللہ پر اور اُس حق پر جو ہمیں پہنچا ہے جب کہ ہم یہ آرزو رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو صالح لوگوں کے ساتھ شامل کرے۔ پس اللہ ان کو اِس قول کے بدلہ میں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کا'' (5: 83-85)۔

خدا کی معرفت آدمی کے اندر کس قسم کی شخصیت پیدا کرتی ہے، اس کو قرآن میں مختلف انداز سے بتایا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت کا ترجمہ یہ ہے: ایمان والے تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذِکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جائیں تو وہ ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں (8: 2)

توحید کے عقیدہ کا خطاب اصلاً انسان سے ہے، نہ کہ کسی نظام سے۔ یہ عقیدہ ایک فرد کے اندر جگہ پکڑتا ہے۔ وہ فرد کو خدا کی عظمت کے احساس میں سرشار کر دیتا ہے۔ وہ انسان کی پوری شخصیت کو خدا کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ وہ انسان کے فکر اور احساس کا کامل رہنما بن جاتا ہے۔ ایسا انسان خدا کو یاد کرنے والا بن جاتا ہے۔ توحید کا عقیدہ انسان کی داخلی شخصیت میں اِس طرح بھونچال بن کر داخل ہوتا ہے کہ وہ اس کی پوری زندگی کو ہلا دیتا ہے۔ وہ خدا کو اپنا سب کچھ بنا لیتا ہے۔ اس کا جینا اور مرنا خدا کے لیے ہو جاتا ہے۔ اس کی پوری زندگی خدارخی زندگی (God-oriented life) بن جاتی ہے۔

اعلیٰ درجۂ معرفت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ خدا کی عبادت کرے (51:56) اِس آیت میں خدا کی عبادت سے مراد خدا کی معرفت ہے۔ معرفت خداوندی کی دریافت بلاشبہہ کسی انسان کی ذہنی ترقی کی اعلیٰ ترین منزل ہے۔ وہی انسان اعلیٰ انسان ہے جو معرفت کے اس درجے کو حاصل کرے۔ اِس معرفت کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی اور دوسری قسم کی معرفت کا تجربہ تاریخ میں واقعہ بن چکا ہے۔ جہاں تک تیسری قسم کی معرفت کا تعلق ہے، اس کے واقعہ بننے کا امکان پہلی بار صرف اکیسویں صدی عیسوی میں قابلِ حصول بن سکا ہے۔

پہلی قسم کی دریافت کا تجربہ پیغمبروں کو حاصل ہوا۔ یہ تجربہ ''رُؤیت'' کی سطح پر ہوا۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: **وكذلك نري إبراهيم ملكوت السموات والأرض** (6:75)۔ اسی طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آیا ہے: **ولقد رآه نزلةً اخرى** (53:13)۔ یہ معرفت کی وہ قسم ہے جو رویت کی سطح پر حاصل ہوتی ہے۔ یہ معرفت صرف پیغمبروں کے لیے مخصوص ہے۔

دوسری معرفت وہ ہے جو اپنے عجز کی دریافت کی سطح پر ہوتی ہے۔ انسان، خدا کے قادرِ مطلق ہونے کے مقابلہ میں اپنے عاجزِ مطلق ہونے کی حیثیت کو دریافت کرتا ہے۔ اِس طرح وہ خدا کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ اِس بات کو خلیفہ چہارم حضرت علی نے ان الفاظ میں بیان کیا: **عرفتُ ربّي بفسخ العزائم** (میں نے اپنے رب کو عزائم کے ٹوٹنے سے دریافت کیا)۔

معرفت کی تیسری قسم وہ ہے جو اختیار کی سطح پر ہوتی ہے، یعنی آدمی کامل اختیار رکھتے ہوئے خدا کی عظمت کو دریافت کرتا ہے اور اختیارانہ طور پر خدا کے آگے سرنڈر کر دیتا ہے۔ یہ بلاشبہہ مشکل ترین کام ہے۔ تمام فلاسفہ اور متکلمین اِس بحث میں پڑے رہے کہ خدا جب قادرِ مطلق ہے تو انسان کی حیثیت صرف عاجزِ مطلق کی بنتی ہے، انسان کے بااختیار ہونے کا نظریہ صرف خیالی ہے۔

تیسری قسم کی معرفت کے لیے انسان کے پاس پہلے ایسا کوئی پائنٹ آف ریفرنس موجود نہ تھا

جس کے ذریعے وہ معرفت کی اِس قسم کو سمجھ سکے۔ اِس لیے وہ اِس کا تصور بھی نہ کرسکتا تھا۔ اور جو چیز قابلِ تصور نہ ہو، وہ قابلِ دریافت بھی نہیں بن سکتی۔

موجودہ زمانے میں ڈارک میٹرس (dark matters) کی دریافت نے پہلی بار اس معاملے میں انسان کو ایک پائنٹ آف ریفرنس دیا۔ یہ دریافت بتاتی ہے کہ خلا کا تقریباً 95 فی صد حصہ نہایت روشن ستاروں سے بھرا ہوا ہے، لیکن وہ ہمیں نظر نہیں آتا۔ کیوں کہ ان کی قوتِ کشش اتنا زیادہ ہے کہ وہ اپنی روشنی کو اپنے اندر روکے ہوئے ہیں اور اس کو باہر جانے نہیں دیتے۔ یہ دریافت ایک خدائی مظاہرہ (divine demonstration) ہے۔ یہ دریافت ایک واقعہ کی صورت میں بتارہی ہے کہ قادرِ مطلق خدا کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی قدرتِ کاملہ کو کسی مخلوق کی نسبت سے روک لے۔ چناں چہ خدا نے انسانی اختیار کو حقیقی بنانے کے لیے انسان کی نسبت سے اپنی قدرت کو روک لیا ہے۔ خدا کی قدرتِ کاملہ کے باوجود انسان کو روزِ قیامت تک حقیقی معنوں میں آزادانہ اختیار حاصل ہے۔

یہ دریافت ایک ریفرنس پائنٹ ہے، جو تیسری قسم کی معرفت کے حصول کو ممکن بناتی ہے۔ اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ انسان اپنے عجز کو دریافت کرے۔ اس کے بعد وہ مذکورہ پائنٹ آف ریفرنس کے ذریعے یہ دریافت کرے کہ عجزِ کامل کے باوجود وہ اِس دنیا میں محدود مدت کے لیے کامل اختیار کا مالک ہے۔ اِس دریافت کے بعد وہ شعوری طور پر ایسا کرے کہ کامل آزادی کے باوجود خدا کے مقابلے میں وہ کامل طور پر سرینڈر کردے۔ یہ بلاشبہہ مشکل ترین کام ہے۔ اس میں کسی انسان کو دو انتہائی متضاد چیزوں کے درمیان جینا پڑتا ہے — ایک طرف کامل عجز اور دوسری طرف کامل اختیار۔ جو انسان اپنے شعور کو اتنا زیادہ ترقی یافتہ بنا سکے کہ وہ ان دو متضاد چیزوں کے درمیان جی سکے، وہی وہ انسان ہے جو تیسری قسم کی معرفت حاصل کرے گا۔ یہ تیسری قسم کی معرفت ایک حقیقی انسان کے لیے ناممکن نہیں۔ کیوں کہ انسان کے اندر فطری طور پر یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ متضاد افکار کا مجموعہ (mixture of opposites) بن سکے۔ اسی حقیقت کو ایک مغربی مفکر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

I am large enough to contain all these contradictions

معرفت اور وحدتِ وجود

معرفت اِس دنیا کی سب سے بڑی یافت ہے۔مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ پوری تاریخ میں معرفت کے بارے میں لوگوں کو ایک شدید مغالطہ ہوا ہے۔ انسان کو جب اعلیٰ معرفت حاصل ہوتی ہے،تو یہ اُس کے لیے ایک ناقابلِ بیان تجربہ ہوتا ہے۔ انسانی زبان میں اس کو بیان کرنا ممکن نہیں۔ اِس معرفت کا ایک پہلو یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا تجربہ ہوتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ خدا کے اتنا قریب آ گیا ہے جیسے کہ اس کی ہستی خدا کی ہستی میں شامل ہوگئی ہے۔

تاہم یہ تمام تر ایک نفسیاتی تجربہ ہوتا ہے۔لوگوں نے شدید غلط فہمی کی بنا پر اِس تجربہ کو وجودی قربت (physical nearness)، یا وجودی اتحاد (physical emergence) کے معنٰی میں لے لیا۔ اِسی سے وحدتِ وجود (monism) کا نظریہ پیدا ہوا۔نفسیاتی قربت کی حد تک یہ حقیقتِ اعلیٰ کے ادراک کی بات تھی، لیکن وحدتِ وجود کے نظریے کی صورت میں وہ سرتاپا ایک باطل چیز بن گئی۔ اِس مشکل کو حل کرنے کے لیے شیخ احمد سرہندی نے وحدتِ شہود کا نظریہ ایجاد کیا۔ اِسی طرح ابنِ عربی نے کہا:

العبدُ عبدٌ، وإن ترقّٰی   والربُّ ربٌّ، وإن تنزّل

مگر میرے نزدیک، یہ دونوں باتیں صرف کنفیوژن (confusion) کا کیس ہیں، وہ اصل معاملے کی حقیقی توضیح نہیں۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ خدا نے اپنے تخلیقی نقشے کے مطابق، انسان کی فطرت میں ربانی شعور پیوست کردیا ہے۔ وہ انسان کے لاشعور میں مسلسل موجود رہتا ہے۔ اِسی لاشعور کو شعور میں لانے کا نام معرفت ہے۔ یہ صرف ایک دریافت ہے، اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا اور بندے کے درمیان کسی بھی قسم کی کوئی مماثلت نہیں۔ معرفت کا معاملہ تمام تر دریافت کا معاملہ ہے۔ معرفت ایک خارجی حقیقت کی شعوری دریافت ہے۔ تاہم یہ دریافت سائنسی دریافت کی طرح محض ایک ٹکنکل دریافت نہیں۔ یہ دریافت آدمی کو حقیقت کے سمندر میں غرق کردیتی ہے۔ اِسی نفسیاتی معاملے کی غلط توجیہہ کے نتیجے میں وحدتِ وجود (monism) یا ادوئت واد کا نظریہ پیدا ہوا۔

خدا کا فلسفیانہ تصور

آرین مذاہب میں وحدتِ وجود (monism) کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس کے مطابق، خدا کا اپنا کوئی فارم نہیں ہے۔ وہ ایک نراکار خدا (formless God) ہے۔ اِس تصور کے مطابق، خدا کی اپنی کوئی الگ ہستی نہیں ہے۔ دنیا میں جو چیزیں دکھائی دیتی ہیں، وہ سب کی سب اِسی بے وجود خدا کا وجودی اظہار ہیں۔ یہ تصور دراصل ایک فلسفیانہ تصور ہے۔ فلاسفہ عام طور پر اِسی معنیٰ میں خدا کو مانتے رہے ہیں۔ وہ خدا کو اسپرٹ (spirit) یا آئڈیا (idea) جیسے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ یہی فلسفیانہ تصور آرین مذاہب میں ایک عقیدے کے طور پر شامل ہوگیا۔

خدا کا یہ غیر وجودی تصور محض ایک بے بنیاد قیاس (speculation) ہے۔ حقیقی معنوں میں اس کی کوئی استدلالی بنیاد موجود نہیں۔ پہلی بات یہ کہ تخلیق کی صورت میں ہم جس کائنات کا تجربہ کرتے ہیں، وہ پورے معنوں میں ایک فارم (form) ہے۔

یہ کہنا ایک غیر منطقی بات ہے کہ ایک خدا جو محض ایک اسپرٹ یا آئڈیا تھا، جس کی اپنی کوئی ہستی نہ تھی، اس نے اتنے بے شمار قسم کے فارم پیدا کردیے۔ خدا وہی ہے جس کے اندر تخلیق کی صفت پائی جاتی ہو، اور اسپرٹ یا آئڈیا میں تخلیق کی صفت سرے سے موجود نہیں۔ اِس لیے یہ نظریہ بداہۃً ہی قابلِ رد ہے:

Prima facie it stands rejected.

سائنس نے جو دنیا دریافت کی ہے، اس کی تمام چیزیں ایٹم سے مرکب ہیں۔ اس کو لے کر کہا جاتا ہے کہ سائنس کے مطالعے سے کائنات میں وحدت (oneness) کا ثبوت ملتا ہے، یعنی تمام مادی چیزوں میں استثناء کے باوجود یکسانیت (unifortmity amids exception) مگر یہ استدلال درست نہیں۔ کائنات میں مادّی اجزا کے اعتبار سے ضرور وحدت ہے، لیکن اِن مادی اجزا کی ترکیب سے جو چیز بنی، اس کے اندر غیر معمولی ڈزائن (design) موجود ہے، اور ڈزائن صرف ایک ذہن کی تخلیق ہوتی ہے، نہ کہ کسی بے فارم اسپرٹ کی تخلیق۔

وحدتِ وجود

شیخ محی الدین ابن العربی اندلس میں 560ھ میں پیدا ہوئے اور 638ھ میں دمشق میں وفات پائی۔ وہ صوفی کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ: **کان ظاھریًا فی العبادات، باطنیًا فی الاعتقاد** (وہ عبادات میں ظاہری تھے اور عقیدہ میں باطنی تھے)۔ ان کے بارے میں امام ذہبی نے لکھا ہے کہ: **قدوۃ القائلین بوحدۃ الوجود** (وہ وحدۃ الوجود کے ماننے والوں کے پیشوا ہیں)۔ ابن العربی نے قرآن کی آیت: **واعبد ربك حتی یاتیك الیقین** (15:99) کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے: **حتی یأتیك حق الیقین، منتهی عبادتك بانقضاء وجودك فیکون هذا العابد والمعبود جمیعاً لا غیر**۔ یعنی یہاں تک کہ تجھے حق الیقین حاصل ہو، اور تیرے وجود کے ختم ہونے سے تیری عبادت بھی ختم ہوجائے، پھر عابد و معبود سب ایک ہوں گے، غیر نہیں۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وحدۃ الوجود کا نظریہ کن بے بنیاد دلائل پر قائم کیا گیا ہے، قرآن کی آیت کی مذکورہ تفسیر جو ابن العربی نے کی ہے، وہ بلاشبہہ ایک بے اصل تفسیر ہے، علمی اعتبار سے اُس کی کوئی حیثیت نہیں، یہ تفسیر بالرائے کی ایک بدترین قسم ہے۔ اس طرح کی تفسیر کو اگر درست سمجھا جائے تو اس سے ہر بات ثابت کی جاسکتی ہے، حتی کہ قرآن سے غیر قرآنی نظریہ بھی۔

وحدتِ وجود اصلاً ایک فلسفیانہ نظریہ ہے۔ فلسفیوں نے خدا اور موجودات کو ایک ثابت کرنے کے لئے وحدتِ وجود کا نظریہ پیش کیا۔ اس کو فلسفیانہ اصطلاح میں مانزم (Monism) کہا جاتا ہے۔ بعد کو یہ نظریہ آرین مذاہب میں داخل ہوگیا۔ اس کے بعد اکثر مسلم صوفیا نے اس کو اختیار کرتے ہوئے اسلام میں داخل کردیا۔ شیخ احمد سرہندی بظاہر وحدتِ وجود کے خلاف تھے، مگر انھوں نے وحدتِ شہود کے نام سے جو نظریہ پیش کیا ہے، وہ بھی وحدتِ وجود ہی کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وحدتِ وجود (monism) کا نظریہ قرآن اور حدیث میں سرتاسر اجنبی ہے۔ وحدتِ وجود کا نظریہ ایک غیر اسلامی نظریہ ہے، وہ کوئی اسلامی نظریہ نہیں۔

اصلاحِ قلب یا اصلاحِ شعور

قرآن کی سورہ الشعراء میں ارشاد ہوا ہے کہ آخرت میں جنت میں داخلے کا مستحق وہ قرار پائے گا جو قلبِ سلیم کے ساتھ وہاں پہنچے: إلاّ مَن أتی الله بقلبٍ سلیم (26: 89)۔ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ: إلاّ مَن أتی اللہ بأعمالٍ کثیرۃ (مگر وہ شخص جو بہت زیادہ اعمال لے کر آئے)۔ اِس سے معلوم ہوا کہ جنت کی قیمت حقیقتاً کمیاتی عمل نہیں ہے، بلکہ کیفیاتی عمل ہے، یعنی وہ عمل جس کا تعلق قلبِ سلیم سے ہو۔

اِس آیت میں قلب سے مراد معروف معنوں میں دل نہیں ہے، بلکہ شعور ہے۔ سلیم یا سلامت کا مطلب ہوتا ہے — بَری ہونا۔ ضحّاک بن مُزاحم تابعی (وفات: 723ء) نے قلبِ سلیم کی تفسیر قلبِ خالص سے کی ہے (تفسیر القرطبی)۔ قلبِ سلیم سے مراد ہے — آلائش سے پاک قلب (pure heart)، یعنی جو شخص دنیا میں اپنی فطرت کو آلائش سے بچائے اور صحیح فطرت کے ساتھ آخرت میں پہنچے۔ اِس کو دوسرے لفظوں میں ڈی کنڈیشنڈ روح (de-conditioned soul) بھی کہہ سکتے ہیں۔ قلب کا لفظ یہاں اپنے لٹرری معنیٰ میں ہے۔ ادبی استعمالات میں قلب کا لفظ مرکزِ شعور کے معنیٰ میں رائج ہوگیا ہے۔ اور قرآن انسانی زبان میں نازل ہوا ہے، اِسی مفہوم کے اعتبار سے قرآن میں بھی اِس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ حقیقی معنویت کے اعتبار سے، اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو انسان اپنے شعور کی اصلاح کرے، جو اپنی فطرت کو بعد کی آلائشوں سے پاک کرے، جو ماحول کی کنڈیشننگ کو توڑ کر اپنے آپ کو ایک ڈی کنڈیشنڈ مائنڈ (de-conditioned mind) بنائے۔ ایسے ہی انسان کو خدا کی معرفت حاصل ہوگی، ایسا ہی انسان صراطِ مستقیم پر چل سکے گا۔

اصل یہ ہے کہ ہر انسان صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر ماحول کے اثر سے اُس کی فطرت گرد آلود ہوتی رہتی ہے۔ اِن خارجی اثرات سے پاک کر کے فطرت کو اس کی اصل حالت پر قائم کرنے کا نام محاسبہ یا ڈی کنڈیشننگ ہے۔ یہی بے لاگ محاسبہ اِس بات کا ضامن ہے کہ آدمی صحیح فطرت یا قلبِ سلیم کا حامل ہو۔ اور جو لوگ ایسا کرسکیں، وہی وہ لوگ ہیں جو قلب سلیم کے ساتھ خدا کے یہاں پہنچیں گے اور آخرت میں جنت کی ابدی دنیا میں داخلے کے مستحق قرار پائیں گے۔

قلبِ سلیم

قرآن کی سورہ الشعراء میں یہ آیت آئی ہے: **یوم لا ینفع مالٌ ولا بنون۔ إلا من أتی اللہ بقلبٍ سلیم** (26: 89) یعنی قیامت کے دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد۔ مگر وہ جو اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر آئے۔

قرآن کی اِس آیت میں قلب سے مراد وہی چیز ہے جس کو عقل کہا جاتا ہے۔ لسان العرب نے اہلِ لغت کے حوالے سے لکھا ہے کہ عربی زبان میں قلب کا لفظ عقل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے: **وقد یعبّر بالقلب عن العقل** (1/687)۔ سلیم کے لفظی معنی آلودگی سے پاک کے ہیں۔ اِس اعتبار سے، اِس آیت میں قلبِ سلیم کا مطلب ہے— بے آمیز عقل (unimpaired reason)۔ جو لوگ اپنی عقل کو غیر فطری افکار کی آلودگی سے بچائیں، وہی اِس دنیا میں حق کی معرفت حاصل کریں گے، اور ایسے ہی لوگ آخرت کی دنیا میں اللہ کی رحمت کے مستحق ٹھہریں گے۔

قلب سلیم یا عقلِ سلیم کسی آدمی کو فکری جدوجہد کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ ایسا آدمی آخری حد تک سنجیدہ (sincere) ہو جاتا ہے۔ وہ اِس قابل ہوتا ہے کہ افکار و معلومات کے جنگل میں سچائی کو دریافت کر سکے۔ وہ اِس قابل ہوتا ہے کہ چیزوں کا تجزیہ (analysis) کرکے اُن کو سارٹ آوٹ (sort out) کر سکے۔ وہ اِس قابل ہوتا ہے کہ چیزوں کو صحیح زاویۂ نگاہ (right angle of vision) سے دیکھ سکے۔ ایسا آدمی اِس قابل ہوتا ہے کہ وہ فرقان (ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان فرق) کے اصول (principle of differentiation) کو چیزوں پر منطبق کرے، اور اِس طرح وہ صحیح اور غلط، متعلق اور غیر متعلق (relevant & irrelevant) کے درمیان فرق کرکے اُن کی اصل حیثیت میں اُن کی پہچان کر لے۔

اسی کا نام قلب سلیم یا بے آمیز عقل ہے۔ یہ عقل کسی کو عظیم قربانی کے ذریعے حاصل ہوتی ہے، جسمانی قربانی کے ذریعے نہیں، بلکہ فکری اور نظریاتی قربانی کے ذریعے۔

معرفتِ اعلیٰ کی مثال

عبداللہ بن ابی مُلیکہ کہتے ہیں کہ اُن سے بیان کیا ذکوان نے جو کہ حضرت عائشہ کے دربان تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباس آئے اور انھوں نے حضرت عائشہ سے ملنے کی اجازت چاہی۔ میں حضرت عائشہ کے پاس گیا۔ اُس وقت ان کے بھتیجے عبداللہ بن عبدالرحمٰن ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے حضرت عائشہ سے کہا کہ عبداللہ بن عباس آئے ہیں اور وہ آپ سے ملنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ ان کے بھتیجے ان کی طرف جھکے اور کہا کہ یہ عبداللہ بن عباس ہیں۔ حضرت عائشہ اُس وقت موت کے قریب تھیں۔ انھوں نے کہا کہ چھوڑو ابن عباس کو۔ انھوں نے کہا کہ اے میری ماں، ابن عباس آپ کی اولاد کے صالحین میں سے ہیں۔ وہ آپ کو سلام کہہ رہے ہیں اور آپ سے ملنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر تم چاہتے ہو تو ان کو اجازت دے دو۔ پھر میں نے عبداللہ بن عباس کو اندر داخل کیا۔ وہ بیٹھے اور کہا: آپ کو بشارت ہو، کیوں کہ آپ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب سے ملاقات میں اب اتنی ہی دوری ہے کہ روح آپ کے جسم سے نکل جائے۔ آپ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں سب سے زیادہ محبوب تھیں اور رسول اللہ صرف پاک روح سے محبت کر سکتے تھے۔ ابواء کی رات میں آپ کا ہار گر گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے رات کو روانہ ہوئے، یہاں تک کہ منزل پر صبح کی۔ اُس وقت لوگوں کے پاس پانی نہیں تھا، تو اللہ تعالیٰ نے تیمّم کی آیت (المائدۃ: 6) اتاری۔ یہ آپ کے سبب سے ہوا۔ اِس طرح امت کے لیے رخصت کا حکم اترا۔ اور آپ کے لیے ساتویں آسمان سے برأت لے کر جبریل امین اترے۔ چناں چہ ہر مسجد میں صبح و شام آپ کا ذکر ہونے لگا اور وہ آیتیں پڑھی جانے لگیں۔ اِس کو سن کر حضرت عائشہ نے کہا: **دعْني منك يا ابن عباس، فو الذي نفسي بيده، لو ددتُ أنّي كنت نسياً منسيًّا** (اے ابن عباس، مجھ کو چھوڑو۔ اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں تو یہ چاہتی ہوں کہ میں بھولی بسری بن جاؤں (**الطبقات الکبری لابن سعد**، جلد 8، صفحہ 51، بحوالہ: کتاب احکام النساء لعبدالرحمٰن بن علی الجوزی، صفحہ 431، الطبعۃ الثانیۃ، 1993، وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیۃ، قطر)

قلب،عقل

قدیم روایتی زمانے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ تزکیہ اور معرفت کا ذریعہ قلب (heart) ہے، مگر جدید سائنسی تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان کا قلب صرف گردشِ خون (cirulation of blood) کا ذریعہ ہے۔ اِس کے مطابق، معرفت اور تزکیہ ایک مبنی بر دماغ (mind-based) علم ہے، وہ مبنی بر قلب (heart-based) علم نہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن میں کچھ ایسے حوالے ہیں جن میں معرفت اور تزکیہ کو قلب سے منسوب کیا گیا ہے، پھر اس کا مطلب کیا ہے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں صرف قلب کا حوالہ نہیں ہے، بلکہ عقل کا حوالہ بھی قرآن میں بار بار آیا ہے۔ مثلاً: **لعلكم تعقلون** (43:3)، اور **وليتذكر أولوا الألباب** (38:29)، اور **إن في ذلك لآيات لأولي النُهى** (20:54) اور **هل في ذلك قسم لذي حجر** (89:5)، وغیرہ۔

قرآن کی اِن آیتوں میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، وہ سب عقل (mind) کے معنی میں ہیں۔ ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ دونوں قسم کے قرآنی بیانات میں تطبیق کس طرح پیدا کی جائے۔ اِس طرح کے معاملات میں بلاغت کا اصول یہ ہے کہ ایک کو دوسرے کے تابع قرار دیا جائے۔ اِس اصول کو منطبق (apply) کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ کس بیان کے حق میں اضافی قرینہ (additional evidence) موجود ہے، اور پھر جس بیان کے حق میں اضافی قرینہ موجود ہو، اس کو اصل مان کر دوسرے کو اس کے تابع قرار دیا جائے۔

قلب اور دماغ کی اِس بحث میں، دماغ کے حق میں ایک اضافی قرینہ موجود ہے، اور وہ ہے سائنس کی جدید دریافت۔ اِس لیے اِس معاملے میں یہ کیا جائے گا کہ جن آیتوں میں عقل کا حوالہ ہے، ان کو اس کے اصل معنی میں لیا جائے گا، اور جن آیتوں میں قلب کا حوالہ ہے، اُن کو اس کے ادبی معنی (literary meaning) پر محمول کیا جائے گا۔ اِس طرح قرآن میں استعمال کئے گئے دونوں لفظ

(قلب اور عقل) ہم معنی قرار پائیں گے۔

کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ قلب میں سوچنے کی صلاحیت ہے۔ وہ انسانی جسم کا ایک تفکیری عضو (thinking organ) ہے، مگر یہ صرف ایک مغالطہ ہے۔ اِس دعوے کی بنیاد یہ ہے کہ عضویاتی مطالعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قلب اور عقل کے درمیان ایک رابطہ موجود ہے۔

مگر یہ دعویٰ صرف ایک مغالطے پر مبنی ہے۔ اِس قسم کا ربط دماغ اور دوسرے تمام اعضا کے درمیان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ مگر یہ ربط فکری ربط نہیں ہوتا، وہ صرف ڈائریکشن (direction) کے معنی میں ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جسم کے تمام اعضا (organs) دماغ کی ہدایت (direction) ہی پر اپنا اپنا عمل انجام دیتے ہیں۔ کوئی بھی عضو دماغ سے آزاد ہو کر اپنا فنکشن انجام نہیں دیتا۔

اِس استدلال کی غلطی یہ ہے کہ اُس میں ربط کے معاملے کو بیان کرنے کے لیے ایک غلط لفظ استعمال کیا گیا ہے، یعنی کمیونکیشن (communication) کا لفظ۔ اِس معاملے کو بیان کرنے کے لیے صحیح لفظ ڈائریکشن ہے، نہ کہ کمیونکیشن۔ دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ ڈائریکشن کا عمل یک طرفہ (unilateral) ہوتا ہے اور کمیونکیشن کا عمل دوطرفہ (bilateral)۔ ڈائریکشن کا لفظ بتاتا ہے کہ دماغ یک طرفہ طور پر اعضا کو اپنی ہدایت جاری کرتا ہے، جب کہ کمیونکیشن کے لفظ کا مطلب یہ ہے کہ دماغ اور جسم کے اعضا کے درمیان یہ عمل دوطرفہ طور پر ہوتا ہے۔

مذکورہ استدلال میں یہ کیا گیا ہے کہ پہلے ربط کے لیے کمیونکیشن کا لفظ استعمال کیا گیا اور پھر اُس سے یہ مطلب نکال لیا گیا کہ قلب ایک تفکیری عضو (thinking organ) ہے، حالاں کہ اِس مفروضہ کے لیے کوئی علمی بنیاد (scientific base) موجود نہیں۔

اس غلطی کا عظیم نقصان یہ ہوا کہ حکمت (wisdom) اہلِ سائنس کی اجارہ داری بن گئی۔ مبنی بر قلب معرفت کے نظریے کے حاملین عام طور پر حکمت سے محروم ہو کر رہ گئے، کیوں کہ وہ حکمت کو قلب میں تلاش کر رہے تھے، جب کہ قلب میں حکمت سرے سے موجود ہی نہ تھی۔ اہلِ مذہب کے یہاں فرضی کہانیوں کا جو دفتر دکھائی دیتا ہے، اس کا سبب حکمت کی اِسی کمی کی تلافی ہے۔

جہاد فی اللہ

قرآن کی سورہ العنکبوت میں ایک آیت آئی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے— جو لوگ اللہ میں جہاد کریں گے، ان کو اللہ ضرور اپنے راستے دکھائے گا (29:69)۔ قرآن کی اِس آیت میں ’’جہاد فی سبیل اللہ‘‘ نہیں ہے، بلکہ ’’جہاد فی اللہ‘‘ ہے، یعنی یہاں اللہ کے راستے میں جہاد نہیں، بلکہ اللہ میں جہاد۔ سورہ العنکبوت ہجرت حبشہ (5 نبوی) سے پہلے اتری۔ اِس لیے یہ واضح ہے کہ اِس آیت میں جہاد سے مراد قتال نہیں ہے۔ اِسی طرح اِس آیت میں جہاد سے مراد احکام الٰہی کی عملی اطاعت بھی مراد نہیں ہوسکتی، کیوں کہ ایسا کوئی لفظ یہاں موجود نہیں۔ اِس آیت میں جہاد فی اللہ کے نتیجے میں حاصل ہونے والی چیز کو ہدایت کہا گیا ہے، اِس لیے اِس آیت میں جہاد فی اللہ کا کوئی ایسا مطلب مراد ہوگا جس کا تعلق ہدایت سے ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی اِس آیت میں جہاد سے مراد جہادِ فکری ہے، یعنی اللہ کے بارے میں سوچنا، اللہ کے بارے میں تفکر اور تدبر کرنا، اللہ کی معرفت حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کرنا، مسلسل مطالعہ اور مشاہدہ کے ذریعے اپنے ایمان میں اضافہ کرتے رہنا، وغیرہ۔

دین کا آغاز معرفت سے ہوتا ہے۔ یعنی مخلوقات میں غور وفکر کے ذریعے خالق کو پہچاننے کی کوشش کرنا، کلام الٰہی کا مطالعہ کرکے اس سے مسلسل ذہنی غذا حاصل کرنا، اپنے روزمرہ کے تجربات کو ربانی بصیرت میں ڈھالنا، وغیرہ۔ اِس قسم کا غور وفکر کامل یکسوئی کے ذریعے ہوتا ہے، اور کامل یکسوئی (concentration) بلاشبہہ ایک عظیم جہاد ہے۔

’’ہم ضرور ان کو اپنے راستے دکھائیں گے‘‘ اِس سے مراد ہدایت کے راستے ہیں، یعنی ایسے لوگوں کا ذہن زیادہ سے زیادہ کھلے گا، ان کے اندر نئی سوچ جاگے گی، ان پر معرفتِ خداوندی کے نئے نئے پہلو واضح ہوں گے۔ جس طرح اللہ کی ذات لامحدود ہے، اسی طرح اس کی معرفت بھی لامحدود ہے۔ اِس لامحدود معرفت کی توفیق انھیں لوگوں کو ملتی ہے جو تفکر اور تدبر کے ذریعے اللہ میں جہاد کرنے والے ہوں۔ اِسی فکری جہاد کو اِس آیت میں جہاد فی اللہ کہا گیا ہے۔

نصیحت پذیری

کسی انسان کو جب حق کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اس کی سوچ ایمانی سوچ بن جاتی ہے تو فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک سنجیدہ انسان بن جاتا ہے۔ اسی ایمانی سنجیدگی کا ایک پہلو وہ ہے جس کو نصیحت پذیری کہا جاسکتا ہے۔ قرآن میں اس کے لیے مختلف الفاظ آئے ہیں۔ مثلاً تذکّر (39:9)، اعتبار (23:21)، توسم (15:75)، وغیرہ۔ اسی طرح حدیث میں بھی اس قسم کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ مثلاً **أن یکون صمتي فکراً ونظري عبرةً (جامع الأصول في أحادیث الرسول، رقم الحدیث: 9317)** یعنی میری خاموشی سوچ کی خاموشی ہو اور میرا دیکھنا عبرت کا دیکھنا ہو۔

ایمان یا حق کی معرفت بھی بذات خود اسی نوعیت کی ایک چیز ہے۔ ایمانی معرفت کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی مخلوقات پر غور کر کے خالق کو دریافت کرے۔ وہ دیکھنے والی دنیا کے اندر غیب کی دنیا کو پالے۔ قرآن کے الفاظ میں، وہ آیات (خارجی نشانیوں) کے ذریعہ داخلی حقیقتوں کو جان لے۔ وہ بصارت کے ساتھ بصیرت کی استعداد حاصل کر لے۔

تدبر وتفکر مومن کا عام مزاج ہوتا ہے۔ اُس کا یہ مزاج ہمیشہ اور ہر جگہ قائم رہتا ہے۔ یہ مزاج اُس کو دائمی طور پر اللہ کو یاد کرنے والا بنا دیتا ہے۔ وہ ہر دن ایسی باتیں دریافت کرتا رہتا ہے جو اُس کے ایمان ویقین میں اضافہ کرنے والی ہوں۔ دوسرے لوگ ظواہر میں صرف ظواہر کو دیکھتے ہیں، مگر مومن اپنے اس مزاج کی بنا پر ظواہر میں حقائق کو دریافت کر لیتا ہے۔ تدبر اور تفکر کے اس عمل کے لیے کسی تنہائی یا مخصوص مقام کی ضرورت نہیں۔ یہ عمل مومن کے دماغ میں ہر لمحہ جاری رہتا ہے، حتیٰ کہ دنیا کے بھرے ہوئے ہنگاموں میں بھی وہ اُس سے منقطع نہیں ہوتا (24:37)۔

نصیحت پذیری مومن کی روحانی خوراک ہے۔ مومن کے لیے مادی غذا اگر جسمانی تقویت کا ذریعہ ہے تو عبرت ونصیحت اُس کے لیے روحانی غذا کی حیثیت رکھتی ہے۔ مادی غذا کے بغیر جسم صحت مند نہیں رہ سکتا، اسی طرح فکری غذا کے بغیر روحانیت کا ارتقا ممکن نہیں۔

ایمان کی شاخیں

عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الإيمان بضعٌ وسبعون شعبة. فأفضلها قولُ لا إلٰه الا اللّٰه و أدناها إماطة الأذىٰ عن الطريق. والحياء شعبة من الإيمان (صحيح مسلم، رقم الحديث: 162)۔ حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان کی ستر سے زیادہ شاخیں ہیں۔ ان میں سب سے اعلیٰ درجہ لا الٰہ الا اللہ کہنا ہے۔ اور اس کا ادنیٰ درجہ راستہ سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا ہے، اور حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔

اس حدیث کو کچھ لوگوں نے حسابی معنٰی میں لے لیا اور گنتی کے لحاظ سے وہ اس کی تشریح کرنے لگے۔ مثلاً ابوعبداللہ الحلیمی (وفات: 403ھ) جو بخارا میں شوافع کے امام تھے، انہوں نے **المنهاج في شعب الايمان** کے نام سے ایک مفصل کتاب اس حدیث کی تشریح میں لکھی ہے۔ انھوں نے ایمان کے 77 شعبے شمار کئے ہیں اور اسی نسبت سے کتاب میں 77 باب قائم کئے ہیں۔ اسی طرح حافظ ابوبکر البیہقی (وفات: 358ھ) کی کتاب اس موضوع پر بہت مشہور ہے جس کا نام '**الجامع المصنف في شعب الايمان**' ہے۔ حافظ ابن حجر نے قلبی اعمال، لسانی اعمال اور بدنی اعمال کی تقسیم کر کے ایمان کی 69 شاخیں شمار کی ہیں، وغیرہ۔

مگر اس حدیث کی شماریاتی تشریح درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ایک بڑے درخت کی شاخوں کی گنتی نہیں کی جاسکتی، اسی طرح ایمان کی شاخوں کی بھی کوئی گنتی نہیں۔ ایمان کا آغاز اللہ کی معرفت سے ہوتا ہے۔ جب ایک انسان پر اللہ رب العالمین کی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے تو گویا اس کی روحانی زمین میں ایک ربّانی بیج بو دیا جاتا ہے۔ یہ بیج بڑھتا ہے، وہ شاخیں نکالتا ہے۔ آدمی کی سوچ سے لے کر اس کے قول وفعل تک ہر چیز میں اس کا رنگ شامل ہوجاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث میں ایمان کی شاخوں سے مراد ایمان کے مظاہر (manifestations) ہیں۔ ایمان جب کسی آدمی کے قلب و دماغ میں شامل ہوجاتا ہے تو آدمی کی پوری شخصیت میں اس کا ظہور ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ ان گنت حد تک پہنچ جاتا ہے۔

فکری اعتکاف

ایک اعتکاف وہ ہے جو رمضان کے مہینے میں مسجد کے اندر کیا جاتا ہے۔ اِس اعتکاف کا ذکر قرآن کی سورہ البقرہ میں ان الفاظ میں آیا ہے: **وأنتم عاكفون في المساجد** (2: 187)۔ دوسرا اعتکاف فکری اعتکاف (intellectual seclusion) ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آتا ہے کہ: **كان رسول الله صلى الله عليه وسلم متواصل الأحزان، دائم الفكرة** (الشمائل للترمذي، رقم الحديث: 225) اِس سے مراد یہی فکری اعتکاف ہے، یعنی خاموشی کے ساتھ سوچتے رہنا۔

مسجد کا اعتکاف منیمم (minimum) اعتکاف ہے۔ اِس کے برعکس، ذہنی اعتکاف میکسمم (maximum) اعتکاف۔ صحابہ کے درمیان اِس ذہنی اعتکاف کا عام رواج تھا۔ بعض صحابہ کے بارے میں صراحۃً اِس کی مثال ملتی ہے۔ مثلاً حضرت ابوالدرداء انصاری کے بارے میں اُن کی وفات کے بعد اُن کی اہلیہ ام الدرداء سے پوچھا گیا کہ ابوالدرداء کی خاص عبادت کیا تھی۔ ام الدرداء نے جواب دیا کہ — **التفكر والإعتبار**، یعنی غور کرنا اور نصیحت پکڑنا۔

یہ فکری اعتکاف وہی چیز ہے جس کے لیے قرآن میں اس قسم کے الفاظ آئے ہیں — تفکر، تدبر، تذکر، توسم اور تعقل، وغیرہ۔ اِس سے مراد ہے چیزوں پر سوچنا۔ سوچنے کا یہ عمل بے حد اہم ہے۔ سوچنے کے عمل سے تمام اعلیٰ صفات پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً حکمت، معرفت، ذہنی ارتقاء، ازدیادِ ایمان، گہرے معانی کی دریافت، وغیرہ۔

یہ فکری اعتکاف کسی مومن کے لیے بے حد اہم ہے۔ مگر اس کی ایک لازمی شرط ہے۔ اور وہ ہے، ہر قسم کے ڈسٹریکشن (distraction) سے اپنے آپ کو بچانا۔ اِس کے بغیر فکری اعتکاف کسی آدمی کے لیے ممکن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ذہنی اعتکاف ایک مسلسل فکری عمل کا نام ہے۔ اِسی فکری عمل سے وہ چیز حاصل ہوتی ہے جس کو قرآن میں ازدیادِ ایمان کہا گیا ہے۔ فکری عمل نہیں، تو ازدیادِ ایمان بھی نہیں۔

ذہنی افق

ذہنی افق (intellectual horizon) کے کئی درجے یا کئی سطحیں ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ معاملہ افق بالائے افق کا معاملہ ہے۔ اعلیٰ حقیقتوں کا ادراک صرف وہ افراد کرسکتے ہیں جو اعلیٰ ذہنی افق کے مالک ہوں۔ کم تر ذہنی افق کے لوگ اعلیٰ حقیقتوں سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ یہی معاملہ ایمان کا ہے۔

اِس سلسلے میں کچھ صحابہ کی مثال قابلِ ذکر ہے جو حدیث کی کتابوں میں آئی ہے۔ مثلاً عمر بن الخطاب (وفات: 23ھ)، معاذ بن جبل (وفات: 18ھ)، عبد اللہ بن رواحہ الانصاری (وفات: 8ھ)۔ اِن حضرات کا طریقہ تھا کہ وہ بعض صحابہ کے ساتھ بیٹھ کر اللہ کا چرچا کرتے اور کہتے کہ ایسا ہم اضافۂ ایمان کے لیے کر رہے ہیں۔ ایک بار عبد اللہ بن رواحہ نے ایک صحابی سے کہا کہ آؤ ہم ایک ساعت کے لیے ایمان لائیں۔ وہ صحابی غصہ ہوگئے۔ انھوں نے کہا کہ کیا ہم مؤمن نہیں ہیں، پھر وہ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ عبد اللہ بن رواحہ آپ پر ایمان کے بعد ایک ساعت کا ایمان حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ ابن رواحہ پر رحم کرے، وہ ایسی مجلسوں کو پسند کرتے ہیں جن پر فرشتے بھی رشک کرتے ہیں (**رحم اللہ ابن رواحة، إنه يحب المجالس التی تتباهیٰ بها الملائكة**) **حیاة الصحابة، باب إيمان الصحابه بالغيب، مجالس الإيمان**، جلد 3، صفحہ 13۔

ایمان باللہ کا ابتدائی درجہ وہ ہے جو کلمۂ شہادت ادا کرنے کے بعد کسی آدمی کو حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن ایمان باللہ ایک اضافہ پذیر چیز ہے۔ چناں چہ قرآن میں ایمان کو پودے سے تشبیہہ دی گئی ہے جو مسلسل بڑھتا رہتا ہے (إبراهيم: 25-24)۔ ایک مومن جب اللہ کے بارے میں سوچتا ہے، جب وہ اِس موضوع کا مطالعہ کرتا ہے، جب وہ اِس پہلو سے کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے تو اِس عمل کے دوران اللہ پر اُس کا یقین بڑھتا رہتا ہے، وہ اللہ کی اعلیٰ صفات کی بار بار دریافت کرتا رہتا ہے، اُس کو بار بار یقین وایمان کی نئی خوراک ملتی رہتی ہے۔ یہ وہ اہلِ ایمان ہیں جو اعلیٰ ذہنی افق پر ایمان باللہ کا تجربہ کرتے ہیں۔

معرفت کے درجات

قدیم زمانے میں انسان صرف برہنہ آنکھ سے دیکھ سکتا تھا۔ اُس وقت آسمان کے بارے میں انسان کا تصور بہت محدود تھا۔ برہنہ آنکھ سے صرف یہ نظر آتا تھا کہ آسمان میں تقریباً پانچ ہزار چھوٹے چھوٹے ستارے موجود ہیں۔ اِس کے بعد اٹلی کے سائنس داں گلیلیو (وفات: 1642) نے 1609 میں پہلی بار دوربین کے ذریعے آسمان کا مشاہدہ کیا تو معلوم ہوا کہ آسمان کے ستارے اپنے سائز اور تعداد کے اعتبار سے اُس سے بہت زیادہ ہیں جتنا کہ وہ خالی آنکھ سے دکھائی دیتے تھے۔ گلیلیو کی دوربین ابتدائی دور کی بہت چھوٹی دوربین تھی۔ اِس کے بعد اِس فن میں کافی ترقی ہوئی۔

کیلی فورنیا (امریکا) میں پیلومر پہاڑی (Mount Palomar) کے اوپر 1949 میں ایک بڑی دوربین نصب کی گئی جس کا ڈائی میٹر (diameter) 200 انچ تھا۔ اِس دوربین کے ذریعے ممکن ہوگیا کہ بہت زیادہ دور تک آسمانی اجرام کا مشاہدہ کیا جاسکے۔ اِس کے بعد 1990 میں امریکا نے ہبل ٹیلی اسکوپ (Hubble Telescope) تیار کیا۔ ہبل ٹیلی اسکوپ زمینی دوربین نہیں تھی، وہ ایک سیاراتی دوربین تھی۔ وہ زمین سے تقریباً 400 میل اوپر جا کر مسلسل خلا میں گھوم رہی ہے۔ اس میں مخصوص قسم کی دوربین اور کیمرہ لگا ہوا ہے۔ یہ نظام خلا سے حاصل شدہ معلومات اور تصاویر زمینی اسٹیشن پر مسلسل بھیجتا رہتا ہے۔ ہبل ٹیلی اسکوپ نے خلا کے بارے میں انسان کے مشاہدے کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔

یہ مادّی مشاہدے کی بات ہے۔ جس طرح مادی معرفت کے بارے میں انسانی مشاہدے کے مختلف درجات ہیں، اِسی طرح خدا کے بارے میں بھی انسانی معرفت کے مختلف درجات ہیں۔ کسی انسان کو جس درجے کی خدائی معرفت ہوگی، اُسی درجے کا ایمان اس کو حاصل ہوگا۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی معرفت کے درجات کو بڑھائے، وہ مسلسل اِس کی کوشش کرتا رہے۔ جس طرح خدا کی تجلیات کی کوئی حد نہیں، اِسی طرح معرفتِ خداوندی کی بھی کوئی حد نہیں، کسی آدمی کو جس درجے کی معرفت حاصل ہوگی، اُسی اعتبار سے آخرت کی جنت میں اس کا درجہ مقرر کیا جائے گا، نہ اُس سے کم اور نہ اُس سے زیادہ۔

اعلیٰ معرفت کا ذریعہ

اعلیٰ معرفت ہمیشہ اعلیٰ سوچ (high thinking) کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ خدا کے بارے میں، خدا کے کلام کے بارے میں، خدا کی تخلیقات کے بارے میں، آدمی جتنا زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچے، اتنا ہی زیادہ گہری معرفت تک وہ پہنچے گا۔ معرفت کا فارمولا ایک لفظ میں یہ ہے— جتنی گہری سوچ، اتنی ہی گہری معرفت۔

قرآن میں اِس گہری سوچ کے لیے مختلف الفاظ آئے ہیں۔ مثلاً تفکّر، تدبّر، توسم اور تعقل، وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز کے اندر غور وفکر کا سامان موجود ہے، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ اگر چیزوں کو سادہ طور پر نہ لیا جائے، بلکہ اُن پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے تو ہر چیز آدمی کے لیے معرفت کی غذا بن جائے گی۔ اِسی حقیقت کو ایک فارسی شاعر نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:

برگِ درختانِ سبز، درنظرِ ہوشیار　　　ہر ورقے دفترے است، معرفتِ کردگار

مثلاً آدمی روزانہ زمین پر چلتا ہے، مگر وہ سوچتا نہیں۔ اگر وہ سوچے تو یہ چلنا اس کے لیے معرفت کا خزانہ بن جائے۔ زمین پر چلنا بظاہر ایک سادہ بات ہے، مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ چلنے کا یہ واقعہ خالق کا ایک انوکھا معجزہ ہے۔ یہ چلنا اِس لیے ممکن ہوتا ہے کہ بے شمار اسباب نہایت ہم آہنگی کے ساتھ ہماری مدد کر رہے ہوتے ہیں— زمین کی بے حد متوازن قوتِ کشش (well balanced gravity)، ہمارے جسم کے اوپر چاروں طرف سے ہوا کا دباؤ۔ ہوا کا یہ دباؤ ہمارے جسم کے ہر مربع انچ پر تقریباً آٹھ کلوگرام کے برابر ہوتا ہے، اور پورے جسم پر مجموعی طور پر تقریباً 10 ہزار کلوگرام کے برابر۔ جب انسان زمین پر چلتا ہے تو اُس کو غیر منقطع طور پر مسلسل آکسیجن فراہم کیا جا رہا ہوتا ہے، وسیع خلا سے سورج ہماری راہوں کو روشن کرتا رہتا ہے۔ اِس طرح کے ان گنت اسباب ہیں جو براہِ راست یا بالواسطہ طور پر ہمارے مددگار بنے رہتے ہیں، تب یہ ممکن ہوتا ہے کہ انسان زمین پر چلے اور کامیابی کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچ جائے۔ ہماری دنیا میں اِس طرح کی بے شمار چیزیں ہیں۔ اِن چیزوں پر غور وفکر کرنا ہی اعلیٰ معرفت کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

معرفت کی پہچان

ماہ نامہ الرسالہ، ستمبر 2010 میں 12 صفحات پر مشتمل ایک طویل مقالہ چھپا ہے۔ اس کا عنوان یہ ہے: معرفت —— مقصدِ انسانیت۔ اس کو پڑھ کر ایک صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ کا یہ مضمون مجھ کو بہت پسند آیا۔ اب یہ سوال ہے کہ معرفت کی پہچان کیا ہے، یعنی کوئی شخص کیسے یہ سمجھے کہ اس کو وہ چیز حاصل ہوئی ہے جس کو دین میں معرفت کہا جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ قرآن میں اس کی پہچان بتادی گئی ہے، اور وہ ذکر کثیر (33: 41) ہے، یعنی بہت زیادہ خدا کو یاد کرنا۔ معرفت دراصل رب العالمین کی ڈسکوری ہے۔ جب رب العالمین کی ڈسکوری (دریافت) کسی کو معرفت کے درجے میں حاصل ہوجائے تو اس کے بعد اس کے اندر ایک گہرا ذہنی انقلاب آجاتا ہے۔ اب خدا ہی اس کی سوچ کا مرکز ومحور بن جاتا ہے۔ ایسا انسان صبح وشام خدا کو یاد کرتا ہے، وہ ہر لمحہ اس کے بارے میں سوچتا ہے، وہ اسی کا چرچا کرتا ہے۔ یہی اس کے وجود کی سب سے زیادہ نمایاں پہچان بن جاتی ہے۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ کسی شخص کو اگر کوئی ایسی چیز مل جائے جس کو وہ بہت بڑی چیز سمجھتا ہو تو وہ خود اپنے فطری تقاضے کے تحت اس کا بہت زیادہ چرچا کرتا ہے۔ اس کو اُس چیز کی یاد میں اتنی لذت ملتی ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ وہ اُسی کے بارے میں سوچتا اور بولتا رہے۔

یہی معاملہ خداوند عالم کی معرفت کا ہے۔ جب کسی شخص کو دریافت کے درجے میں اللہ کی معرفت ہوجائے تو یہ معرفت اس کے ذہن پر چھا جاتی ہے۔ اپنے فطری تقاضے کے تحت، وہ اُسی کے بارے میں سوچتا ہے، اسی کے بارے میں بولتا ہے، حتی کہ اپنی تنہائیوں میں وہ اسی کے تصور میں غرق رہتا ہے۔ اس کا ہر تجربہ اس کے لیے خدا کی معرفت میں ڈھل جاتا ہے۔ جب کسی انسان کا یہ حال ہوجائے تو یہ اِس بات کی پہچان ہے کہ اس کو وہ ربانی رزق عطا ہوا ہے جس کو معرفت کہا جاتا ہے۔

ذہنی ارتقا

ذہنی ارتقا (intellectual development) بلاشبہہ کسی انسان کی سب سے زیادہ اہم ضرورت ہے۔ ذہنی ارتقا ہی کے ذریعہ ایک انسان کامل انسان بنتا ہے۔ ذہنی ارتقا ہی کے ذریعے ایک شخص اپنی بالقوہ (potential) صلاحیتوں کو بالفعل (actual) بنانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ذہنی ارتقا ہی کے ذریعے آدمی حیوانیت کے درجے سے بلند ہوکر انسانیت کے درجے تک پہنچتا ہے۔ ذہنی ارتقا ہی کے ذریعے یہ ممکن ہوتا ہے کہ کوئی شخص حقیقی معنوں میں خدا کا مطلوب بندہ بن سکے۔

ذہنی ارتقا کوئی نئی چیز نہیں، یہ عین وہی چیز ہے جس کے لیے قرآن میں اِزدیادِ ایمان (48:4) کا لفظ آیا ہے۔ ایمان کا آغاز حقیقت کی دریافت سے ہوتا ہے۔ حقیقت کوئی محدود چیز نہیں، وہ لامحدود حد تک وسیع ہے۔

ایمان کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے حقیقت کی کائناتی وسعتوں میں اپنا سفر شروع کردیا ہے۔ یہ سفر نئی نئی دریافتوں کے ساتھ مسلسل جاری رہتا ہے۔ اِس سفر کا آغاز ہے، لیکن اِس سفر کا کوئی خاتمہ نہیں۔ گویا کہ یہ ایک پراسس (process) ہے۔ ازدیادِ ایمان اور ذہنی ارتقا دونوں اِسی پراسس کے دو نام ہیں۔ یہ دونوں نام الفاظ کے اعتبار سے الگ ہیں، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ ایمان، ازدیاد کے بغیر ایک جامد ایمان ہے، لیکن ازدیاد کے ساتھ ایمان لامتناہی معنوں میں ایک زندہ چیز بن جاتا ہے۔

انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے بعد فوراً ہی اس کا جسمانی ارتقا (physical development) شروع ہوجاتا ہے۔ یہ ارتقائی عمل ایک بچے کو بڑا انسان بنا دیتا ہے۔ یہی معاملہ ذہنی ارتقا کا ہے۔ ذہنی ارتقا بھی پیدائش کے فوراً بعد شروع ہوجاتا ہے، مگر دونوں میں ایک فرق ہے۔ جسمانی ارتقا کی ایک معلوم حد ہے، لیکن ذہنی ارتقا کی کوئی معلوم حد نہیں۔ حقیقت کی حد کبھی ختم نہیں ہوتی، اِسی طرح ذہنی ارتقا کی حد بھی کبھی ختم ہونے والی نہیں۔

عقل، فطرت

ہر انسان کی پہلی ضرورت ہے کہ وہ اپنے خالق کی معرفت حاصل کرے، اِس معرفت سے بڑی کوئی چیز دنیا میں نہیں۔ اِس معرفت کے حصول میں عقل کا حصہ ففٹی پرسنٹ ہے اور فطرت کا حصہ ففٹی پرسنٹ۔ دونوں میں سے کوئی بھی آزادانہ طور پر معرفت کے حصول کے لئے کافی نہیں۔

معرفت ایک پراسس (process) ہے، اِس پراسس میں پہلا مرحلہ تلاش کا ہوتا ہے، تلاش کا یہ سفر عقل کی رہنمائی میں طے ہوتا ہے، مگر عقل اپنے آپ میں کافی نہیں۔ عقل آدمی کو جہاں تک پہنچاتی ہے، وہ صرف احتمال (probability) ہے۔ عقلی غور وفکر کے ذریعے آدمی نظری اعتبار سے اِس ظن غالب تک پہنچ جاتا ہے کہ خدا کا وجود ہے۔ اِس کے آگے کا درجہ یقین (conviction) ہے، اور عقل تنہا کسی شخص کو اِس معاملے میں یقین تک نہیں پہنچاتی۔ اِس معاملے میں یقین تک پہنچنے کا واحد ذریعہ فطرت ہے۔ فطرت ہر انسان کو پیدائشی عطیہ کے طور پر ملتی ہے۔ خالق نے انسانی فطرت کے اندر اپنا شعور پوری طرح پیوست کر دیا ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح ماں کی محبت ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر پیوست ہے۔ عقل کے ذریعے آدمی نظری معرفت تک پہنچتا ہے، اور فطرت کے ذریعے یقینی معرفت تک۔

یہ فطرت ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر موجود ہوتی ہے، فطرت ہر آدمی کے لئے یقین کے حصول میں مددگار بن سکتی ہے، لیکن عملاً یہ ہوتا ہے کہ انسان طرح طرح کے ڈسٹریکشن (distraction) میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ ڈسٹریکشن اس کی فطرت پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ اِس طرح آدمی کی فطرت اپنا اصل کام نہیں کر پاتی۔ موجودہ زمانے میں ڈسٹریکشن کے اسباب بہت بڑھ گئے ہیں۔ مثلاً موبائل، شاپنگ، پارٹیاں، خاندانی فنکشن، معاشی مصروفیت، وغیرہ۔ موجودہ زمانے میں لوگ عام طور پر خدا کی سچی معرفت سے محروم ہیں۔ خدا اُن کے لیے ایک رسمی عقیدہ ہے، نہ کہ ایک دریافت۔ اس کا سبب یہی ڈسٹریکشن ہے۔ معرفت کی قیمت یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ہر قسم کے ڈسٹریکشن سے پوری طرح بچائے۔ اِس لازمی قیمت کو ادا کئے بغیر کسی بھی شخص کو خدا کی معرفت ملنے والی نہیں۔

خدا کی اعلیٰ معرفت

یہ ایک عجیب المیہ ہے کہ پوری تاریخ میں صرف چند مخلص (chosen) انسانوں کے سوا کوئی بھی شخص اللہ کی عظمت کو دریافت نہ کر سکا۔ چناں چہ پوری انسانی تاریخ میں جو چیز سب سے کم پائی جاتی ہے، وہ خدا کی اعلیٰ معرفت ہے۔ اعلیٰ معرفت اعلیٰ عظمت سے جڑی ہوئی ہے۔ جب انسان خدا کی اعلیٰ عظمت کو دریافت نہ کر سکا تو اس کے بعد لازماً یہی ہونا تھا کہ وہ خدا کی اعلیٰ معرفت سے بھی محروم رہے۔

انسان اپنی داخلی فطرت کے اعتبار سے، ایسا خدا چاہتا ہے جو غیر مشترک طور پر اعظم و برتر خدا کی حیثیت رکھتا ہو۔ انسان اپنی نفسیات کے اعتبار سے، لامحدود عظمتوں والا خدا چاہتا ہے۔ چوں کہ انسان پچھلی تاریخ میں ایسے لامحدود خدا کو دریافت نہ کر سکا، اِس لیے خدا سے اس کا برتر تعلق بھی قائم نہیں ہوا۔ انسان، خدا کو رسمی عقیدہ کے طور پر تو مانتا رہا، لیکن اس کو وہ خدا نہیں ملا جو اس کا سب کچھ بن جائے، جس سے وہ سب سے زیادہ محبت کرے اور جس کے بارے میں اس کے اندر سب سے زیادہ خشیت کا جذبہ پایا جاتا ہو۔

ایسا کیوں ہوا۔ ایسا اِس لیے ہوا کہ قدیم زمانے میں انسان دیکھتا تھا کہ یہاں بہت سی چیزیں ہیں جن کو بظاہر بڑائی کا درجہ ملا ہوا ہے۔ مثلاً سورج، چاند، سمندر اور پہاڑ وغیرہ۔ اِس طرح قدیم زمانے میں بہت سے بڑے بڑے بادشاہ تھے جو اپنے بارے میں ”أنا ربکم الأعلیٰ“ کا دعویٰ کرتے تھے۔ اِسی طرح لوگوں کے اپنے زندہ اور مردہ اعاظم تھے جو بظاہر دیکھنے میں بڑے نظر آتے تھے، اِن سب کو انسان نے بڑا درجہ دے دیا۔ قدیم زمانے میں اِس طرح کی بہت سی چیزیں تھیں جو بظاہر انسان کو بڑی دکھائی دیتی تھیں۔ پُرفریب بڑائی (deceptive greatness) کا یہی وہ واقعہ ہے جس کا اشارہ قرآن کی اِس آیت میں کیا گیا ہے: ربّ إنّھُنّ أضللن کثیراً (14: 36)

قدیم زمانے میں اِس قسم کی مختلف بڑائیاں انسان کے ذہن پر چھائی رہتی تھیں۔ اِس بنا پر ایسا ہوا کہ خدا پر عقیدہ رکھنے کے باوجود انسان خدا کو اعلیٰ ترین اور عظیم ترین ہستی کی حیثیت سے دریافت نہ کر سکا۔ انسان نے خدا کو رسمی طور پر مانا، لیکن وہ خدا کی اعلیٰ معرفت سے محروم رہا۔ اِسی بنا پر

ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کو ماننے والے، خدا کو اپنا سول کنسرن (sole concern) نہیں بنا پاتے۔ خدا کی ذات کے ساتھ ان کو وہ برتر تعلق قائم نہیں ہوتا جس کو ایموشنل اٹیچمنٹ (emotional attachment) کہا جاتا ہے۔ اِس معاملے میں مسلم تاریخ کا کوئی استثنا نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ پچھلے ہزار سال میں مسلمانوں کے درمیان بے شمار کتابیں لکھی گئیں، لیکن میرے علم کے مطابق، اللہ کی برتر عظمت اور اللہ کی اعلیٰ معرفت کے موضوع پر غالباً کوئی قابلِ ذکر کتاب نہ لکھی جاسکی۔ اِس تاریخ کو پہلی بار جدید سائنس نے ختم کیا ہے۔ جدید سائنس نے پہلی بار یہ کام کیا کہ اس نے تمام انسانی اور غیر انسانی بڑائیوں کو تحلیل (dilute) کردیا۔ اب کوئی بڑائی بڑائی نہیں رہی۔ اِس طرح جدید سائنس نے معرفت کا ابتدائی نصف سفر طے کردیا۔ اب یہ ممکن ہوگیا کہ انسان اپنے غور وتدبر کے ذریعے معرفت کا بقیہ نصف سفر طے کرے اور اللہ کی معرفت کو اعلیٰ ترین درجے میں حاصل کرسکے۔

اس معاملے کا ایک اور پہلو ہے، یہ وحدتِ وجود (monism) کا پہلو ہے۔ پچھلے ہزاروں سال کا تاریخی ریکارڈ بتاتا ہے کہ خدا پر عقیدہ رکھنے والے لوگوں نے بھی زیادہ تر خدا کو وحدتِ وجود کے مفہوم میں مانا، نہ کہ توحید (monotheism) کے مفہوم میں۔

وحدتِ وجود کیا ہے، وحدتِ وجود دراصل معلوم کائنات کے فریم ورک (framework) میں خدا کے وجود کو ماننا ہے۔ یہی قدیم زمانے میں تمام قائلینِ خدا کا مسلک تھا۔ جو لوگ شرک کے معنی میں خدا کو مانتے تھے، وہ بھی اور جو لوگ وحدتِ وجود کے معنی میں خدا کو مانتے تھے، وہ بھی خدا کو مشاہداتی فریم ورک کی نسبت سے مانتے تھے۔ وہ صرف اُس خدا کا تصور کرپاتے تھے جو عالمِ موجودات میں شامل ہو، نہ کہ اس کے باہر، صرف اِس فرق کے ساتھ کہ مشرکین نے خود دکھائی دینے والی چیزوں ہی کو خدا مان لیا، اور وحدتِ وجود کے قائلین نے دکھائی دینے والی چیزوں کو خدا کا ظہور سمجھ لیا۔

جدید سائنس نے پہلی بار ایک ایسا فریم ورک دیا ہے جب کہ خدا کا تصور موجودات کے دائرے سے باہر کیا جاسکے۔ پچھلے زمانوں میں مختلف صورتوں میں خود مخلوق کو خدا مان لیا جاتا تھا۔ اب دورِ سائنس میں یہ ممکن ہوا ہے کہ مخلوقات یا موجودات کے باہر خدا کا تصور کیا جاسکے۔

معرفتِ دین، احکامِ دین

دینِ خداوندی کے دو حصے ہیں۔ اس کے ایک حصے کو معرفت کہہ سکتے ہیں، اور اس کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کو احکام کہا جاتا ہے۔ اگرچہ دونوں یکساں طور پر ضروری ہیں، جس طرح ایک انسانی شخصیت کے لیے روح اور جسم دونوں یکساں طور پر ضروری ہوتے ہیں۔ لیکن معرفت اور احکام میں یہ فرق ہے کہ معرفت، دین کا اصل حصہ (real part) ہے اور اس کے مقابلے میں، احکام کا حصہ دین کا اضافی حصہ (relative part) ہے۔

دین میں مذکورہ دو حصے کا ہونا نص کے ذریعے ثابت ہے۔ مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے بارے میں فرمایا: **لکلِّ آیةٍ منھا ظَھْرٌ وبَطْنٌ** (**صحیح ابن حبان، رقم الحدیث: 75**) یعنی قرآن کی ہر آیت کا ایک ظَہر (outer portion) ہے اور دوسرا اس کا بَطن (inner portion) ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہ قرآن کی آیات کا ایک پہلو سطور (lines) میں ہے اور اس کا دوسرا پہلو بین السطور (between the lines) میں ملتا ہے۔ اِس حدیث کو لے کر کہا جاسکتا ہے کہ دین کی معرفت نام ہے داخلی معنویت کا، اور دین کے مسائل یا احکام سے مراد دین کا خارجی ڈھانچہ ہے۔

مثال کے طور پر ایمان کو لیجیے۔ فقہی اعتبار سے ایمان یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی زبان سے کہے کہ: **أشھد أن لآ إلٰہ إلاّ اللہ، وأشھد أن محمداً عبدُہ ورسولُہ**۔ جس شخص نے اپنی زبان سے یہ الفاظ ادا کردیے، وہ فقہی مسئلے کے اعتبار سے مومن بن گیا۔

جہاں تک ایمان کی معرفت کی بات ہے، وہ اِس قسم کے تلفّظ سے الگ ایک چیز ہے۔ یہ عارفانہ ایمان کسی شخص کو ذہنی انقلاب (intellectual revolution) کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، نہ کہ محض ادائگیٔ الفاظ کے ذریعے۔

معنی خیز استثنا

کائنات میں بے شمار الگ الگ چیزیں پائی جاتی ہیں، لیکن کائنات کا ایک عجیب ظاہرہ یہ ہے کہ اس میں عمومی طور پر یکسانیت (uniformity) نہیں ہے، بلکہ اُس کے ہر حصے میں استثناء ات (exceptions) پائے جاتے ہیں۔ کائنات کی یہ استثنائی مثالیں اِس بات کا ثبوت ہیں کہ اِس کائنات کا ایک عظیم خالق ہے۔ استثناء (exception) ذہین مداخلت (intelligent intervention) کا ثبوت ہے اور ذہنی مداخلت ایک ذہین خالق (intelligent Creator) کا ثبوت ہے۔

مثلاً وسیع کائنات میں شمسی نظام (solar system) ایک استثنا ہے۔ شمی نظام میں سیارۂ ارض (planet earth) ایک استثناء ہے۔ زمین کا انتہائی متناسب سائز ایک استثناء ہے۔ زمین کی اپنے محور (axis) پر گردش ایک استثناء ہے۔ زمین پر لائف سپورٹ سسٹم (life support system) ایک استثناء ہے۔ زمین پر زندگی ایک استثناء ہے۔ زمین پر انسان ایک استثناء ہے، وغیرہ۔

اِس قسم کے مختلف استثناء جو ہماری دنیا میں پائے جاتے ہیں، وہ سادہ طور پر صرف استثنا نہیں ہیں، بلکہ وہ انتہائی حد تک بامعنی استثناء (meaningful exception) ہیں۔ وسیع کائنات میں اِس قسم کے بامعنٰی استثناء ات یقینی طور پر اِس بات کا ثبوت ہیں کہ اِس کائنات کا ایک خالق ہے۔ اُس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اِس کائنات کو بنایا ہے۔ اُس نے جہاں چاہا، چیزوں میں یکسانیت (uniformity) کا طریقہ اختیار کیا، اور جہاں چاہا، کسی چیز کو دوسری چیزوں سے ممیّز اور مستثنیٰ بنا دیا۔

مثلاً زندہ اجسام کے ڈھانچے میں باہم یکسانیت (uniformity) پائی جاتی ہے، لیکن اِسی کے ساتھ ہر ایک کا جنیٹک کوڈ (genetic code) ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ہر ایک کے ہاتھ کی انگلیاں ایک دوسرے سے مشابہہ ہیں، لیکن ہر ایک کے انگوٹھے کا نشان (thumb impression) ایک دوسرے سے الگ ہے۔ یکسانیت کے درمیان یہ استثناء یقینی طور پر ایک ذہین تخلیق (intelligent creation) کا ثبوت ہے، نہ کہ اندھے اتفاقات کا نتیجہ۔

خدا کے بغیر کائنات بے تعبیر

البرٹ آئن سٹائن (Albert Einstein) بیسویں صدی کا سب سے بڑا سائنس داں مانا جاتا ہے۔ وہ 1879 میں جرمنی میں پیدا ہوا، اور 1955 میں امریکا میں اس کی وفات ہوئی۔ 1921 میں اس کو فزکس کا نوبل پرائز دیا گیا۔

البرٹ آئن سٹائن نے عالمِ مادّی کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اُس نے اپنے مطالعے میں پایا کہ کائنات ایک بے حد بامعنیٰ وجود ہے۔ اُس کے ہر پہلو میں اتھاہ حکمتیں چھپی ہوئی ہیں۔ یہ حکمت ومعنویت کائنات میں کہاں سے آئی۔ آئن سٹائن نے کائنات کی بے پایاں حکمت کو دریافت کیا، لیکن اُس کے حکیم کو وہ دریافت نہ کرسکا۔ اُس نے تعجب کے ساتھ کہا— کائنات کے بارے میں سب سے زیادہ حسین تجربہ جو ہم کو ہوتا ہے، وہ پُراسراریت کا تجربہ ہے:

The most beautiful experience we can have is the mysterious.

البرٹ آئن سٹائن کا ایک دوسرا قول اِس معاملے میں یہ ہے— فطرت کے بارے میں سب سے زیادہ ناقابلِ فہم واقعہ یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے قابلِ فہم ہے:

The most incomprehensible fact about
nature is that it is comprehensible.

سائنس داں کو یہ مشکل کیوں پیش آئی، اِس لیے کہ کائنات کی معنویت (meaning) کو تو اُس کے دماغ نے دریافت کیا، لیکن اِس معنوی نظام کے خالق کو وہ دریافت نہ کرسکا۔ اس بنا پر وہ تعجب کے ساتھ کہتا ہے کہ جب کائنات کی معنویت انسان کے لیے قابلِ مشاہدہ ہے تو اس کے لیے وہ ہستی کیوں ناقابلِ مشاہدہ ہے جس نے کائنات میں اِس معنویت کو پیدا کیا ہے، جب حکمت موجود ہے تو آخر اس کا حکیم کہاں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کے عقیدے کے بغیر کائنات بے معنیٰ بن جاتی ہے۔ یہ صرف خدا کا عقیدہ ہے جو کائنات کی معنویت کو انسان کے لیے قابلِ فہم بناتا ہے۔

معرفت کی قیمت

اعلیٰ معرفت بلاشبہہ کسی انسان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ یہ دراصل اعلیٰ معرفت ہے جو انسان کو حیوان سے ممیّز کرتی ہے۔ اعلیٰ معرفت کو حاصل کرنا، اتنا ہی ممکن ہے جتنا کہ کسی اور چیز کو حاصل کرنا۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی اس کی قیمت ادا کرے۔ ضروری قیمت ادا کیے بغیر اِس دنیا میں کوئی چیز کسی کو نہیں ملتی، اور اِسی طرح اعلیٰ معرفت بھی۔

اعلیٰ معرفت کے حصول کی قیمت کیا ہے، وہ صرف ایک ہے— معرفت کو اپنی زندگی میں اوّلین درجہ دینا اور بقیہ تمام چیزوں کو ثانوی بنا دینا۔ جو عورت یا مرد یہ قیمت ادا کریں، وہ ضرور اعلیٰ معرفت کے درجے تک پہنچیں گے۔ اور جو لوگ یہ قیمت ادا نہ کریں، وہ کسی بھی حال میں اعلیٰ معرفت کے درجے تک نہیں پہنچ سکتے، خواہ کسی اور اعتبار سے انھوں نے کتنا ہی زیادہ عمل کیا ہو۔

اصل یہ ہے کہ زندگی میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں، جب کہ آدمی اپنے آپ کو دو تقاضوں کے درمیان پاتا ہے، دین کا تقاضا اور دنیا کا تقاضا۔ ایسے موقع پر آدمی اگر یہ کرے کہ وہ دین کے تقاضے کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے دنیوی تقاضے کی طرف جھک جائے، تو ایک بار ایسا کرنا بھی آدمی کے لیے ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے۔

اِس طرح شیطان کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ آدمی کے سفرِ معرفت کو روک کر اس کو پیچھے کی طرف دھکیل دے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں اِس طرح بیان کی گئی ہے:

> ’’جو لوگ ڈر رکھتے ہیں، جب کبھی اُنھیں کوئی شیطانی خیال چھو جاتا ہے تو وہ فوراً چونک پڑتے ہیں، اور پھر اُسی وقت اُن کو سوجھ آجاتی ہے۔ اور جو شیطان کے بھائی ہیں، وہ اُن کو گم راہی میں کھینچے چلے جاتے ہیں، پھر وہ کمی نہیں کرتے۔‘‘ (7: 201-202)

حقیقت یہ ہے کہ معرفت کا سفر ایک مسلسل سفر ہے۔ ایک دن کے لیے بھی اگر آدمی نے اپنے سفرِ معرفت کو روکا تو وہ سالوں کے لیے پیچھے چلا جائے گا۔

عظمتِ خداوندی کی دریافت

مشہور امریکی باکسر محمد علی کلے (پیدائش: 1942) کو جب ورلڈ ہیوی ویٹ چیمپین (World Heavy weight Champion) کا خطاب ملا تو انھوں نے کہا کہ — میں دنیا کا بادشاہ ہوں:

I am the king of the world.

یہی کم وبیش ہر عورت اور ہر مرد کا حال ہے۔ ہر آدمی صرف اپنی ذاتی بڑائی (self glory) کو جانتا ہے۔ کسی نے خدا کی بڑائی کو دریافت نہیں کیا۔

انسان کا وجود ایک تخلیقی معجزہ ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے وجود کو ڈوائن گلوری (divine glory) کے طور پر دریافت کرے۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے وجود میں صرف ذاتی عظمت (self glory) کو دیکھتا ہے، وہ اپنے وجود میں خدا کی عظمت کو دریافت نہیں کر پاتا۔ یہ بلاشبہہ تاریخِ انسانی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

مشہور فرانسیسی فلسفی رینے ڈیکارٹ (وفات: 1650) نے اپنے مشہور قول میں کہا تھا کہ — میں سوچتا ہوں، اِس لیے میں ہوں (I think, therefore, I exist)۔ یہ کسی انسان کے لیے خود اپنی دریافت کا معاملہ ہے۔ لیکن زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ آدمی اپنے وجود میں خدا کے وجود کو دریافت کرے۔ وہ یہ کہہ سکے کہ — میں موجود ہوں، اِس لیے خدا بھی یقیناً موجود ہے:

I am, therefore, God exists

یہی معرفت کا آغاز ہے۔ انسان سب سے پہلے اپنی موجودگی کی صورت میں، خدا کی موجودگی کو دریافت کرتا ہے۔ اِس دریافت کے بعد اس کے لیے دریافتوں کا لامتناہی دروازہ کھل جاتا ہے۔ ہر نئی دریافت اس کی معرفت میں اضافہ کرتی رہتی ہے۔ اِس طرح، انسان کے عارفانہ شعور میں مسلسل ترقی ہوتی رہتی ہے۔ معرفت کا لامحدود خزانہ اُس پر انفولڈ (unfold) ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ انسان یقین اور معرفتِ خداوندی کے اعلیٰ درجے تک پہنچ جاتا ہے۔

معرفت کا سفر

گورنمنٹ سروس میں ایک ضابطہ ہے جس کو بریک اِن سروس (break in service) کہا جاتا ہے۔ اگر آپ گورنمنٹ سروس میں ہوں اور آپ بیس سال تک سروس کرتے رہیں، اِس کے بعد اچانک آپ بلا سبب اور بلا اجازت ڈیوٹی پر نہ آئیں تو آپ کی ساری سینئرٹی (seniority) ختم ہو جائے گی۔ آپ پیچھے لوٹ کر دوبارہ وہاں پہنچ جائیں گے، جہاں سے آپ نے سروس شروع کی تھی۔ اِس معاملے کو اصطلاح میں بریک ان سروس کہا جاتا ہے۔

یہی معاملہ معرفت (realization of God) کے سفر کا بھی ہے۔ اگر آپ معرفت کا سفر شروع کریں اور ایک مدت تک آپ مسلسل اُس پر چلتے رہیں، پھر آپ ایک عذر (excuse) لے کر وقتی طور پر معرفت کے سفر کو روک دیں، تو یہ رکنا صرف ایک وقتی رکنا نہ ہوگا، بلکہ وہ بریک اِن معرفت کے ہم معنیٰ بن جائے گا، یعنی آپ پیچھے لوٹ کر دوبارہ اُس ابتدائی مقام پر پہنچ جائیں گے جہاں سے آپ نے اپنا سفرِ معرفت شروع کیا تھا۔

آدمی پر حقیقت کھلتی ہے اور وہ معرفت کا مسافر بن جاتا ہے، پھر درمیان میں کچھ غیر متعلق تقاضے پیش آتے ہیں جن کو عذر بنا کر آدمی اپنے سفرِ معرفت کو روک دیتا ہے۔ مثلاً خاندانی تقاضا، مادّی منفعت کا تقاضا، ذاتی رجحان کا تقاضا، وغیرہ۔

ایسے موقع پر آدمی کو چاہئے کہ وہ اِس قسم کے کسی تقاضے کو ہرگز اپنے لیے عذر نہ بنائے۔ وہ دوسرے تمام تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے معرفت کے سفر کو جاری رکھے۔ ایسا ہی شخص منزل تک پہنچے گا۔ اور جس آدمی نے کسی غیر متعلق تقاضے کو لے کر اس کو اپنے لیے عذر بنا لیا تو وہ اُس کے لیے بریک اِن معرفت کا واقعہ بن جائے گا۔

یہ ایک نہایت سنگین معاملہ ہے۔ معرفتِ حق کے مسافر کو ایسی غلطی کبھی نہیں کرنا چاہیے، ورنہ وہ ایسے نقصان سے دوچار ہوگا جس کی تلافی دوبارہ ممکن نہیں۔

معرفتِ الٰہی

معرفت کیا ہے

معرفت کے لفظی معنی پہچاننے کے ہیں۔ دینی اصطلاح میں، معرفت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اللہ کو پہچانے۔ وہ اپنے شعور کو اِس طرح بیدار کرے کہ اس کو خالق اور مخلوق اور عبد اور معبود کے درمیان تعلق کی گہری پہچان ہوجائے۔ معرفت شعوری دریافت کا نام ہے، وہ کسی پراسرار چیز کا نام نہیں۔

معروف لغوی اور مفسر راغب الاصفہانی (وفات: 1108ء) نے لکھا ہے: **المعرفة والعرفان إدراك الشئ بتفكر وتدبر لأثره، ومعرفة البشر لله هي بتدبر اٰثاره دون إدراك ذاته (المفردات في غريب القرآن، صفحہ 331)** یعنی معرفت یا عرفان کا لغوی مطلب یہ ہے کہ آدمی کسی چیز کی علامت میں غور وفکر کرکے اس کی حقیقت کو دریافت کرے۔ اور اللہ کی معرفت یہ ہے کہ انسان اللہ کو اس کی نشانیوں میں غور وفکر کے ذریعے دریافت کرے، نہ کہ اس کی ذات میں۔

اِس سے معلوم ہوا کہ معرفت کا تعلق مجرد علم سے نہیں ہے، بلکہ معرفت کا تعلق غور وفکر سے ہے۔ علم کسی آدمی کے اندر معرفت کی ابتدائی صلاحیت پیدا کرتا ہے، یعنی چیزوں پر گہرائی کے ساتھ غور وفکر کرنا۔ جب کوئی شخص معرفت کو اپنا مرکزِ توجہ بناتا ہے، وہ مسلسل طور پر اس کے بارے میں سوچتا ہے، وہ تخلیقات میں خالق کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اِس غور وفکر کے نتیجے میں اس کے اندر ایک نئی شخصیت ابھرتی ہے۔ اسی شخصیت کا نام عارف انسان ہے۔

جس شخص کو اِس قسم کی معرفت حاصل ہوجائے، وہ انتہائی سنجیدہ شخص بن جاتا ہے۔ وہ ہر چیز کو عارفانہ نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ شدت کے ساتھ اپنا محاسبہ کرنے لگتا ہے۔ اس کی عبادت اور اس کے اخلاق ومعاملات میں معرفت کے اثرات دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس کو فرشتوں کی ہم نشینی حاصل ہوجاتی ہے۔ اس کا لگاؤ سب سے زیادہ اُن چیزوں میں ہوجاتا ہے جو معرفت کی غذا دینے والی ہوں۔ وہ معرفت کے ماحول میں جیتا ہے اور معرفت کی ہواؤں میں سانس لیتا ہے۔

معرفت کی اہمیت

حضرت انس بن مالک الانصاری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا۔ اُس نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کون سا عمل افضل ہے (**أيّ الأعمال أفضل**)۔ آپ نے فرمایا: اللہ کی معرفت (**العلم بالله عزوجل**) اُس آدمی نے دوبارہ پوچھا کہ اے خدا کے رسول، کون سا عمل افضل ہے۔ آپ نے فرمایا: اللہ کی معرفت۔ اُس آدمی نے کہا اے خدا کے رسول، میں آپ سے عمل کے بارے میں پوچھتا ہوں اور آپ مجھ کو علم کے بارے میں بتا رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: **إن قليل العمل ينفع مع العلم، وإن كثير العمل لا ينفع مع الجهل** (**جامع بيان العلم وفضله، رقم الحديث** : 165) یعنی علم کے ساتھ تھوڑا عمل زیادہ نفع دیتا ہے، اور جہل کے ساتھ زیادہ عمل بھی نفع نہیں دیتا۔

اِس حدیث رسول میں علم سے مراد معرفت ہے۔ اِسی طرح قلیل اور کثیر سے مراد صرف مقداری معنیٰ میں کمی یا زیادتی نہیں ہے۔ اِس سے مراد دراصل یہ ہے کہ جو عمل معرفت یا داخلی اسپرٹ کے ساتھ کیا جائے، وہی دراصل عمل ہے۔ جو عمل معرفت یا داخلی اسپرٹ سے خالی ہو، اُس عمل کا کوئی اعتبار نہیں۔

اصل یہ ہے کہ اسلام کا آغاز معرفت سے ہوتا ہے، یعنی اللہ کے وجود کی دریافت اور اللہ سے اپنے تعلق کی دریافت۔ اِسی دریافت کا نام ایمان باللہ ہے۔ جب کسی شخص کو اس قسم کا ایمان باللہ حاصل ہو جائے تو اس کا ظہور اس کی زندگی میں لازمی طور پر ہونے لگتا ہے۔ اُس کی سوچ، اس کا کلام، اُس کا سلوک، اس کے معاملات اور اس کی عبادت، ہر چیز میں اس کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس درجے کی معرفت، اُسی درجے کا اسلام، جس درجے کی شعوری معرفت، اُسی درجے کا خارجی عمل۔

معرفت اسلام کی روح (spirit) ہے، معرفت اسلام کی زندگی ہے۔ معرفت کسی آدمی کے اسلام کو زندہ اسلام بنا دیتی ہے — معرفت کے ساتھ عمل شاداب درخت کے مانند ہے، اور معرفت کے بغیر عمل سوکھے درخت کے مانند۔

معرفت ایک دریافت

معرفت (realization) کیا ہے۔ معرفت دراصل یہ ہے کہ ایک بندہ، خدا کی نسبت سے

اپنے عجز (helplessness) کو دریافت کرلے۔ وہ جان لے کہ خدا قادرِ مطلق ہے اور انسان عاجزِ مطلق۔ یہ دریافت جب دل کی گہرائیوں کے ساتھ انسان کی نفسیات میں شامل ہوجائے تو اِسی کا نام معرفت ہے۔ ایک شخص نے اپنے ایک محبوب بیٹے کے نام اپنے خط میں اس کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ — میرے دل کی گہرائیوں کو روشن کرنے والے چاند۔ یہی احساس جب خداوند عالم کی نسبت سے پیدا ہوجائے تو اِسی کا نام معرفت ہے۔

مثلاً آپ قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے اِس آیت تک پہنچتے ہیں: **ولو أنّ ما فی الأرض من شجرة أقلامٌ والبحر یمدّه من بعده سبعةُ أبحرٍ، ما نفدت کلماتُ الله** (31:27)۔ قرآن کی اس آیت پر غور کرتے ہوئے آپ کے سینے میں جذبات کا ایک طوفان اُمڈ پڑتا ہے۔ آپ سوچتے ہیں کہ خدا اگر قدرت کے اعتبار سے ایک انتہا پر ہے، تو انسان عجز کے اعتبار سے دوسری انتہا پر ہے۔ اُس وقت آپ اشک بار آنکھوں کے ساتھ کہہ اٹھتے ہیں کہ — خدایا، جس طرح تیری صفت **ما نفدث کلمات اللّٰه** ہے، اُسی طرح انسان کی صفت '**ما نفدث عجز الانسان**' ہے۔

یہ گویا کہ دریافت کی آخری حد ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان، قادرِ مطلق کے مقابلے میں عاجزِ مطلق کی آخری حد (extent) بناتا ہے۔ یہ شعورِ انسانی کا وہ مقام ہے، جس کا تجربہ انسان کے سوا کوئی دوسری مخلوق نہیں کرسکتی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ستارے اور سیارے، پہاڑ اور سمندر انسان پر رشک (envy) کرنے لگیں۔ یہ تجربہ کسی بندے کے لیے اعلیٰ دریافت کی حیثیت رکھتا ہے، اور اعلیٰ دریافت ہی کا دوسرا نام اعلیٰ معرفت ہے۔ یہ اعلیٰ معرفت اِس وسیع کائنات میں انسان کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں۔

انسانی زندگی کا مقصد

قرآن کی سورہ الذاریات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وما خلقت الجنّ والإنس إلا لیعبدون** (51:56) یعنی میں نے جن اور انسان کو صرف اِس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ اِس میں ''لیعبدون'' کی تشریح عبداللہ بن عباس نے ''لیعرفون'' سے کی ہے، یعنی خالق کی

معرفت کے لیے۔ یہی بات ایک روایت میں اِن الفاظ میں آئی ہے: **کنتُ کنزاً مخفیا، فأردتُ أن أعرف فخلقت الخلق (کشف الخفاء، 2/1011)**

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی زندگی شروع سے آخر تک معرفت کا ایک سفر ہے۔ اِس سفرِ معرفت کا ابتدائی حصہ موجودہ دنیا میں گزرتا ہے، اور اس کا انتہائی اور ابدی حصہ آخرت کی دنیا میں گزرے گا۔ معرفت ایک لامتناہی سمندر ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اس لامتناہی سفر کا مسافر بنے، موت سے پہلے کے مرحلۂ حیات میں بھی اور موت کے بعد کے مرحلۂ حیات میں بھی۔

موجودہ دنیا کے بارے میں قرآن میں آیا ہے: **واٰتاکم من کلّ ما سألتموہ** (14:34) یعنی خدا نے تم کو ہر اُس چیز میں سے دیا جس کو تم نے اس سے مانگا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ وہ معرفت کا سفر طے کرے، لیکن جینے کے سامان کے طور پر اس کو وہ تمام چیزیں دے دی گئی ہیں جن کو لائف سپورٹ سسٹم (life support system) کہا جاتا ہے۔ آخرت کی زندگی بھی حقیقۃً معرفت کی زندگی ہے۔ دنیا کی زندگی میں معرفت کا جو سفر ابتدائی طور پر شروع ہوا تھا، وہ آخرت کی زندگی میں بھی اپنے اعلیٰ ترین صورت میں جاری رہے گا۔ آخرت میں انسان کو یہ موقع ملے گا کہ وہ خالق کا براہِ راست مشاہدہ کرے، وہ خالق کا شریکِ مجلس بنے، وہ خالق سے کلام کرسکے۔ تاہم آخرت میں انسان خدا کا مہمان بن کر رہے گا۔ دنیا میں زندگی کی جو چیزیں اس کو درجۂ ضرورت میں ملی تھیں، وہ آخرت میں انسان کو درجۂ اشتہاء (41:31) میں حاصل ہوجائیں گی۔

معرفت ایک ذاتی دریافت

قرآن میں، ہزار سے زیادہ آیتیں ہیں۔ اِن میں ایک آیت وہ ہے جو قرآن کی سب سے زیادہ لمبی آیت ہے۔ یہ سورہ البقرہ کی آیت نمبر 282 ہے۔ یہ آیت، قرض (debt) کی کتابت (writing) کے بارے میں ہے۔ اِس آیت میں نہ صرف قرض کے معاملے کی کتابت کا حکم ہے، بلکہ اس کی جزئی تفصیلات تک اس میں بتائی گئی ہیں۔

اس کے برعکس معاملہ معرفت کا ہے۔ قرآن میں معرفت کا ذکر ہے، لیکن اس میں کہیں بھی

معرفت کی تفصیلات (details) بیان نہیں کی گئی ہیں۔معرفت کا مادّہ (root) ع، ر، ف ہے۔اِس کے مشتقات (derivatives) قرآن میں تقریباً 70بار آئے ہیں،مگر کہیں بھی معرفت کی تفصیل مذکور نہیں۔مثال کے طور پرقرآن کی سورہ المائدہ میں یہ آیت آئی ہے: **وإذا سمعوا ما أنزل إلى الرسول تریٰ اعینَھم تفیض من الدمع ممّا عرفوا من الحق** (5:83)۔اِس آیت میں بتایا گیا ہے کہ ایک گروہ کوکلام اللّٰہ سن کرمعرفت ملی،لیکن قرآن کے اِس بیان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ متعین طور پر وہ معرفت کیا تھی جواُس گروہ کوحاصل ہوئی۔

قرآن کی اِن دونوں آیتوں کے تقابل سے ایک اہم حقیقت معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ معرفت، فقہی مسئلہ جیسی کوئی چیز نہیں ہے جس کوتعین کی زبان (specific language) میں بیان کیا جاسکے۔معرفت ایک ایسی چیز ہے جوذاتی دریافت (self-discovery) کے طور پر کسی کوحاصل ہوتی ہے۔معرفت یا توخوددریافت کردہ حقیقت (self-discovered reality) کے طور پر حاصل ہوگی، یا پھر وہ سرے سے حاصل ہی نہ ہوگی۔معرفت کے معاملے میں اللّٰہ تعالٰی نے طالب معرفت کے لیے وہی طریقہ رکھا ہے جس کوفنِ تعلیم میں ڈسکوری متھڈ (discovery method) کہا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ معرفت ایک ایسی چیز ہےجس کوآدمی خوداپنے غوروفکر سے دریافت کرتا ہے۔دوسرے لفظوں میں، یہ کہ معرفت ایک اجتہادی موضوع ہے، وہ تقلیدی موضوع نہیں۔ معرفت کے حصول کے لیے تخلیقی ذہن (creative mind) درکار ہے۔معرفت کسی شخص کولمبی فکری جدوجہد کے بعد حاصل ہوتی ہے۔معرفت ایک ذاتی دریافت ہے،معرفت کسی ایسے مقرر کورس کے ذریعے حاصل نہیں ہوتی جوآپ نے کسی شخص کے بتانے سے جانا ہو، جوآپ نے کسی شخص سے بطورتقلیدحاصل کیاہو۔

معرفت ایک تخلیقی موضوع

معرفت کا کوئی سٹ کورس (set course) نہیں۔ایسانہیں ہے کہ اورادووظائف یا

ذکر و اشغال کا کوئی بنا بنایا طریقہ ہے، جو شخص بھی اس کو دہرائے، اُس کو اپنے آپ معرفت حاصل ہو جائے گی۔ اِس قسم کا کوئی نظریہ معرفتِ خداوندی کی تصغیر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معرفت ایک تخلیقی موضوع (creative subject) ہے۔ معرفت کے لیے اجتہادی ذہن درکار ہے۔ معرفت ایک طوفانی تجربہ ہے۔ معرفت کسی شخص کو ذاتی دریافت کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ جو معرفت کسی تقلیدی فارم کے دہرانے سے حاصل ہو، وہ کچھ اور چیز ہوسکتی ہے، وہ معرفت نہیں ہوسکتی۔ جس خدا کی صفت کلّ یومٍ ھو فی شان (55: 29) ہو، اس کی معرفت کسی جامد یا تقلیدی کورس کے ذریعے حاصل نہیں کی جاسکتی۔

جس چیز کو سیکولر اصطلاح میں تخلیقی فکر (creative thinking) کہا جاتا ہے، مذہب کی زبان میں اُسی کا نام اجتہادی فکر ہے۔ اجتہادی فکر کا مطلب آزادانہ سوچ نہیں ہے، اجتہادی فکر کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے بیانات میں چھپے ہوئے معانی کو دریافت کیا جائے۔ معانی کی یہ دریافت اجتہادی فکر کے ذریعے ہوتی ہے۔ اِسی اجتہادی فکر سے اعلیٰ معرفت کے دروازے کھلتے ہیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ یہ خدائی کتاب (قرآن) اِس لیے اتاری گئی ہے، تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر تدبر کریں، وہ اپنی عقل کو استعمال کرکے اُس سے نصیحت حاصل کریں (37-29)۔ اِسی غور وفکر پر مبنی نصیحت کا دوسرا نام معرفت ہے۔ اجتہادی معرفت کے حصول میں قرآن کی حیثیت ایک رہنما کتاب کی ہے۔ معرفت کے بنیادی اصول قرآن میں بتا دئے گئے ہیں۔ اِن بنیادی اصولوں کی رہنمائی میں غور کرکے اُن کے اندر چھپے ہوئے معانی کو دریافت کرنا یہی اجتہاد ہے۔ اور اِسی اجتہادی عمل کے ذریعے اعلیٰ معرفت کے دروازے کھلتے ہیں۔

معرفت کا سفر

قرآن میں خدا کی قدرت کو بیان کرتے ہوئے یہ الفاظ آئے ہیں: **إنما أمره إذا أراد شيئا أن يقول له كن فيكون** (36:82) یعنی خدا جب کسی چیز کو وجود میں لانا چاہتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ ہوجا اور پھر وہ چیز ہوجاتی ہے۔

قرآن کی اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی قدرت اتنی زیادہ ہے کہ وہ چیزوں کو ایک لمحے کے اندر وجود میں لا سکتا ہے، مگر تخلیق کی تاریخ بتاتی ہے کہ خدا نے ایسا نہیں کیا۔ جدید سائنس کی دریافت کے مطابق، موجودہ کائنات کی عمر تقریباً 15 بلین سال ہے۔ خدا نے سب سے پہلے تمام کائناتی ذرات کا مجموعہ بنایا۔ اس مجموعے کو سپر ایٹم (super atom) کہا جاتا ہے۔ پھر اس سپر ایٹم میں دھماکہ (explosion) ہوا۔ اور جمے ہوئے ذرات منتشر ہوکر وسیع خلا میں پھیل گئے۔ پھر اِن ذرات نے ستاروں اور سیاروں کی شکل اختیار کی۔ اس کے بعد نظامِ شمسی (solar system) بنا۔ پھر اِسی نظامِ شمسی کے اندر موجودہ زمین کی تشکیل ہوئی۔ پھر دو گیسوں کے ملنے سے سیال (liquid water) وجود میں آیا۔ اِس کے بعد نباتات اور حیوانات کا ظہور ہوا۔ آخر میں انسان کو پیدا کرکے اُس کو زمین پر بسایا گیا۔

یہ پورا واقعہ اگر ایک تخلیقی کرشمہ کے طور پر اچانک ایک لمحے کے اندر ظہور میں آتا تو وہ انسان کے لیے صرف تحیّر (bewilderment) کا سبب ہوتا، وہ انسان کے لیے غور وفکر کا ذریعہ نہ بنتا۔ خالق نے ایسا کیا کہ کائنات کو ایک لمحے میں پیدا کرنے کے بجائے، ایک لمبے عمل (process) کے ذریعے پیدا کیا۔ کائنات کی تخلیق میں بے شمار عوامل (factors) شامل ہوگئے۔ اِس طرح یہ ممکن ہوا کہ انسان کائنات پر غور کرے اور لامتناہی طور پر وہ اس کے قوانین کو دریافت کرتا رہے۔ اِس طرح کائنات، انسان کے لیے ابدی معرفت کا ذریعہ بن گئی۔ انسان کے لیے یہ ممکن ہوگیا کہ وہ ہر صبح وشام کائنات میں چھپے ہوئے تخلیقی عمل پر غور کرے۔ اِسی طرح وہ مسلسل طور پر خدا کے تخلیقی کرشموں کو دریافت کرتا رہے، اس کا سفرِ معرفت کبھی ختم نہ ہو۔

معرفت کا خزانہ

قرآن میں کلمات اللہ (31:27) کا ذکر ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے اِن کلمات کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کی گنتی کی جائے تو اُن کی گنتی کبھی ختم نہ ہو۔ یہ کلمات اللہ کیا ہیں، یہ کوئی مبہم چیز نہیں۔ اِس سے مراد وہی چیز ہے جس کو اسرارِ کائنات (mysteries of the universe) کہا جاتا ہے۔

جدید سائنس اپنی حقیقت کے اعتبار سے، انھیں کلماتِ الٰہی کو دریافت کرنے کا نام ہے۔

جدید سائنس کی تاریخ تقریباً پانچ سو سال تک پھیلی ہوئی ہے۔ اِس دوران سائنس دانوں نے قوانین فطرت کے اعتبار سے بے شمار چیزیں دریافت کی ہیں۔ دور بین (telescope) اور خورد بین (microscope) کی ایجاد نے اِن دریافتوں کا دائرہ بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنس اپنی نوعیت کے اعتبار سے، معرفت کا علم ہے۔ اُس نے اہلِ ایمان کے لیے معرفت کا ایک عظیم خزانہ کھول دیا ہے۔

یہاں سائنس سے مراد ٹکنکل سائنس (technical science) نہیں ہے، بلکہ اِس سے مراد پاپلر سائنس (popular science) ہے۔ پاپلر سائنس کے موضوع پر ہر زبان میں کتابیں موجود ہیں۔ یہ کتابیں آسان زبان میں ہوتی ہیں اور ہر آدمی اُن کو پڑھ کر سمجھ سکتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ معرفت کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ تخلیقِ خداوندی میں غور وفکر کرنا ہے۔ غور وفکر کے لیے ہمیشہ معاون ڈاٹا (supporting data) درکار ہوتا ہے۔ سائنس کے ظہور سے پہلے اِس معاملے میں صرف محدود ڈاٹا دستیاب تھا۔ اب سائنس نے طالبِ معرفت کے لیے لامحدود ڈاٹا کی عظیم لائبریری فراہم کر دی ہے۔ اب طالب معرفت کے لیے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ وہ اپنے سفرِ معرفت کو لامتناہی طور پر (endlessly) جاری رکھے۔ وہ ہر لمحہ معرفتِ رب کی غذا حاصل کرتا رہے۔ اس کے اندر روحانی ارتقا کا عمل (process) مسلسل طور پر جاری رہے۔ روحانی ارتقا کا یہ عمل موت سے پہلے ایک لمحے کے لیے بھی ختم نہ ہو۔

معرفت ایک خدائی عطیہ

انسان بے شمار چیزوں کا ضرورت مند ہے۔ مگر ان ضرورت کی چیزوں میں سے کوئی بھی چیز وہ خود سے پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ تمام چیزیں خدا کی طرف سے انسان کو یک طرفہ عطیہ کے طور پر ملتی ہیں۔ خدا اگر یہ عطیہ نہ دے تو انسان آخری حد تک تباہ ہو کر رہ جائے۔

انسانی زندگی کا یہی وہ پہلو ہے جہاں سے معرفتِ رب کا آغاز ہوتا ہے۔ کوئی انسان

جب اپنی اِس حیثیت کوشعوری طور پر دریافت کرتا ہےتو وہ خدائی فیضان کا وِعایہ (container) بن جاتا ہے۔ کسی انسان کے اندر اِس قسم کے شعور کا پیدا ہونا، خدا کے ساتھ اس کی صحیح نسبت کا قائم ہوجانا ہے۔ جب کسی انسان کو یہ نسبت حاصل ہوجائے تو اس کے بعد وہ مسلسل طور پر خدائی فیضان (divine inspiration) پانے لگتا ہے۔ ایسے انسان کے اندر معرفتِ رب کا عمل (process) جاری ہوجاتا ہے۔ اگر آدمی اپنی طرف سے کوئی منفی سبب پیدا نہ کرے تو معرفت کا یہ عمل اس کے اندر برابر جاری رہے گا۔ اس کی معرفت مسلسل ترقی کرتی رہے گی، یہاں تک کہ وہ اپنے حدِ کمال کو پہنچ جائے۔

معرفت اپنی حقیقت کے اعتبار سے، ایک خدائی عطیہ (divine gift) ہے۔ دنیا میں جس انسان کو معرفت کا عطیہ ملا، وہی وہ انسان ہے جو آخرت میں جنت کے عطیہ کا مستحق قرار پائے گا۔ معرفت گویا کہ کسی انسان کے لیے خدا کا دنیوی انعام ہے، اور جنت کسی انسان کے لیے خدا کا اُخروی انعام۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ جنت سچائی کی سیٹ (54:55) پر ہوں گے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ جو چیز کسی انسان کو جنت کے لیے غیر مستحق بناتی ہے، وہ کذب (جھوٹ) ہے، کذبِ جلی بھی اور کذبِ خفی بھی۔ جو آدمی اپنے آپ کو ہر قسم کے کذب سے بچائے، وہی وہ انسان ہے جو جنت میں داخلے کا مستحق قرار پائے گا۔ معرفت آدمی کو سچا انسان بناتی ہے اور سچائی انسان کو جنت تک پہنچانے کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔

توسم ذریعۂ معرفت

قرآن میں ربانی انسان کی ایک صفت توسم (15:75) بتائی گئی ہے۔ توسُّم کا مطلب تفرُّس ہے، یعنی ظاہری علامت کے ذریعے کسی داخلی صفت کو پہچاننا۔ صاحب توسم آدمی اِس قابل ہوتا ہے کہ وہ چیزوں سے سبق لے سکے، وہ مادی تجربات کے دوران روحانی غذا حاصل کر سکے۔ توسم کی یہ صلاحیت معرفت کے حصول کے لیے بے حد ضروری ہے۔ جس آدمی کے اندر توسم کی صلاحیت نہ ہو،

وہ یقیناً معرفت سے بھی محروم رہے گا۔

آسٹریلیا کے عالمی تعلیمی ادارہ (Australian Education International) کی طرف سے 2010 میں 60 صفحے کا ایک میگزین شائع ہوا۔ اس کے ایک صفحے پر پوری دنیا کا نقشہ (world map) بڑے سائز میں چھپا ہوا ہے۔ اِس نقشے میں ایک طرف سفید رنگ میں انڈیا ہے، اور دوسری طرف دس ہزار میل کے فاصلے پر ہرے رنگ میں آسٹریلیا۔ ہندستانی نقشے کے اوپر ہندستانی نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں— تم یہاں ہو (You are here)۔ اس کے بعد آسٹریلیا کے نقشے پر لکھا ہوا ہے کہ— تمھارا مستقبل یہاں ہے (Your future is here)۔

آپ نے اس نقشے کو دیکھا۔ اس کے بعد اچانک آپ کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ انسان آج موت سے پہلے کی دنیا میں ہے، لیکن اس کا ابدی مستقبل موت کے بعد کی دنیا میں ہے۔ اپنا مستقبل تلاش کرنے کی جگہ موجودہ دنیا نہیں ہے، بلکہ وہ بعد کو آنے والی آخرت کی ابدی دنیا ہے۔

اِسی انتقالِ فکر (intellectual shift) کا نام توسم ہے، یعنی مادی واقعات سے روحانی سبق لینا، مادی واقعات کو عارفانہ تجربے میں تبدیل کرنا:

To convert material events into spiritual experience.

اِس توسم کا سامان ہر چیز میں موجود ہوتا ہے، کوئی بھی چیز اس سے خالی نہیں۔ اگر آدمی کا ذہن بیدار ہو تو وہ ہر چیز میں توسم کے ذریعے معرفت کی غذا حاصل کرتا رہے گا۔

مبنی بر عقل معرفت

معرفت کا ذریعہ، قرآن کے الفاظ میں، تفکر اور تدبر (3: 191) ہے۔ معرفت کا حصول غور وفکر (contemplation) کے ذریعے ہوتا ہے، اور غور وفکر کا تعلق تمام تر عقل یا دماغ (mind) سے ہے۔ انسان کے جسم میں صرف دماغ یا برین (brain) وہ حصہ ہے جس کے اندر سوچنے کا عمل جاری ہوتا ہے۔ اِسی سوچنے کے عمل کے ذریعے وہ چیز حاصل ہوتی ہے جس کو معرفت

(realization) کہا جاتا ہے۔

قدیم زمانے سے ایک روحانیت پسند طبقہ رہا ہے جو معرفت کا ذریعہ قلب کو بتاتا ہے۔ اِسی نظریے کے تحت، قلبی مراقبہ (meditation) کا طریقہ رائج ہوا۔ مگر یہ نظریہ دینِ خداوندی کی پیداوار نہیں، یہ نظریہ تمام تر وحدتِ وجود (monism) کے تصور کے تحت پیدا ہوا ہے۔ وحدتِ وجود یا ادوئت واد کا عقیدہ رکھنے والوں نے اپنے اِس عقیدے کے تحت ایک نظریہ وضع کیا ہے۔ اِس نظریے کو وہ اِن ڈویلنگ گاڈ (in-dwelling god) کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں، یعنی دل کے اندر بسنے والا خدا۔ مگر یہ نظریہ تمام تر صرف قیاس (supposition) پر مبنی ہے، اُس کے حق میں کوئی حقیقی دلیل موجود نہیں۔

قرآن میں قلب (heart) کے حوالے سے فقہ (فہم) کا حوالہ آیا ہے (7: 179)، مگر یہ صرف ادبی استعمال (literary usage) کے طور پر ہے، وہ حقیقی معنی کے اعتبار سے نہیں۔ موجودہ زمانے میں قلب کی تحقیق کرنے والوں نے بتایا ہے کہ قلب گردشِ خون (blood circulation) کا جو عمل کرتا ہے، اس کے دوران قلب اور دماغ کے مابین کمیونکیشن (communication) ہوتا ہے۔ مگر اِس سے سوچنے والے دل (thinking heart) کا نظریہ ثابت نہیں ہوتا، کیوں کہ دماغ کے ساتھ اِس قسم کا کمیونیکیشن جسم کے ہر عضو (organ) کے ساتھ ہوتا ہے۔ جدید علمِ تشریح الاعضا (anatomy) کے ذریعے جو چیز ثابت ہوئی ہے، وہ اعضا (organs) کے درمیان صرف کمیونکیشن ہے، نہ یہ کہ قلب یا کوئی اور عضو سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جسم کے تمام اعضا (organs) اس اعتبار سے، دماغ کے ماتحت (subservient to the brain) ہیں، اس میں قلب کا کوئی استثنا (exception) نہیں۔

معرفت کا ذریعہ

معرفت کا ذریعہ کسی قسم کے اوراد و اشغال نہیں ہیں۔ معرفت ایک زندہ دریافت کا نام ہے۔ معرفت کے حصول کا طریقہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے، غور وفکر کے ذریعے اپنے اندر وہ

صلاحیت پیدا کرنا، جب کہ آدمی مطالعہ اور مشاہدہ اور تجربہ کے دوران معرفت کا رزق پاتا رہے۔ وہ روزمرہ کے واقعات کو پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) بنا کر معرفت کی دریافت کرتا رہے۔ مثال کے طور پر آپ قرآن کی سورہ النساء پڑھ رہے ہیں۔ آپ اِس آیت تک پہنچتے ہیں: **وإن أردتم استبدال زوج مکان زوج وآتیتم إحداهن قنطاراً فلا تأخذوا منه شیئاً** (4: 20) یعنی اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم اس کو بہت سا مال دے چکے ہو، تو تم اُس میں سے کچھ واپس نہ لو۔

قرآن کی اِس آیت پر غور کرتے ہوئے آپ کی سمجھ میں آتا ہے کہ دئے ہوئے مال کو واپس نہ لینا، یہ ایک شرافت کا معاملہ ہے۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسی شرافت کا حکم دیا ہے اور غیر شریفانہ طرزِ عمل سے منع کیا ہے — پھر آپ سوچتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس شرافت کا حکم دیا ہے، وہ شرافت خود اللہ تعالیٰ میں بے حساب گنا زیادہ ہوگی۔ یہ سوچتے ہوئے آپ تڑپ اٹھتے ہیں اور آنسوؤں کی زبان میں یہ کہتے ہیں کہ — خدایا، تو نے دنیا میں مجھ کو ہر قسم کی نعمتیں عطا فرمائیں۔ اب کیا آخرت میں تو اِن نعمتوں کو مجھ سے چھین لے گا۔ موت سے پہلے کی زندگی میں تو نے مجھ کو جنت میں رکھا۔ یہ تیری اعلیٰ شرافت کے خلاف ہے کہ تو موت کے بعد کی زندگی میں مجھ کو جہنم میں ڈال دے۔

اِسی کا نام پوائنٹ آف ریفرنس ہے، یعنی واقعات اور تجربات کے حوالے سے اللہ کو یاد کرنا، واقعات اور تجربات کو تخلیقی معرفت کا ذریعہ بنا لینا۔ معرفت صرف اُس شخص کو ملتی ہے جو اِس انداز میں اپنے ذہن کی تربیت کرے، دوسرا کوئی طریقہ معرفت کے حصول کا نہیں۔

بے یقینی نہیں

ہدایت کے معاملے میں خدا کا ایک قانون وہ ہے جس کو سورہ الانعام میں قانونِ التباس کہا گیا ہے (6: 8)۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز میں شبہہ کا ایک عنصر (element of doubt) موجود ہوتا ہے۔ یہ قانون مصلحتِ امتحان کی بنا پر ہے۔ جو شخص شبہہ کے اِس پردے کو پھاڑ سکے، وہ سچائی کو پائے گا۔

اور جو شخص شبہہ کے اِس پردے کو پھاڑنے میں ناکام رہے، وہ سچائی کو پانے میں بھی ناکام رہے گا۔ کوئی بھی دوسری چیز اس معاملے میں آدمی کو بچانے والی نہیں۔

معرفت کا معاملہ بھی یہی ہے۔ جو آدمی معرفت کے سفر کا مسافر بنے، اس کو بار بار ایسی صورتِ حال کا سامنا پیش آئے گا، جب کہ وہ محسوس کرے گا کہ وہ شبہہ اور یقین (doubt and conviction) کے درمیان ہے۔ وہ ایک چیز پر یقین کرنا چاہتا ہے، لیکن اِسی کے ساتھ کچھ ایسے اسباب بھی ہیں جو اُس کو شبہہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ ایک چیز کو ماننا چاہتا ہے، لیکن وہ اس کو مان نہیں پاتا۔ تذبذب (hesitation) کی یہ حالت اکثر لوگوں پر گزرتی ہے۔ یہ تذبذب معرفت کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

جب بھی کوئی شخص تذبذب کی کیفیت کا شکار ہوتا ہے تو ہمیشہ اس کے سامنے دو حالتیں ہوتی ہیں— ایک طرف، عقل (reason) کی سطح پر وہ محسوس کرتا ہے کہ فلاں چیز علمی معیار پر بالکل درست ہے، لیکن اِسی کے ساتھ اپنے روایتی خیالات کی بنا پر وہ اِس شک میں رہتا ہے کہ کہیں اس کے اندر کوئی غلطی نہ ہو۔ علمی طور پر مدلل ہونے کے باوجود وہ موہوم شبہہ کی بنا پر بے یقینی کی حالت میں پڑا رہتا ہے۔

بے یقینی کی یہ حالت کسی کے لیے عذر نہیں بن سکتی۔ معرفت کے طالب کے لیے ضروری ہے کہ وہ تذبذب کی اِس حالت سے نکلے۔ وہ شبہہ کے مقابلے میں علم کو ترجیح (priority) دے۔ وہ بے ثبوت شک کی فضا سے باہر آئے۔ وہ ثابت شدہ چیز پر یقین کرتے ہوئے اس کو اختیار کرلے۔ یہ معرفت کے حصول کی لازمی شرط ہے۔

اعلیٰ معرفت

ایک حدیث میں آیا ہے کہ: **الدنیا سجن المؤمن وجنة الکافر (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 5256)** یعنی دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور غیر مومن کے لیے جنت۔

اِس حدیث کو عام طور پر مادی معنی میں لیا جاتا ہے، یعنی دنیا کی مادی چیزوں میں مومن

کو سکون نہیں ملتا، جب کہ غیر مومن اِن مادی چیزوں کو پا کر خوش ہو جاتا ہے۔ یا یہ کہ مومن کو شریعت کے نواہی (ممنوعات) میں جینا پڑتا ہے، جب کہ غیر مومن اپنے آپ کو اِس قسم کی شرعی پابندیوں سے آزاد سمجھتا ہے۔

لیکن اِس حدیث کا ایک اور مطلب ہے جو اعلیٰ معرفت سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک مومن جب حقیقت کی دریافت کے اُس ارتقائی مرحلے پر پہنچتا ہے جہاں اُس کو اعلیٰ معرفت حاصل ہوتی ہے، اُس وقت دنیا اُس کے لیے ایسی ہو جاتی ہے جیسے کہ وہ ایک نفسیاتی قید خانے میں ہے، جیسے کہ وہ ایک ایسی دنیا میں آ گیا ہے جو اُس کے لیے بنائی نہیں گئی، جہاں اُس کی روحانی تسکین کا سامان موجود نہیں۔

ایسے مومن کو جب اعلیٰ معرفت حاصل ہوتی ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اُس کا وجود اِس کا متحمل نہیں، اُس کے پاس وہ الفاظ نہیں جن کے ذریعے وہ اپنی عارفانہ دریافت کو بیان کر سکے، اس کے پاس ایسے سامعین نہیں جو اس کی باتوں کو سمجھ سکتے ہوں، اُس کے آس پاس وہ ماحول نہیں جہاں وہ اپنی معرفت کے ساتھ جی سکے۔

ایسا باشعور مومن ہر لمحہ یہ محسوس کرتا ہے جیسے کہ وہ ایک قفس میں ہے، تمام چیزیں اس کو اپنی عارفانہ سطح کے اعتبار سے غیر موافق نظر آتی ہیں۔ یہی اعلیٰ کیفیت کسی انسان کے لیے جنت میں داخلے کا سرٹفکٹ ہے۔ خدا جس انسان کو ایسی حالت میں پاتا ہے تو وہ اپنے فرشتوں سے کہتا ہے کہ میرے اِس بندے کو جنت میں داخل کر دو، کیوں کہ جنت کو میں نے ایسے ہی بندوں کے لیے بنایا ہے۔ جنت ایسے ہی بندوں کے لیے ہے اور ایسے بندے صرف جنت کے لیے۔

معرفت الٰہی

خدا کی معرفت (realization of God) ایک شعوری دریافت ہے۔ خدا کی معرفت کسی کو اِس طرح نہیں ہو سکتی کہ وہ اللہ، اللہ، کی لفظی تکرار کرے، یا مراقبہ کر کے وہ اپنے آپ کو اِس قابل بنائے کہ دل کی ہر دھڑکن میں اس کو اللہ اللہ کی آواز سنائی دینے لگے۔ اِس قسم کی چیزیں ایک غیر متعلق ورزش

کی حیثیت رکھتی ہے، ان کا خدا کی معرفت سے کوئی تعلق نہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ: **خلق اللہ اٰدم علی صورتہ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 6227)** یعنی اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ اِسی کو لے کر ایک عربی مقولہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے: **من عرف نفسہ فقد عرف ربّہ**، یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچانا، اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

یہ بات بلاشبہہ بہت بامعنی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جس طرح ایک انا (I) ہے، اُسی طرح خدا زیادہ بڑے پیمانے پر ایک انا ہے۔ یہ شعوری انا، ساری کائنات میں ایک استثنا کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ واقعہ انسان کی اپنی حیثیت کو بتاتا ہے اور اِسی کے ساتھ وہ خدا کے وجود کو بھی ثابت کرتا ہے۔ اِس لیے کہ اگر اِس کائنات میں انسان کی صورت میں ایک چھوٹا استثنا (small exception) موجود ہے تو یہ واقعہ اپنے آپ میں اِس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں ایک بڑا استثنا (big exception) بھی یقینی طور پر موجود ہے۔ انسان کا وجود لازمی طور پر خدا کے وجود کا ثبوت بن جاتا ہے۔

اِسی بات کو حدیث میں اِن الفاظ میں کہا گیا ہے کہ — اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا، یعنی جس طرح خدا ایک استثنائی وجود ہے، اُسی طرح انسان بھی کائنات میں ایک استثنائی وجود کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان اگر اِس استثنا کے ظاہرہ پر غور کرے تو وہ یقینی طور پر خدا کو دریافت کرلے گا، وہ پکار اٹھے گا کہ — میں ہوں، اِس لیے یقینی طور پر خدا بھی ہے:

I am, therefore, God is.

معرفت کا استحقاق

ایک حدیث قدسی اِن الفاظ میں آئی ہے: **الکبریاء رِدائی، والعظمۃُ إزاری، فمن نازعنی واحداً منھما، فقذفتہ فی النار (سنن أبی داؤد، رقم الحدیث: 4090)** یعنی اللہ نے فرمایا کہ — کبریائی میری چادر ہے، اور عظمت میرا اِزار ہے، اِن دونوں میں سے کسی کے معاملے میں جو شخص مجھ سے نزاع کرے گا، میں اُس کو آگ میں پھینک دوں گا۔

اِس حدیثِ قدسی سے تواضع (modesty) کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ خدا کے ساتھ انسان کی نسبت صرف حقیقی تواضع کی سطح پر قائم ہوتی ہے۔انسان کے اندر اگر ایک ذرہ کے برابر بھی اپنی بڑائی کا احساس پایا جائے تو خدا سے اُس کی نسبت ہی نہیں قائم ہوگی، اور جس آدمی کی نسبت خدا سے قائم نہ ہو، اُس کا حال یہ ہوگا کہ وہ معرفت کا لفظ بولے گا، لیکن وہ معرفت سے کلی طور پر بے خبر رہے گا۔حقیقی تواضع کی پہچان یہ ہے کہ — آدمی کا حال یہ ہوجائے کہ تعریف اُس کو خوش نہ کرے اور تنقید سے اس کو ناگواری نہ ہو۔

جس آدمی کے اندر حقیقی تواضع نہ ہو، وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اِس احساس میں مبتلا رہتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں۔اِس قسم کا احساس اس کے لیے خدا سے تعلق قائم کرنے میں حتمی رکاوٹ بن جاتا ہے۔اِس کی مثال یہ ہے کہ سوکھی ہوئی زمین میں پانی ڈالا جائے تو وہ اس کو پوری طرح جذب (absorb) کرلے گی۔اِس کے برعکس، گیلی زمین پانی کا ایک قطرہ بھی جذب نہیں کرے گی۔متواضع انسان (modest man) اِس قابل ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آنے والے معرفت کے فیضان (inspiration) کو پوری طرح قبول کرے۔اس کے برعکس، جس آدمی کے اندر کامل تواضع نہ ہو، اس کا حال یہ ہوجائے گا کہ وہ معرفت کے فیضان کو قبول کرنے کے لیے اس کا آخِذ (recipient) نہ رہے گا، وہ معرفت کی بارش کے ماحول میں بھی معرفت سے محروم رہے گا۔

عارفانہ شخصیت

حدیث میں آیا ہے کہ: **اتقوا فراسةَ المومن، فإنه ينظر بنور الله (الترمذی، رقم الحدیث: 3127)** یعنی مومن کی فراست سے بچو، کیوں کہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

اِس حدیث میں فراستِ مومن سے مراد فراستِ عارف (wisdom of a realized person) ہے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ جس شخص کو معرفت حاصل ہوجائے، وہ ایک بے پناہ شخص بن جاتا ہے۔وہ خدا کی روشنی میں چلنے لگتا ہے، اور خدا کی روشنی کو بجھانے کی طاقت کسی کے اندر بھی نہیں۔

جس آدمی کو معرفت کے درجے میں ایمان حاصل ہو جائے، وہ انتہائی حد تک ایک

باشعور انسان بن جاتا ہے۔ اس کے اندر وہ صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے جس کو ذہنی بیداری (intellectual awakening) کہا جاتا ہے۔ وہ ایک نفس مطمئنہ (complex-free soul) بن جاتا ہے۔ اس کے اندر فرقان (8: 29) کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے، یعنی ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان فرق کرکے دیکھنا۔ اس کے اندر مستقبل بینی کی صفت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کی فکر کے اندر وہ گہرائی پیدا ہوجاتی ہے، جب کہ آدمی چیزوں کے اضافی پہلو کو دیکھ سکے۔ یہی وہ صفت ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے:

A wise man is one who knows the relative value of things.

معرفت کسی آدمی کے اندر زہد کی صفت پیدا کردیتی ہے، یعنی دنیا سے بے رغبتی۔ یہی وہ انسان ہے جس کے بارے میں حدیث میں آیا ہے: **ما زهد عبد في الدنيا إلا أنبت الله الحكمة في قلبه، وأنطق بها لسانه، وبصّره عيب الدنيا وداء ها ودواء ها، وأخرجه منها سالماً إلى دار السلام (الفردوس بمأثور الخطاب، رقم الحديث: 6214)**، یعنی جو بندہ دنیا سے بے رغبت ہوجاتا ہے تو اللہ اس کے دل میں حکمت اگا دیتا ہے اور اس کی زبان پر حکمت کو جاری کردیتا ہے، اس کو وہ دنیا کے عیب دکھا دیتا ہے، اس کو وہ دنیا کی بیماری اور اس کے علاج سے باخبر کردیتا ہے، اور اس کو وہ دارالسلام (جنت) تک سلامتی کے ساتھ پہنچا دیتا ہے۔

منفی سوچ نہیں

حدیث میں آیا ہے کہ تم إمّعة نہ بنو، یعنی تم یہ نہ کہو کہ دوسرا شخص تمھارے ساتھ جو سلوک کرے گا، وہی سلوک تم اس کے ساتھ کروگے۔ اِس کے بجائے تمھارا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ اگر کوئی شخص تمھارے ساتھ برا سلوک کرے گا، تب بھی تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کروگے (**لاتكونوا إمّعةً، تقولون: إن أحسن الناس أحسنا، وإن ظلمونا ظلمنا، ولكن وطّنوا أنفسكم إن أحسن الناسُ أن تُحسنوا، وإن أساؤا فلا تظلموا۔ سنن الترمذي، رقم الحديث: 2007**)۔

معرفت صرف اُن عورتوں اور مردوں کو ملتی ہے جو ہمیشہ مثبت سوچ (positive thinking)

کے ساتھ رہنے والے ہوں۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی کے لیے بھی موافق حالات کا ملنا ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں مثبت سوچ پر قائم رہنے کا فارمولا (formula) صرف ایک ہے، اور وہ ہے — یک طرفہ اخلاقیات (unilateral ethics) یعنی یک طرفہ طور پر دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، خواہ وہ اچھا سلوک کرتا ہو یا برا سلوک۔

معرفت صرف اُس سینے میں جگہ پاتی ہے جو مکمل طور پر منفی احساس سے خالی ہو۔ جس دل کے اندر نفرت اور غصہ اور انتقام موجود ہو، اُس دل میں کبھی معرفت جگہ نہیں پائے گی۔ انسان ایک ایسی دنیا میں رہتا ہے جہاں خود قانونِ فطرت کے تحت روزانہ ناخوش گوار تجربات پیش آتے ہیں۔

ایسی حالت میں کسی آدمی کے لیے معرفت کے حصول کا ذریعہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کرے کہ وہ منفی تجربہ (negative experience) کو مثبت سبق میں تبدیل کر سکے۔ وہ ناخوش گوار حالات میں بھی اپنی مثبت سوچ پر قائم رہے۔ وہ اپنے اندر وہ برتر سوچ (high thinking) پیدا کرے جس کے بعد آدمی اِس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ ماحول سے اثر قبول کیے بغیر اپنی بلند فکری کو برقرار رکھے۔ یہی وہ صفت ہے جو آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ اس کا سفرِ معرفت رُکے بغیر ہر حال میں جاری رہے۔

خالق کے وجود کی دریافت

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **خلق الله آدم على صورته (صحيح البخاری، رقم الحديث: 6227)** یعنی اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اِس وسیع کائنات میں ایک فطری استثنا (natural exception) کے طور پر بنایا گیا ہے۔ اپنے اِس ذاتی تجربے سے انسان سمجھ سکتا ہے کہ جب یہاں ایک فطری استثنا ممکن ہے تو فوق الفطری استثنا (supernatural exception) بھی یقینی طور پر ممکن ہے۔ انسان کا وجود خدا کے وجود کو قابلِ فہم (understandable) بناتا ہے۔

وسیع خلا میں بے شمار ستارے اور سیارے (stars and planets) ہیں۔ ہماری زمین میں

بے شمار حیوانات ہیں مگر انسان جیسی حیوانی مخلوق ساری کائنات میں کہیں موجود نہیں۔ انسان ساری کائنات میں ایک نادر استثنا (rare exception) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس نادر استثنا پر غور کیا جائے تو یہ یقین کرنا کچھ مشکل نہیں رہتا کہ اِس قسم کا ایک اور برتر استثنا یہاں موجود ہے۔ یہ معلوم واقعہ کے ذریعے نامعلوم واقعہ کو دریافت کرنا ہے۔ یہ استدلال پورے معنوں میں ایک علمی اور منطقی استدلال کی حیثیت رکھتا ہے۔

رینے ڈیکارٹ (René Descartes) فرانس کا مشہور فلسفی ہے۔ وہ 1596 میں پیدا ہوا، اور 1650ء میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے کہا تھا کہ — میں سوچتا ہوں، اِس لیے میں ہوں:

I think, therefore, I am.

مذکورہ فرانسیسی فلسفی صرف نصف صداقت (half truth) تک پہنچا۔ اس نے اپنے آپ کو دریافت کیا، لیکن وہ اپنے خالق کو دریافت نہ کرسکا۔ اگر وہ مزید غور وفکر کرتا تو اپنے وجود (existence) کی صورت میں، وہ خدا کے وجود کو دریافت کرلیتا۔ اس کا اپنا وجود اُس کے لیے خدا کے وجود کا ثبوت بن جاتا۔ وہ مخلوق کے ذریعے خالق کو دریافت کرلیتا۔ وہ پکار اٹھتا کہ — میں ہوں، اِس لیے خدا ہے:

I am, therefore, God is.

سب سے بڑا امتحان

جان اسٹوارٹ مل (John Stuart Mill) انیسویں صدی عیسوی کا ایک برطانی فلسفی ہے۔ وہ 1806 میں پیدا ہوا، اور 1873 میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کی کتاب آٹو بائیوگریفی (Autobiography) 1873 میں شائع ہوئی۔ اِس کتاب میں مصنف نے لکھا ہے کہ پہلے میں روایتی طور پر خدا کو مانتا تھا۔ لیکن میرے باپ (James Mill) نے اِس سلسلے میں مجھ سے ایک بات کہی، اُس کے بعد میں نے خدا کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔ میرے باپ نے کہا کہ — اگر خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے تو خدا کو کس نے پیدا کیا:

If God created man, who created God.

خدا کی معرفت کے بارے میں بلا شبہہ یہ سب سے بڑا امتحان ہے۔ انسان کا ذہن ایک محدود ذہن ہے۔ اِس کے باوجود انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ لامحدود خدا کی معرفت حاصل کرے۔ معرفت

کا معاملہ اصلاً یہی ہے کہ ایک محدود ہستی، ایک لامحدود ہستی کو دریافت کرے اور کامل یقین کے ساتھ اس کو مان لے۔ یہی معرفت ہے۔ اِس مرحلے کو پار کئے بغیر کسی کو معرفت کا کریڈٹ ملنے والا نہیں۔

خدا کی دریافت کا معاملہ دوسری چیزوں کی دریافت سے مختلف ہے۔ مثلاً قوتِ کشش (gravity) بھی ایک دریافت کا موضوع ہے، لیکن یہ دریافت صرف ایک علمی دریافت ہے، اس کی بنیاد پر کسی کو ابدی انعام ملنے والا نہیں۔ لیکن خدا کی دریافت کے ساتھ ایک عظیم انعام جُڑا ہوا ہے۔ خدا کی دریافت کرنے والے کے لیے یہ مقدر ہے کہ اس کو ابدی جنت میں داخلہ ملے۔ اِس لیے خدا کی دریافت کی ایک قیمت رکھ دی گئی۔ اِس قیمت کو ادا کئے بغیر کسی کو خدا کی دریافت کا کریڈٹ نہیں مل سکتا۔ وہ قیمت یہ ہے کہ آدمی محدود ذہن کے ساتھ لامحدود کا احاطہ کرے، وہ عالمِ مشاہدہ (seen world) میں غیر مشہود خدا (unseen God) کو دریافت کرلے۔ اِسی دریافت کا نام معرفت ہے، اور جنت کی قیمت یہی معرفت ہے۔

خاموشی اور معرفت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آتا ہے کہ: **کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طویلَ الصَّمت** (مسند احمد، رقم الحدیث: 20311) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر خاموش رہتے تھے۔ حدیث کی کتابوں میں خاموشی (silence) کی اہمیت کے بارے میں بہت سی روایتیں آئی ہیں۔ مثلاً:

علیکم بالصّمْت (الدّارمی، رقم الحدیث: 2440) یعنی تم لوگ خاموشی کو لازم پکڑو۔

فلیقل خیراً اولیصمت (مسند احمد، رقم الحدیث: 6621) یعنی مومن کو چاہیے کہ وہ بہتر بات بولے یا وہ خاموش رہے۔

من صمتَ نجا (مسند احمد، رقم الحدیث: 6481) یعنی جو خاموش رہا، اس نے نجات پائی۔

وأن يكون صمتي فكراً (جامع الأصول، رقم الحديث: 9317)
یعنی یہ کہ میری خاموشی غور وفکر کی خاموشی ہو۔

خاموش رہنا صرف خاموش رہنا نہیں ہے، خاموش رہنے کا مطلب ہے— سوچنا اور غور وفکر کرنا۔ ایک مومن جب خاموش رہے گا تو وہ اپنے رب کے بارے میں سوچے گا، اسی کا نام معرفت ہے۔ خاموشی معرفت کا دروازہ ہے۔ سچی خاموشی آدمی کو سچی معرفت تک پہنچاتی ہے۔

خاموشی آدمی کو یہ موقع دیتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ڈسٹریکشن (distraction) سے بچائے۔ وہ اپنے مشاہدات اور تجربات میں توجیہہ (explanation) کا اضافہ کرے۔ وہ سادہ معلومات کو بامعنی معلومات بنائے۔ وہ عالمِ ظاہر سے نکل کر عالم باطن کا سفر کرے۔ وہ نفسیات کی سطح پر خدا اور فرشتوں سے رابطہ (contact) قائم کرے۔ یہ تمام چیزیں آدمی کی معرفت میں اضافہ کرتی ہیں۔ معرفت کا ذریعہ غور وفکر ہے، اور خاموشی کے بغیر غور وفکر کا عمل ممکن نہیں۔ خاموشی کسی انسان کو غیر خدا سے دور، اور خدا سے قریب کر دیتی ہے۔ خاموشی کسی انسان کو یہ موقع دیتی ہے کہ وہ پورے عالمِ وجود سے معرفت کی غذا حاصل کرے، اُس کا عارفانہ سفر غیر منقطع طور پر (non-stop) جاری رہے۔

ایک صحابی کی مثال

مسلم بن بشیر کہتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ اپنی بیماری میں روئے۔ اُن سے پوچھا گیا کہ اے ابو ہریرہ، کیا چیز آپ کو رلا رہی ہے۔ انھوں نے کہا: میں تمھاری اِس دنیا کے لیے نہیں روتا، بلکہ میں تو اِس لیے روتا ہوں کہ میرا سفر لمبا ہے اور زادِ راہ کم ہے۔ میں نے ایک ایسے ٹیلے پر صبح کی ہے جو جنت اور جہنم کی طرف اتر رہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجھ کو اِن دونوں میں سے کس طرف چلایا جائے گا (**بكى أبو هريرة في مرضه، فقيل له ما يبكيك يا أبا هريرة. قال، أما أنّني، فلا أبكي على دنياكم هذه، ولكنّي أبكي لبعد سفري وقلة زادي. أصبحتُ في صعود مهبطة على جنّة ونار، فلا أدري إلى أيّها يُسلك بي.** (الطبقات الكبرى لابن سعد، رقم الأثر: 5699)

صحابیٔ رسول کا یہ کلمہ اعلیٰ معرفت کا کلمہ ہے۔ جب انسان کی معرفت بڑھتی ہے تو اُس وقت اُس کا حال وہی ہو جاتا ہے جس کی ایک مثال صحابیٔ رسول کے مذکورہ قول میں ملتی ہے۔

اعلیٰ معرفت کیا ہے۔ اعلیٰ معرفت یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اس کی عظمت وجلال کے ساتھ دریافت کر لے۔ جب کوئی انسان اللہ کو اس کی عظمت وجلال کے ساتھ دریافت کرتا ہے تو اس کی نظر میں اس کا اپنا وجود بالکل حقیر بن جاتا ہے۔ وہ جنت کے مقابلے میں اپنے اعمال کو بے حقیقت سمجھنے لگتا ہے۔ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کے پاس خدا کے دربار میں پیش کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ یہی احساس اس کو اُس آخری حد تک پہنچا دیتا ہے جس کی تصویر حضرت ابو ہریرہ کے مذکورہ قول میں نظر آتی ہے۔ ایک طرف، اللہ کا ارحم الراحمین ہونا، اُس کے اندر امید کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

دوسری طرف، اپنے عمل کی بے بضاعتی کو دیکھ کر وہ اس احساس میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ میں کسی بھی انعام کا مستحق نہیں۔ بے حس انسان صرف اپنے پلس پوائنٹ کو دیکھتا ہے اور حساس انسان کو صرف اپنا مائنس پوائنٹ دکھائی دیتا ہے۔ یہی وہ فرق ہے جو عارف انسان کو غیر عارف انسان سے الگ کرتا ہے۔

معرفت کا سادہ فارمولا

خلیفہ چہارم علی بن ابی طالب کا قول ہے: **عرفتُ ربي بفسخ العزائم** (میں نے اپنے رب کو ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا)۔ یہ معرفت کا ایک ایسا فارمولا ہے جو ہر آدمی کو ہر وقت حاصل رہتا ہے۔ ہر عورت اور ہر مرد کو روزانہ ایسے تجربات ہوتے ہیں، جب کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ میں نے جو چاہا تھا، وہ نہیں ہوا، کبھی چھوٹا تجربہ اور کبھی بڑا تجربہ۔ ایسا ہر تجربہ آدمی کو اس کی محدودیت (limitation) یاد دلاتا ہے۔ ایسا ہر تجربہ آدمی کو بتاتا ہے کہ چاہنا اس کے اختیار میں ہے، لیکن اپنے چاہنے کو تکمیل تک پہنچانا اُس کے اختیار میں نہیں۔ جب بھی آدمی کا ارادہ پورا نہیں ہوتا تو یہ اِس حقیقت کی یاد دہانی ہوتی ہے کہ انسان کی ایک حد (limit) ہے۔

جہاں آدمی کی حد آجائے اُس کو فوراً محسوس کرنا چاہیے کہ اس کے بعد خدا کی حد شروع ہو گئی، خواہ وہ ایک چھوٹا واقعہ ہو، مثلاً کسی چیز کا ہاتھ سے چھوٹ کر گرنا یا کوئی بڑا واقعہ،

مثلاً کسی منصوبے کا اپنی خواہش کے مطابق پورا نہ ہونا۔ اگر آدمی کے اندر شعوری بیداری (intellectual awakening) آچکی ہو تو ایسے ہر موقع پر وہ خدا کو دریافت کرے گا، ایسا ہر موقع اس کے لیے خدا کی معرفت کے حصول کا ذریعہ بن جائے گا۔

یہ ایک سادہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ آدمی ہر وقت معرفت کی غذا لے سکتا ہے۔ خواہ وہ تعلیم یافتہ ہو یا غیر تعلیم یافتہ، خواہ وہ امیر ہو یا غریب، خواہ وہ سند یافتہ ہو یا غیر سند یافتہ، اِس قسم کا تجربہ ہر عورت اور مرد کو روزانہ بار بار پیش آتا ہے۔

اگر آدمی اپنے ذہن کو کھلا رکھے، اگر اُس کے اندر تفکیر (thinking) کی صلاحیت زندہ ہو تو وہ اپنی روز مرہ کی زندگی (daily life) میں ہر لمحہ، معرفت کی خوراک حاصل کرتا رہے گا۔ اس کے دل و دماغ میں معرفت کا سر چشمہ مسلسل طور پر جاری رہے گا۔

عظمتِ انسانی

وسیع خلا (space) میں بے شمار ستارے (stars) اور سیارے (planets) اور کہکشائیں (galaxies) ہیں۔ اس میں شمسی نظام (solar system) ہے جس میں بہت سے سیارے ہیں۔ اُن کے درمیان ایک استثنائی سیارہ ہے جس کو زمین کہا جاتا ہے۔ اِس زمین پر لاتعداد مخلوقات ہیں۔ اِن لاتعداد مخلوقات کے ہجوم میں انسان ہے جو انوکھی صفات کا حامل ہے۔

ایسی وسیع کائنات (vast universe) میں ایک انسان زمین پر کھڑا ہوتا ہے۔ وہ بول کر انسانی الفاظ میں کہتا ہے کہ — خدایا، تو رب العالمین ہے۔ میں نے تیری تمام صفتوں کے ساتھ تیری کبریائی کا اعتراف کیا۔ میں تیرے آگے اپنے پورے وجود کے ساتھ سرینڈر کرتا ہوں۔

انسان کے یہ الفاظ خلا میں گونجتے ہیں۔ ان کو کان والے بھی سنتے ہیں اور بغیر کان والے بھی۔ پھر ساری کائنات زبانِ حال سے پکار اٹھتی ہے — دیکھو، یہ انسان بھی کتنا قابلِ رشک ہے۔ ہماری تخلیق میں پہلے سے خدا کی معرفت موجود تھی، انسان نے خود اپنی کوشش سے خدا کو دریافت کیا۔ ہم بولے بغیر خدا کی حمد کر رہے تھے، یہ انسان بول کر خدا کی حمد کر رہا ہے۔ ہم مجبورانہ اطاعت

پر قائم تھے، انسان نے اختیارانہ اطاعت پر اپنے کو قائم کیا۔ ہم غیر شعوری سطح پر خدا سے تعلق قائم کر پائے تھے، انسان شعور کی سطح پر دریافت کئے ہوئے الفاظ میں خالق کا نغمہ گا رہا ہے۔ ہم حالتِ مشہود میں خالق کا اقرار کر رہے تھے، انسان حالتِ غیب میں ہوتے ہوئے خالق کا اعتراف کر رہا ہے۔ ہم گویا مقلدانہ انداز میں خدا کی عبادت کر رہے تھے، انسان تخلیقی (creative) انداز میں خدا کا عبادت گزار بنا ہوا ہے۔ ہم زبانِ حال سے خدا کی بڑائی بیان کر رہے تھے، انسان زبانِ قال سے خدا کی بڑائی بیان کر رہا ہے۔ ہم محدود سطح پر خدا کی تسبیح کر رہے تھے۔ انسان لامحدود سطح پر خدا کی تسبیح کرنے والا بنا ہوا ہے۔

یہی اعلیٰ معرفت ہے۔ اِس قسم کی شعوری معرفت ساری کائنات میں صرف انسان کو حاصل ہے۔ یہی وہ اعلیٰ معرفت والے لوگ ہیں جو جنت الفردوس میں داخل کئے جائیں گے۔

خدااور جنت

انسان کے اندر استثنائی طور پر دو فیکلٹی (faculty) پائی جاتی ہے — ایک، سوچنے کی فیکلٹی (faculty of thinking) اور دوسرے، محظوظ ہونے کی فیکلٹی (faculty of enjoyment)۔ یہ دونوں صلاحیتیں انسان کو استثنائی طور پر دی گئی ہیں۔ اگر آدمی ان دونوں صلاحیتوں کو درست طور پر استعمال کرے تو وہ ایک طرف خدا کے وجود کو دریافت کرلے گا اور دوسری طرف جنت کے وجود کو۔

سوچنا (thinking) انسان کی استثنائی صفت ہے۔ سوچنے کا ظاہرہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ اِس کائنات میں ایک ایسی مخلوق موجود ہے جو استثنائی طور پر تفکیر (thinking) کی صلاحیت رکھتی ہے۔ فرانس کے مشہور فلسفی رینے ڈیکارٹ نے کہا تھا کہ — میں سوچتا ہوں، اِس لیے میں موجود ہوں:

I think, therefore, I exist.

اِسی طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ مفکرِ صغیر کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں مفکرِ کبیر بھی موجود ہے:

The existence of small thinker is a proof
of the existence of the big thinker.

یہی معاملہ احساسِ تلذّذ (sense of pleasure) کا ہے۔انسان اگرغور کرے تو وہ دریافت کرے گا کہ وسیع کائنات میں وہ ایک انوکھا وجود ہے جو استثنائی طور پر لذت کا شعور (sense of pleasure) رکھتا ہے۔

اِس حقیقت کی دریافت اپنے آپ میں ایک اور بڑی حقیقت کی دریافت ہے، وہ یہ کہ اِس دنیا میں جب شعورِ لذت کا وجود ہے تو یقینی طور پر اِس دنیا میں اس کے فل فل منٹ (fulfilment) کا سامان بھی ہونا چاہیے، کیوں کہ ہماری دنیا میں ہر چیز کی تکمیل کے لیے اس کا جوڑا (pair) موجود ہے۔ اِس عام قانونِ فطرت کے مطابق، یقینی طور پر ایسا ہونا چاہیے کہ شعورلذت (sense of pleasure) کا جوڑا، یعنی فل فل مینٹ بھی اِس دنیا میں موجود ہو۔ یہ ظاہرہ جنت کے وجود کا یقینی ثبوت ہے۔

معرفت کی قیمت

ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ قیمت کی ادائیگی کے بغیر کسی کو اس کی مطلوب چیز نہیں ملتی۔ اِسی طرح معرفتِ الٰہی کی بھی ایک قیمت ہے، اور وہ قیمت طالبِ معرفت کی خود اپنی ذات ہے۔ اِس سے کم کوئی چیز معرفت کی قیمت نہیں بن سکتی— خدا کی معرفت کسی آدمی کو ہمیشہ اپنی نفی کی قیمت پر ملتی ہے۔ اپنی نفی نہیں تو خدا کی معرفت بھی نہیں۔

اپنی نفی کا مطلب نام نہاد قسم کی پراسرار ورزشیں نہیں۔ یہ معاملہ تمام تر غور وفکر کے ذریعہ انجام پاتا ہے، نہ کہ روحانیت کے نام پر کچھ جسمانی ورزشوں کے ذریعے۔ نفیِ خویش (self-negation) کیا ہے۔ نفی خویش یہ ہے کہ آدمی رب العالمین کو اِس طرح دریافت کرے کہ اس کے مقابلے میں اُس کو خود اپنا وجود سرتاسر بے حقیقت نظر آنے لگے۔

نفی خویش کا مزاج دراصل عجز، تواضع، اعتراف، محاسبہ، بے نفسی، سادگی، خداترسی، جہنم کا خوف اور جنت کا اشتیاق، جیسی صفات کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ صفات متصوفانہ ریاضت کے ذریعے بیدار نہیں ہوتیں، بلکہ وہ ہمیشہ فکری عمل (thinking process) کے ذریعے کسی شخص کو حاصل ہوتی ہیں۔

نفیِ خویش کا عمل حقائقِ ربانی کی گہری دریافت کے بعد شروع ہوتا ہے، اور وہ زندگی کے آخری لمحے تک برابر جاری رہتا ہے۔ نفیِ خویش دراصل اپنی حقیقتِ واقعی کی دریافت کا دوسرا نام ہے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، انسان کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک معمولی حادثہ اُس کے لیے نا قابلِ برداشت بن جاتا ہے۔ کسی بھی چیز کا علم اس کو یقین کے درجے میں حاصل نہیں۔

انسان ہر لمحہ خارجی اسباب کا محتاج ہے۔ انسان کے وجود کا کوئی بھی حصہ کسی بھی وقت اپنا فطری کام کرنا بند کرسکتا ہے۔ انسان نہ اپنی زندگی کی حقیقت کو جانتا اور نہ اپنی موت کی حقیقت کو جانتا۔ انسان بہت سی چیزیں چاہتا ہے، لیکن کسی بھی چیز پر اُسے کوئی قدرت حاصل نہیں۔ انسان بظاہر آزاد ہے، لیکن ارادہ (will) کے سوا ہر اعتبار سے، وہ مجبور ہے۔

انسانی وجود کے اِن تمام پہلوؤں کے شعور ہی کا دوسرا نام نفیِ خویش ہے، اور یہی نفیِ خویش معرفت کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ نفیِ خویش ایک اعتبار سے، خدا کو قادرِ مطلق کی حیثیت سے دریافت کرنے کا نام ہے، اور دوسرے اعتبار سے، اپنے آپ کو عاجزِ مطلق کی حیثیت سے دریافت کرنے کا نام۔

معرفت کا دروازہ

معرفت کا تعلق مفروضہ قسم کے رومانوی عشق سے نہیں ہے۔ معرفت کا تعلق اِس بات سے ہے کہ آدمی گہرائی کے ساتھ یہ محسوس کرنے لگے کہ اس کا مستقبل تمام تر صرف ایک اللہ سے وابستہ ہے۔ اس کی محبوب جنت صرف اللہ کے دینے سے ملے گی۔

اسی طرح مبغوض جہنم سے نجات بھی اسی وقت ممکن ہوگی جب کہ اللہ اس کو اس سے نجات دے۔ کسی آدمی کے اندر جب اِس قسم کا گہرا شعور پیدا ہوجائے تو اس کے بعد ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس کے اوپر معرفت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

معرفت کوئی فلسفیانہ تصور نہیں۔ معرفت لازمی طور پر ہر آدمی کے ذاتی انٹرسٹ سے جڑی ہوئی ہے۔ اعلیٰ معرفت کا حصول صرف اُس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی ایک طرف فکری سطح پر معرفت کو دریافت کرے۔ نظریاتی اعتبار سے آدمی یہ جان لے کہ معرفت کے سوا کوئی اور چیز اس کی حقیقی منزل

نہیں بن سکتی۔ آدمی کا ذہن پوری طرح اس کی صداقت پر مطمئن ہو جائے۔

دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کا ذاتی انٹرسٹ مکمل طور پر معرفت کے ساتھ وابستہ ہو جائے۔ اِس معاملے میں اس کی دریافت اتنی زیادہ بڑھے کہ وہ شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگے کہ معرفت کے حصول کے بغیر اس کا وجود بے معنی ہو جائے گا، اس کی زندگی اجڑ جائے گی، اس کے لیے مستقبل کے تمام امکانات ختم ہو جائیں گے، وہ ہر اعتبار سے ناکام ونامراد انسان ہو کر رہ جائے گا۔

جب آدمی کا یہ حال ہو کہ اِس طرح وہ فکری اور عملی دونوں اعتبار سے، آخری حد تک معرفت کا طالب بن جائے تو اس کے فوراً بعد یہ ہوتا ہے کہ اس کے اوپر معرفت کے تمام دروازے کھل جاتے ہیں، یہاں تک کہ معرفت کا کوئی بھی دروازہ اُس پر بند نہیں رہتا۔ یہی معرفت کا راستہ ہے۔ اِس کے سوا کسی اور راستے سے معرفت کی منزل تک پہنچنا ممکن نہیں۔

اعلیٰ معرفت

اگر تمام انسانوں میں کوئی ایک شخص ہے جو اعلیٰ معرفت تک پہنچا ہے تو وہ میں ہوں۔ اور اگر تمام انسانوں میں کوئی ایک شخص ہے جو اعلیٰ معرفت سے محروم رہا تو وہ میں ہوں — یہ احساس اس انسان کا ہوتا ہے جو اعلیٰ معرفت کے درجہ تک پہنچے۔ اعلیٰ معرفت تک پہنچنا ممکن ہے مگر کوئی بھی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اعلیٰ معرفت کا درجہ حاصل ہوا ہے۔

اس بے یقینی کا سبب یہ ہے کہ معرفت کسی خارجی کورس کا نام نہیں ہے کہ اس کو پورا کرکے آدمی سمجھ لے کہ میں نے معرفت کا کورس کرلیا اس لیے اب میں معرفت تک پہنچ گیا معرفت تمام تر ایک داخلی حالت کا نام ہے۔ اور داخلی حالت کے بارے میں کوئی فیصلہ دینا صرف خداوند عالم الغیب کے لیے ممکن ہے۔ کوئی انسان حتی کہ خود طالبِ معرفت بھی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

خدا کی اعلیٰ معرفت دراصل خدا کی اعلیٰ دریافت کا نام ہے۔ جب کوئی بندہ اس اعلیٰ دریافت تک پہنچتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا کے مقابلہ میں اس کی حیثیت تمام تر صفر (zero) کی ہوگئی ہے۔ خدا سب کچھ ہے اور وہ خود کچھ بھی نہیں۔ یہ دریافت اس کو بتاتی ہے کہ اس معاملہ میں فیصلہ کا

سارا اختیار صرف خدا کو ہے، فیصلہ میں اس کا اپنا دخل کچھ بھی نہیں ۔ یہ دریافت اس کو بتاتی ہے کہ سارا معاملہ تمام تر یک طرفہ (unilateral) ہے۔

صاحب معرفت کون ہے۔ صاحب معرفت صرف وہ ہے جس کو خدا صاحب معرفت قرار دے۔ اور خدا فیصلہ کے دن (Day of Judgement) سے ایک سکنڈ پہلے بھی کسی کو کچھ نہیں بتاتا۔ یہی وجہ ہے کہ صاحب معرفت اپنی طرف سے سب کچھ کرنے کے باوجود اِس معاملے میں آخر وقت تک مکمل طور پر ایک قسم کی بے یقینی (uncertainty) کے احساس میں مبتلا رہتا ہے۔

معرفت کی راہ میں رکاوٹ

ایک امریکن اسکالر نے اسلام کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد اس نے اسلام پر ایک کتاب لکھی۔ اپنی اِس کتاب میں اس نے لکھا ہے کہ — اسلام کا سب سے بڑا کنسرن اللہ ہے:

The greatest concern of Islam is Allah.

یہ نہایت درست بات ہے۔ معرفت کا دروازہ صرف اُس کے لیے کھلتا ہے جو ایک اللہ کو اپنا سول کنسرن (sole concern) بنالے۔ اِسی طرح معرفت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اپنا واحد کنسرن نہ بناسکے۔ معرفت کے سلسلے میں بلاشبہہ یہی سب سے زیادہ اہم بات ہے۔

اصل یہ ہے کہ کوئی آدمی جس چیز کو اپنا واحد کنسرن بنائے، وہی چیز اس کی سوچ کا مرکز بن جاتی ہے۔ وہ اُسی چیز کی یاد کو لے کر سوتا ہے اور اسی چیز کی یاد کو لے کر جاگتا ہے۔

وہ چیز آدمی کے دماغ پر اتنا زیادہ چھا جاتی ہے کہ عملاً دوسری تمام چیزیں اس کی یاد سے حذف ہو جاتی ہیں۔ آدمی اسی موضوع پر سوچتا ہے۔ وہ اسی کا چرچا کرتا ہے۔ وہ اسی کے بارے میں پڑھتا ہے۔ وہ اسی کے بارے میں ڈسکشن (discussion) کرتا ہے۔ آدمی کا حال یہ ہوجاتا ہے کہ اسی چیز کی یاد سے اس کو سکون ملتا ہے۔ وہ اکیلے میں بھی اسی چیز کی بابت سوچتا ہے اور جب وہ لوگوں کے درمیان ہوتا ہے تب بھی وہ اسی کا چرچا کرتا ہے۔

یہی کسی چیز کو اپنا واحد کنسرن بنانا ہے۔ اور خدا کی معرفت صرف اس انسان کے لیے مقدر ہے

جو اِسی معنی میں خدا کو اپنا واحد کنسرن بنا لے۔ جو شخص اس معنی میں خدا کو اپنا واحد کنسرن نہ بنا سکے، وہ یقینی طور پر خدا کی معرفت سے محروم رہے گا۔ خواہ زبانی طور پر وہ اللہ کا نام لے، وہ تسبیح کے دانوں پر الحمدللہ اور سبحان اللہ کا لفظی وظیفہ پڑھتا رہے۔

معرفت کے حصول میں اصل رکاوٹ یہ ہے کہ آدمی خدا کے سوا کسی اور چیز کو اپنا بڑا بنا لے۔ کسی کو بڑا بنانے کا یہ کام کبھی شعوری طور پر ہوتا ہے اور کبھی غیر شعوری طور پر، مگر نتیجہ دونوں کا ایک ہے، اور وہ ہے خدا کی اعلیٰ معرفت سے محرومی۔ جس عورت یا مرد کو خدا کی اعلیٰ معرفت مطلوب ہو، اس کو بہر حال یہ قیمت دینی پڑے گی۔ اس کو بہر حال یہ کرنا ہوگا کہ وہ اپنی توجہ کو دوسری چیزوں سے ہٹائے اور صرف ایک اللہ کو اپنا واحد مرکزِ توجہ بنا لے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، یہ ایک نفسیاتی قربانی ہے۔ جو شخص یہ قربانی دے، اُسی کو وہ ربانی نعمت ملتی ہے جس کو معرفت کہا جاتا ہے۔

معرفت کا تجربہ

ایک مرتبہ میں سورج کی روشنی میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ اچانک ایک لمحے کے لیے ایسا محسوس ہوا جیسے میں خدا کے دیکھنے کو دیکھ رہا ہوں، میں خدا کے دیکھنے کا تجربہ کر رہا ہوں۔ اس کے بعد اچانک مجھ کو خیال آیا کہ خدا بھی تو اِسی طرح دیکھتا ہوگا۔ اُس وقت ایسا محسوس ہوا جیسے کہ میں خدا کے دیکھنے کو دیکھ رہا ہوں۔ اِسی طرح میں نے ایک بار کسی کے بولنے کو سنا۔ اُس وقت مجھے خیال آیا کہ خدا بھی تو اسی طرح بولتا اور سنتا ہوگا۔ اِس طرح ایک بار میں نے کسی بات کو سوچا، اُس وقت مجھے محسوس ہوا کہ خدا بھی تو اِسی طرح سوچتا ہوگا، وغیرہ۔

ایک دن صبح کو فجر کی نماز کے بعد میں اپنے کمرے کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اُس وقت یہ تمام تجربات مجھے یاد آنے لگے۔ اچانک شدتِ احساس کے ساتھ میں چیخ اٹھا۔ تھوڑی دیر کے لیے میں ایک اور دنیا میں پہنچ گیا۔ اِس تجربے کو قریب تر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے — مجھے ایسا لگا جیسے کہ میں اپنے وجود کی صورت میں بلاتشبیہ خدا کی موجودگی (presence) کو محسوس کر رہا ہوں۔ میں خدا کے دیکھنے کو دیکھ رہا ہوں، میں خدا کے سننے کو سن رہا ہوں، میں خدا کے سوچنے کا تجربہ کر رہا ہوں۔ اُس وقت

ایسا محسوس ہوا جیسے میرا وجود بلاتشبیہ خدا کے وجود میں ڈھل گیا۔ اُس وقت خدا میرے لیے اتنا ہی یقینی وجود بن گیا، جتنا کہ مجھے خود اپنا وجود یقینی معلوم ہوتا ہے۔ ابن عربی کے اِس شعر کو اگر وحدتِ وجود کے معنی میں نہ لیا جائے، جو کہ ایک باطل نظریہ ہے، تو غالباً وہ اِسی قسم کے ربانی تجربے کا ایک بیان ہوگا:

العبد عبدٌ، ولو ترقّی　　والرب ربٌّ، ولو تنزّل

اِس طرح کے تجربات مختلف احوال کے درمیان مجھے بار بار پیش آتے ہیں۔ یہ تجربات میرے لیے خدا کی معرفت کو اُس سطح پر دریافت کرنے کے ہم معنی ہوتے ہیں جس کو قرآن میں بصیرت (75:14) کہا گیا ہے۔ انسان کو خدا نے قدرت (omnipotence) کے سوا اپنی تمام صفات بشری سطح پر دے دیں، تا کہ انسان خدائی صفات کو بشری تجربات کی سطح پر سمجھ سکے۔ وہ خدا کے دیکھنے کو دیکھے، وہ خدا کے سننے کو سنے، اور پھر کامل یقین کے درجے میں وہ خدا کا عارف بن جائے۔

معرفت کی تمثیلات

کائنات معرفت کا ایک عظیم دفتر ہے۔ کائنات کی ہر چیز معرفت کی ایک داستان ہے۔ کائنات کی ہر چیز معرفت کو مجسم کئے ہوئے ہے۔ بقیہ کائنات میں جو چیز فطرت کے قانون کے تحت ظاہر ہوئی ہے، وہی انسان کی سطح پر شعوری معرفت کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔ انسان اگر غور کرے تو کائنات کی ہر چیز اس کو معرفت کا سبق دیتی ہوئی نظر آئے گی۔

سورج تمثیل کی زبان میں بتا رہا ہے کہ معرفت وہی معرفت ہے جو انسان کے وجود کو اندر سے باہر تک روشن کردے۔ بہتا ہوا دریا انسان کو بتا رہا ہے کہ معرفت کو اس طرح حاصل کرو کہ وہ تمھاری روح میں چشمہ بن کر جاری ہو جائے۔ درخت کی ہری بھری شاخیں جب ہوا سے ہلتی ہیں تو وہ انسان کو یہ پیغام دیتی ہیں کہ معرفت کو اِس طرح حاصل کرو کہ وہ تمھارے لیے ایک پُر اہتزاز تجربہ (thrilling experience) بن جائے۔ چڑیاں جب چہچہاتی ہیں تو وہ انسان سے کہتی ہیں کہ خدا کے کمالات اِس طرح دریافت کرو کہ تمھاری زبان پر حمد خداوندی کا نغمہ جاری ہو جائے۔ پہاڑ کی بلندی خاموش زبان میں یہ پیغام دے رہی ہے کہ خدا کو اس کی اعلیٰ عظمتوں کے ساتھ دریافت کرو، وغیرہ۔

یہی حال پوری کائنات کا ہے۔ کائنات کی ہر چیز فطرت کی زبان میں معرفت کا پیغام دے رہی ہے۔ گویا کہ کائنات معرفت کی ایک عظیم لائبریری ہے۔ جس طرح ایک اسکالر لائبریری میں داخل ہوکر کتابوں کے ذریعے معلومات اخذ کرتا ہے، اِسی طرح ایک سچا انسان کائنات کی خدائی لائبریری سے معرفت کی فکری غذا (intellectual food) حاصل کرتا ہے۔

کائنات کی لائبریری انسان کے لیے معرفت کا ایک لامحدود خزانہ ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ معرفت کے انسائکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں درخت کا ہر پتہ اپنے اندر معرفت کا دفتر سموئے ہوئے ہے۔ اِسی بات کو ایک فارسی شاعر نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے— دانش مند انسان کی نظر میں سرسبز درختوں کا ہر پتہ معرفتِ خداوندی کا ایک دفتر لئے ہوئے ہے:

برگِ درختانِ سبز، درنظرِ ہوشیار　　　　ہر ورقے دفترے است، معرفتِ کردگار

معرفت کا آغاز

ایک عربی مثل ہے: **لا أدری، نصف العلم** (میں نہیں جانتا، آدھا علم ہے) یعنی اپنی بےخبری کو جان لینا، علم کا نقطۂ آغاز (starting point) ہے۔ آدمی جب یہ جان لے کہ میں نہیں جانتا تو اس کے بعد اس کے اندر جاننے کی اسپرٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ اسپرٹ آخر کار اس کو علم تک پہنچانے کا ذریعہ بن جاتی ہے، وہ اس کے نہ جاننے کو جاننا بنا دیتی ہے۔ یہی معاملہ معرفت کا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے یہ دریافت کرے کہ وہ معرفت سے خالی ہے۔ اِس کے بعد اس کے اندر تلاشِ معرفت کا جذبہ پیدا ہوگا، جو آخر کار اس کو معرفت تک پہنچا دے گا۔

علم کا آغاز روحِ تجسس (spirit of enquiry) ہے۔ یہی اسپرٹ معرفت کے لیے بھی ضروری ہے۔ آدمی کو سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ معرفت کے بغیر وہ اندھیرے میں ہے۔ معرفت کے ساتھ جینا روشنی میں جینا ہے، اور معرفت کے بغیر جینا اندھیرے میں جینا۔ معرفت کے بغیر انسان کے لیے صرف ناکامی ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ معرفت آدمی کو برتر سطح پر جینے والا بناتی ہے۔ معرفت والا آدمی اِس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ حقیقتوں کو بےآمیز (as it is) انداز میں سمجھ سکے۔

معرفت آدمی کوفرشتوں کا ہم نشیں بناتی ہے۔معرفت آدمی کو اِس قابل بناتی ہے کہ اُس کو خدا کا فیضان (inspiration) ملنے لگتا ہے۔معرفت کسی انسان کو انسانِ کامل بناتی ہے۔معرفت دنیا میں ہدایت کا ذریعہ ہے اور آخرت میں جنت کا ذریعہ۔

معرفت کسی انسان کے لیے اس کے سفرِ حیات کا صحیح آغاز ہے۔معرفت کسی انسان کو بے شعور زندگی سے نکال کر باشعور زندگی کی طرف لے جانے کا ذریعہ ہے۔معرفت کسی آدمی کو اِس قابل بناتی ہے کہ وہ بے خدا طرزِ زندگی سے نکل کر با خدا طرزِ زندگی کو اختیار کر سکے۔معرفت کے ذریعے یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی اپنے اعلیٰ امکانات (potentials) کو دریافت کرے اور خدا کی مدد سے اس کو واقعہ (actual) بنائے— معرفت تکمیلِ علم کا ذریعہ ہے، اور تکمیلِ حیات کا ذریعہ بھی۔

معرفت کی زمین

ایک پودے کے اگنے کے لیے زرخیز زمین (fertile land) درکار ہوتی ہے۔صرف زرخیز زمین ہی میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہاں ایک پودا اُگے اور پھر بڑھتے بڑھتے وہ ایک ہرا بھرا درخت بن جائے۔اِس قسم کا واقعہ کسی بنجر زمین (barren land) میں نہیں ہوسکتا۔زرخیز زمین درخت کے اُگنے کے لیے موافق زمین ہے اور بنجر زمین درخت کے اگنے کے لیے غیر موافق زمین۔

یہی معاملہ معرفت کا بھی ہے۔معرفت کا نشو ونما صرف ایک موافق انسان کی شخصیت میں ہوتا ہے۔غیر موافق انسان کی شخصیت میں کبھی معرفت کا نشو ونما نہیں ہوتا۔اِس موافق شخصیت کو ایک لفظ میں، مثبت شخصیت (positive personality) کہا جاسکتا ہے۔اِسی طرح غیر موافق شخصیت کو ایک لفظ میں منفی شخصیت (negative personality) کہنا صحیح ہوگا۔جو آدمی چاہتا ہو کہ اس کے اندر معرفت کا باغ پرورش پائے، اس کو چاہیے کہ وہ ہر قیمت پر اپنے آپ کو منفی شخصیت بننے سے بچائے۔وہ اپنے آپ کو مثبت شخصیت بنائے، خواہ اُس کو اِس کی کوئی بھی قیمت دینی پڑے۔

منفی شخصیت والا انسان وہ ہے جو ردعمل کی نفسیات میں جیتا ہو، جو ماحول کا اثر قبول کرتا رہے، جو اپنی شعوری ناپختگی (immaturity) کی بنا پر خارجی واقعات سے متاثر ہوتا رہے۔ایسا انسان منفی

شخصیت والا انسان ہے۔ایسے انسان کو کبھی معرفت کا رزق نہیں مل سکتا۔

مثبت شخصیت والا انسان وہ ہے جو اپنی شعوری پختگی (maturity) کی بنا پر اِس قابل ہو کہ وہ خارجی حالات سے اوپر اٹھ کر زندگی گزارے، جو خارجی اثرات سے غیر متاثر رہ کر اپنے ذہن کی تشکیل کر سکے، جو منفی تجربات کو مثبت سبق (positive lesson) میں تبدیل کر سکے۔

یہی مثبت شخصیت ہے۔ اِسی مثبت شخصیت کو خدا کی توفیق سے یہ موقع ملتا ہے کہ وہ مثبت انداز میں سوچے، اُس کو معرفت کی دریافت ہوتی رہے۔اس کے اندر عارفانہ شخصیت کی تشکیل کا عمل (process) جاری رہے— معرفت کا حصول صرف مثبت شخصیت کی زمین پر ہوتا ہے، نہ کہ منفی شخصیت کی زمین پر۔

معرفت کی روشنی

آپ کے آفس میں ٹیوب لائٹ ہے، لیکن اس کا کنکشن پاور ہاؤس سے قائم نہیں ہوا ہے تو آپ کی ٹیوب لائٹ میں کوئی روشنی نہیں ہوگی، وہ بے نور پڑی رہے گی۔لیکن جب اس کا کنکشن پاور ہاؤس سے قائم ہوتو اچانک وہ روشن ہوجاتی ہے۔

یہ مادی واقعہ اُس روحانی حقیقت کی مثال ہے جس کو معرفت (realization) کہا جاتا ہے۔ خدااور بندے کے درمیان اگر ربط قائم نہ ہوتو اس کا وجود معرفت سے بے بہرہ رہے گا، لیکن جب خدا اور بندے کے درمیان ربط قائم ہوجائے تو اس کے بعد اچانک ایسا ہوتا ہے کہ بندے کا دل ودماغ معرفت کی روشنی سے منور ہوجاتا ہے۔

خدا کے تخلیقی نقشہ (creation plan of God) کے مطابق، انسان کی حیثیت اِس دنیا میں پانے والے (taker) کی ہے۔اس کے مقابلے میں، خدا کی حیثیت دینے والے (giver) کی ہے۔ انسان ہر اعتبار سے، ایک محتاج مخلوق ہے۔وہ اپنی کسی بھی حاجت کو خود سے پورا نہیں کرسکتا۔ یہ صرف خدا ہے جو اس کی تمام حاجتوں کو پورا کرنے والا ہے۔انسانی شخصیت کا یہ احتیاطی پہلو انسان کو مسلسل طور پر فقدان کے احساس میں مبتلا رکھتا ہے۔

یہ احساسِ فقدان انسانی شخصیت کا ایک ایسا لازمی حصہ ہے جو کبھی اُس سے جدا نہیں ہوتا۔ جو آدمی شعوری طور پر اِس فقدان سے باخبر ہوجائے، وہ متلاشی (seeker) بن جاتا ہے۔ اور جو آدمی اپنی ذات کے اِس فقدان سے باخبر نہ ہو، وہ ہمیشہ محرومی کے احساس میں مبتلا رہتا ہے۔

خدا کی معرفت انسان کی اِسی تخلیقی کمی کا جواب ہے۔ خدا کی معرفت کے سوا کوئی اور چیز انسان کی اِس کمی کو پورا کرنے والی نہیں۔ جس طرح بلب پاور ہاؤس سے کنکشن کے بغیر روشن نہیں ہوتا، اِسی طرح معرفت کے بغیر کسی انسان کی زندگی ایک بےنور زندگی ہوتی ہے، کوئی اور چیز اس کی شخصیت کو منور کرنے والی نہیں۔

ارتقا پذیر معرفت

ایک مغربی مبصر نے لکھا ہے کہ — ہر دن صبح کو جب سورج کی پہلی کرن تمھارے کمرے میں داخل ہو تو تم اچھل کر بستر سے اٹھو اور کہو کہ ایک اور نئی شان دار صبح:

Wonderful, what a new bright sun!

خدا جو سورج کا خالق ہے، اس کی معرفت بلاشبہہ سورج سے بے شمار گنا زیادہ ہے۔ جس انسان کو خدا کی دریافت ہوجائے، وہ ہر صبح وشام خدا کی نئی تجلّی کو دریافت کرے گا، اس کی معرفتِ خدا ربانی تجلیات کا ایک لامتناہی سفر بن جائے گی۔

معرفت پتھر کی طرح کوئی جامد چیز نہیں ہے، معرفت درخت کی مانند ایک نمو پذیر چیز ہے۔ ایک چھوٹا سا بیج بڑھتے بڑھتے ایک سرسبز درخت بن جاتا ہے۔ یہی معاملہ معرفت کا بھی ہے۔ معرفت کا آغاز اقرارِ ایمان سے ہوتا ہے۔ اِس کے بعد مطالعہ اور غور وفکر کے ذریعہ یہ اقرارِ ایمان ترقی کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ معرفت کا ایک ہرا بھرا درخت، بلکہ معرفت کا ایک پورا باغ بن جاتا ہے۔ معرفت کے ارتقا کا یہ سلسلہ مسلسل جاری رہتا ہے، آدمی کی موت سے پہلے وہ ختم نہیں ہوتا۔

معرفت، خدا کے آلاء (wonders of God) کی دریافت کا نام ہے۔ خدا کے آلاء بے شمار ہیں، اِس لیے خدا کی معرفت بھی ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سفر ہے۔ ہمیشہ نئی نئی دریافتوں کے

ذریعہ یہ سفر مسلسل طور پر جاری رہتا ہے۔ موت اِس سفر کا خاتمہ نہیں۔ موت کے بعد اہل ایمان کے لیے معرفت کا سفر مزید اضافے کے ساتھ جاری رہے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اہلِ جنت کے لیے سب سے زیادہ لذیذ تجربہ یہی ہوگا کہ وہ معرفت کے باغوں میں جئیں، وہ معرفت کی ہواؤں میں سانس لیتے رہیں۔ یہی بلاشبہہ جنت کا سب سے زیادہ لذیذ عطیہ ہوگا۔

وجد اور معرفت کا فرق

وجد (ecstasy) اور معرفت (realization) دونوں بظاہر مشابہ (similar) الفاظ ہیں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے، دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ معرفت ایک اعلیٰ اسلامی صفت ہے، مگر وجد کا اسلام سے کوئی لازمی تعلق نہیں۔ وجد کا تجربہ کسی بھی شخص کو ہوسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وجد کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ رقص وسرود جیسی چیزیں بھی آدمی کے اندر وجد پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔

معرفت کا تعلق شعوری دریافت سے ہے۔ جب ایک شخص غوروفکر کے ذریعہ اپنے خالق کو دریافت کرتا ہے تو اس کو فکر کی سطح پر ایک ربانی دریافت ہوتی ہے۔ اِسی کو معرفت کہا جاتا ہے۔ معرفت کو دوسرے الفاظ میں ذہنی ارتقا (intellectual development) کہا جاسکتا ہے۔ ذہنی ارتقا اگر خالص فطری انداز میں ہو تو وہ لازماً آدمی کو اپنے خالق کی دریافت تک پہنچائے گا، اور خالق کی شعوری دریافت ہی کا دوسرا نام معرفت ہے۔

وجد (ecstasy) اِس کے برعکس، کوئی شعوری چیز نہیں، وہ ایک کیفیاتی حالت ہے۔ اِس قسم کی کیفیت مختلف چیزوں سے پیدا ہوسکتی ہے، مذہبی چیز سے بھی اور غیر مذہبی چیز سے بھی۔ معرفت آدمی کے اندر سوچ اور فکر کی صلاحیت کو جگاتی ہے، مگر وجد کے ذریعے صرف یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر ایک سرور کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ آدمی کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو بے فکری کی حالت میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ وجد کسی آدمی کو ایک مبہم قسم کا سرور تو ضرور دے سکتا ہے، لیکن وجد کسی آدمی کے اندر ذہنی اور روحانی ارتقا کی صفت پیدا نہیں کرسکتا۔

معرفت کسی آدمی کے اندر فکری بیداری پیدا کر کے اس کو اپنے رب سے ملا دیتی ہے، جب کہ وجد کسی آدمی کو صرف اِس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے آپ میں گم رہے، وہ اپنے سے باہر کسی حقیقت کا ادراک نہ کر سکے۔ معرفت کسی آدمی کی بصیرت میں اضافہ کرتی ہے، جب کہ وجد آدمی کو بے خبری کے سوا کہیں اور پہنچانے والا نہیں۔ معرفت ایک شعوری واقعہ ہے، اور وجد صرف ایک وجدانی کیفیت۔

معرفت اور دعا

دعا ایک عارفانہ روح سے نکلتی ہے۔ معرفت کے بغیر دعا صرف تکرارِ الفاظ ہے۔ عارفانہ دعا ہی حقیقی معنی میں دعا ہے۔ جو دعا معرفت سے خالی ہو، اس کی حیثیت صرف ایک قسم کی لپ سروس (lip service) کی ہے، اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ دعا ایک عبادت ہے، اور حقیقی عبادت وہی ہے جس میں اللہ رب العالمین کی معرفت شامل ہو۔

دعا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک دعا وہ ہے جو اپنی کسی حاجت کے لیے کی جائے، جس میں دعا کرنے والا اپنے کسی ذاتی مسئلے کا حوالہ دے کر اللہ سے اس کے حل کی درخواست کرے۔ مثال کے طور پر ایک بے روزگار انسان کا روزگار حاصل کرنے کے لیے اللہ سے دعا کرنا۔ یہ عام قسم کی دعا ہے۔ یہ دعا بھی ایک مطلوب دعا ہے اور اخلاص کے بقدر آدمی کو اس کا ثواب ملتا ہے۔ یہ اللہ کے اوپر منحصر ہے کہ وہ ایسی دعا کو سن کر فوراً اس کو پورا کر دے یا اس کو مستقبل کے خانے میں ڈال دے۔

دوسری دعا وہ ہے جس میں دعا کرنے والا اِس طرح دعا کرے کہ اس کا مسئلہ خود خدا کا مسئلہ بن جائے۔ مثلاً قدیم اسپین میں قحط کے وقت سلطان عبدالرحمٰن الناصر (وفات: 961ء) کی دعا جس میں اس نے کہا تھا: أتعذّب بي الرعيّة، وأنت أرحم الراحمين، یعنی کیا تو میری وجہ سے عام لوگوں کو سزا دے گا، حالاں کہ تو ارحم الراحمین ہے۔ (واقعہ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ماہ نامہ الرسالہ، نومبر 2007، صفحہ 32)۔ اِس دعا میں قحط کے زمانے میں بارش کو خود خدا کی رحمت کا تقاضا قرار دیا گیا ہے، نہ کہ صرف انسان کی ضرورت کا تقاضا۔

پہلی قسم کی دعا محض انسانی تقاضے کے تحت ظہور میں آتی ہے۔ لیکن دوسری قسم کی دعا ہمیشہ

گہری معرفت کے تحت کسی انسان کے دل سے نکلتی ہے۔ دوسری قسم کی دعا ہمیشہ عارفانہ دریافت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اِس قسم کی دعا ہمیشہ کسی آدمی کے دل سے اُس وقت نکلتی ہے جب کہ اس کو اللہ کی قربت کا خصوصی تجربہ ہوا ہو۔ اس قسم کی دعا کی بہت سی مثالیں حدیث میں آئی ہیں۔

سفرِ معرفت

خدا کی معرفت کا سفر لا الہ سے شروع ہوتا ہے اور پھر وہ الّا اللہ تک پہنچتا ہے۔ آدمی کو پہلے متلاشی (seeker) بننا پڑتا ہے، اِس کے بعد وہ دریافت کرنے والے (finder) کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ سفرِ معرفت کی یہی ترتیب عام انسان کے لیے بھی ہے اور یہی ترتیب پیغمبر کے لیے بھی۔

عربی زبان کا ایک مقولہ ہے: **لا أدري، نصف العلم** (میں نہیں جانتا، آدھا علم ہے) آدمی کو پہلے اپنی لاعلمی کو دریافت کرنا پڑتا ہے، اِس کے بعد اس کے اندر تلاش کا وہ جذبہ پیدا ہوتا ہے جس کو روحِ تجسس (spirit of enquiry) کہا جاتا ہے۔ لاعلمی کا یہ جذبہ جتنا زیادہ شدید ہوگا، اتنی ہی زیادہ بڑی معرفت آدمی کو حاصل ہوگی۔ یہ ایک ایسی فطری حقیقت ہے جس میں کوئی استثنا نہیں۔

معرفت کوئی وراثتی چیز نہیں جو باپ سے بیٹے کو اور بیٹے سے پوتے کو مل جائے، معرفت انتہائی حد تک ایک ذاتی نوعیت کی چیز ہے۔ خدا کی معرفت کسی کو ملے گی تو وہ صرف ذاتی کوشش سے ملے گی، ذاتی کوشش کے بغیر ہرگز کسی کو خدا کی معرفت ملنے والی نہیں۔ ذاتی کوشش کے بغیر جو چیز کسی آدمی کو ملے گی، وہ ایک رسمی عقیدہ ہوگا، نہ کہ زندہ معرفت۔

معرفت کا تعلق آدمی کی پوری شخصیت سے ہے۔ معرفت ابتداءً کسی شخص کو ذہن کی سطح پر حاصل ہوتی ہے۔ اِس کے بعد وہ فطری عمل کے تحت اس کی پوری شخصیت کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔ معرفت کا حصول کسی آدمی کے لیے اِس بات کو یقینی بنا دیتا ہے کہ اس کی پوری شخصیت معرفت کے رنگ میں رنگ جائے، اس کی زندگی کا کوئی پہلو اس کے اثر سے خالی نہ رہے۔

معرفت کا سفر دراصل دریافت (discovery) کا سفر ہے۔ یہ دریافت ساری عمر جاری رہتی ہے۔ جو آدمی یہ سمجھے کہ اس نے کامل معرفت حاصل کر لی، اس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس نے

معرفت کوسرے سے دریافت (discover) ہی نہیں کیا۔

معرفت کی قیمت

ایک صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھ کو بتائیے کہ میں خدا کی معرفت کیسے حاصل کروں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کی شادی ہوگئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں، میرے کئی بچے بھی ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ اپنے بچوں کے لیے تحفہ لاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں، کبھی کبھی لاتا ہوں۔ میں نے کہا کہ نہیں، آپ بار بار تحفہ لاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ روزانہ نہیں لاتا، میں نے کہا کہ یہ آدھا جھوٹ ہے۔ کوئی بھی شخص ہر روز اپنے بچوں کے لیے تحفہ نہیں لاتا۔ جو شخص اِس قسم کا تحفہ لاتا ہے، وہ صرف کبھی کبھی لاتا ہے۔

اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ معرفت کی باتیں کرتے ہیں، لیکن وہ معرفت سے خالی ہوتے ہیں۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ وہ معرفت چاہتے ہیں، لیکن وہ معرفت کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، اور اِس دنیا میں کوئی بھی چیز قیمت ادا کیے بغیر نہیں ملتی۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ جس چیز کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار نہ ہو، اس کی وہ بات بھی نہ کرے۔ کیوں کہ یہ اِس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہ معرفت کے الفاظ بولتا ہے، لیکن وہ معرفت کی اہمیت کو نہیں جانتا۔

کہا جاتا ہے کہ: **العلم لا یعطیك جُزءَہ، حتی تعطیه کلّك** (علم تم کو اپنا جز صرف اُس وقت دیتا ہے، جب کہ تم اس کو اپنا کُل دے دو)۔ یہی بات معرفت کے لیے درست ہے۔ معرفت کی قیمت یہ ہے کہ آدمی اپنا سب کچھ اُس کو دے دے، وہ اُس کو اپنا واحد کنسرن بنائے، وہ معرفت کی سوچ لے کر شام کو سوئے اور معرفت کی سوچ کے ساتھ صبح کو جاگے، وہ اپنے آپ کو معرفت میں اتنا زیادہ غرق کرے کہ وہ اُس کا خواب دیکھنے لگے۔ معرفت کی قیمت کامل حوالگی ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو معرفت کے حوالے نہ کرے، معرفت کے دروازے بھی اس کے لیے نہیں کھلتے۔

مسائلِ دین، معرفتِ دین

علمِ دین کے دو پہلو ہیں — ایک ہے مسائل دین کا علم، اور دوسرا ہے معرفت دین کا علم۔

مسائل کا تعلق دین کے فارم سے ہے، اور معرفت کا تعلق دین کی اسپرٹ سے۔ دین دار بننے کے لیے دونوں ضروری ہیں۔ مسائل کا علم آدمی کو معرفت کا علم عطا نہیں کرتا، لیکن معرفت کا علم حاصل ہو جائے تو آدمی مسائل کے علم تک بھی ضرور پہنچ جائے گا۔ دین کا سفر معرفت سے شروع ہوتا ہے اور مسائل تک پہنچتا ہے۔ اِس کے برعکس، مسائل کا علم خود بخود کسی کو معرفت تک نہیں پہنچاتا۔

معرفت کیا ہے۔ معرفت دراصل یہ ہے کہ آدمی کو حقیقتِ حیات کی دریافت ہو جائے، آدمی کو اس کی داخلی تلاش کا جواب مل جائے، آدمی اپنی زندگی کی صحیح آئڈیالوجی کو پالے۔ معرفت کو ایک لفظ میں، داخلی انقلاب کہا جاسکتا ہے۔ کسی انسان کے اندر جب یہ داخلی انقلاب آتا ہے تو وہ اس کی پوری شخصیت کو بدل دیتا ہے — اس کا سوچنا، اس کا بولنا، لوگوں کے ساتھ اس کا سلوک، زندگی کے بارے میں اس کے حوصلے اور آرزوئیں، معاملات میں اس کا نقطۂ نظر (outlook)، کسی چیز کو لینے اور کسی چیز کو نہ لینے کے بارے میں اس کا معیار، غرض ہر چیز اللہ کے رنگ میں رنگ جاتی ہے۔

معرفت کے حصول کے بعد آدمی کی جو شخصیت بنتی ہے، اس کے مختلف مظاہر ہیں۔ اِنھیں مظاہر میں سے ایک مظہر وہ ہے جس کو عبادت کہا جاتا ہے۔ مسائل کا تعلق اِنھیں مظاہر سے ہے۔ مظاہر اصلاً داخلی تحریک کے تحت پیدا ہوتے ہیں۔

مسائل کا رول یہ ہے کہ وہ اِن مظاہر کے صحیح حدود کو بتائیں۔ مصلح کا کام یہ ہے کہ وہ معرفت (داخلی اسپرٹ) کے پیدا کرنے پر سب سے زیادہ زور دے۔ یہی اصلاح کا فطری طریقہ ہے۔ اِس کے برعکس، اگر مسائل پر زور دیا جانے لگے تو وہ انتقالِ تاکید (shift of emphasis) کے ہم معنیٰ ہوگا۔ اِس طرح کی تبدیلی سے کبھی مطلوبہ نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ ایسا کرنے سے دین، مسائل پر مبنی دین بن جائے گا، حالاں کہ دین کو معرفت پر مبنی دین ہونا چاہیے۔

معرفتِ تخلیق

انسانی تاریخ کا مطالعہ
خدا کے تخلیقی پلان کی روشنی میں

انسان پوری کائنات میں ایک انوکھا استثنا (exception) ہے۔قرآن میں انسان کی تخلیق کے بارے میں یہ الفاظ آئے ہیں: **خلقتُ بيديَّ** (38:75)یعنی انسان کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا۔حدیث میں انسان کے بارے میں آیا ہے کہ: **خلق اللّٰه آدم على صورته (صحيح البخاري، رقم الحديث: 5873)**یعنی اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔قرآن اورحدیث کے اِن حوالوں سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ انسان کو اللہ نے ایک استثنائی مخلوق کے طور پر پیدا کیا ہے، اور استثنائی مخلوق کے طور پر اس کو پیدا کرنا اپنے آپ میں اِس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کے خالق کو اُس سے ایک استثنائی کردار (role) مطلوب ہے۔

کائنات کی تاریخ کو اگر بگ بینگ (Big Bang) کے واقعے سے شمار کیا جائے تو کائنات کی تاریخ تقریباً 15 بلین سال تک پھیلی ہوئی ہے۔اس مدت میں خالق نے بے شمار چیزیں پیدا کیں۔آخر میں اُس نے انسان کو پیدا کیا۔قرآن کے مطابق، خالق نے انسان کو احسنِ تقویم (95:4) کے ساتھ پیدا کیا اور اس کو ایک مکرّم مخلوق (exalted creature) کا درجہ دیا(17: 70)۔ قرآن سے مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے سوا جو بقیہ موجودات ہیں، وہ براہِ راست یا بالواسطہ طور پر انسان کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ اِس بات کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **وسخّر لكم ما في السماوات وما فى الأرض جميعاً منه، إن في ذلك لأيـاتٍ لقومٍ يتفكّرون** (45: 13)۔قرآن کی یہ آیت ساتویں صدی عیسوی میں نازل ہوئی۔ عجیب بات ہے کہ اکیسویں صدی عیسوی میں سائنسی تحقیقات نے اِس حقیقت کی علمی تصدیق کی ہے۔ جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ پوری کائنات ایک کسٹم میڈ کائنات (custom-made universe) ہے۔ اِس تحقیق کا حوالہ دیتے ہوئے برٹش سائنس داں

الفریڈ رسل (Alfred Russel Wallace) نے لکھا ہے:

> Such a vast and complex universe as that which we know exists around us, may have been absolutely required in order to produce a world that should be precisely adapted in every detail for the orderly development of life culminating in man. (*The Times of India*, New Delhi, September 26, 2010)

انسانیت کی تاریخ

مورخین نے تاریخ نگاری کے مختلف اسلوب اختیار کیے ہیں۔ مثلاً شاہی خاندان (dynasty) کو یونٹ (unit) بنا کر تاریخ لکھنا، جیسے مصر کے فرعون کی خاندانی بادشاہت، روس کے زار (Tzar) کی خاندانی بادشاہت، یا ایمپائر (empire) کو یونٹ بنا کر تاریخ لکھنا۔ مثلاً رومن ایمپائر، ساسانی ایمپائر (Sasanid empire)، یا تہذیب (civilization) کو یونٹ بنا کر تاریخ لکھنا، جیسے مسلم تہذیب، مغربی تہذیب، وغیرہ۔ لیکن تاریخ نگاری کا ایک اور اسلوب ہے جو زیادہ بامعنی اسلوب ہے، وہ یہ کہ خدا کے تخلیقی منصوبہ (creation plan) کی بنیاد پر تاریخ لکھی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ مورخین نے انسانیت کے جن پہلوؤں کو اہم قرار دے کر ان کی نسبت سے تاریخ لکھی ہے، وہ سب تاریخ کے اضافی (relative) پہلو ہیں۔ تاریخ نگاری کا حقیقی پہلو (real) یہ ہے کہ خدا کے منصوبۂ تخلیق کو سمجھا جائے اور اس کے مطابق، انسانی تاریخ کو مرتب کیا جائے۔ اِس اعتبار سے بنیادی طور پر انسانی تاریخ کے چار دور ہیں:

1- انبیاء (prophets) کا دور، یہ دور حضرت آدم سے حضرت محمد تک پھیلا ہوا ہے۔

2- صحابہ کا دور، یعنی پیغمبر اسلام کے اصحاب (companions) کا دور۔

3- الاخوان کا دور، یعنی وہ لوگ جن کو حدیث میں اخوانِ رسول کہا گیا ہے۔

4- الصالحون کا دور، یہ دور قیامت کے بعد آخرت میں شروع ہوگا۔

خدا نے انسان کو ایک آزاد مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ بہت سے انسانوں نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کیا، اور کچھ لوگوں نے اپنی آزادی کا صحیح استعمال کیا۔ اِس طرح یہ تاریخ مختلف حالات سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ انسان کی آزادی کو باقی رکھتے ہوئے خدا اِس تاریخ کو مینیج (manage)

کررہا ہے۔ آخرکار خدا قیامت برپا کرے گا۔ اس کے بعد وہ لوگ منتخب کر لیے جائیں گے جنھوں نے خدا کی نظر میں، اپنی آزادی کا صحیح استعمال کیا اور جنھوں نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کیا، وہ چھانٹ کر الگ کردئے جائیں گے۔ اِس معاملے کو بائبل میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

The descendants of the wicked shall be cut off. (Psalm 37: 38)

جن اور انس کی تخلیق

قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیارہ زمین (planet earth) کو استثنائی طور پر اِس طرح بنایا ہے کہ یہاں زندگی کی بقا ممکن ہوسکے۔ خدا نے زمین پر وہ موافق نظام قائم کیا جس کو معاونِ حیات نظام (life support system) کہا جاتا ہے۔ اِس کے بعد زمین پر سب سے پہلے جنات (15: 27) کو آباد کیا۔ زمین ایک عرصے تک جنات کے چارج میں رہی۔ جن، آگ سے پیدا کئے گئے تھے۔ انھوں نے زمین پر فساد برپا کیا۔ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جنات کو معزول کرکے انسان کو پیدا کیا اور ان کو زمین پر بسایا۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے جب انسان کو بنایا، اُس وقت یہاں دو اور مخلوق جن اور ملائکہ (angels) موجود تھے۔ خدا نے دونوں کو یہ حکم دیا کہ وہ انسان کے آگے سجدہ کریں۔ یہ سجدہ اِس بات کی علامت تھا کہ جن اور ملائکہ انسان کے لیے رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ وہ انسان کو آزادی کے ساتھ عمل کا موقع دیں گے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: **إنّي جاعل فی الأرض خليفة** (2: 30)۔ اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان خلیفۃ اللہ ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خلیفۃ الجن ہے، یعنی جنات کو ہٹا کر ان کی جگہ زمین پر انسان کو ایک آزاد مخلوق کی حیثیت سے آباد کیا گیا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جب خدا نے انسان کو خلیفہ بنانے کا اعلان کیا تو فرشتوں نے اِس پر اپنے تردد کا اظہار کرتے ہوئے کہا: **أتجعل فيها مَن يفسد فيها ويسفك الدماء** (2: 30)۔ یہ بات فرشتوں نے غالباً جنات کے متعلق اپنے سابق تجربے کی بنیاد پر کہی۔ اُن کا مطلب یہ تھا کہ جب آزادی پا کر جنات نے زمین پر فساد برپا کیا، تو اِسی طرح انسان بھی آزادی پا کر زمین میں فساد برپا

کرے گا۔ اِس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إنّي أعلم ما لا تعلمون (2:30) یعنی میں وہ جانتا ہوں جس کو تم نہیں جانتے۔

غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جن اور انسان میں ایک بنیادی فرق ہے، وہ یہ کہ انسان کے خالق نے اس کی تخلیق میں استثنائی طور پر ایک طاقت ور جذبہ شامل کیا جس کو ندامت (feeling of guilt) کہا جاتا ہے، یعنی انسان اپنی آزادی کا بے جا استعمال کر کے ایک غلطی کرتا ہے، لیکن اس کے بعد اس کے اندر ندامت کا احساس جاگتا ہے اور وہ اپنی اصلاح کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ یہ جذبۂ ندامت جنات کے اندر موجود نہ تھا جن کو خالق نے آگ سے پیدا کیا تھا۔ اِسی جذبۂ ندامت کی بنا پر یہ امید تھی کہ انسان غلطی کر کے مستقل طور پر سرکش نہیں بن جائے گا، جیسا کہ ابلیس نے کیا، بلکہ وہ غلطی کرنے کے بعد نادم ہوگا اور دوبارہ اصلاح کے راستے پر چلنے لگے گا۔

ندامت (repentance) کا یہ جذبہ انسان کا ایک عظیم سرمایہ ہے۔ اِس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی صراطِ مستقیم سے بھٹکنے کے بعد دوبارہ مزید شدت کے ساتھ اُس پر قائم ہوجائے۔ اِس معاملے کی پہلی مثال خود انسانِ اول آدم کی زندگی میں ملتی ہے۔ قرآن کے مطابق، انھوں نے ایک غلطی کی اور پھر توبہ کر کے انھوں نے نبوت کا درجہ حاصل کیا (20: 121-122)۔ بعد کی تاریخ میں اِس قسم کی ایک معلوم مثال عمر بن عبد العزیز اموی (وفات: 720ء) کی ہے۔ اُن سے ایک غلطی ہوئی اور پھر انھوں نے توبہ کی۔ اِس کے بعد اُن کو یہ درجہ حاصل ہوا کہ وہ اسلام کی تاریخ میں ایک انتہائی ممتاز فرد قرار پائے، حتی کہ اُن کو خلفاء راشدین کی فہرست میں شامل کر کے پانچواں خلیفہ کہا گیا۔

انسان کا مقصدِ حیات

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جنات اور انسان کو اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں (51: 56)۔ صحابی مفسر عبد اللہ بن عباس کی تفسیر کے مطابق، اس آیت میں عبادت سے مراد معرفت ہے (القرطبی 17/55)۔ معرفت سے مراد کوئی پر اسرار معرفت نہیں ہے۔ یہ دراصل خدا کے تخلیقی منصوبہ کی معرفت ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی فکری صلاحیت (intellectual ability) کو

استعمال کر کے اپنے خالق اور اپنے رب کو دریافت کرے۔ پھر وہ اپنے آپ کو خالق کے منصوبہ میں شامل کرے، وہ اپنے آپ کو اِس کا اہل بنائے کہ خدا اس کو اپنے اعلیٰ انعامات سے نوازے، وہ اپنے آپ کو جنت کے لیے لائق امیدوار (deserving candidate) ثابت کرے۔

قرآن کی یہ آیت اس سلسلے میں رہنما آیت کی حیثیت رکھتی ہے: **خلق الموت والحیاة لیبلوکم أیکم أحسن عملاً** (67:2)۔ قرآن کی اِس آیت کے مطابق، موجودہ دنیا ایک انتخابی مقام (selection ground) ہے۔ یہاں آزادی کے ماحول میں انسان کو رکھ کر یہ دیکھا جارہا ہے کہ کون اپنے آپ کو احسن العمل (best in conduct) ثابت کرتا ہے۔

زندگی کا یہ تصور، زندگی کو نہایت بامعنیٰ بنا دیتا ہے۔ برٹش سائنس داں سرجیمز جینز (James Jeans) نے دیکھا کہ انسان اس دنیا میں آتا ہے اور اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دماغ کو استعمال نہیں کرپاتا، اس کی خواہشوں کو فُل فِل مینٹ (fulfillment) نہیں ملتا اور وہ مر کر اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر اُس نے کہا کہ — انسان بھٹک کر ایک ایسی دنیا میں آ گیا ہے جو اُس کے لیے بنائی نہیں گئی تھی:

Man has strayed into a world which has not been made for him.

لیکن قرآن کے مذکورہ تصورِ حیات کی روشنی میں دیکھئے تو انسانی زندگی ایک انتہائی بامعنی واقعہ بن جاتی ہے۔

قرآن میں خدا کی صفت احسن الخالقین (95:4) بتائی گئی ہے۔ دوسری طرف انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ احسن العمل (67:2) بنے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ خدا کی جو صفت خدائی سطح پر ہے، وہی صفت انسان سے انسانی سطح پر مطلوب ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ خدا کی یہ صفت، قدرت کی سطح پر ظاہر ہوتی ہے اور انسان کے اندر یہ صفت، اطاعت (obedience) کی سطح پر۔

ایک مشہور قول ہے: **تخلّقوا بأخلاق الله** (**شرح العقیدة الطحاویة**، جلد 1، صفحہ 120) یعنی اللہ والے اخلاق کو اپناؤ۔ یہ قول حدیث رسول نہیں ہے، لیکن وہ قرآن کے مذکورہ بیان سے مطابقت رکھتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اخلاقِ خداوندی کے مشابہ بنائے، کسی مجبوری کے بغیر وہ اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرتے ہوئے احسن العمل بنے۔ جو لوگ

اِس معیار پر پورے اتریں، وہ خدا کے مطلوب انسان قرار پائیں گے۔ان کو آخرت کی معیاری دنیا میں خدا کے پڑوس میں جگہ ملے گی (66: 11) ۔ وہ اِس قابل ٹھہریں گے کہ ان کو خدا کی مہمان داری (hospitality) کا شرف حاصل ہوگا (41: 32)۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری کائنات اللہ کی اطاعت کررہی ہے(30:26)۔اِس اعتبار سے، مادّی کائنات انسان کے لیے اطاعتِ الٰہی کے ایک ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ انسان کامل آزادی کے باوجود خود اپنے اختیار سے اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت میں دے دیتا ہے، جب کہ بقیہ کائنات جبر (compulsion) کے تحت یہ اطاعت کررہی ہے۔

اختیارانہ اطاعت (submission by choice) ایک استثنائی ظاہرہ ہے جس کا ثبوت اِس دنیا میں صرف انسان دیتا ہے۔کائنات کی ہر چیز، ذرہ سے لے کر ستاروں (stars) اور سیاروں (planets) تک، کامل طور پر خالق کی عظمت بیان کررہی ہے، مگر اُن کا یہ بیان خاموش زبان میں ہے۔ایسی ایک دنیا میں انسان کھڑا ہو کر نُطق (speech) کی زبان میں کہتا ہے کہ — خدایا، تو سب سے بڑا ہے۔ میں تیری عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے آپ کو تیرے آگے جھکاتا ہوں۔ یہ صرف انسان ہے جو شعور کی سطح پر خالق کو دریافت کرتا ہے اور پھر اپنے شعور کی سطح پر خالق کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے آگے مکمل طور پر اپنے آپ کو سرینڈر (surrender) کردیتا ہے۔یہی شعوری سرینڈر جنت کی قیمت ہے۔

انبیاء کا دور

خالق کے منصوبہ (creation plan) کے مطابق، انسان کو ٹسٹ (test) کے لیے اِس دنیا میں رکھا گیا ہے۔ٹسٹ کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اُس کا معیار(criterion) کیا ہے۔ وہ معیار یہ ہے کہ کون شخص ملی ہوئی آزادی کا صحیح استعمال کرتا ہے اور کون شخص اِس ملی ہوئی آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے۔صحیح اور غلط کا فرق جاننے کے لیے خالق نے پہلا انتظام یہ کیا کہ انسان کی فطرت میں صحیح اور غلط کی تمیز رکھ دی۔یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: فألھمھا

فجورها وتقواها (91: 8) صحیح اور غلط کو جاننے کے لیے فطرت کی یہ رہنمائی گویا کہ ایک غیر منطوق رہنمائی (unspoken guidance) ہے۔ یہ رہنمائی پیدائشی طور پر ہر عورت اور مرد کے اندر یکساں طور پر موجود رہتی ہے۔

اِسی کے ساتھ خالق نے منطوق رہنمائی (spoken guidance) کا انتظام کیا۔ اِس دوسرے انتظام کے تحت، اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اور ہر بستی میں اپنے پیغمبر بھیجے (35: 24)۔ اِن پیغمبروں کو وحی (revelation) کے ذریعے وہ رہنمائی بھیجی گئی جس کو قرآن میں الصراط المستقیم (1: 5) کہا گیا ہے۔ یہ پیغمبر تاریخِ انسانی کے ہر دور میں مسلسل آتے رہے (23: 44)۔ آدم، پہلے انسان بھی تھے اور پہلے پیغمبر بھی۔ اِس کے بعد حضرت محمد تک جو پیغمبر آئے، اُن کی تعداد حدیث میں تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار (1,24000) بتائی گئی ہے (**مسند أحمد بن حنبل، رقم الحديث:** 22288)۔ قرآن میں نام کے ساتھ 25 پیغمبروں کا حوالہ آیا ہے۔

تاہم جدید ذہن کے نزدیک، یہ تمام پیغمبر غیر تاریخی پیغمبر کی حیثیت رکھتے ہیں، اُن کے نزدیک اِن پیغمبروں کو تاریخی پیغمبر (historical prophets) کا درجہ حاصل نہیں۔ پیغمبروں کی پوری تاریخ میں صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا استثنا ہے۔ پیغمبر اسلام محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب مکمل طور پر ایک تاریخی پیغمبر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِس حقیقت کا اعتراف ایک مغربی اسکالر نے اِن الفاظ میں کیا ہے کہ — محمد تاریخ کی مکمل روشنی میں پیدا ہوئے:

Muhammad was born within the full light of history.

پچھلے پیغمبروں کا ذکر تاریخ میں کیوں موجود نہیں، اِس کا سبب تاریخ نگاری کا قدیم ذوق ہے۔ قدیم زمانے میں صرف بادشاہوں کے حالات یا جنگ اور فتح کے واقعات قابلِ ذکر سمجھے جاتے تھے۔ چوں کہ پچھلے پیغمبروں کے ساتھ اِس طرح کے سیاسی واقعات جمع نہیں ہوئے، اِسی لیے قدیم مورخین نے پیغمبر کو تاریخی طور پر قابلِ ذکر نہیں سمجھا۔ آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بڑے بڑے سیاسی واقعات پیش آئے، اِس لیے آپ کے ہم عصر مورخین نے آپ کے ظہور کو ایک تاریخی واقعہ کی

حیثیت دی اور اپنی کتابوں میں ایک واقعہ کے طور پر اس کا اندراج کیا۔

خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر آئے، سب ایک ہی پیغام لے کر آئے اور وہ توحید کا پیغام تھا، یعنی انسان کو چاہیے کہ وہ ایک خدا کا عابد بن کر دنیا میں زندگی گزارے۔ لیکن پچھلے پیغمبروں میں سے کسی پیغمبر کے ساتھ کوئی مضبوط ٹیم جمع نہ ہوسکی، اِس لیے ہر پیغمبر کا مشن عملاً توحید کے اعلان (announcement) کے درجے تک پہنچا، وہ توحید پر مبنی انقلاب کے درجے تک نہ پہنچ سکا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ غیر موحّدانہ آئڈیالوجی پر چلتی رہی، تاریخ کا سفر موحدانہ آئڈیالوجی پر جاری نہ ہوسکا۔

خدا کی یہ سنت ہے کہ وہ دعوت کے لیے اٹھنے والوں کی تائید فرماتا ہے۔ پچھلے پیغمبروں کو اِس مقصد کے لیے جو تائید دی گئی، وہ معجزہ (miracle) تھا۔ مثلاً حضرت موسیٰ کو یہ معجزہ کہ اُن کا عصا ایک زندہ سانپ بن کر زمین پر چلنے لگا۔ مگر اِس طرح کے خارقِ عادت معجزات کے باوجود لوگ پیغمبر کی دعوت کو قبول کرنے پر راضی نہ ہوسکے، معجزہ کو انھوں نے جادو (magic) قرار دے کر رد کردیا۔

نئی منصوبہ بندی

خالق کا وجود ایک نا قابلِ مشاہدہ وجود ہے۔ اِس کے مقابلے میں، مخلوق ایک قابلِ مشاہدہ چیز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اِس بنا پر تاریخ کے آغاز ہی سے ایسا ہوا کہ انسان، مخلوق پرستی یا فطرت پرستی (nature worship) میں مبتلا ہوگیا۔ عبودیت کے فطری جذبات جو خالق کے لیے تھے، اُس کو انسان نے مخلوق کے ساتھ وابستہ کردیا۔ قرآن کی ایک آیت میں اِس حقیقت کی طرف اِن الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: ربّ إنّهن أضللن کثیراً (14: 36) یعنی جو چیزیں انسان کو زیادہ نمایاں دکھائی دیں، اُن کو اُس نے خدائی کا درجہ دے کر پوجنا شروع کردیا۔ مثلاً سورج، چاند، ستارہ، پہاڑ اور سمندر، وغیرہ۔

اِس طرح تاریخ میں انسان کبھی عمومی طور پر مذہبِ توحید کو اختیار نہ کرسکا۔ تمام انسانی آبادیوں میں ایک ہی مذہب رائج ہوا، اور وہ مظاہر پرستی کا مذہب تھا۔ اِسی مظاہر پرستی کو قرآن میں شرک یا مشرکانہ مذہب کا نام دیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ نسل در نسل جاری رہا، یہاں تک کہ شرک کی روایات

تاریخ کے تسلسل میں شامل ہوگئیں۔ اِسی واقعہ کو قرآن کی ایک آیت میں، اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **ولا یلدوا إلاّ فاجراً کفّاراً** (71:27)۔ اِسی تاثر پذیری کو موجودہ زمانے میں کنڈیشننگ (conditioning) کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں ہر پیدا ہونے والا مشرکانہ روایات کے ماحول میں پیدا ہوتا تھا اور دھیرے دھیرے وہ اُسی میں پختہ ہوجاتا تھا۔ اِس طرح ہر انسان کنڈیشننگ (conditioning) کا کیس بن گیا۔ اِسی کنڈیشننگ کی طرف ایک حدیث میں اِن الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: **کُلُّ مولودٍ یولد علی الفطرة، فأبواه یهوّدانه، وینصرانه، ویمجّسانه (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 1319)**۔

حضرت ابراہیم بن آزر (وفات: 1985 ق م) قدیم عراق میں پیغمبر بنا کر بھیجے گئے۔ اُن کی غیر معمولی دعوتی کوشش کے باوجود ان کی قوم انکار کی روش پر قائم رہی۔ اُن کے زمانے تک یہ واضح ہوگیا کہ مجرد دعوت یا انذار وتبشیر لوگوں کی مشرکانہ کنڈیشننگ کو توڑنے کے لیے کافی نہیں۔ نسل در نسل کے روایتی تسلسل نے لوگوں کے ذہن کو شرک پر اتنا زیادہ پختہ کردیا ہے کہ اب اُن کے ذہنی شاکلہ (framework) کو توڑنے یا ان کی ڈی کنڈیشننگ کرنے کے لیے ایک اور انقلابی منصوبہ درکار ہے۔ یہی وہ خدائی فیصلہ تھا جس کے تحت ہاجرہ اور اسماعیل کو عرب کے صحرا میں بسایا گیا۔

خدا کے حکم سے حضرت ابراہیم اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے چھوٹے بیٹے اسماعیل کو لے کر فرشتہ جبریل کی رہنمائی میں شام سے نکلے۔ جب بھی وہ راستے میں کسی بستی سے گزرتے تو وہ جبریل سے پوچھتے کہ اے جبریل، کیا مجھ کو یہاں ٹھہرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جبریل کہتے کہ نہیں۔ اِس طرح چلتے ہوئے وہ موجودہ مکہ کے مقام پر پہنچے۔ اُس وقت یہاں کوئی آبادی نہ تھی، صرف صحرا تھا یا خشک پہاڑ۔ بالآخر جبریل کے حکم سے حضرت ابراہیم نے اپنی بیوی اور اپنے چھوٹے بچے اسماعیل کو یہاں بسا دیا۔

حضرت ابراہیم جب اِس طرح ہاجرہ کو چھوڑ کر وہاں سے جانے لگے تو ہاجرہ نے پوچھا کہ آپ ہم کو اِس صحرا (desert) میں چھوڑ کر کہاں جارہے ہیں۔ ہاجرہ نے کئی بار پوچھا، مگر حضرت ابراہیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر میں ہاجرہ نے کہا کہ کیا آپ کو اللہ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے

(الله أمرك بهذا) حضرت ابراہیم نے کہا کہ ہاں۔ یہ سن کر ہاجرہ نے کہا: إذن لا يُضيِّعُنا الله (صحيح البخاری، رقم الحديث: 3364) یعنی پھر اللہ ہم کو ضائع نہیں کرے گا۔

یہ واقعہ چار ہزار سال پہلے عرب کے صحرا میں پیش آیا۔ اِس کے بعد تحریکِ توحید کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اِس نئے دور کو ایک جملے میں اِس طرح بیان کیا جاسکتا ہے — ایک ایسی قوم تیار کرنا جو مشرکانہ ماحول کی کنڈیشننگ سے پاک ہو۔ یہ مقام جہاں ہاجرہ اپنے چھوٹے بچے کو لے کر آباد ہوئیں، وہ متمدن شہروں سے بہت دور تھا۔ یہاں دن کے وقت صحرا اور پہاڑ اور سورج دکھائی دیتے تھے اور رات کے وقت چاند اور ستارے نظر آتے تھے۔ اِس طرح ایک بے آمیز ماحول میں توالد وتناسل کے ذریعے ایک نئی نسل بننا شروع ہوئی، جو تاریخ میں بنواسماعیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ اِس نسل کی پرورش ایک انتہائی سادہ اور غیر متمدن ماحول میں ہوئی۔ اِس بنا پر وہ مشرکانہ ماحول کی کنڈیشننگ سے محفوظ رہی۔

عام طور پر مورخین اِس نسل کو ایک منفرد نسل کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں۔ اِس نسل کے افراد میں انسانی اوصاف اعلیٰ درجے میں موجود تھے۔ قدیم عرب اِن اوصاف کو 'المروءة' کہتے تھے۔ زیادہ درست طور پر اس کو 'الفطرة' کہا جاسکتا ہے۔ اُس دور کے بنواسماعیل کی اِن غیر معمولی صفات کی بنا پر ایک مغربی اسکالر نے اُن کو ہیروں کی قوم (a nation of heroes) کا نام دیا ہے۔

ہاجرہ اور اسماعیل کے لیے یہ صحرائی زندگی غیر معمولی قربانی کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ قربانی کسی میدانِ جنگ میں لڑ کر مرجانے سے ہزاروں گنا زیادہ بڑی قربانی تھی۔ اِسی لیے قرآن میں اُس کو ذِبحِ عظیم (37: 107) کہا گیا ہے، یعنی عظیم قربانی۔ قرآن کی اِس آیت میں ذِبحِ عظیم سے مراد مینڈھے کا ذبیحہ نہیں، بلکہ وہ خود اسماعیل کا ذبیحہ ہے۔ چار ہزار سال پہلے حضرت اسماعیل کا بے آب وگیاہ صحرا میں آباد ہونا بلا شبہہ ایک عظیم ترین قربانی کا درجہ رکھتا تھا، جسمانی معنوں میں نہیں، بلکہ روحانی معنوں میں۔

آخری رسول کا ظہور

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ایک اعتبار سے، دوسرے رسولوں کی طرح ایک رسول تھے، آپ کی مزید

صفت یہ تھی کہ اسی کے ساتھ آپ خاتم النبیین (33:40) تھے۔ خاتم النبیین کا مطلب صرف یہ نہیں کہ آپ پیغمبروں کی لسٹ کے آخری فرد تھے، پیغمبر اسلام کی اصل حیثیت یہ ہے کہ آپ دو دوروں کے درمیان حدِ فاصل (line of demarcation) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کے اوپر دعوتِ توحید کا ایک دور ختم ہوا۔ آپ کے بعد دوسرے دورِ دعوت کا آغاز ہوا جو قیامت تک مختلف صورتوں میں جاری رہے گا۔

یہاں سوال یہ ہے کہ ختمِ رسالت کے باوجود انسانی نسل کا سلسلہ برابر جاری ہے، پھر آپ کے بعد آنے والی نسلوں کی پیغمبرانہ ہدایت کی صورت کیا ہو۔ اِس کا جواب قرآن کی اِس آیت میں ملتا ہے: **عسیٰ أن یبعثك ربّك مقاماً محموداً** (17:79)۔ قرآن کی اس آیت میں ''مقامِ محمود'' سے مراد کوئی پراسرار مقام نہیں ہے، بلکہ ایک معلوم مقام ہے۔ اِس کا مطلب ہے— تاریخی طور پر مانا ہوا پیغمبر (historically acknowledged prophet)۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو پیغمبر آئے، اُن کی پیغمبرانہ حیثیت کا تعلق دنیا میں ان کی جسمانی موجودگی سے تھا۔ اُن کی وفات کے بعد اُن پر یقین کرنے کے لیے تاریخی شہادت درکار تھی، مگر تاریخی ریکارڈ میں ان کا حوالہ موجود نہ تھا، اِس لیے بعد کی نسلوں کے لیے اُن کی حیثیت تاریخی اعتبار سے، ایک غیر تسلیم شدہ پیغمبر کی ہوگئی۔ جب آدمی زندہ موجود نہ ہو تو صرف تاریخ اس کی زندگی کا ثبوت ہوتی ہے۔ اِس بنا پر یہ ہوا کہ انبیاءِ سابقین اپنی بعد کی نسلوں کے لیے خالص تاریخی اعتبار سے، ہدایت کے مستند مرجع (authentic reference) کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔

مثال کے طور پر مشہور برٹش فلسفی برٹرنڈ رسل (وفات: 1970) نے اپنی کتاب 'میں مسیحی کیوں نہیں' (Why I am not a Christian) میں حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں لکھا ہے کہ— تاریخی اعتبار سے یہ امر سخت مشتبہ ہے کہ مسیح کا کبھی وجود بھی تھا:

Historically, it is quite doubtful whether Christ ever existed at all.

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو مقامِ محمود پر کھڑا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے ساتھ ایسے اسباب اکھٹا کئے جائیں کہ آپ کو تاریخی طور پر ایک مسلَّم پیغمبر کی حیثیت حاصل ہو جائے، تا کہ آپ اپنی

وفات کے بعد آنے والی نسلوں کے لیے بھی اُسی طرح ایک قابلِ حوالہ پیغمبر کی حیثیت سے باقی رہیں، جیسا کہ آپ اپنی زندگی میں ایک قابلِ حوالہ پیغمبر کی حیثیت رکھتے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم واحد پیغمبر ہیں جن کی زندگی اور مشن کے بارے میں مکمل تاریخی ریکارڈ موجود ہے۔ اِسی مسلّمہ تاریخی ریکارڈ کو قرآن میں 'مقامِ محمود' کہا گیا ہے۔ یہی ختمِ نبوت کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ جب ایک پیغمبر کی زندگی اور اس کے مشن سے متعلق تمام تفصیلات قابلِ اعتماد صورت میں لکھی ہوئی محفوظ ہوجائیں، تو اس کے بعد یہ مستند تاریخی ریکارڈ پیغمبر کا قائم مقام بن جاتا ہے۔ اِس کے بعد یہ ضرورت باقی نہیں رہتی کہ دوسرا پیغمبر آئے۔

اصحابِ رسول کا دور

مشہور صحابی رسول عبداللہ بن مسعود کی ایک روایت اِن الفاظ میں آئی ہے: **إنّ اللّٰه نظر فی قلوب العباد فاختار محمداً صلی الله علیه وسلم فبعثه برسالته وانتخبه بعلمه، ثم نظر فی قلوب الناس بعده فاختار الله له أصحاباً، فجعله أنصار دینه و وزراء نبیّه** (**الاستیعاب لابن عبدالبرّ**، جلد 1، صفحہ 6) یعنی اللہ نے بندوں کے دلوں کو دیکھا، پس اُس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چن لیا۔ پیغمبری کے لیے آپ کی بعثت فرمائی اور آپ کو اپنے علم کے مطابق منتخب کرلیا۔ اِس کے بعد اللہ نے لوگوں کے دلوں کو دیکھا، اور رسول اللہ کے لیے آپ کے اصحاب کو چن لیا۔ اُن کو اپنے دین کا مددگار اور اپنے نبی کا وزیر بنایا۔

اِس روایت سے اور اِس طرح کی دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ رسول ایک منتخب گروہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ اصحابِ رسول کون لوگ تھے۔ یہ بنو اسماعیل کی اُس نسل میں پیدا ہونے والے افراد تھے جو خصوصی منصوبہ کے تحت، عرب کے صحرا میں تیار کئے گئے۔ ان کے اندر استثنائی طور پر وہ انسانی کردار موجود تھا جو دعوتِ توحید کی بنیاد پر ایک ٹیم بنانے کے لیے درکار تھا۔ اِس کردار کے اہم پہلو قرآن کی ایک آیت میں اِن الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں: **محمد رسول الله، والذین معه أشداء علی الکفار رحماء بینهم** (48:29)

اِس آیت میں 'والذین معہ' سے مراد ہے— تاریخی عظمت قائم ہونے سے پہلے خالص جوہر (merit) کی بنیاد پر پیغمبر کو پہچاننا، اوراس کی تصدیق کر کے اس کے مشن میں کامل طور پراس کا ساتھی بن جانا۔صحابہ کی جماعت میں یہ صفت ایک تاریخی استثناء کی حیثیت رکھتی ہے۔ پیغمبر اسلام سے پہلے جو پیغمبر آئے، ان کے معاصرین ان کو پہچاننے میں ناکام رہے۔صحابہ کے اندر یہ صفت ان کی صحرائی تربیت کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ اِس صحرائی تربیت نے اُن کو آخری حد تک حقیقت پسند (realist) بنا دیا۔ وہ اِس قابل ہوگئے کہ ایک حقیقت کو وہ اس کی مجرد صورت میں پہچان سکیں۔ عام طور پر لوگ کسی انسان کو صرف اُس وقت پہچانتے ہیں جب کہ بعد کو اس کے گرد تاریخ کی عظمتیں جمع ہوگئی ہوں۔ صحابہ وہ معاصر اہلِ ایمان تھے جنھوں نے تاریخی عظمت سے پہلے پیغمبر کواس کی ساعتِ عسرہ (9: 117) میں پہچانا اوراس کے مشن کے لیے اپنے آپ کو پوری طرح وقف کردیا۔

'أشداء علی الکفار' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صحابہ منکرین پر سخت یا بے رحم تھے۔عربی زبان میں کہا جاتا ہے کہ: هو شديد عليّ (وہ میرا اثر قبول نہیں کرتا)۔اِس اعتبار سے،اشداء علی الکفار کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ اہلِ انکار کے لیے غیر اثر پذیر افراد کی حیثیت رکھتے تھے۔اُن کا شعور اتنا زیادہ بیدار تھا کہ وہ ماحول کا اثر قبول کیے بغیر اپنے اسلامی کردار پر قائم رہ سکتے تھے۔

اِس واقعہ کو دوسرے الفاظ میں، اِس طرح کہہ سکتے ہیں کہ صحابہ اپنے ماحول کی کنڈیشننگ (conditioning) کو قبول نہیں کرتے تھے۔ وہ پوری طرح کنڈیشننگ سے پاک شخصیت (de-conditioned personality) کی حیثیت رکھتے تھے۔ان کے اندر یہ استثنائی صفت ان کی صحرائی تربیت کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ یہ لوگ بنو اسماعیل کی نسل سے تعلق رکھتے تھے،اور بنو اسماعیل کے لیے ان کے صحرائی ماحول میں وہ تمدنی اسباب سرے سے موجود ہی نہ تھے جو لوگوں کی کنڈیشننگ کریں اور اِس طرح اُن کو ان کی فطرت سے ہٹا دیں۔

'رُحماء بينهم' کا مطلب سادہ طور پر یہ نہیں ہے کہ صحابہ دوسروں کے لیے مہربان تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسروں کے لیے مہربان ہونا، ایک نہایت مشکل کام ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں بار بار دوسروں کی طرف سے ناپسندیدہ روش کا تجربہ ہوتا ہے۔ اِس بنا پر عمومی طور پر یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کے اندر ایک دوسرے کے لیے نفرت اور شکایت پیدا ہوجاتی ہے۔ اِس بنا پر دوسروں کے لیے مہربان ہونا، صرف اُس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی شکایتوں سے اوپر اٹھ جائے۔ وہ اتنا زیادہ باشعور ہو کہ وہ منفی تجربات کو مثبت احساس میں تبدیل کرسکے۔

دوسروں کے لیے مہربان ہونے کا مطلب ہے، یک طرفہ طور پر دوسروں کے لیے مہربان ہونا۔ اِس حقیقت کو سامنے رکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ صحابہ کے اندر وہ خصوصی صفت موجود تھی جس کو مثبت سوچ (positive thinking) کہا جاتا ہے۔ صحابہ مثبت ذہن رکھنے والوں (positive thinkers) کا ایک گروہ تھے۔ اِسی یک طرفہ مثبت سوچ کی بنا پر ان کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ شکایات کے باوجود لوگوں کے لیے ہمدرد بن جائیں، لوگوں کی طرف سے ناخوش گوار تجربات پیش آنے کے باوجود وہ لوگوں کے لیے خیر خواہ بنے رہیں۔

فتنہ کا خاتمہ

صحابہ کی جماعت نے جو کام انجام دیا، اُس میں سے ایک خاص کام وہ ہے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة، ويكون الدين كلّه لله** (8:39)۔ فتنہ سے مراد وہی چیز ہے جس کو مذہبی جبر (religious persecution) کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں مذہبی جبر، مذہب کی نسبت سے سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ اِسی حقیقت کی طرف قرآن کی سورہ البروج (85: 4-7) میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اِس عمومی مذہبی جبر کی بنا پر قدیم زمانے میں صرف یہی نہیں تھا کہ مذہب کے بارے میں اختیار (choice) ختم ہوگیا تھا، بلکہ ہر پہلو سے آزادانہ غور وفکر کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ حکومتیں اِس مذہبی جبر کی سرپرستی کرتی تھیں، کیوں کہ اربابِ حکومت اس کو اپنے سیاسی اقتدار کے باقی رکھنے کے لیے نہایت مفید سمجھتے تھے۔ جمہوری دور میں ایک سیاسی پارٹی ووٹروں سے مینڈیٹ (mandate) حاصل کرتی ہے۔

قدیم زمانے میں بادشاہ مشرکانہ عقائد سے اپنے لیے حکومت کا حق حاصل کرتے تھے۔

اصحاب رسول کا رول

اصحاب رسول کی تاریخ عملاً چار ہزار سال پہلے، ہاجرہ اُمّ اسماعیل سے شروع ہوتی ہے۔ ہاجرہ کی قربانی اِس مشہور قول کی کامل مصداق ہے کہ — ہر بڑے واقعہ کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے:

There is a woman at the beginning of all great things.

ہاجرہ کی قربانی سے وہ اعلیٰ نسل بنی جو تاریخ میں بنو اسماعیل (Ishmilites) کے نام سے مشہور ہے۔ اِسی نسل سے وہ استثنائی افراد نکلے جن کے مجموعے کو اصحابِ رسول کہا جاتا ہے۔

اصحابِ رسول کا رول تاریخ میں کیا تھا، وہ ایک حدیثِ رسول سے معلوم ہوتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر (2 ہجری) کے موقع پر دعا کرتے ہوئے اپنے اصحاب کے بارے میں کہا تھا: **اللهم إن تهلك هذه العصابة من أهل الإسلام، لا تُعبد في الأرض** (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1763)۔

اِس قولِ رسول میں **العصابة** سے مراد صحابہ کی جماعت ہے۔ صحابہ نے ہاجرہ کے بعد دوبارہ بے مثال قربانی کے ذریعے عہد ساز رول (epoch-making role) ادا کیا تھا۔ اصحاب رسول کے اِس غیر معمولی رول سے انسانی تاریخ میں وہ انقلاب آیا جس کو فرانسیسی مورخ ہنری پرین (وفات: 1935) نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے — اسلام نے زمین کے نقشہ کو بدل دیا۔ تاریخ کے روایتی ڈھانچے کو اکھاڑ کر پھینک دیا گیا:

Islam changed the face of the globe. The traditional order of history was overthrone.

صحابہ کی قربانیوں کے ذریعے تاریخ میں جو تبدیلی آئی، اس کو ایک لفظ میں اِس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ — صحابہ نے تاریخ میں پہلی بار مخلوق کی پرستش (nature worship) کے دور کو ختم کیا اور خالق کی پرستش کے دور کا آغاز کیا۔ بعد کے زمانے میں انسانی تاریخ میں جو دور رس تبدیلیاں آئیں، وہ سب اُسی انقلاب کا نتیجہ تھیں جو صحابہ کے ذریعہ ساتویں صدی عیسوی میں برپا ہوا تھا۔

الحمدللہ کلچر

قرآن کی پہلی آیت یہ ہے: **الحمد للہ رب العالمین** (1:1)۔ یہ آیت دنیا کی زندگی کے بارے میں ربُّ العالمین کے مطلوب کو بتاتی ہے۔ ٹھیک یہی آیت قرآن میں آخرت کے حوالے سے آئی ہے: **وقیل الحمد للہ رب العالمین** (39:75)۔ یہ دوسری آیت آخرت میں خدا کے مطلوب کو بتا رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ خالقِ کائنات کو انسان کی زندگی میں ایک ہی کلچر مطلوب ہے، اور وہ الحمدللہ کلچر ہے، موجودہ دنیا میں بھی الحمدللہ کلچر، اور قیامت کے بعد بننے والی اگلی دنیا میں بھی الحمدللہ کلچر۔

انسانوں کے درمیان اِسی الحمدللہ کلچر کو فروغ دینے کے لیے خدا نے مسلسل اپنے پیغمبر بھیجے۔ اِس کے نتیجے میں کچھ افراد (individuals) ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی ذاتی زندگی میں الحمدللہ کلچر کو اپنایا، لیکن عمومی حیثیت سے، پوری تاریخ میں الحمدلغیر اللہ کلچر چھایا رہا، انسانی زندگی کا پورا نقشہ الحمدلغیر اللہ کلچر کا عملی نمونہ بن کر رہ گیا۔ یہ معاملہ انسان کے بارے میں خدا کے تخلیقی منصوبہ کے سراسر خلاف تھا۔ اس لیے خدا نے تاریخ میں مداخلت کا فیصلہ کیا۔ خدائی مداخلت (divine intervention) کا یہ واقعہ ساتویں صدی عیسوی میں اصحابِ رسول کے ذریعے ظہور میں آیا۔

قرآن میں اصحابِ رسول کے رول کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ، ویکون الدین کلّہ للہ** (8:39) یعنی اُن سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب کا سب اللہ کے لیے ہوجائے۔ اِس آیت میں فتنہ سے مراد شرک ہے، جیسا کہ مفسرینِ قرآن نے عام طور پر بیان کیا ہے۔ شرک کیا ہے، شرک دراصل الحمدلغیر اللہ کلچر کا دوسرا نام ہے۔ انسان، خالق کو دیکھ نہ سکا تو اُس نے دکھائی دینے والی مخلوقات کی پرستش شروع کردی۔ وہ خالق کے بجائے مخلوق کی عظمت (glory) میں جینے لگا۔ اِسی کا نام شرک ہے۔ اور اِسی کو ہم نے الحمدلغیر اللہ کلچر کا نام دیا ہے۔

حمد کیا ہے

حمد صرف اللہ کے لیے ہے۔ اللہ کے سوا کوئی اور اِس کا سزاوار نہیں کہ اس کی حمد کی جائے۔

حمد کی اصل مدح ہے، لیکن حمد میں مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اِس لحاظ سے، حمد کا مطلب اعلیٰ تعریف (high praise) ہے۔ جس ہستی کی تعریف کی جائے اُس کے لحاظ سے تعریف کرنے والے کے اندر جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جب ایک شخص اللہ کو اس کی عظمتوں کے ساتھ دریافت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ الحمد للہ، تو یہ سادہ طور پر صرف مدح اور تعریف کا ایک کلمہ نہیں ہوتا، اُس میں شکر واعتراف، احسان مندی اور جذباتی تعلق جیسے تمام اعلیٰ احساسات لازمی طور پر شامل ہوجاتے ہیں۔ لغت کے اعتبار سے حمد، مدح کے معنی میں ہے، لیکن استعمال کی نسبت سے اس میں معنوی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ حمد کے لغوی معنی اگرچہ وہی ہیں جو مدح کے معنی ہیں، لیکن حمد کا لفظ جب رب العالمین کی نسبت سے بولا جائے تو وہ مدح پلس (praise plus) کے ہم معنی بن جائے گا۔

ایک انسان جب اپنے وجود پر غور کرتا ہے، وہ کائنات کے بارے میں سوچتا ہے، وہ تخلیق کے مظاہر میں خالق کو دریافت کرتا ہے، تو اس کے اندر احساسات کا سمندر موج زن ہوجاتا ہے۔ اُس وقت وہ بے تابانہ طور پر کہہ اٹھتا ہے: الحمد لله ربّ العالمين۔ یہ شعوری حمد خدا کی ہستی کا اعلیٰ ترین اعتراف ہے، اِس کے بعد اعتراف کا اور کوئی درجہ نہیں۔

انسان کی فطرت میں پیدائشی طور پر یہ شعور موجود ہے کہ وہ ایک اعلیٰ ہستی کو پائے اور اس کے لیے اپنی طرف سے کمالِ اعتراف کے جذبات پیش کرے۔ انسان جب ایک خدا کو اپنی اِس فطرت کی پکار کے جواب کے طور پر دریافت کرے، تو اِسی کا نام توحید ہے۔ اور جب انسان اپنے اِن جذبات کو کسی غیرِ خدا کی طرف منسوب (attribute) کردے اور اُس سے وہ تعلق پیدا کرلے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: يحبّونهم كحب الله (2:165) تو اِسی کا نام شرک ہے۔ توحید پر مبنی دین، اللہ کا مطلوب دین ہے اور شرک پر مبنی دین، اللہ کا غیر مطلوب دین۔

اصحابِ رسول کا ایک استثنائی رول تھا۔ وہ رول یہ تھا کہ وہ تاریخ میں الحمد لغیر اللہ کلچر کے غیر مطلوب تسلسل کو توڑیں اور الحمد للہ کلچر کے مطلوب دور کا آغاز کریں۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں قتال (جنگ) کا لفظ زمانے کی رعایت سے آیا ہے۔ قدیم زمانے میں یہ صورتِ حال تھی کہ الحمد لغیر اللہ کلچر نے

سیاسی اقتدار (political power) کی سرپرستی حاصل کرلی تھی، اِس لیے الحمدلغیر اللہ کلچر کا خاتمہ کرنے کے لیے وقت کے سیاسی اقتدار سے مسلّح ٹکراؤ پیش آیا۔

ساتویں صدی عیسوی میں دو بڑے سیاسی ایمپائر تھے جو الحمدلغیر اللہ کلچر کے فعّال سرپرست بنے ہوئے تھے۔ یہ تھے — رومن ایمپائر، اور ساسانی ایمپائر۔ وہ اپنے اقتدار کی بقا کے لیے ضروری سمجھتے تھے کہ الحمدلغیر اللہ کلچر کا رواج پوری طرح قائم رہے۔ چناں چہ انھوں نے عرب کے صحرا میں اٹھنے والی تحریکِ توحید یا الحمدللہ کلچر کو اپنے لیے ایک سنگین خطرہ سمجھا اور اس کے خلاف خود اپنی طرف سے مسلّح کارروائی کا آغاز کردیا۔ اِس کے نتیجے میں اصحابِ رسول کو رومن ایمپائر اور ساسانی ایمپائر کے مقابلے میں دفاعی طور پر جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ ایک بے حد مشکل کام تھا۔ رومن ایمپائر اور ساسانی ایمپائر کے مقابلے میں اصحاب رسول کی طاقت تقریباً صفر (zero) کی حیثیت رکھتی تھی۔ اِس موقع پر اللہ تعالیٰ نے خصوصی مدد کی۔ ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ دونوں ایمپائر دس سال کے اندر دو بار خود ایک دوسرے کے خلاف مسلّح جنگ میں مبتلا ہوگئے۔ اِس باہمی ٹکراؤ نے دونوں کو آخری حد تک کمزور کردیا۔ باہمی جنگ کے ذریعے پیش آنے والی یہی دوطرفہ مغلوبیت ہے، جس کی طرف قرآن کی سورہ الروم کی ابتدائی آیتوں میں اشارہ کیا گیا ہے (30:2-5)۔

بائبل میں کئی ایسی پیشین گوئیاں ہیں جن کا تعلق اصحابِ رسول سے ہے۔ اُن میں سے ایک پیشین گوئی وہ ہے جس کا تعلق رومن ایمپائر اور ساسانی ایمپائر کی مغلوبیت کے اِسی واقعے سے ہے۔ اِس واقعے کو بائبل میں تمثیل کی زبان میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے — اُس نے نگاہ کی اور قومیں پراگندہ ہوگئیں، ازلی پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگئے، قدیم ٹیلے جھک گئے:

> He looked and startled the nations. And the everlasting mountains were scattered. (Habakkuk 3:6)

خلیفہ ثانی عمر بن الخطاب کے زمانہ خلافت (634-644ء) میں صحابہ کی جماعت ایران میں داخل ہوئی۔ ان کی فتوحات کو دیکھ کر ایران کا سپہ سالار رستم مرعوب ہوگیا۔ اس نے صحابہ کے وفد کو اپنے دربار میں گفت وشنید کے لیے بلایا۔ گفتگو کے دوران رستم نے صحابی رسول ربعی بن عامر سے پوچھا

کہ تم لوگ ہمارے ملک میں کیوں داخل ہوئے۔ ربعی بن عامر نے بے خوفی کے ساتھ جواب دیا: **الله ابتعثنا لنخرج مَن شاء من عبادة العباد إلیٰ عبادة الله** (تاریخ الامم والملوک، جلد 2، صفحہ 401) یعنی اللہ نے ہم کو بھیجا ہے، تا کہ وہ جس کو چاہے ہم اُس کو بندوں کی عبادت سے نکال کر خدا کی عبادت کی طرف لے آئیں۔

صحابیِ رسول کے اِس قول کو اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ اللہ نے اپنے ایک منصوبے کے تحت ہم کو اٹھایا ہے، وہ منصوبہ یہ ہے کہ دنیا سے الحمد لغیر اللہ کلچر کے غیر مطلوب دور کا خاتمہ ہو، اور دنیا میں الحمد للہ کلچر کا ربانی دور شروع ہو جائے۔ اصحابِ رسول کا یہ اقدام اپنی حقیقت کے اعتبار سے، کسی قسم کا سیاسی غلبہ قائم کرنے کے معنی میں نہ تھا، بلکہ وہ زیادہ وسیع تر معنی میں تھا۔ اصحاب رسول کا مشن یہ تھا کہ وہ دنیا میں ایک نئی تہذیب (civilization) کا غلبہ قائم کریں۔ یہ ایک دورِ تہذیب کی جگہ دوسرے دورِ تہذیب کو لانا تھا، نہ کہ محدود معنوں میں ایک حکومت کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسری حکومت کو لانا، یعنی الحمد لغیر اللہ پر مبنی تہذیب کی جگہ الحمد للہ پر مبنی تہذیب۔

حقیقی تصویر، تاریخی تصویر

آج جب اصحابِ رسول کا نام لیا جاتا ہے تو اُس وقت تک اُس کو مکمل نہیں سمجھا جاتا، جب تک کہ اُن کے نام کے ساتھ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جیسے تعظیمی الفاظ شامل نہ کیے جائیں۔ آج اصحاب رسول کا لفظ مسلّمہ طور پر ایک پُرعظمت لفظ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اصحابِ رسول کی یہ تصویر اُس وقت بنی ہے، جب کہ اُن کے ساتھ بعد کی تاریخی عظمتیں شامل ہوگئیں۔ لیکن اصحاب رسول کی تصویر اُن کے معاصرین کے لیے بالکل عام انسانوں جیسی تھی۔ صلح حدیبیہ (6 ہجری) کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان صلح کی گفتگو ہوئی تھی۔ اُس وقت آپ کے ساتھ چودہ سو اصحاب تھے۔ اُس موقع پر قریش کے نمائندہ عروہ بن مسعود الثقفی نے صحابہ کو دیکھ کر حقارت کے ساتھ اُن کو أشواب یعنی محض ایک بھیڑ (crowd) کا نام دیا تھا۔ (**السیرة النبویة لابن کثیر** 3/317)

یہی معاملہ یقینی طور پر بعد کے زمانے کے گروہ، اخوان رسول کے ساتھ بھی پیش آئے گا۔ اُن کے

معاصرین کی اکثریت ان کو پہچاننے میں ناکام رہے گی۔ یہ عام انسانی کمزوری ہے۔ مشہور مثل ہے کہ پیغمبر اپنے زمانے میں پہچانا نہیں جاتا (A prophet is never honored in his own land)۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ اپنے معاصرین کو عام انسانوں جیسا دکھائی دیتا ہے۔ جب بعد کا زمانہ آتا ہے تو ایسے فرد یا گروہ کے ساتھ بعد کو پیش آنے والے تاریخی واقعات اُن کے نام کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ بعد کے زمانے کے لوگ جب اُن کا نام لیتے ہیں تو ایک تاریخی انسان یا تاریخی گروہ کا تصور ان کے ذہن میں آتا ہے، نہ کہ اُس انسان یا اُس گروہ کا تصور جو کہ خود اپنے زمانے میں پایا جاتا تھا۔ حقیقی انسان اور تاریخی انسان کا یہی فرق دوبارہ کام کرے گا اور لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ سابق اصحاب رسول کی عظمت تو خوب بیان کریں گے، لیکن وہ اپنے معاصر اخوان رسول کو کم تر سمجھ کر اُنھیں نظر انداز کر دیں گے۔

مشترک تائیدی عمل

ساتویں صدی عیسوی میں اصحاب رسول کی جماعت کا بننا کوئی سادہ واقعہ نہ تھا، وہ ایک لمبے تائیدی عمل کے ذریعے انجام پایا۔ یہ تائیدی عمل تھا— صحرائی حالات میں خصوصی تربیت کے ذریعے بنو اسماعیل کی نسل کو وجود میں لانا۔ اس نسل کی خاص صفت یہ تھی کہ وہ غیر فطری ماحول کی کنڈیشننگ سے پاک تھی۔ اِس بنا پر یہ لوگ حق کو قبول کرنے کی استثنائی صلاحیت رکھتے تھے۔ اِسی صلاحیتِ قبولیت کو قرآن میں تمثیل کی زبان میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے: **یکاد زیتها یضیئ و لو لم تمسسه نار** (24:35)۔

بیسویں صدی عیسوی میں ڈی کنڈیشننگ کا یہ واقعہ ایک اور نظام کے تحت پیش آیا۔ یہ سیکولر تہذیب کے تحت سیکولر تعلیم اور سیکولر افکار (secular thoughts) کا نظام تھا۔ موجودہ زمانے کے سیکولر تعلیمی اداروں کو بعض لوگوں نے منفی نام دے کر ''قتل گاہ'' (slaughter house) بتایا۔ اِسی طرح انھوں نے جدید سیکولر تہذیب کو اسلام دشمن تہذیب کہا۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ ادارے ڈی کنڈیشننگ کے ادارے (institutions of de-conditioning) تھے۔ اِن جدید تعلیمی اداروں نے یہ کیا کہ وہاں تعلیم پانے والے افراد کے سابق شاکلہ کو توڑ کر اُن کو اِس قابل بنایا کہ وہ کھلے ذہن کے تحت سوچیں اور تعصّبات (prejudices) سے خالی ہو کر چیزوں کو ایز اِٹ اِز (as it is)

دیکھ سکیں۔ ڈی کنڈیشننگ کا یہی کام جدید سیکولر تہذیب نے بھی انجام دیا۔

اِس طرح جدید سیکولر اداروں میں تعلیم پا کر جو افراد تیار ہوئے، وہ گویا کہ بیسویں صدی کے ''بنو اسماعیل'' تھے۔ یہ لوگ اپنی تربیت کے تحت، غیر متعصّبانہ ذہن رکھتے تھے۔ وہ اِس قابل تھے کہ اُن کے سامنے بے آمیز حق پیش کیا جائے تو وہ اُس کے بارے میں آزادانہ طور پر سوچیں اور اس کو قبول کرلیں۔ اِس طرح یہ جدید نسل اُن لوگوں کے لیے ایک موافق نسل بن گئی جن کو موجودہ زمانے میں اخوانِ رسول کا رول ادا کرنا تھا۔ یہ ایک مشترک تائیدی عمل کا واقعہ ہے جو دونوں گروہوں کے لیے خصوصی خدائی منصوبے کے تحت پیش آیا۔

مسلم دورِ اقتدار

رسول اور اصحاب رسول 622 عیسوی میں مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آگئے۔ اس کے بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ مدینہ میں مسلمانوں کا ایک سٹی اسٹیٹ (city state) قائم ہوگیا، یعنی شہری ریاست۔ 632 عیسوی میں جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو پورا عرب مدینہ کے سیاسی سنٹر کے تحت آچکا تھا۔ اِس کے بعد مسلمانوں کا سیاسی اقتدار تیزی سے بڑھتا رہا، یہاں تک کہ وہ ایشیا اور افریقہ اور یورپ کے بڑے حصے میں پھیل گیا۔ یہ مسلم اقتدار مختلف نشیب و فراز کے ساتھ تقریباً ایک ہزار سال تک باقی رہا۔

یہ مسلم سیاسی اقتدار اپنی وسعت کے اعتبار سے ایک ایمپائر (empire) کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ اصولاً اسلام کی آئڈیالوجی پر قائم تھا۔ اِس طویل دورِ اقتدار میں انسانیت کو بہت سے مثبت فائدے حاصل ہوئے۔ مثلاً انسانی مساوات کے دور کا آنا، توہم پرستی کا خاتمہ، عدل وانصاف کا قیام، وغیرہ۔ اگر چہ فطرت کے عام قانون کے مطابق، مسلم اقتدار کے طویل دور میں بہت سی کمیاں پائی جاتی تھیں، لیکن عملی اعتبار سے اِس دور نے انسانی تاریخ کو ایک نئے دورِ ترقی سے آشنا کیا۔

مسلم دورِ اقتدار کا سب سے زیادہ دوررس رول یہ تھا کہ اُس نے انسانی تاریخ میں پہلی بار علم کو عمومی توسیع کے درجے تک پہنچایا۔ اسلام کے ظہور سے پہلے علم کا دائرہ بہت محدود تھا۔ عام طور پر لوگ ناخوانداہ (illiterate) ہوتے تھے۔ مطالعۂ کتب کا مطلب صرف یہ تھا کہ مذہبی کتابیں برکت کے طور پر

پڑھی جائیں یا بادشاہوں کے حالات کا مطالعہ کیا جائے۔

علمی توسیع کا اصل سبب

علم کی اِس توسیع کا اصل سبب بلاشبہہ قرآن تھا۔قرآن، انسانی تاریخ کی پہلی کتاب ہے۔جس میں بار بارنہایت تاکید کے ساتھ یہ بات کہی گئی کہ زمین وآسمان کی چیزوں میں غور کرو۔قرآن نے اِس غور وفکر کو اتنا زیادہ بڑھایا کہ اس کو عبادت کا درجہ دے دیا۔سورہ آل عمران کے آخری رکوع میں کائنات میں غور وفکر کرنے والوں کو خصوصی مقام دیتے ہوئے فرمایا: **الذین یتفکرون في خلق السماوات والأرض** (3:191)۔اورسورہ فاطر میں بارش کے نظام، نباتات اور حیوانات اور پہاڑوں کی ساخت وغیرہ کا مطالعہ کرنے والوں کو علماء (35:28) کا درجہ دیا گیا۔قرآن میں پہلی بار اس حیثیت کا انکشاف کیا گیا کہ زمین وآسمان کو اس کے خالق نے انسان کے لیے مسخر (subservient) بنا دیا ہے (45:13)۔ اس تصور کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیچر انسان کو اپنا خادم نظر آنے لگی، نہ کہ معبود۔

اِس طرح کی آیتیں قرآن میں کثرت سے موجود ہیں۔قرآن کی اِن آیتوں نے اہلِ ایمان کو علم کے ایک توسیعی مفہوم سے متعارف کیا۔ اِس کے مطابق، پوری کائنات گویا کہ ایک وسیع لائبریری قرار پائی۔علم ایک محدود شعبہ نہ رہا، بلکہ وہ ایک آفاقی شعبہ بن گیا۔

یہ کوئی سادہ بات نہ تھی۔ اسلام کے ظہور سے پہلے ساری دنیا میں شرک کا رواج تھا۔شرک دراصل مظاہرِ فطرت کی پرستش (nature worship) کا دوسرا نام ہے۔شرک کے نظریے کے تحت، فطرت (nature) پرستش کی چیز بنی ہوئی تھی۔ جو چیز پرستش کا موضوع (object of worship) کا درجہ رکھتی ہو، وہ اُسی وقت تحقیق کا موضوع (object of investigation) نہیں بن سکتی۔

مسلم دورِ اقتدار میں، قرآن کی آئڈیالوجی کے تحت، یہ ہوا کہ عمومی طور پر فطرت (nature) کو اُلوہیت (divinity) کے درجے سے ہٹا دیا گیا۔اس کے بعد یہ ہوا کہ مظاہر فطرت بڑے پیمانے پر تحقیق ومطالعے کا موضوع بن گئے۔ اِس نئے کلچر کا پہلا مرکز مدینہ بنا۔اس کے بعد وہ دمشق پہنچا۔اس کے بعد قاہرہ اور بغداد میں اس کو غیر معمولی فروغ ملا۔اس کے بعد وہ مسلم اسپین تک پہنچا اور قرطبہ اور

غرناطہ اس کا مرکز بنے مسلم اقتدار کے تحت، اِس دورِ علم نے کائنات کی تمام چیزوں کو مطالعہ اور تحقیق کا موضوع بنا دیا، جب کہ اِس سے پہلے اُس کو صرف تقدس اور عبودیت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

اِس حقیقت کا اعتراف مختلف اہلِ علم نے کیا ہے۔ مثال کے طور پر برٹش مورخ آرنلڈ ٹائن بی (وفات: 1975) نے یہ سوال قائم کیا ہے کہ فزیکل سائنس (physical science) تمام تر فطرت (nature) کی دریافت کا نام ہے۔ یہ فطرت ہمیشہ سے دنیا میں موجود تھی۔ انسان، اول دن سے اس کو دیکھ رہا تھا، پھر ایسا کیوں ہوا کہ فطرت کی یہ دریافت بہت زیادہ تاخیر کے ساتھ صرف موجودہ زمانے میں ممکن ہوسکی۔ آرنلڈ ٹائن بی نے اس سوال کا جواب یہ دیا کہ قدیم زمانے میں انسان نے نیچر (فطرت) کو مقدس (sacred) سمجھ لیا تھا۔ وہ نیچر کو خدائی کا درجہ دئے ہوئے تھا۔ اِس بنا پر انسان، نیچر کی تحقیق یا اس کو مسخر کرنے کی بات نہ سوچ سکا۔ ٹائن بی (Arnold Toynbee) کے مطابق، بعد کے زمانے میں جب توحید (monism) کو فکری غلبہ حاصل ہوا اور اس نے شرک کے نظریے کو ختم کیا تو اس کے بعد انسان کے اندر نیچر کے بارے میں ایک نئی سوچ پیدا ہوئی جو آخر کار سائنسی انقلاب کا سبب بنی۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب ''اسلام دورِ جدید کا خالق'')۔

انسان مرکزی پلان

خدا کا تخلیقی منصوبہ انسان مرکزی منصوبہ (man-centered plan) ہے۔ اِس حقیقت کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **وسخر لکم ما فی السماوات ومافی الأرض جمیعاً منه** (45:13) یعنی زمین اور آسمان کا پورا نظام انسان کی ضرورت کے مطابق، بنایا گیا ہے۔ ہر چیز براہِ راست یا بالواسطہ طور پر انسان کی کسی نہ کسی ضرورت سے جڑی ہوئی ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں جب قرآن نازل ہوا، اس وقت یہ بات صرف ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن اکیسویں صدی عیسوی میں یہ چیز ایک سائنسی حقیقت بن چکی ہے۔ جدید ترین سائنسی تحقیقات نے بتایا ہے کہ پوری کائنات کسٹم میڈ (custom-made) کائنات ہے، یعنی مکمل طور پر انسانی تقاضوں کے مطابق۔

انسان کو خدا کے تخلیقی منصوبہ سے آگاہ کرنے کے لیے ہر دور میں خدا کی طرف سے پیغمبر بھیجے

گئے۔ یہ پیغمبر عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہوتے تھے، اِس لیے اُن کے معاصرین اُن کو پہچان نہ سکے۔ انھوں نے ان کا استہزا (35:30) کیا اوران کو ماننے سے انکار کر دیا۔ دعوتی مشن کے لیے ہمیشہ ایک خارجی تائید کی ضرورت ہوتی ہے، اِس لیے انبیاء کو یہ تائید معجزہ (miracle) کے ذریعے دی گئی۔

آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی حسّی معجزہ نہیں دیا گیا (17: 59)۔ اِس کے برعکس، آپ کے لیے خصوصی منصوبہ کے تحت، قابلِ کار انسانوں کی ایک طاقت ور ٹیم فراہم کی گئی۔ اِس ٹیم کی تائید سے پیغمبر اسلام نے اپنے تاریخی مشن کو مکمل کیا۔ اِسی ٹیم کو اصحابِ رسول کہا جاتا ہے۔ یہ ٹیم ایک صحرائی کلچر (desert culture) کے ذریعے تیار کی گئی۔ اِس صحرائی کلچر نے گویا کہ تائید کا وہ کام کیا جو پیغمبروں کے زمانے میں معجزہ کے ذریعے انجام پایا تھا۔

اخوان رسول کا دور

تاریخ میں تیسرا رول اُس گروہ کا ہے جس کو حدیث میں اخوانِ رسول کہا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں ایک حدیث رسول اِن الفاظ میں آئی ہے: **وددتُ أنّا قد رأينا إخواننا، قالوا: أو لسنا إخوانك يا رسول الله، قال: أنتم أصحابي، وإخواننا الذين لم يأتوا بعد (صحيح مسلم، رقم الحديث: 249)** یعنی رسول اللہ صلی اللہ نے فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ ہم اپنے اخوان (بھائیوں) کو دیکھیں۔ صحابہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا ہم آپ کے اخوان نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم میرے اصحاب ہو، ہمارے اخوان وہ ہیں جو ابھی نہیں آئے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوتی مشن میں ساتھ دینے والے معاصر اہلِ ایمان (contemporary believers) کو اصحابِ رسول کہا جاتا ہے۔ تاریخ کے آخری دور میں پیغمبر اسلام کے دعوتی مشن کے لیے دوبارہ اٹھنے والے غیر معاصر اہلِ ایمان کو اخوانِ رسول کہا گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دعوت الی اللہ کے مشن کو دوبارہ دریافت کریں گے اور آخری زمانے کے انسانوں تک حق کا پیغام پہنچائیں گے۔ اخوانِ رسول کا مشن ایک اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے جس میں اُن کے دعوتی مشن کو اِدخالِ کلمہ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

ایک حدیثِ رسول اِن الفاظ میں آئی ہے: **لا یبقیٰ علی ظهر الأرض بیتُ مدرٍ ولا وبَرٍ إلا أدخله الله كلمة الإسلام** (مسند احمد، جلد 6، صفحہ 4) یعنی زمین کی پشت پر کوئی خیمہ یا کوئی گھر باقی نہیں رہے گا جس میں اللہ تعالیٰ اسلام کا کلمہ داخل نہ کردے۔

اِس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آخری زمانے میں اسلام کی سیاسی حکومت ساری دنیا میں قائم ہو جائے گی۔ یہ حدیث واضح طور پر دعوتی توسیع کے معنی میں ہے، نہ کہ حکومتی توسیع کے معنی میں۔ حدیث میں 'کلمۂ اسلام' کا لفظ ہے، نہ کہ حکومت اسلام کا لفظ۔ دعوت کی عالمی توسیع کا یہ کام آخری زمانے میں سائنٹفک کلچر کی تائید سے انجام پائے گا۔ آخری زمانے میں سائنسی تحقیقات کے ذریعے ایسے وسائل اور ایسی ٹکنالوجی دریافت ہوگی جو تاریخ میں پہلی بار اس بات کو ممکن بنادے گی کہ کرہ ارض پر بسے ہوئے تمام انسانوں تک خدا کا پیغام پہنچ جائے۔ خواہ نہ ماننے والے اُس کو نہ مانیں، اور ماننے والے اس کو مان کر خدا کے انعام کے مستحق بنیں۔ اِس پیشین گوئی سے مراد واضح طور پر بیسویں صدی کے نصف آخر میں ظاہر ہونے والا وہ دور ہے جس کو کمپیوٹر ایج (computer age) کہا جاتا ہے۔ تاریخ کا آخری رول الصالحون (21:105) کے لیے مقدر ہے۔ یہ رول قیامت کے بعد جنت میں ملکوتی کلچر (angelic culture) کی تائید سے انجام پائے گا۔

حدیث رسول کی پیشین گوئی کے مطابق، آخری زمانے میں اخوانِ رسول کا ظاہر ہونا یقینی ہے، تاکہ وہ دعوتی عمل انجام پائے جو آخری زمانے کے لیے مقدر کیا گیا ہے۔ جس طرح ساتویں صدی عیسوی میں اصحاب رسول کے لیے ایک رول مقدر تھا جس کو انھوں نے انجام دیا، اِسی طرح بعد کے زمانے میں اخوانِ رسول کے لیے ایک رول مقدر ہے جس کو وہ اللہ کی توفیق سے انجام دیں گے۔ دنیا میں کوئی فرشتہ ظاہر ہو کر یہ اعلان نہیں کرے گا کہ فلاں گروہ اخوانِ رسول کا گروہ ہے۔ اِس قسم کا اعلان صرف آخرت میں ہوگا۔ البتہ صاحب معرفت افراد اُس کو پہچانیں گے اور اس کا ساتھ دے کر آخرت کے انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔

اخوانِ رسول کا معاملہ کوئی پر اسرار معاملہ نہیں۔ قرآن اور حدیث کے مطالعے سے اس کو یقینی

طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسانی تاریخ دو بڑے دوروں (periods) میں تقسیم ہے— روایتی دور، اور سائنسی دور۔ امتِ مسلمہ سے ہر زمانے میں ایک ہی کام مطلوب ہے، اور وہ دعوت الی اللہ کا کام ہے۔ روایتی دور میں جن لوگوں نے اِس کام کو پیغمبرانہ نمونے کے مطابق انجام دیا، وہ اصحاب رسول کہے جاتے ہیں۔ اسی طرح بعد کے سائنسی دور میں جو لوگ دعوت کے کام کو پیغمبرانہ نمونے کے مطابق انجام دیں، وہ اخوان رسول قرار پائیں گے۔

مزید مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب رسول نے جو کام انجام دیا، وہ قرآن کے الفاظ میں، اظہارِ دین (48:29) کا کام تھا۔ بعد کے زمانے میں اخوانِ رسول جو کام انجام دیں گے، وہ حدیث کے الفاظ میں، ادخالِ کلمۂ اسلام کا کام ہوگا۔ ادخالِ کلمہ کا لفظ اپنے آپ یہ متعین کررہا ہے کہ اس کا زمانہ کیا ہوگا۔ دنیا کے تمام چھوٹے اور بڑے گھروں میں ادخالِ کلمہ کا کام صرف اُس وقت انجام دیا جاسکتا ہے جب کہ اُس کے لیے اُس کے موافق اسباب پیدا ہو چکے ہوں۔ مثلاً عالمی کمیونکیشن، مذہبی آزادی، وغیرہ۔ موجودہ زمانے میں یہ تمام اسباب پیدا ہو چکے ہیں، اِس لیے یقینی ہے کہ وہ زمانہ اب وقوع میں آچکا ہے جب کہ اخوانِ رسول کی جماعت ظاہر ہو اور وہ نئے مواقع کو استعمال کرکے عالمی ادخالِ کلمہ کا کام انجام دے۔

مگر یاد رکھنا چاہیے کہ یہ سارا کام بشر کی سطح پر ہوگا، نہ کہ فوق البشر کی سطح پر۔ اصحاب رسول بشر تھے۔ انھوں نے بشر کی سطح پر اپنے رول کو انجام دیا۔ اصحاب رسول کو اُن کے معاصرین میں سے صرف اُن لوگوں نے پہچانا جو یہ جانتے تھے کہ اصحاب رسول بشر ہیں، نہ کہ فوق البشر۔

اِسی طرح بعد کے زمانے میں اخوانِ رسول کا رول بھی بشر کی سطح پر ہوگا۔ اِس بنا پر اخوانِ رسول کو پہچاننے اور ان کا ساتھ دینے کی توفیق صرف وہ لوگ پائیں گے جو اُن کو بشر کی سطح پر پہچاننے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جو لوگ اخوانِ رسول کے بارے میں کوئی پُراسرار تصور رکھتے ہوں، جو اُن کو بشر کے بجائے فوق البشر کی سطح پر دیکھنا چاہتے ہوں، وہ اخوانِ رسول کے زمانے میں اخوانِ رسول کو پہچاننے میں اُسی طرح ناکام رہیں گے جس طرح اصحاب رسول کے زمانے میں لوگ اصحاب رسول کو پہچاننے میں ناکام رہے۔

تائید بذریعہ سیکولر تہذیب

ایک حدیث رسول اِن الفاظ میں آئی ہے: **إن اللہ لیؤیّد ہذا الدین بالرجل الفاجر** (**صحیح البخاری، رقم الحدیث:** 3062) یعنی اللہ ضرور اِس دین کی تائید کرے گا فاجر انسان کے ذریعے۔ اِس حدیث میں فاجر کا لفظ گناہ گار کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ سیکولر یا غیر مومن (unbeliever) کے معنی میں ہے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ بار بار ایسا ہوا کہ ایک غیر مومن یا غیر متقی انسان نے کسی موقع پر دینِ خداوندی کی مدد کی۔ مثلاً ہجرت کے مشکل سفر میں عبد اللہ بن ارقط کی رہنمائی، خیبر کے غزوہ میں قُزمان الظُّفری کا صحابہ کے ساتھ لڑنا، وغیرہ۔

اِس قسم کی تائیدِ دین کا غالباً سب سے بڑا واقعہ وہ ہے جو بیسویں صدی عیسوی میں پیش آیا۔ جدید دور میں مغرب کے مفکرین اور سائنس دانوں نے غیر معمولی محنت کر کے فطرت میں چھپے ہوئے رازوں کو دریافت کیا۔ اِس کے نتیجے میں جدید مغربی تہذیب وجود میں آئی۔ یہ تہذیب ایک سیکولر تہذیب تھی اور اس کو وجود میں لانے والے افراد بھی سب کے سب سیکولر تھے۔ نیز اس کا استعمال بھی عام طور پر سیکولر مقاصد کے لیے کیا گیا، لیکن اِس جدید تہذیب کے اندر ایک اور عظیم امکان چھپا ہوا تھا۔ یہ دعوتی امکان تھا۔ اِن دعوتی مواقع نے تاریخ میں پہلی بار اِس بات کو ممکن بنایا کہ زمین پر بسنے والے تمام انسانوں تک خدا کا پیغام موثر انداز میں پہنچا دیا جائے۔ یہی وہ واقعہ ہے جس کو حدیث میں ادخالِ کلمہ کہا گیا ہے۔

عالمی سطح پر ادخالِ کلمہ کا دعوتی کام پُراسرار طور پر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کام قدیم روایتی وسائل کے ذریعے بھی انجام دینا ممکن نہ تھا۔ مثلاً عُقبہ بن نافع تابعی (وفات: 683ء) گھوڑے پر سوار ہو کر افریقہ کی شمالی سرحد تک گئے، لیکن اُس زمانے میں بحرِ اٹلانٹک کو (Atlantic Ocean) کو پار کرنے کا کوئی وسیلہ موجود نہ تھا، اِس لیے اُن کا دعوتی مشن افریقہ کے ساحل سے آگے نہ بڑھ سکا۔

مغربی تہذیب کے ذریعے دعوت کے جو نئے مواقع کھلے، وہ بنیادی طور پر دو قسم کے مواقع تھے۔ اس کا ایک پہلو وہ تھا جس کو فکری پہلو کہا جا سکتا ہے، یعنی فکری اور نظریاتی اعتبار سے نئے دعوتی مواقع کا پیدا ہونا۔ مثلاً مکمل مذہبی آزادی، عمومی سطح پر روحِ تجسس (spirit of enquiry) کا وجود

میں آنا، مذاہب کا غیر اعتقادی مطالعہ، وغیرہ۔ اِس سلسلے میں سب سے بڑا واقعہ یہ ہوا کہ سائنسی مطالعے کے نتیجے میں فطرت (nature) میں چھپے ہوئے قوانین دریافت ہوئے۔ یہ دریافتیں گویا کہ آلاءاللہ (wonders of God) کی دریافتیں تھیں۔ اِن دریافتوں کے نتیجے میں مذہبِ توحید کوخود انسان کے قائم کردہ علمی معیار پر مدلل کرنا ممکن ہوگیا۔ مستقبل میں پیش آنے والا یہی عظیم دعوتی امکان ہے جس کو قرآن کی سورہ حم السجدہ میں بطور پیشین گوئی اِس طرح بیان کیا گیا تھا: **سنريهم آياتنا في الآفاق وفي أنفسهم حتى يتبين لهم أنه الحق** (41:53)۔

اِس سلسلے میں پہلا اہم واقعہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں با قاعدہ طور پر پرنٹنگ پریس کا وجود میں آنا تھا۔ اِس ٹکنالوجی نے دعوت کے کام کو دستی کتابت کے مرحلے سے نکال کر پرنٹنگ کے مرحلے میں پہنچا دیا۔ اِسی طرح جدید کمیونکیشن کی دریافت ہے۔ جدید کمیونکیشن اور ملٹی میڈیا نے بیسویں صدی عیسوی میں پہلی بار حقیقی طور پر اِس بات کو ممکن بنا دیا کہ خدائی پیغام کو نہ صرف سارے عالم میں پہنچایا جاسکے، بلکہ اس کو اتنی سُرعت کے ساتھ انجام دیا جائے کہ وقت کا معاملہ اضافی (relative) ہوجائے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو موجودہ زمانے میں فوری مواصلات (instant communication) کہا جاتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمیونکیشن اور میڈیا کے میدان میں یہ ناقابلِ قیاس ترقی اِسی لیے ہوئی کہ آخری دور کے داعیوں کی جماعت (اخوانِ رسول) اُس کو استعمال کرکے ادخالِ کلمہ کے عمل کو موثر طور پر انجام دے سکے۔

اصحابِ رسول اور اخوانِ رسول کا مشترک رول

اصحابِ رسول اور اخوانِ رسول ایک ہی امت کے دو مختلف گروہ ہیں۔ دونوں گروہوں کے درمیان بظاہر ایک ہزار سال سے زیادہ کا فاصلہ ہوگا۔ دونوں اپنے اپنے دور کے اعتبار سے دعوت الی اللہ کا کام انجام دیں گے، مگر دونوں گروہوں کے درمیان ایک چیز مشترک (common) ہوگی، وہ یہ کہ دونوں اللہ کی خصوصی توفیق سے ایک ایسے منفی اتحاد (nexus) کو توڑیں گے جو دعوتی مشن کے راستے میں سنگین رکاوٹ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

اصحابِ رسول کا زمانہ ساتویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے۔ اُس زمانے میں یہ صورتِ حال تھی کہ

ہزاروں سال کی روایات کے نتیجے میں شرک اور پولٹکل پاور کے درمیان خطرناک قسم کا اتحاد (nexus) قائم ہوگیا تھا۔ یہ اتحاد، دعوت الی اللہ کے کام کو آگے بڑھانے میں ایک مستقل رکاوٹ (road block) بنا ہوا تھا۔ شرک کے علم بردار پولٹکل پاور کی مدد سے توحید کی دعوت کو ابتدا ہی میں کچل کر ختم کر دیتے تھے۔ اصحابِ رسول نے شرک اور پولٹکل پاور کے اِس منفی اتحاد کو اپنی بے پناہ قربانیوں کے ذریعے ختم کیا۔

ساسانی ایمپائر اور رومی ایمپائر کے خلاف مسلح ٹکراؤ اِسی قسم کا آخری اور فیصلہ کن واقعہ تھا۔ اِس ٹکراؤ کا آغاز دونوں ایمپائر کی طرف سے کیا گیا۔ اُس وقت اصحابِ رسول نے خلیفہ عمر فاروق کی قیادت میں بے مثال قربانی کا ثبوت دیا، یہاں تک کہ دونوں ایمپائر ٹوٹ گئے۔ اِس کے بعد یہ ہوا کہ توحید کا رکا ہوا سیلاب ایک طوفان بن کر سارے عالم میں پھیل گیا۔

اِسی طرح بیسویں صدی میں ایک نیا غیر مطلوب اتحاد (nexus) قائم ہوا ہے۔ اِس اتحاد کو الحاد (atheism) اور سائنس کے درمیان اتحاد کہہ سکتے ہیں۔ سائنس اپنی حقیقت کے اعتبار سے، علمِ فطرت کا نام ہے، لیکن الحاد کے علم برداروں نے سائنس کو غلط تعبیر کے ذریعے الحادی نظریات کی حمایت کے لیے استعمال کیا، انھوں نے سائنس کو اپنے مقصد کے لیے ہائی جیک (hijack) کرلیا۔ یہ گویا سیکولرائزیشن آف سائنس (secularization of science) کا معاملہ تھا۔ اِس طرح عملاً یہ ہوا کہ جدید سائنس دعوتِ توحید کی معاون بننے کے بجائے اس کی رقیب (rival) بن گئی۔ بدقسمتی سے لوگوں نے ہائی جیکڈ سائنس (hijacked science) کو جانا، وہ پیور سائنس (pure science) سے بے خبر رہے۔ اس لیے وہ سائنس کے بارے میں منفی ہوگئے، انھوں نے سائنس اور الحاد کو ہم معنی سمجھ لیا۔

بعد کے زمانے کے اخوانِ رسول دوبارہ یہ کارنامہ انجام دیں گے کہ وہ سائنس اور الحاد کے اِس اتحاد کو توڑیں اور دوبارہ توحید کو ایک فکری اور نظریاتی سیلاب کا درجہ عطا کردیں۔ اصحاب رسول کو اِس مقصد کے لیے مسلح جہاد کرنا پڑا تھا۔ اخوانِ رسول کے زمانے میں حالات بدل چکے ہوں گے۔ اخوانِ رسول اپنا مقصد فکری جہاد (ideological jihad) کے ذریعے حاصل کریں گے۔

اخوانِ رسول کا رول

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دعوتی مشن کا آغاز 610 عیسوی میں مکہ میں کیا۔ آپ خدا کے آخری رسول تھے۔ آپ کے زمانے میں پہلی بار آپ کے متبعین (followers) کی ایک طاقت ور ٹیم بنی۔ اِس ٹیم کو تاریخ میں، اصحابِ رسول کہا جاتا ہے۔ پیغمبر اسلام کی ایک پیشین گوئی کے مطابق، آخری زمانے میں دوبارہ آپ کے متبعین کی ایک طاقت ور ٹیم بنے گی۔ اِس دوسری ٹیم کو حدیث میں اخوانِ رسول کہا گیا ہے۔ یہ دوسری ٹیم خدا کی خصوصی مدد سے آخری زمانے میں اہم دعوتی رول ادا کرے گی۔

اِن دونوں جماعتوں کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ قرآن کی سورہ الفتح کی آخری آیتوں کے مطالعے سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ اِن آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: ''محمد، اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں، وہ منکروں کے اوپر شدید ہیں۔ وہ باہم ایک دوسرے کے لیے مہربان ہیں۔ تم ان کو رکوع میں، سجدہ میں دیکھو گے، وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کی طلب میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی نشانی اُن کے چہروں پر ہے، سجدہ کے اثر سے۔ ان کی یہ مثال تورات میں ہے۔ اور انجیل میں ان کی مثال یہ ہے کہ جیسے کھیتی، اس نے اپنا انکھوا نکالا، پھر اس کو مضبوط کیا، پھر وہ اور موٹا ہوا، پھر وہ اپنے تنے پر کھڑا ہوگیا۔ وہ زارعین کو بھلا معلوم ہوتا ہے، تاکہ وہ ان سے منکروں کو جلائے۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیا، اللہ نے ان سے معافی کا اور ایک بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے''۔ (48: 29)۔

قرآن کے اِس حصے میں دو حوالوں کا ذکر ہے، تورات اور انجیل۔ تورات کے حوالے سے اصحاب رسول کا وہ انفرادی کردار بیان ہوا ہے جس کا اظہار دورِ اول میں خود زمانہ رسالت میں پیش آیا۔ انھوں نے خالص جوہر (merit) کی بنیاد پر پیغمبر اسلام کو پہچانا اور کسی تحفظ (reservation) کے بغیر آپ کا ساتھ دیا۔ وہ اعلیٰ درجے کے بااصول افراد تھے۔ وہ کامل معنوں میں عبادت گزار تھے۔ وہ اللہ پر اعتماد کرنے والے تھے۔ موجودہ تورات میں ان کے لیے قدسیوں (saints) کا لفظ آیا ہے (Deuteronomy 33:2)۔

انجیل میں حضرت مسیح کی زبان سے اصحابِ رسول کا جو ذکر آیا ہے، وہ درخت کی تمثیل کے روپ

میں ہے (Mathew 13:31-32)۔ درخت کی تمثیل سے مراد تاریخی عمل (historical process) ہے۔ اصحابِ رسول کا ایک رول وہ ہے جو انھوں نے اپنے زمانے میں ادا کیا۔ ان کا دوسرا رول وہ تھا جو پراسس کے روپ میں انجام پایا۔ اصحابِ رسول کے انقلابی عمل نے تاریخ میں ایک پراسس جاری کیا جو مختلف صورتوں میں بعد کی نسلوں میں آگے بڑھتا رہا۔

چار ہزار سال پہلے ہاجرہ اور اسماعیل کے ذریعے عرب کے صحرا میں ایک پراسس جاری ہوا تھا۔ اِس پراسس کے نقطۂ انتہا (culmination) کے طور پر ساتویں صدی عیسوی میں اصحابِ رسول (companions of the Prophet) کا گروہ وجود میں آیا۔ اس کے بعد دوسرا تاریخی پراسس وہ تھا جو ساتویں صدی عیسوی میں اصحابِ رسول کے انقلابی عمل کے ذریعے تاریخ میں شروع ہوا۔ اِس دوسرے تاریخی پراسس کا نقطہ انتہا (culmination) وہ لوگ ہوں گے جن کو حدیث میں اخوانِ رسول (brothers of the Prophet) کہا گیا ہے۔

احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اخوانِ رسول کا یہ گروہ غالباً اُس زمانے میں پیدا ہونے والا تھا جس کو عام طور پر سائنسی دور کہا جاتا ہے۔ اخوانِ رسول کا گروہ سائنسی زمانے کی دریافتوں سے واقف ہو کر اعلیٰ معرفتِ رب حاصل کرے گا۔ دوسری طرف وہ نئے طاقت ور ذرائع کو استعمال کر کے اُس عالمی دعوت کو انجام دے گا جس کو حدیث میں **ادخالُ الکلمة في كلِّ البيوت** (ہر گھر میں کلمۂ اسلام کا داخلہ) کہا گیا ہے۔

بعد کے دور کے اہلِ ایمان

روایات میں بعد کے دور کے ایسے اہلِ ایمان کا ذکر ہے جو ایمان و اسلام کے خصوصی اوصاف کے حامل ہوں گے۔ اِس سلسلے میں چند روایتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں:

حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **مثل أمتي مثل المطر، لا يدري أوله خير أم آخره** (الترمذی، رقم الحدیث: 2869) یعنی میری امت کی مثال بارش کی مثال جیسی ہے۔ نہیں معلوم کہ اس کا پہلا زمانہ بہتر ہوگا یا اس کا آخری زمانہ۔

اِس حدیث میں بارش کی مثال کے ذریعے ایک تاریخی پراسس (historical process) کو بتایا گیا ہے۔ رسول اور اصحاب رسول کے ذریعے ساتویں صدی عیسوی میں جو انقلاب آیا، وہ اپنے آغاز کے اعتبار سے، ایک زمانی ظاہرہ تھا۔ اُس کے ذریعے جو تاریخی پراسس جاری ہوا، وہ اپنے مابعد انجام کے اعتبار سے مستقبل کا ایک واقعہ ہے۔ اِس مستقبل سے مراد غالباً وہی تاریخی ظاہرہ ہے جس کا حوالہ دوسری روایت میں اخوان رسول کے الفاظ میں ملتا ہے۔

حضرت مالک الاشعری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **عباد لیسوا بأنبیاء ولا شهداءَ، یغبطهم النبیون والشهداء لمقعدهم وقربهم من الله یوم القیامة** (مسند احمد، جلد 5، صفحہ 341) یعنی خدا کے کچھ بندے ایسے ہیں جو نہ تو پیغمبر ہیں اور نہ شہید ہیں، ان کے اوپر پیغمبر اور شہید بھی رشک کریں گے، اُن کے اُس درجے اور قربت کی وجہ سے جو قیامت کے دن انھیں خدا کے یہاں حاصل ہوگا۔

اِس روایت میں غالباً اُن اہلِ ایمان کا ذکر ہے جو دورِ سائنس میں پیدا ہوں گے، جب کہ فطرت میں نئی دریافتوں کی بنا پر معرفت کا نیا فریم ورک وجود میں آئے گا اور اس کو استعمال کرکے کسی کے لیے یہ ممکن ہوجائے گا کہ وہ اعلیٰ معرفت کا تجربہ کرے۔ غالباً اِس جماعت سے مراد وہی لوگ ہیں جن کو دوسری روایت میں اخوانِ رسول کہا گیا ہے۔

اصحابِ رسول اور اخوانِ رسول دونوں کا معاملہ ایک اعتبار سے یکساں ہے۔ وہ ہے اپنے زمانے کے مواقع کا دینی استعمال۔ اصحاب رسول نے بنو اسماعیل کے ذریعے پیدا ہونے والی صحرائی تہذیب کے مواقع کو استعمال کیا۔ اخوانِ رسول بعد کے زمانے میں سائنسی دور کے مواقع کو دین کے لیے استعمال کریں گے۔ ان مواقع کو اخوانِ رسول کے ذریعے استعمال کئے جانے کی جو صورتیں مطالعہ کے ذریعے سمجھ میں آتی ہیں، وہ غالباً یہ ہوں گی:

1- فطرت میں سائنسی دریافتوں کے ذریعے پیدا ہونے والے استدلالی مواقع کا استعمال۔ مثلاً خدا کے وجود پر فلاسفہ اور متکلمین کے مبنی بر معنویت استدلال (argument from design) کو

جدید شواہد کے ذریعے مدلل کرنا۔

2- جدید مواصلاتی مواقع کا عالمی دعوت کے لیے استعمال، یعنی پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا اور دوسرے ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے دعوت کی عالمی اشاعت۔

3- بعد کے دور میں حاصل ہونے والی مذہبی آزادی کا بھرپور استعمال، دعوتِ حق کی عمومی اشاعت کے لیے پرامن جدوجہد۔

عالمی انذار وتبشیر

قرآن کی سورہ الفرقان میں یہ آیت آئی ہے: **تبارك الذی نزّل الفرقان علی عبده لیکون للعالمین نذیرا** (25: 1)۔ یعنی بہت بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر قرآن اتارا، تاکہ وہ سارے عالم کے لیے آگاہ کرنے والا ہو۔ اِس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن کو عالمی انذار وتبشیر کے لیے اتارا گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ قرآن ساتویں صدی عیسوی کے رُبع اول میں اترا۔ اُس وقت اور اس کے بعد ہزار سال تک وہ ذرائع موجود نہ تھے جن کو استعمال کرکے قرآن کرہ ارض کے تمام انسانوں تک پہنچا دیا جائے، نہ قرآن کے چھپے ہوئے نسخے موجود تھے، نہ تیز رفتار سواریاں تھیں، نہ جدید کمیونکیشن تھا۔ اُس زمانے میں ساری دنیا میں صرف علاقائی زبانیں (regional languages) تھیں۔ کوئی ایسی بین الاقوامی زبان (international language) موجود نہ تھی جس میں ترجمہ کیا جائے تو قرآن تمام لوگوں کے لیے قابل فہم بن سکے، وغیرہ۔ ایسی حالت میں کیوں کر یہ ممکن تھا کہ قرآن کا مقصدِ نزول پورا ہو اور پہنچانے والے اس کو تمام انسانوں تک پہنچا دیں۔

اس کا جواب قرآن کی ایک اور آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کی سورہ الانعام میں یہ آیت آئی ہے: **وأوحي إليَّ هذا القرآن لأنذركم به ومَن بلغ** (6: 19) یعنی اے رسول کہہ دو کہ مجھ پر یہ قرآن اترا ہے، تاکہ میں تم کو اُس سے خبردار کردوں، اور وہ بھی جسے یہ قرآن پہنچے، یعنی میں اپنے زمانے کے لوگوں کو آگاہ کروں، اور میرے بعد آنے والے اہلِ ایمان اپنے زمانے کے لوگوں کو اس سے آگاہ

کرتے رہیں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اپنے ہم زمانہ (contemporaries) لوگوں تک قرآن کو پہنچا دے۔ اس کے بعد امت کی یہ مستقل ذمہ داری ہے کہ وہ ہر دور کے لوگوں تک قرآن کو پہنچاتی رہے۔ امت کی ہر نسل کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے زمانے کے لوگوں تک اُسی طرح قرآن کو پہنچائے جس طرح پیغمبر نے اپنے زمانے کے لوگوں تک قرآن کو پہنچایا تھا۔

قرآن کی دعوتی اشاعت کا یہ کام نسل درنسل کیا جانے والا کام ہے۔ اِس ابتدائی دور میں قرآن کی دعوتی اشاعت کا کام جن لوگوں نے انجام دیا، اُن کو صحابی اور تابعین اور مفسرین، وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اِسی طرح دورِ آخر میں بھی امت کا ایک خصوصی گروہ ہوگا جو اپنے زمانے کے نئے پیدا شدہ مواقعِ دعوت کو استعمال کر کے قرآن کی عمومی اشاعت کا یہ کام انجام دے گا۔ آخری دور کا یہی وہ خصوصی گروہ ہے جس کو حدیث میں اخوانِ رسول کا نام دیا گیا ہے۔

سیکولر سویلائزیشن، اسپریچول سویلائزیشن

قرآن کی سورہ الذاریات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وما خلقتُ الجنّ والإنس إلا ليعبدون** (51:56)۔ اِس آیت میں 'یعبدون' سے مراد 'یعرفون' ہے، یعنی اللہ نے جن اور انس کو صرف اِس لیے پیدا کیا ہے تاکہ وہ اللہ کی معرفت حاصل کریں۔ اللہ کی معرفت حاصل کرنے کا ذریعہ غور وفکر (contemplation) ہے، یعنی تخلیقات میں غور کر کے خالق کی معرفت حاصل کرنا اور پھر اس کے مطابق، اپنی زندگی کی تعمیر کرنا۔

مقصدِ تخلیق کے بارے میں ایک مشہور قول یہ ہے: **كنتُ كنزاً مخفياً، فأحببتُ أن أعرف، فخلقتُ الخَلْقَ** (كشف الخفاء، 2/1011) یعنی اللہ نے فرمایا کہ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، پھر میں نے چاہا کہ میں جانا جاؤں، تو میں نے اِس مقصد کے لیے خلق (انسان) کو پیدا کیا۔ کسی عارف کا یہ قول اصلاً سورہ الذاریات کی مذکورہ آیت کی تفسیر ہے۔ قائل نے کلام کی رعایت سے اس کو حدیث قدسی کے اسلوب میں بیان کردیا ہے۔ اگر اسلوب کو بدل دیا جائے اور اس کو معروف تفسیری اسلوب میں بیان کیا جائے تو وہ یہ ہوگا: **كان الله كنزاً مخفياً، فأحبّ أن يُعرف، فخلق الخَلْق**۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے جنات کو پیدا کیا۔ ان سے یہ مطلوب تھا کہ وہ کائنات میں چھپے ہوئے رموزِ معرفت کو دریافت کریں اور خدا کی عظمت کا اعلان واظہار کریں۔ مگر جنات کے سردار ابلیس کے قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات **أنا خير منه** (7:12) کی نفسیات میں مبتلا ہو گئے، وہ اللہ کی کبریائی کی معرفت حاصل نہ کر سکے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جنات نے خود اپنی عظمت (self-glory) کو جانا، مگر وہ خدا کی عظمت (glory of God) کو دریافت کرنے میں ناکام رہے۔ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔ انسان کی تخلیق اِس لیے ہوئی کہ وہ جنات کے بعد اُن کا جانشین بنے۔ اُس وقت یہ معاملہ فرشتوں کی سمجھ میں نہیں آیا۔ انھوں نے یہ اشکال ظاہر کیا کہ جس طرح جن، مقصد تخلیق کو پورا کرنے میں ناکام رہے، اُسی طرح انسان بھی ناکام رہے گا، وہ تخلیق کے مقصد کو پورا نہ کر سکے گا۔

فرشتوں کے اشکال کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک مظاہرہ (demonstration) کا انتظام کیا۔ اِس مظاہرے کا خلاصہ قرآن کے اِن الفاظ میں ملتا ہے: **علّم آدم الأسماء كلّها** (2:31)۔ اِس آیت میں اسماء سے مراد مسمّیات ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے اضافی انعام کے طور پر انسان کو تمام اشیا کا علم عطا فرمایا، اُس نے انسان کی فطرت میں تمام تخلیقات کا علم داخل کر دیا۔ اِس طرح انسان اپنے لاشعور (unconscious mind) کی سطح پر بطور امکان (potentially) ہر چیز سے واقف ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے وقتی طور پر اِس کا مظاہرہ بھی کیا۔ اس کے بعد فرشتے مطمئن ہو گئے۔

قرآن کے اِس حصے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات کو دماغ دیا گیا تھا، لیکن اجزاءِ معرفت کا پیشگی علم اُنھیں حاصل نہ تھا۔ اُن سے مطلوب تھا کہ وہ اپنے دماغ کو استعمال کر کے کائنات میں چھپے ہوئے رموزِ معرفت کو دریافت کریں۔ انھیں غور وفکر کے ذریعے اپنے نامعلوم کو معلوم بنانا تھا، مگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے۔

اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مزید اہتمام کے ساتھ انسان کو پیدا فرمایا۔ وہ مزید اہتمام یہ تھا کہ جن اجزاءِ معرفت کو اُسے دریافت کرنا تھا، اس کو پیشگی طور پر اس کے لاشعور میں داخل کر دیا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن کی اِس آیت میں بیان کیا گیا ہے: **بل هو آيات بينات في صدور الذين أوتوا**

العلم (29:49) یعنی تمام اجزاءِ معرفت پیشگی طور پر انسان کے لاشعور (unconscious mind) میں موجود ہیں۔اب انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے اِس لاشعور کو شعور میں لے آئے۔

دریافت یا ان فولڈنگ

مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کو علمی دنیا میں دریافت (discovery) کہا جاتا ہے، وہ حقیقت میں دریافت نہیں ہے، بلکہ وہ ان فولڈنگ (unfolding) ہے، یعنی جو چیزیں انسان کی فطرت میں پہلے سے بالقوہ (potential) طور پر موجود ہیں، اُن کو بالفعل (actual) طور پر وقوع میں لانا۔ جنات کو اپنے لامعلوم کو معلوم بنانا تھا، اِس میں وہ ناکام ہوگئے۔ اِس لیے اللہ تعالیٰ نے اگلی مخلوق کے لیے تیسیر کا معاملہ فرمایا، یعنی غیر شعوری سطح پر موجود چیزوں کو شعور کی سطح پر معلوم بنانا۔

سائنس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سائنس دانوں کی ہر دریافت اتفاقی دریافت ہے، وہ صرف اتفاقی طور پر سائنس داں کے علم میں آتی ہے:

It is discovered by scientist by the way of accident.

مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ سائنسی دریافتوں کا معاملہ ایکسیڈنٹ (accident) کا معاملہ نہیں، بلکہ وہ کوانسیڈینس (co-incidence) کا معاملہ ہے، یعنی سائنس داں کوئی تجربہ کررہا ہوتا ہے، اُس وقت ایک چیز فلیش (flash) کرتی ہے۔ یہ فلیش اس کے لاشعور میں موجود ایک علم سے مطابقت کرتا ہے۔ اس کے بعد سائنس داں مزید تجربہ کرکے ایک نئی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے، جس کو دریافت کہا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک سائنس داں ایک بار ایک برتن کا مشاہدہ کررہا تھا۔ اِس برتن کے اوپر ایک ڈھکن تھا اور برتن میں پانی بھرا ہوا تھا۔ برتن کے نیچے آگ جل رہی تھی۔ پانی کا درجۂ حرارت جب 100 ڈگری تک پہنچ گیا تو اس کے اندر پیدا ہونے والی بھاپ سے ڈھکن اوپر اٹھ گیا۔ سائنس داں اس پر غور کرنے لگا، یہاں تک کہ اس نے دریافت کیا کہ پانی کا درجہ حرارت جب بڑھتا ہے تو اس کے مالکیول (molecule) ٹوٹ کر اِدھر اُدھر اڑنے لگتے ہیں۔ مالکیول کے اِس انتشار (moleculor disintegration) سے اسٹیم پاور پیدا ہوتا ہے۔ اِس پاور کے ذریعے انجن چلائے جاسکتے

ہیں— پانی کی یہ خاصیت پہلے سے اس کے لاشعور میں موجود تھی۔ مذکورہ مشاہدہ اس کے لاشعور سے مطابقت کرگیا۔ مطابقت کے نتیجے میں انسان نے وہ چیز دریافت کی جس کو اسٹیم پاور (steam power) کہا جاتا ہے۔ اِس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ — دریافتیں کوانسیڈینس کا نتیجہ ہوتی ہیں:

Discoveries are results of co-incidence.

حصولِ معرفت کا ذریعہ

یہی معاملہ معرفت کا ہے۔ معرفت کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے وجود پر سوچتا ہے، وہ کائنات کے مظاہر میں غور وفکر کرتا ہے۔ اِس طرح غور وفکر کے ذریعے وہ رموزِ معرفت کو دریافت کرتا ہے۔ اِن رموزِ معرفت میں پچاس فی صد حصہ خارجی مظاہر کا ہے، اور پچاس فی صد حصہ داخلی اعتبار سے علمِ اشیا کا۔ یہی وہ علمِ اشیا ہے جس کو وجدان (intuition) کہا جاتا ہے۔ تدبر اور تفکر کے ذریعے یہ ہوتا ہے کہ آدمی دونوں کے درمیان مطابقت کو دریافت کرتا ہے۔ یہ واقعہ مسلسل پیش آتا ہے اور اِس طرح مومن کا سفرِ معرفت مسلسل طور پر جاری رہتا ہے۔

معرفت کا حصول کوئی پراسرار چیز نہیں، وہ تخلیق میں تدبر کرکے خالق کو دریافت کرنے کا نام ہے۔ یہ عمل اسلام کے ظہور کے بعد مسلمانوں میں ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوگیا تھا۔ قرآن کے ذریعے ان کے اندر تحریک ہوئی اور وہ کائنات کی چیزوں میں معرفت کے نقطۂ نظر سے غور وفکر کرنے لگے۔ مثال کے طور پر ایک صحابیِ رسول ابوذر غفاری کہتے ہیں کہ: **ولقد ترکنا رسول الله صلی الله علیه وسلم، وما یقلّب طائر جناحیه فی السماء، إلّا ذکر لنا منه علماً (مسند أحمد بن حنبل، رقم الحدیث: 21361)** یعنی ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اِس حال میں چھوڑا کہ ایک چڑیا بھی آسمان میں اپنا پر پھڑ پھڑاتی تھی تو آپ اُس سے ہم کو ایک علم کی یاد دلاتے تھے۔

تخلیق کے نظام میں غور وفکر کرکے معرفت کی خوراک حاصل کرنے کا کام مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر شروع ہوا اور صدیوں تک جاری رہا۔ علم کلام میں جس چیز کو مبنی بر براہین استدلال کہا جاتا ہے، وہ یہی ہے۔ مگر مسلمان علمِ معرفت یا سائنس آف معرفت کو ایک حد سے آگے نہ بڑھا سکے۔ اِس کا سبب

یہ تھا کہ قدیم زمانے میں غور وفکر کے لیے صرف روایتی فریم ورک (traditional framework) موجود تھا، اور روایتی فریم ورک میں مشاہدہ اور تجربہ کا عمل صرف محدود دائرے میں ممکن ہوتا تھا۔

اِس معاملے میں زیادہ وسیع غور وفکر صرف موجودہ زمانے میں ممکن ہوا، جب کہ دور بین (telescope) اور خورد بین (microscope) جیسے آلات ایجاد ہوئے۔ دور بین کو پہلی بار گلیلیو نے 1609 میں فلکیاتی مشاہدے کے لیے استعمال کیا۔ خورد بین پہلی بار 1590 میں دریافت ہوئی۔ اِن دریافتوں کے بعد عالمِ کبیر (macro world) اور عالم صغیر (micro world) دونوں کا مشاہدہ زیادہ گہرائی کے ساتھ ممکن ہوگیا۔ معرفت کے حقائق جو اب تک انسان کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے، وہ اب انسان کے براہِ راست علم میں آنے لگے۔ بعد کے دور میں یہ کام تمام تر اہلِ مغرب نے انجام دیا۔

انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں مغربی علماء کے ذریعے فطرت کی تحقیقات سامنے آئیں، انھوں نے معرفتِ خداوندی کے نئے وسیع تر دروازے کھول دئے۔ اِس کے بعد تاریخ میں پہلی بار یہ ہوا کہ پہلے جو چیز صرف عقیدہ کا درجہ رکھتی تھی، وہ اب علمی مسلّمہ کے درجے میں ایک ثابت شدہ واقعہ بن گئی (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، راقم الحروف کی کتاب 'مذہب اور جدید چیلنج')۔

مغربی سائنس دانوں نے موجودہ زمانے میں جو کام کیا، وہ علمِ معرفت کے اعتبار سے بہت بڑا کام تھا۔ اِس اعتبار سے، یہ مغربی علماء پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس پیشین گوئی کا مصداق تھے: وإنَّ اللّٰهَ لَيؤيّدُ هَذَا الدّينَ بالرجُلِ الفَاجِر (صحيح البخاري، رقم الحديث: 3062)۔

ایک مغالطہ

جدید سائنس کی دریافتیں دراصل آلاء اللہ (wonders of God) کی دریافتیں تھیں۔ وہ خالق کی معرفت کا ایک نیا خزانہ کھولنے کے ہم معنی تھیں۔ لیکن جن مغربی علماء نے اِس میدان میں کام کیا، وہ سب سیکولر ذہن کے لوگ تھے۔ اِس بنا پر عملاً یہ ہوا کہ یہ دریافتیں معرفتِ رب کے بجائے سیکولر نظریے کی حمایت بن کر رہ گئیں۔ حالاں کہ سائنس کا یہ سیکولرائزیشن (secularization) صرف ایک مغالطہ (fallacy) کی حیثیت رکھتا تھا۔

مثلاً ایک مغربی مفکر نے جدید سائنس کی دریافتوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ اِن دریافتوں سے معلوم ہوا کہ فطرت (nature) میں ایک قانونِ اسباب (law of causation) قائم ہے، یعنی ہر واقعہ اسباب وعلل کے نظام کے تحت واقع ہوتا ہے۔ اِس کا حوالہ دیتے ہوئے اُس نے لکھا ہے کہ — اگر واقعات فطری اسباب کا نتیجہ ہوتے ہیں تو وہ فوق الفطری اسباب کا نتیجہ نہیں ہوسکتے:

If events are due to natural causes,
they are not due to supernatural causes.

مگر یہ صرف ایک مغالطہ ہے، کیوں کہ فطرت کا قانون اپنے آپ میں توجیہہ نہیں ہے، بلکہ وہ خود اپنے وجود کے لیے ایک توجیہہ کا طالب ہے۔ اِس اعتبار سے، صحیح بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ — اگر واقعات قوانین سے کنٹرول ہوتے ہیں تو ضروری ہے کہ اس کا ایک کنٹرول کرنے والا ہو:

If events are controled by laws, then
there must be a controller of laws.

جرمن سائنس داں البرٹ آئن اسٹائن (وفات: 1955) نے فطرت کے نظام کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس کو نظر آیا کہ فطرت کے نظام میں نہایت بامعنی ڈیزائن پایا جاتا ہے۔ اِس طرح وہ گویا کہ معرفت کے دروازے تک پہنچ گیا، لیکن اس نے یہ کہہ دیا کہ — فطرت کے بارے میں سب سے زیادہ ناقابلِ فہم بات یہ ہے کہ وہ قابل فہم ہے:

The most incomprehensible fact about
nature is that it is comprehensible.

یہ بلاشبہہ ایک مغالطہ آمیز بیان ہے۔ آئن اسٹائن نے جب فطرت میں غیر معمولی معنویت دیکھی تو اس کو برعکس طور پر یہ کہنا چاہیے تھا کہ — فطرت میں اتنی زیادہ معنویت پائی جاتی ہے کہ ضروری ہے کہ اس کا ایک ڈزائنر ہو:

Nature is so well-designed that it is
inconceivable that there is no designer of it.

جنت کا دور

قرآن کی سورہ الکہف کی آخری چند آیتیں یہ ہیں: إن الذين اٰمنوا وعملوا الصالحات

كانت لهم جنات الفردوس نزلاً۔ خالدين فيها لا يبغون عنها حولاً۔ قل لو كان البحر مداداً لكلمات ربي، لنفد البحر قبل أن تنفد كلمات ربي، ولو جئنا بمثله مدداً (18: 107-109) یعنی بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیا، اُن کے لیے فردوس کے باغوں کی مہمانی ہے۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہ وہاں سے کبھی نکلنا نہ چاہیں گے۔ کہو کہ اگر سمندر میرے رب کے کلمات کو لکھنے کے لیے روشنائی بن جائے، تو سمندر ختم ہو جائے گا، اِس سے پہلے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں، اگر چہ ہم ایسا ہی اور سمندر اس کی مدد کے لیے لے آئیں۔

قرآن کی اِن آیات کے چار حصے ہیں۔ اس کے پہلے حصہ (**إن الذين آمنوا وعملوا الصالحات**) میں یہ بتایا گیا ہے کہ تخلیقی منصوبہ کے مطابق، خدا کا مطلوب انسان کون ہے۔ یہ وہ انسان ہے جو خالق کو دریافت کرے۔ یہ دریافت اتنی گہری ہو کہ اس کی پوری زندگی ہر اعتبار سے اس کے مطابق ڈھل جائے، وہ کامل معنوں میں ایک ربانی انسان بن جائے۔ یہی وہ ربانی انسان ہے جو آخرت کی دنیا میں خدا کے سب سے بڑے انعام کا مستحق قرار پائے گا۔

آیت کا دوسرا حصہ یہ ہے: **كانت لهم جنات الفردوس نزلاً** ۔ اِس حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ ربانی انسان کو آخرت میں یہ موقع ملے گا کہ وہ جنت کی معیاری دنیا میں ابدی طور پر قیام کر سکے۔ جنت کی دنیا میں یہ قیام مہمانی (hospitality) کے طور پر ہوگا، یعنی جنت میں ان ربانی انسانوں کا قیام سادہ طور پر صرف عیش کے لیے نہ ہوگا، بلکہ وہ مہمانی کے طور پر ہوگا۔ یعنی خدائی منصوبہ کے مطابق، اہلِ جنت مکمل طور پر ایک سرگرم زندگی گزاریں گے۔ یہ زندگی ان کے لیے پوری طرح تعب اور مشقت سے خالی ہوگی۔ وہ اُن کے لیے شُغلِ فاکہ (35: 55) کے ہم معنی ہوگی، یعنی پُر لطف سرگرمیوں (enjoyable activities) کی زندگی۔

اِس جنتی زندگی کے بارے میں تیسری بات یہ فرمائی کہ: **خالدين فيها، لا يبغون عنها حولاً** ۔ یعنی اس میں ہمیشہ رہنے کے باوجود اہل جنت کبھی اکتاہٹ (boredom) کا شکار نہ ہوں گے۔ وہ دوامی طور پر انتہائی معنوں میں ایک پر لطف مشغولیت کے ساتھ جنت میں اپنی سرگرمیاں

جاری رکھیں گے۔ یہ سرگرمیاں کبھی ختم نہ ہوں گی اور نہ کبھی ان کی دل چسپیوں کی حد آئے گی۔ یہ اہلِ جنت کے لیے ایک ایسی مسرت ہوگی جو کامل بھی ہوگی اور ابدی بھی۔

مذکورہ قرآنی بیان کا چوتھا حصہ یہ ہے: **قل لو كان البحر مداداً لكلمات ربي، لنفد البحر قبل أن تنفد كلمات ربي، ولو جئنا بمثله مدداً**۔ قرآن کے یہ الفاظ اہل جنت کی اُس اعلیٰ ترین سرگرمی کو بتاتے ہیں جس میں اہلِ جنت کامل لذت و مسرت کے ساتھ مشغول رہیں گے۔ یہ سرگرمی ہے— کلمات اللہ کی دریافت (discover) کرنا اور اِس طرح اعلیٰ معرفت کے حصول کے لامتناہی سفر میں مشغول رہنا۔ انسان کے لیے سب سے زیادہ محبوب چیز یہ ہے کہ اس کی تمام خواہشیں (desires) پوری ہوں، اس کو پورا فل فل مینٹ (fulfilment) حاصل ہو۔ اِس کو انسان کی زندگی کا مادی تقاضا کہہ سکتے ہیں۔ یہ تمام تقاضے جنت میں انتہائی کامل اور آئڈیل صورت میں پورے ہوں گے۔ قرآن میں اِسی کی طرف اِن الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: **ولكم فيها ما تشتهي أنفسكم، ولكم فيها ما تدعون** (41:31) یعنی تمھارے لیے وہاں ہر وہ چیز ہے جس کو تمھارا دل چاہے، اور تمھارے لیے جنت میں ہر وہ چیز ہے جس کو تم طلب کروگے۔

اہلِ جنت کا مشن

دوسری اعلیٰ چیز جو ربانی انسان کو جنت میں مشن کی صورت میں حاصل ہوگی، وہ معرفت کی مسلسل دریافت ہے۔ یہ معرفت وہی چیز ہے جس کو قرآن میں مختلف الفاظ میں مثلاً کلمات اللہ (18:109)، آلاءِ رب (55:130) اور آیاتِ رب (41:53)، وغیرہ جیسے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ جس خالق نے یہ انتہائی بامعنی کائنات بنائی ہے، وہ خود بلا شبہہ ہزاروں بامعنی کائنات سے زیادہ بامعنی ہے۔ اس کی معنویت کا ایک بہت چھوٹا حصہ جدید سائنس نے دریافت کیا ہے۔ مگر سائنس دانوں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ ان کی دریافتیں اتنی زیادہ حقیر ہیں کہ وہ کم سے کم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے (knowing more and more about less and less) کے ہم معنی ہیں۔ ایسے لامحدود حد تک بامعنی خالق کی دریافت بیک وقت ایک انتہائی پُرمسرت تجربہ ہے اور اِسی کے ساتھ وہ ایک لامتناہی عمل بھی۔

یہی وہ پُر مسرت مشن ہے جس میں اہلِ جنت ہمیشہ کے لیے پُر مسرت طور پر مشغول رہیں گے۔

انسان اصلاً ذہن (mind) کا نام ہے۔ ذہن سوچنے کا کام کرتا ہے۔ ذہن کے اندر سوچنے کی صلاحیت (thinking capacity) لامحدود حد تک پائی جاتی ہے۔ ایک سائنس داں نے کہا کہ پوری کائنات میں جتنے پارٹیکل (particle) ہیں، اتنے پارٹیکل صرف ایک فرد کے ذہن (individual brain) میں ہوتے ہیں۔ انسان کا ذہن لامحدود ہے، اس کے مقابلے میں انسان کی عمر بہت زیادہ محدود ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی انسان کے لیے ذہنی فل فل مینٹ (intellectual fulfilment) حاصل ہونا ممکن نہیں، جب کہ ذہنی فل فل مینٹ ہی انسان کا سب سے بڑا مطلوب ہے۔ انسان کے لیے سب سے بڑی خوشی (pleasure) کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن کو استعمال کر کے سوچے اور نئی نئی دریافتیں کرے۔ دریافت (discovery) انسان کی سب سے بڑی لذت ہے اور یہی لذت انسان کو اس دنیا میں حاصل نہیں ہوتی۔

خدا کا تخلیقی منصوبہ اِس سوال کا جواب ہے۔ خدا کا تخلیقی منصوبہ بتاتا ہے کہ انسان کی زندگی موت پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ وہ موت کے بعد ابدی طور پر جاری رہتی ہے۔ موت کے بعد کی یہ دنیا نہ صرف ابدی ہے، بلکہ وہ معیاری اور کامل بھی ہے۔ اس اگلی دنیا میں انسان کے لیے یہ موقع ہوگا کہ وہ اپنے ذہن کے پوٹنشل کو ان فولڈ (unfold) کرے، وہ اپنی تخلیقیت (creativity) کو ابدی طور پر جاری رکھے۔ وہ مسلسل طور پر وجد آمیز دریافتوں (thrilling discoveries) کی فضا میں جیتا رہے۔

یہ ابدی موقع انسان کو آخرت کی جنت میں ملے گا۔ جنت سادہ طور پر عیش کا مقام نہیں ہے۔ جنت کا زیادہ بڑا پہلو یہ ہے کہ جنت کی آفاقی وسعتوں میں وہ تمام اسباب انتہائی معیاری صورت میں موجود ہوں گے جو دنیا میں صرف ناقص صورت میں ملے تھے۔ قرآن کے مطابق، دنیا میں انسان کو سب چیزیں دی گئی ہیں، لیکن وہ سب بقدر ضرورت ہیں (وآتاکم من کلّ ما سألتموہ) لیکن آخرت میں یہ تمام چیزیں بقدر خواہش دی جائیں گی (ولکم فیھا ما تشتھی أنفسکم)۔

انسان پیدائشی طور پر معیار پسند (idealist) ہے۔ ہر عورت اور مرد اپنی فطرت کے اعتبار سے کامل پسند (perfectionist) ہوتے ہیں، مگر تجربہ بتاتا ہے کہ کوئی بھی شخص اِس دنیا میں اپنے آئڈیل کو

نہیں پاتا۔ ہر انسان ایک ایسی چیز کا متلاشی ہے جو موجودہ دنیا میں اُس کے لیے آخری حد تک ناقابلِ حصول ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ ہر انسان ایک متلاشیٔ جنت حیوان ہے:

Man is a paradise-seeking animal.

یہ جنت انسان کو صرف آخرت میں ملے گی، اُس انسان کو جو موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو جنت میں بسائے جانے کا استحقاق ثابت کرے۔ موجودہ دنیا جنت کا استحقاق ثابت کرنے کے لیے ہے اور آخرت عملی طور پر جنت کو پانے کے لیے۔

الصالحون کا دور

قرآن کی سورہ الانبیاء میں بعد کے زمانے کی ایک پیشین گوئی اِن الفاظ میں آئی ہے: **ولقد كتبنا في الزبور من بعد الذكر أن الأرض يرثها عبادي الصالحون** (21: 105) یعنی زبور میں ہم نصیحت کے بعد لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔ یہ پیشین گوئی موجودہ بائبل میں اِن الفاظ میں ملتی ہے— شریروں کی نسل کاٹ ڈالی جائے گی اور صادق، زمین کے وارث ہوں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ آباد رہیں گے:

But the descendants of the wicked shall be cut off. The righteous shall inherit the land, and dwell in it forever. (Psalm 37: 28-29)

قرآن کی مذکورہ آیت میں 'الصالحون' سے مراد پوری تاریخِ بشری کے منتخب مومنین (selected believers) ہیں۔ یہ واقعہ قیامت کے بعد آخرت کی دنیا میں پیش آئے گا۔ قیامت کے بعد تمام پیدا ہونے والے انسان حشر کے میدان میں اکھٹا کئے جائیں گے۔ خداوند ذوالجلال اور اس کے فرشتے ظاہر ہوں گے۔ قبل از قیامت دور میں ہر ایک کے عمل کے ریکارڈ کے مطابق، اس کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کیا جائے گا۔ کچھ لوگ رد کئے ہوئے (rejected) قرار پائیں گے، کچھ لوگوں کو ان کے قول وعمل کے بہتر ریکارڈ کی بنا پر منتخب کیا جائے گا۔ یہ منتخب لوگ ابدی جنتوں میں داخل کئے جائیں گے، جو ہر اعتبار سے ایک کامل دنیا (perfect world) ہوگی۔ اِس جنتی دنیا میں ابدی طور پر خوف وحزن کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ یہاں داخل ہونے والی عورتوں اور مردوں کے لیے ہر اعتبار سے،

کامل طور پر فل فل مینٹ (fulfillment) کا انتظام ہوگا۔

قیامت کے بعد کا جنتی دور ایک آئڈیل دور ہوگا۔ یہ انسان کی وہ آخری منزل ہوگی جس کے لیے موجودہ دنیا کی تخلیق کی گئی تھی۔ موجودہ دنیا کو بنانا اور یہاں انسان کو آباد کرنا امتحان کے لیے تھا، یعنی عملی زندگی میں امتحان لے کر اُن نادر افراد کا انتخاب کرنا جو اعلیٰ معرفت کی سطح پر جینے والے ہوں، جو مکمل طور پر مثبت شخصیت (positive personality) کے مالک ہوں، جو اختیار کے باوجود مکمل طور پر ربانی ڈسپلن کے پابند ہوں، جو اپنے اعلیٰ اوصاف کی بنا پر اِس قابل ہوں کہ وہ خدا کے پڑوس میں رہ سکیں، جو اپنی تخلیق کے اعتبار سے انسان، مگر اپنے اوصاف کے اعتبار سے فرشتوں کے مانند ہوں، جو پوری کائنات کا خلاصہ ہوں، جس طرح گلاب کا پھول ایک پورے درخت کا خلاصہ ہوتا ہے۔

یہ خوش قسمت لوگ ابدی جنت میں رہیں گے، لیکن جنت محض عیش و آرام کا مقام نہیں ہوگا، بلکہ وہ کامل معنوں میں نفیس سرگرمیوں کا مقام ہوگا۔ جنت میں عیش و آرام کی حیثیت دراصل خدائی میزبان (divine hospitality) کی ہوگی۔ اہلِ جنت کا اصل مشن وہ ہوگا جس کو قرآن میں: **وأشرقت الأرض بنور ربها** (39:69)، اور **وقيل الحمد لله رب العالمين** (39:75) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی یہ اہلِ جنت اپنی سرگرمیوں کے ذریعے انوارِ رب کو ظاہر کرنے کا ابدی پراسس شروع کریں گے۔ جنت کی دنیا میں الحمد للہ کلچر اپنی کامل صورت میں ظہور پذیر ہوگا۔ اہلِ جنت کے لیے یہ عمل ایک پرلطف سرگرمی (enjoyable activity) ہوگی۔ جنت کی یہ دنیا اتنی زیادہ پرمسرت ہوگی کہ اہلِ جنت کبھی وہاں تھکن یا اکتاہٹ کا شکار نہ ہوں گے۔

جنت کی اِس دنیا کو دوسرے لفظوں میں اسپریچول سویلائزیشن یا ربانی سویلائزیشن کہا جاسکتا ہے۔ یہ دور ابتدائی طور پر موجودہ دنیا میں شروع ہوا، لیکن موجودہ دنیا ایک محدود دنیا تھی، اِس لیے ربانی سویلائزیشن کا فروغ اِس دنیا میں صرف محدود طور پر ہوسکا۔ آخرت کی لامحدود دنیا میں اِس ربانی سویلائزیشن کا فروغ اپنی آخری صورت میں ہوگا۔ اہلِ ایمان آلاء اللہ کو جنت کی دنیا میں ابدی طور پر ان فولڈ (unfold) کرتے رہیں گے۔ ہر دن ان کے لیے نئی دریافت کی خوشی کا دن ہوگا۔ یہ سلسلہ ابد تک جاری رہے گا، وہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

معرفتِ دعوت

تاریخِ دعوت — ایک جائزہ

قرآن، خالقِ کائنات کی کتاب ہے۔ قرآن کا موضوع ہے انسان کو خدا کے تخلیقی منصوبہ (creation plan of God) سے آگاہ کرنا۔ اِس سلسلے میں قرآن کی سورہ آل عمران کی ایک آیت یہ ہے: **أفغير دين الله يبغون، وله أسلم من في السماوات والأرض طوعاً وكرهاً** (3:83) یعنی کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں، حالاں کہ اللہ ہی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے، خوشی سے یا ناخوشی سے۔

انسان کی کامیابی اِس میں ہے کہ وہ اِس دین اللہ کو اختیار کرے۔ اِس معاملے میں، انسان کے لیے دوسرا کوئی چوائس (choice) نہیں۔ اِس دین اللہ کے دو پہلو ہیں — توحید، اور امن۔ توحید (oneness of God) اِس دینِ کائنات کی نظریاتی بنیاد (ideological base) ہے۔ دین کے تمام فکری اور عملی تقاضے اِسی توحید کے نظریے سے پیدا ہوتے ہیں۔ توحید کا آغاز دریافت (discovery) سے ہوتا ہے، یعنی خالق کائنات کی دریافت۔ یہ دریافت جب کسی کو حقیقی طور پر حاصل ہوجائے تو اس کے بعد اس کی پوری زندگی اس میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے آنے والے تمام انبیاء اِسی توحید کا پیغام لے کر آئے۔

امن (peace) کا لفظ دین اللہ کے اجتماعی تقاضے کو بتاتا ہے۔ امن کا مطلب یہ ہے کہ انسانی سماج میں نارمل فطری حالت کو برقرار رکھا جائے۔ اِسی فطری حالت کی برقراری پر زندگی کی تمام تعمیری سرگرمیوں کا انحصار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی اعتبار سے، امن کی حیثیت خیرِ اعلیٰ (summum bonum) کی ہے۔ امن دراصل سماج کی صحت مند حالت کا دوسرا نام ہے۔ امن کے بغیر کوئی بھی انسانی سرگرمی درست طور پر جاری نہیں رکھی جاسکتی، نہ دینی سرگرمی اور نہ دنیوی سرگرمی۔

انسان کو ایک آزاد مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا گیا ہے۔ انسان جب آزادی کا صحیح استعمال کرتا ہے تو سماج میں معتدل ماحول بنتا ہے۔ ہر قسم کی صحت مند سرگرمیاں کسی رکاوٹ کے بغیر جاری

ہوجاتی ہیں۔ اِس کے برعکس، انسان جب اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتا ہےتو سماج میں وہ ماحول بن جاتا ہےجس کوقرآن میں فساد (7: 85) کہا گیا ہے۔ایسی حالت میں کسی بھی کام کوخوش گوارطور پر انجام دیناناممکن ہوجاتا ہے۔

قرآن کی سورہ النساءمیں کہا گیاہے: **الصلح خیر** (4: 128)یعنی صلح بہتر ہے۔صلح سے مرادامن اورمسالمت (conciliation) ہے،یعنی نزاع (controversy) کےوقت ٹکراؤ کا طریقہ اختیارنہ کرنا،اِس کے بجائے وہ طریقہ اختیارکرنا جس میں ٹکراؤ(conflict) کےبغیرنزاع ختم ہوجائے اوردوبارہ معتدل فضامیں کام ہونے لگے۔

زندگی میں نزاع کیوں پیدا ہوتی ہے۔اِس کا اصل سبب یہ نہیں ہے کہ کوئی شخص آپ کا دشمن بن گیاہے، وہ آپ کےخلاف سازش کررہاہے۔اِس صورتِ حال کا اصل سبب خدا کا قائم کردہ تخلیقی نظام ہے۔انسان کے پیدا کرنے والے نے ہرانسان کوآزاد پیدا کیا ہے۔ ہرانسان آزاد ہے کہ وہ جس طرح چاہے،اپنی آزادی کواستعمال کرے۔اِس صورت حال سے،مسابقت (competition) اور چیلنج کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔اِس چیلنج کواگر منفی معنی میں لیں تو وہ نزاع ہےاوراگراُس کومثبت معنی میں لیں تووہ ترقی کے لیےمحرک (incentive) بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو وہ انسانی معاشرہ پسند ہے جس میں امن کا ماحول پایا جاتا ہو۔امن خدا کے نقشۂ حیات کےمطابق ہےاورتشددخدا کےنقشۂ حیات کےخلاف۔قرآن کی سورہ یونس میں ارشادہواہے: **واللہ یدعو إلی دار السلام** (10: 25)یعنی اللہ سلامتی کےگھر کی طرف پکارتاہے:

And God calls to the home of peace.

قرآن کی اس آیت میں ’’دار السلام‘‘ سے مراد اصلاً آخرت کی جنت ہے۔ جنت کامل معنوں میں امن کا مقام ہے۔یہی پرامن زندگی موجودہ دنیامیں بھی انسان سے مطلوب ہے۔حقیقت یہ ہے کہ جولوگ موجودہ دنیامیں پُرامن زندگی کا ثبوت دیں، وہی وہ لوگ ہیں جوآخرت میں کامل امن کی جنت میں داخلے کےمستحق قرار پائیں گے۔

امن کا برعکس، تشدد (violence) اور جنگ ہے۔ اہل علم، امن کی تعریف (definition) اِس طرح کرتے ہیں کہ امن ناجنگ حالت (absence of war) کا نام ہے۔ لیکن یہ امن کی ایک منفی تعریف (negative definition) ہے۔ امن کی مثبت تعریف یہ ہے کہ امن مواقع کی موجودگی (presence of opportunity) کا نام ہے۔ امن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مواقع کا دروازہ کھولتی ہے۔ امن کے ماحول میں ہر قسم کے مواقع قابلِ حصول ہوجاتے ہیں۔ اِسی لیے خالق کا منشا یہ ہے کہ امن کو ہر حال میں برقرار رکھا جائے۔ امن کو لازمی طور پر قائم رکھا جائے، خواہ اس کی کوئی بھی قیمت (price) دینی پڑے۔

ایگو کا مثبت اور منفی پہلو

انسان کو پیدائشی طور پر ایگو (ego) کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ ایگو کیا ہے، ایگو اپنے وجود کا احساس ہے۔ یہ انسانی دماغ کی وہ صلاحیت ہے جو آدمی کے اندر سیلف (self) کا احساس پیدا کرتی ہے:

Ego: The part of the mind that is responsible for your sense of who you are.

ایگو کا مثبت پہلو بھی ہے اور منفی پہلو بھی۔ ایگو کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اُس سے اپنے آپ پر اعتماد (confidence) پیدا ہوتا ہے۔ ایگو کے ذریعے آدمی عزم (determination) کے ساتھ کسی کام کو کرنے کے قابل بنتا ہے۔ ایگو آدمی کو یقین عطا کرتا ہے، ایگو آدمی کے اندر استحکام پیدا کرتا ہے، ایگو آدمی کو اِس قابل بناتا ہے کہ وہ زندگی کے چیلنج کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا سفر آگے کی طرف جاری رکھے۔ ایگو اپنے مثبت معنی کے اعتبار سے، قوتِ حیات ہے۔ ایگو سے وہ تمام اعلیٰ صفات پیدا ہوتی ہیں جن کو مردانگی (manliness) کہا جاتا ہے۔ یہ دراصل ایگو ہے جو کسی آدمی کو مردِ آہن (iron-man) بناتا ہے۔

اِسی کے ساتھ ایگو کا ایک منفی پہلو ہے۔ یہ منفی پہلو کبر (arrogance) ہے۔ ایگو جب منفی صورت اختیار کرلے تو اُس سے شدید ترین برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً غصہ، نفرت، تشدد، سرکشی، ناانصافی، انتقام، حتی کہ ناحق قتل، وغیرہ۔ اِس کی ایک انتہائی مثال قرآن میں آدم کے بیٹوں، ہابیل اور قابیل کی صورت میں بیان کی گئی ہے۔ ہابیل اور قابیل دونوں سگے بھائی تھے۔ قابیل کسی بات پر

اپنے بھائی ہابیل سے غصہ ہوگیا اور بے رحمی کے ساتھ اس کو مار ڈالا۔

ابتدائی دور کے اِس واقعے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے ایک قانون مقرر فرمایا۔ اِس قانون کا ذکر قرآن کی سورہ المائدہ میں اِن الفاظ میں آیا ہے: **مِن أجل ذلك، كتبنا على بني إسرائيل أنه من قتل نفساً بغير نفسٍ أو فساد في الأرض فكأنما قتل الناس جميعاً، ومَن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعاً۔ ولقد جائتهم رسلنا بالبينات ثم إن كثيراً منهم بعد ذلك في الأرض لمسرفون** (5:32) یعنی اِسی سبب سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ لکھ دیا کہ جو شخص کسی کو قتل کرے، بغیر اس کے کہ اُس نے کسی کو قتل کیا ہو یا اُس نے زمین میں فساد برپا کیا ہو، تو گویا اُس نے سارے آدمیوں کو قتل کر ڈالا، اور جس نے ایک شخص کو بچایا تو گویا اُس نے سارے آدمیوں کو بچا لیا۔ اور ہمارے پیغمبران کے پاس کھلے ہوئے احکام لے کر آئے، اِس کے باوجود اُن میں سے بہت سے لوگ زمین میں زیادتیاں کرتے ہیں۔

آدم اور حوا سے انسان کی نسل شروع ہوئی۔ توالد وتناسل کے نتیجے میں انسان کی آبادی بڑھتی رہی۔ دھیرے دھیرے انسان زمین کے مختلف علاقوں میں آباد ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے شروع ہی سے انبیاء کے ذریعے ہدایت کا سلسلہ شروع کیا۔ ہر مقام پر اور ہر گروہ میں مسلسل انبیاء آتے رہے۔ انھوں نے پر امن جدوجہد کے ذریعے لوگوں کو خدا کا پیغام پہنچایا۔

توحید اور امن

اِس پیغامِ نبوت کے دو خاص اجزا تھے — توحید، اور امن۔ خدا کی نسبت سے، انسان سے یہ مطلوب تھا کہ وہ ایک اللہ کو اپنا الٰہ (معبود) بنائے اور اُس کی عبادت کرے، وہ اللہ کے حکموں کے مطابق، دنیا میں زندگی گزارے۔ یہ بات پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہے، خاص طور پر سورہ الاعراف (7:59-85) اور سورہ الشعراء (26:105-180) میں اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔

خدا کی طرف سے آنے والی پیغمبرانہ ہدایت کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ انسان اِس دنیا میں دوسروں کے درمیان امن کے ساتھ زندگی گزارے۔ خدا کے نزدیک، امن کا تصور کیا ہے،

وہ یہ ہے کہ انسان اِس دنیا میں فطرت کے نقشے کے مطابق رہے۔ خالق نے فطرت کا جو نظام بنایا ہے، وہ اس میں کوئی بگاڑ پیدا نہ کرے۔ یہ حکم قرآن میں اِن الفاظ میں دیا گیا ہے: **قد جائتکم بینة من ربکم، فأوفوا الکیل والمیزانَ، ولا تبخسوا الناس أشیاء هم، ولا تفسدوا فی الأرض بعد إصلاحها** (7: 85) یعنی تمھارے پاس تمھارے رب کے پاس سے کھلی ہوئی دلیل آچکی ہے، تو تم ناپ اور تول پوری کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر مت دو اور زمین میں فساد نہ ڈالو، اس کی اصلاح کے بعد۔

امن (peace) ہر قسم کی تعمیری سرگرمیوں کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔ امن کیا ہے، امن دراصل کوئی قائم کرنے کی چیز نہیں۔ فطرت کا نظام تمام تر امن ہی پر مبنی ہے۔ خالق نے جو دنیا بنائی ہے، اس میں خود تخلیقی نظام کے تحت، امن کی حالت قائم ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ امن کی اِس فطری حالت کو برقرار رکھے۔ انسان اگر فطرت کے اِس نظام کو براقرار رکھے تو اس کا نام اصلاح ہے، اور انسان اگر فطرت کے اِس نظام میں خلل ڈالے تو اِس کا نام فساد ہے۔

قرآن میں وارننگ کے طور پر بتایا گیا ہے کہ انسان اگر فطرت کے نظام میں خلل ڈالے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا کا ہر حصہ آلودگی (pollution) سے بھر جائے گا۔ ہوائی آلودگی (air pollution) اور آبی آلودگی (water pollution) جیسی چیزوں کے ذریعے دنیا انسان کے لیے رہنے کے قابل نہیں رہے گی۔ انسانی عمل کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اِس فساد کے خلاف یہ انتباہ (warning) قرآن کی حسب ذیل آیت میں موجود ہے: **ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت أیدی الناس، لیذیقهم بعض الذی عملوا، لعلهم یرجعون** (30:41) یعنی خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے، تاکہ اللہ مزا چکھائے اُن کو اُن کے بعض اعمال کا، شاید وہ باز آئیں۔

پچھلی تاریخ میں آنے والے تمام پیغمبروں نے انسانی نسلوں کو اِن دونوں حقیقتوں (توحید اور امن) کی طرف متوجہ کیا، مگر عجیب بات ہے کہ انسان پیغمبروں کو اپنا رہنما نہ بنا سکا۔ اس نے پیغمبروں کو حقیر سمجھ کر اُن کو نظرانداز کر دیا۔ اِس تاریخی واقعے کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ اِس نوعیت کی ایک قرآنی آیت

یہ ہے: **یا حسرۃً علی العباد، ما یأتیھم من رسول إلا کانوا به یستھزؤن** (36:30) یعنی افسوس ہے بندوں کے اوپر، جو رسول بھی ان کے پاس آیا، وہ اس کا مذاق ہی اڑاتے رہے۔

توحید اور امن سے انحراف

توحید کے معاملے میں انسان نے یہ انحراف کیا کہ اُس نے خالق کے بجائے مخلوق کی پرستش شروع کردی۔ مخلوقات میں جو چیز بھی نمایاں نظر آئی، مثلاً سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، سمندر، وغیرہ ہر چیز انسان کے لیے پرستش کا موضوع بن گئے۔ اِس معاملے کو مذاہب کی تاریخ میں فطرت کی پرستش (nature worship) کہا جاتا ہے۔ مظاہر فطرت میں چوں کہ تعدد (diversity) تھا، اِس لیے لوگوں کے معبود بھی متعدد ہو گئے۔ اِسی تعدّدِ الٰہ کے تصور کو قرآن میں شرک کہا گیا ہے۔

اِسی قسم کا انحراف امن کے معاملے میں پیش آیا۔ انسان اپنے مقصد کو پُر امن جدوجہد کے بجائے، پُر تشدد جدوجہد کے ذریعے حاصل کرنے لگا۔ اِس طرح پوری تاریخ جنگ اور ٹکراؤ کی تاریخ بن گئی — قبائلی سرداروں کے درمیان جنگ، راجاؤں کے درمیان جنگ، بادشاہوں کے درمیان جنگ، وغیرہ۔ فطرت کے نظام میں یہ انحراف حضرت نوح کے زمانے میں شروع ہوا۔ وہ مسلسل جاری رہا، یہاں تک کہ حضرت ابراہیم کا زمانہ آ گیا۔

نیا منصوبہ

اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک نیا منصوبہ بنایا۔ اِس منصوبے کا خلاصہ یہ تھا کہ نظریاتی طور پر انسان کے لیے توحید اور امن ہی واحد آپشن (option) کے طور پر باقی رہے۔ توحید اور امن کے سوا دوسرے آپشن کے لیے کوئی نظریاتی جواز (ideological justification) باقی نہ رہے۔ موجودہ امتحان کی دنیا میں انسان کی آزادی کو منسوخ نہیں کیا جاسکتا تھا، البتہ یہ ممکن تھا کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ انسان کے لیے اِس معاملے میں نظریاتی جواز باقی نہ رہے۔

یہ منصوبہ معجزاتی طور پر اچانک ظہور میں نہیں آسکتا تھا، اِس عالمِ امتحان میں یہی ممکن تھا کہ اِس منصوبے کو اسباب کے ماحول کے تحت ظہور میں لایا جائے۔ چناں چہ ایسا ہی کیا گیا۔ اِس منصوبے کے آخری مرحلے کا ذکر

قرآن میں اِن الفاظ میں کیا گیا ہے: **وقاتلوهم حتى لاتكون فتنة ويكون الدين كلّه لله** (8:39) یعنی اُن سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب کا سب اللہ کے لیے ہو جائے۔

قرآن کی اِس آیت میں جس واقعے کا ذکر کیا گیا ہے، وہ کوئی سیاسی واقعہ نہیں ہے، وہ تمام تر ایک نظریاتی واقعہ ہے۔ اِس میں اُس خدائی منصوبے کا ذکر ہے جس کا آغاز ہاجرہ اور اسماعیل سے ہوا اور اصحاب رسول پر اس کا ایک مرحلہ مکمل ہوا۔ اِس منصوبے کے نتیجے میں تاریخ میں یہ انقلابی واقعہ پیش آیا کہ انسان کے لیے نظریاتی اعتبار سے، شرک کا آپشن ختم ہو گیا۔ اِسی طرح نظریاتی اعتبار سے، انسان کے لیے جنگ کا کوئی جواز باقی نہیں رہا۔

چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم عراق کے قدیم شہر اُر (Ur) میں پیدا ہوئے۔ وہاں انھوں نے اپنی معاصر قوم کے درمیان اپنا دعوتی مشن جاری کیا۔ لیکن آپ کی قوم کی کنڈیشننگ اتنی زیادہ پختہ ہو چکی تھی کہ وہ آپ کے پیغام کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ نے ایک نیا منصوبہ شروع کیا۔ اِس منصوبے کا آغاز اِس طرح ہوا کہ آپ اپنی اہلیہ ہاجرہ اور اپنے چھوٹے بیٹے اسماعیل کو عرب کے صحرا میں لے گئے اور وہاں اُنھیں اس غیر آباد ماحول میں بسا دیا۔

اِس خصوصی منصوبے کے ذریعے عرب میں ایک نئی نسل پیدا ہوئی۔ اِسی نسل میں 570 عیسوی میں پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ اِسی نسل میں سے وہ لوگ پیدا ہوئے جن کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔ رسول اور اصحاب رسول کی خصوصی جدوجہد کے ذریعے ساتویں صدی عیسوی میں عرب میں ایک انقلاب برپا ہوا۔ اِس انقلاب کے ذریعے تاریخ میں ایک نیا پراسس جاری ہوا جو بیسویں صدی عیسویں میں اپنی آخری تکمیل کو پہنچا۔

اِسی تاریخی پراسس (historical process) کے وہ نتائج ہیں جن کو ہم موجودہ زمانے میں دیکھتے ہیں۔ مثلاً انسانی مساوات، مذہبی جبر کا خاتمہ، جمہوریت اور سائنسی انقلاب جس کے نتیجے میں پرنٹنگ پریس اور جدید کمیونکیشن کا دور دنیا میں آیا۔ اِس کے علاوہ، فطرت (nature) کے نئے حقائق دریافت ہوئے جو دینِ توحید کے لیے تصدیق کی حیثیت رکھتے تھے۔

نظریاتی جواز کا خاتمہ

اِس جدید انقلاب کے نتیجے میں جو موافق باتیں پیدا ہوئیں، اُن میں سے دو خاص چیزیں یہ تھیں کہ نظریاتی طور پر توحید اور امن کے سوا کوئی اور انتخاب انسان کے لیے باقی نہ رہا۔ سائنسی دریافتوں (scientific discoveries) کے نتیجے میں ایک طرف یہ ہوا کہ توحید اب ایک ثابت شدہ علمی حقیقت بن گئی۔ اب کوئی شخص اِس امتحان کی دنیا میں اپنی آزادی کا غلط استعمال کرکے توحید سے انحراف کرسکتا ہے، لیکن خالص اصولی اعتبار سے اس کے لیے اپنے انحراف کا کوئی نظریاتی جواز (ideological justification) موجود نہ ہوگا۔

یہی معاملہ امن کے اصول کا ہے، جو کہ صحت مند سماجی تعمیر کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔ قدیم زمانے میں ہزاروں سال سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ مسلح طاقت ہی اصل طاقت ہے۔ کوئی بڑا مقصد صرف مسلح طاقت کے ذریعے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جدید انقلاب کے ذریعے یہ قدیم مفروضہ یکسر بدل گیا ہے۔ اِس تبدیلی کے دو خاص پہلو ہیں— ایک، یہ کہ موجودہ زمانے میں جدید حالات کے نتیجے میں ایک نئی چیز ظاہر ہوئی ہے جس کو ایک لفظ میں مواقع کا انفجار (opportunity explosion) کہا جاسکتا ہے۔ اِن مواقع کو استعمال کرکے آج ہر مقصد کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اب کسی بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جنگ یا سیاسی طاقت کی قطعاً ضرورت نہیں۔ قدیم زمانے میں سیاسی ایمپائر (political empire) ہوا کرتے تھے، آج اُس سے بھی زیادہ بڑے پیمانے پر غیر سیاسی ایمپائر (non-political empire) بنانا ممکن ہوگیا ہے۔

دوسری چیز وہ ہے جس کو عمومی تخریب کے ہتھیار (weapons of mass destruction) کہا جاتا ہے۔ اِن نئے ہتھیاروں کے ظہور میں آنے کے بعد اب جنگ انسان کے لیے سرے سے کوئی آپشن ہی نہ رہا۔ اب جنگ کا مطلب صرف تباہی ہے۔ اب کوئی بھی مثبت نتیجہ جنگ کے ذریعے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اِس طرح امن اب انسان کے لیے واحد آپشن (option) بن گیا۔ اب انسان کے لیے جو آپشن ہے، وہ امن اور جنگ کے درمیان نہیں ہے، بلکہ وہ امن اور تباہی کے درمیان ہے۔

آج کے انسان کو یا تو امن کا طریقہ اختیار کرنا ہے یا اپنے آپ کو تباہی کے حوالے کر دینا ہے۔

اِس طرح اب تاریخِ انسانی کا سفر اُس مقام پر پہنچ گیا ہے جس کی طرف قرآن کی مذکورہ آیت (**وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة، ويكون الدين كلّه لله**) میں اشارہ کیا گیا تھا۔ تاریخ میں یہ انقلاب اتفاقی طور پر پیش نہیں آیا، وہ براہِ راست خدا کی منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔ خدا نے تاریخی عمل (historical process) کو اِس طرح مینیج (manage) کیا کہ وہ ایک ایسے انجام تک پہنچے جو دعوتِ حق کے کام کے لیے آخری حد تک موافق ہو۔

تاریخِ کائنات کا پہلا دور

کائنات کو اس کے خالق نے ایک بامقصد کائنات کے طور پر پیدا کیا ہے۔ اِس مقصد کی تکمیل ایک تدریجی اصول پر قائم ہے۔ اِس لحاظ سے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ کائنات کی ابتدائی تاریخ 6 بڑے ادوار (periods) پر مبنی ہے۔ یہ 6 ادوار حسب ذیل ہیں:

1- بگ بینگ (Big Bang)
2- لٹل بینگ (Little Bang)
3- واٹر بینگ (Water Bang)
4- پلانٹ بینگ (Plant Bang)
5- اینیمل بینگ (Animal Bang)
6- ہیومن بینگ (Human Bang)

سائنسی مطالعے کے مطابق، تقریباً 15 بلین سال پہلے خلا (space) میں ایک عظیم دھماکا ہوا جس کو بگ بینگ کہا جاتا ہے۔ اُس وقت کائنات کے تمام اجزا (particles) ایک سپر ایٹم کے اندر جمع تھے۔ اِس سپر ایٹم (super atom) میں دھماکا ہوا، اس کے بعد اس کے مادی اجزا وسیع خلا میں پھیل گئے۔ پھر یہ مادی اجزا مختلف اجسام کی صورت میں جمع ہوئے اور وہ مادی دنیا وجود میں آئی جس کو ستارے (stars) اور سیارے (planet) کہا جاتا ہے۔

غالباً ایک بلین سال پہلے ایک ستارہ (star) میں لٹل بینگ (Little Bang) کا واقعہ ہوا۔ اُس کے بعد اس ستارے کے مختلف ٹکڑے ہوگئے۔ اس کے بعد خلا (space) میں وہ مجموعہ بنا جس کو شمسی نظام (Solar System) کہا جاتا ہے۔ یہ شمسی نظام ہماری قریبی کہکشاں

(Milky Way) کے کنارے واقع ہے۔

اِس کے بعد واٹر بینگ (Water Bang) ہوا، یعنی فضا میں موجود دو گیس (ہائڈروجن اور آکسیجن) کے ملنے سے پانی وجود میں آیا۔ یہ پانی لمبے عرصے تک بارش کی صورت میں زمین پر برستا رہا۔ پھر وہ گہرے سمندروں میں ذخیرہ (reservoir) کی صورت میں جمع ہوگیا۔ اِس کے بعد پلانٹ بینگ (Plant Bang) ہوا، یعنی زمین کی سطح پر سبزہ اور درخت وجود میں آئے۔ سمندروں کے سوا زمین کی پوری سطح جو زمین کے تقریباً چوتھائی حصے پر مشتمل ہے، وہ سبزہ سے ڈھک گئی۔ اِس کے بعد انیمل بینگ (Animal Bang) ہوا اور مختلف قسم کے حیوانات وجود میں آئے۔ سمندر میں مچھلیاں اور خشکی پر چرند و پرند بڑی تعداد میں پیدا ہوگئے۔ اِس کے بعد ہیومن بینگ (Human Bang) ہوا۔ خالق نے انسان کو پیدا کرکے اُس کو زمین پر آباد کیا۔ یہاں سے سیارۂ زمین کی ایک نئی تاریخ شروع ہوئی۔ اِس تاریخ کو دوسرے الفاظ میں، تہذیب کی تاریخ (history of civilization) کہا جاتا ہے۔

انسان کے سوا جو کائنات ہے، وہ سب کی سب قانونِ فطرت (law of nature) کے تحت کام کرتی ہے۔ ہر چیز کی سرگرمیوں کے لیے خالق نے ایک نظام مقرر کردیا ہے۔ اِس نظام کے تحت تمام چیزیں اپنا کردار (role) ادا کرتی ہیں۔ مگر انسان کا معاملہ ایک استثنائی معاملہ ہے۔ انسان کو اُس کے خالق نے کامل آزادی (complete freedom) عطا کی ہے۔ انسان کو اختیار ہے کہ وہ اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرے یا غلط استعمال۔ آزادی کے اِسی صحیح یا غلط استعمال کی بنیاد پر انسان کے ابدی مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔

ہدایت کا انتظام

یہی وہ مصلحت ہے جس کی بنا پر انسان کے لیے ہدایت کا خصوصی انتظام کیا گیا۔ انسانوں کی ہر نسل کے درمیان خدا نے اپنے پیغمبر بھیجے۔ اِن پیغمبروں نے انسان کو بتایا کہ انسان کے لیے اِس دنیا میں صحیح روش کیا ہے اور غلط روش کیا۔ پیغمبر نے بتایا کہ موت سے پہلے کی زندگی انسان کے لیے امتحان کی زندگی ہے۔ موت کے بعد انسان کی ابدی زندگی (eternal life) شروع ہوگی، جہاں وہ اپنے عمل

کے مطابق، یا تو انعام پائے گا یا وہ سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔ پیغمبروں کی آمد کا یہ سلسلہ ہزاروں سال تک جاری رہا۔ مگر عملاً صرف یہ ہوا کہ یہ تمام پیغمبر صرف انفرادی اعلان (announcement) کے درجے میں اپنا کام کر سکے، اُن کا مشن اجتماعی انقلاب کے درجے تک نہیں پہنچا۔

اجتماعی انقلاب کا دور

اِس کے بعد تقریباً چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم کے ذریعے عرب کے صحرا میں ایک نئی نسل تیار کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ تقریباً ڈھائی ہزار سال کے عرصے میں یہ نسل بن کر تیار ہوئی۔ اِس نسل کو تاریخ میں بنو اسماعیل (Ishmaelites) کہا جاتا ہے۔ اِسی نسل میں پیغمبر اسلام محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب پیدا ہوئے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی کوششوں کے ذریعہ وہ گروہ بن کر تیار ہوا جس کو اصحابِ رسول کہا جاتا ہے۔ اصحابِ رسول کی غیر معمولی کوششوں کے ذریعے تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ دعوتِ نبوت، اعلان سے آگے بڑھ کر اجتماعی انقلاب تک پہنچ گئی۔ یہاں اِس سلسلے کی چند مثالیں دی جاتی ہیں۔ ان مثالوں کے ذریعے یہ واضح ہو سکے گا کہ دعوتِ نبوت کا اعلان سے بڑھ کر اجتماعی انقلاب تک پہنچ جانے کا مطلب کیا ہے۔

1- قرآن کی سورہ الانفال میں یہ آیت آئی ہے: **وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة، ويكون الدين كلّه لله** (8: 39)۔ یہ آیت مدنی دور میں اتری۔ قرآن کی اِس آیت میں ایک آنے والے مستقبل کی خبر دی گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اصحاب رسول کی جدوجہد سے دنیا میں ایک نیا تاریخی عمل (historical process) جاری ہوگا۔ اِس پراسس کی تکمیل یہ ہوگی کہ دین سب کا سب اللہ کے لئے ہو جائے۔ اِس سے مراد دین کی سیاسی حکومت (political rule) نہیں ہے، بلکہ دین کا نظریاتی (ideological) غلبہ ہے، یعنی دینِ خداوندی کے سوا ہر دین کا غیر مدلل ہو جانا، دینِ خداوندی کے سوا ہر دین کا نظریاتی جواز (ideological justification) سے محروم ہو جانا۔

یہ واقعہ موجودہ زمانے میں مکمل طور پر پیش آ چکا ہے۔ موجودہ دنیا دار الامتحان ہے، اِس لیے یہاں قیامت سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ لوگوں سے ان کی آزادی چھین لی جائے۔ آزادی کے

غلط استعمال کا موقع آدمی کے لیے پہلے بھی تھا اور وہ آج بھی باقی ہے۔ لیکن جہاں تک نظریاتی جواز (ideological justification) کی بات ہے، وہ دینِ خداوندی کے سوا کسی اور دین کے لیے باقی نہیں رہے گا۔ اِس انقلابی عمل کا آغاز ساتویں صدی عیسوی میں اصحاب رسول کے ذریعے ہوا اور بیسویں صدی کے آخر میں یہ عمل اپنے اختتام تک پہنچ گیا۔ اب ہم اکیسویں صدی میں ہیں۔ اکیسویں صدی میں جو کام کرنا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ پیدا شدہ مواقع کو بھرپور طور پر دعوتِ حق کے لیے استعمال کیا جائے۔

2- قرآن کی سورہ البقرہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب (companions) کی طرف سے یہ دعا منقول ہوئی ہے: **ربّنا، ولا تحمل علینا إصراً کما حملته علی الذین من قبلنا** (2: 286) یعنی اے ہمارے رب، تو ہم پر بوجھ نہ ڈال جیسا بوجھ تو نے ڈالا تھا ہم سے اگلوں پر۔

اِس دعا میں ''ہم'' سے مراد صرف اصحابِ محمد نہیں ہیں، توسیعی معنوں میں یہ دعا پوری امتِ محمد کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اِس دعا میں اللہ تعالیٰ سے جو چیز مانگی گئی ہے، وہ یقیناً پوری ہوئی، لیکن یہ اُسی وقت ساتویں صدی میں پوری نہیں ہوئی، بلکہ وہ ایک پراسس (process) کے طور پر انسانی تاریخ میں جاری ہوئی اور وہ بیسویں صدی کے آخر میں پہنچ کر مکمل ہوئی۔

اب اکیسویں صدی میں حالات مکمل طور پر بدل چکے ہیں۔ آج کے داعیانِ حق کو دعوت الی اللہ کے راستے میں نہ وہ مسائل (problems) پیش آئیں گے جو صحابہ سے پہلے کے داعیوں کو پیش آئے تھے اور نہ اُن کو اُن مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا جو اصحابِ رسول کے زمانے میں پائے جاتے تھے۔ اب ضرورت ہے کہ آج کے داعی، تاریخ کی اِس تبدیلی کو سمجھیں اور اس کو دعوت کے لیے استعمال کریں۔ موجودہ زمانے میں دعوت حق کے لیے تمام رکاوٹیں کلی طور پر ختم ہو چکی ہیں۔ اب اگر کسی داعی کے لیے رکاوٹ پیدا ہو تو وہ یقینی طور پر اس کی اپنی کسی غلط پالیسی کا نتیجہ ہوگی، وہ ہرگز حالات کے تحت پیش آنے والی رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔

3- قرآن کی سورہ حم السجدہ میں مستقبل کے اعتبار سے، ایک پیشین گوئی اِن الفاظ میں آئی ہے: **سنریهم اٰیاتنا فی الاٰفاق و فی أنفسهم حتی یتبین لهم أنه الحق** (41: 53) یعنی عن

قریب ہم اُن کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے، آفاق میں بھی اور خود اُن کے اندر بھی، یہاں تک کہ اُن پر یہ امر پوری طرح ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن حق ہے۔

قرآن کی اِس آیت میں دراصل اُس عمل کا ذکر ہے جو صلیبی جنگوں (crusades) کے بعد شروع ہوا۔ صلیبی جنگوں کے بعد یورپ میں وہ علمی واقعہ پیش آیا جس کو تاریخ میں اسپریچول کروسیڈس (spiritual crusades) کہا جاتا ہے۔ اس اسپریچول کروسیڈ کے بعد یورپ کے تمام بڑے بڑے دماغ سائنسی تحقیق میں مصروف ہو گئے۔ انھوں نے فطرت کے پوشیدہ رازوں کو دریافت کیا۔ بیسویں صدی میں یہ عمل اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے۔ اب آفاق وانفس کے وہ تمام چھپے ہوئے حقائق علمی طور پر ایک معلوم واقعہ بن چکے ہیں جو قرآن کے الفاظ میں تبیینِ حق کے لیے ضروری تھے۔ اکیسویں صدی کے داعیوں کا کام یہ ہے کہ وہ اِن سائنسی حقائق کو جانیں اور اُن کو دعوتِ حق کے لیے استعمال کریں۔ یہ سائنسی حقائق دعوت کو مسلّمہ علمی سطح پر مدلل کرنے والے ہیں۔

4- قرآن کی سورہ الحج میں بتایا گیا ہے کہ چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم نے کعبہ کی تعمیر کی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم نے ایک اعلانِ عام کیا۔ اِس کا ذکر قرآن کے اِن الفاظ میں آیا ہے: **وأذّن في الناس بالحج يأتوك رجالاً وعلى كلّ ضامر ياتين من كل فجّ عميق** (22:27) یعنی تم لوگوں میں حج کا اعلان کردو۔ لوگ تمھارے پاس آئیں گے پیدل بھی اور لاغر اونٹنیوں پر بھی، جو پہنچیں گی دور دراز گہرے پہاڑی راستوں سے۔

قرآن کی اِس آیت کا براہِ راست تعلق حج کے سفر سے ہے۔ لیکن توسیعی طور پر اُس میں یہ مفہوم شامل ہے کہ تدریجی عمل کے تحت ایک وقت آئے گا جب کہ لوگ دور دور سے سفر کرکے مکہ پہنچیں، یہاں تک کہ مکہ عالمی سفر کا مرکز بن جائے۔

قرآن کی اِس آیت میں اشاراتی طور پر یہ بات موجود ہے کہ ایک وقت آئے گا جب کہ سفر بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔ موجودہ زمانے میں جدید مواصلات (modern communication) کی ایجاد نے اس پیشین گوئی کو واقعہ بنا دیا ہے۔ عالمی آمد ورفت اتنی بڑھی ہے کہ یہ کہا جاتا ہے کہ ساری دنیا

ایک گلوبل ولیج (global village) بن گئی ہے۔موجودہ زمانے میں سیاحت (tourism) نے اتنی ترقی کی ہے کہ اب ایک مستقل ٹورسٹ انڈسٹری (tourist industry) وجود میں آگئی ہے۔سیاحت اورتجارت، وغیرہ کے تحت روزانہ لوگ کروروں کی تعداد میں اِدھر سے اُدھر جاتے ہیں۔

اِس واقعہ نے موجودہ زمانے میں دعوت کا ایک نیا موقع کھول دیا ہے۔اب دعوتی موقع روزمرہ کی زندگی میں شامل ہوگیا ہے۔اِس کے نتیجے میں یہ ہورہا ہے کہ ہرروز کثیر تعداد میں داعی، مدعو کے علاقے میں جاتا ہے اور مدعو، داعی کے علاقے میں آتا ہے۔اِس صورتِ حال نے دعوت کے نئے عالمی مواقع کھول دئے ہیں۔اب ضرورت ہے کہ اہلِ ایمان اِن نئے مواقع کو دریافت کریں اور اُن کو دعوت کے حق میں استعمال کریں۔

5- پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں مکہ میں اپنا دعوتی مشن شروع کیا۔یہ زمانہ مذہبی جبر (religious persecution) کا زمانہ تھا۔اُس زمانے میں کچھ لوگ جو آپ کے اوپر ایمان لائے، اُن کو وہاں مشرکین ستانے لگے۔وہ ان کو جسمانی اذیت پہنچاتے تھے۔

اُس وقت کچھ اہلِ ایمان نے پیغمبر اسلام سے اِس صورتِ حال کی شکایت کی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ اِن حالات کو ہمارے لیے ختم کردے۔اُس وقت رسول اللہ کعبہ کی دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔یہ سن کر آپ بیٹھ گئے اور فرمایا کہ تم سے پہلے یہ حال تھا کہ ایک مومن کے جسم پر لوہے کی کنگھی کی جاتی تھی، اور اس کے سر پر آرا چلایا جاتا تھا، مگر اِس قسم کی اذیت کے باوجود وہ اپنے دین پر قائم رہتا تھا۔اِس کے بعد آپ نے فرمایا: **واللہ لیتمنّ ہذا الأمر حتی یسیر الراکب من صنعاء إلی حضرت موت، ولا یخاف إلا اللہ (صحیح البخاري، رقم الحدیث: 6943)** یعنی خدا کی قسم، یہ امر (اسلام) ضرور اپنی تکمیل تک پہنچے گا، یہاں تک کہ یہ حال ہوگا کہ ایک شخص سوار ہو کر صنعا سے حضرت موت تک جائے گا اور اس کو اللہ کے سوا کسی اور چیز کا ڈر نہ ہوگا۔

اِس حدیث میں صرف ایک زمانی واقعے کو نہیں بتایا گیا ہے، بلکہ وہ مستقبل کے بارے میں

ایک پیشین گوئی ہے۔ اِس میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے بعد جو انقلاب آیا، اُس سے انسانی تاریخ میں ایک نیا عمل (process) شروع ہوگا جو آخر کار یہاں تک پہنچے گا کہ دنیا میں مذہبی جبر کا دور ختم ہوجائے گا اور دنیا میں مذہبی آزادی کا دور شروع ہوجائے گا۔

اکیسویں صدی میں یہ پیغمبرانہ پیشین گوئی آخری حد تک واقعہ بن چکی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ آج کے داعی اِس زمانی حقیقت کو دریافت کریں اور پھر جدید مواقع کو استعمال کرتے ہوئے وہ اس کے مطابق، دعوتِ حق کے کام کی منصوبہ بندی کریں۔

6- ایک حدیث میں بتایا گیا ہے کہ بعد کے زمانے میں توحید کا پیغام دنیا کے ہر گھر میں پہنچ جائے گا۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں: **لا یبقیٰ علی ظهر الأرض بیتُ مدرٍ ولا وبرٍ إلا أدخله اللہ کلمةَ الإسلام (مسند أحمد، رقم الحدیث: 23814)** یعنی زمین کی سطح پر کوئی خیمہ یا گھر نہیں بچے گا، مگر اللہ اس خیمہ یا گھر کے اندر اسلام کا کلمہ داخل کردے گا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ دراصل مستقبل کے بارے میں ایک پیشین گوئی ہیں۔ اِس میں بتایا گیا ہے کہ آئندہ انسانی تاریخ میں ایسی تبدیلیاں واقع ہوں گی، جب کہ یہ ممکن ہوجائے گا کہ اسلام کی دعوت ہر انسان تک پہنچ جائے، ہر چھوٹے یا بڑے گھر میں اسلام کا پیغام داخل ہوجائے۔

اِس قسم کا عالمی ادخالِ کلمہ پراسرار طور پر نہیں ہوگا، بلکہ وہ معلوم اسباب کے تحت واقع ہوگا۔ موجودہ زمانے میں یہ تمام اسباب مکمل طور پر واقعہ بن چکے ہیں۔ آج وہ تمام مواقع (opportunities) کھل چکے ہیں، جب کہ پیغمبر اسلام کی پیشین گوئی کے مطابق، دعوتِ حق کے کام کو عالمی سطح (global level) پر ممکن بنایا جاسکے۔

ضرورت ہے کہ آج کے اہلِ ایمان اِن امکانات کو دریافت کریں۔ موجودہ زمانے کے اہلِ ایمان کی نسل گویا کہ اِن تبدیلیوں کی وارث ہے۔ اُس پر فرض کے درجے میں یہ ضروری ہے کہ وہ شعوری طور پر اِن تبدیلیوں کو جانیں اور اُن کو استعمال کرتے ہوئے مذکورہ حدیث کی پیشین گوئی کو واقعہ بنائیں۔

7- دجال کے ظہور کے ذیل میں ایک روایت حدیث کی کتابوں میں آئی ہے۔ اِس میں

بتایا گیا ہے کہ دجال جب ظاہر ہوگا تو اُس وقت اہلِ ایمان کی جماعت میں سے ایک شخص اُس کے مقابلے کے لیے نکلے گا۔ اِس رجلِ مومن کے پاس تلوار یا اور کوئی اسلحہ نہیں ہوگا، لیکن اللہ کی توفیق سے وہ اِس مقابلے میں حجت اور برہان کے ذریعے دجال پر غالب آجائے گا۔ اِس کے بعد حدیث کے الفاظ یہ ہیں: **هذا أعظم الناس شهادةً عند ربّ العالمين (صحيح مسلم، كتاب الفتن)** یعنی یہ اللہ رب العالمین کے نزدیک تاریخ کی سب سے بڑی گواہی ہوگی۔

یہ کوئی سادہ واقعہ نہیں، اور نہ وہ کوئی پراسرار واقعہ ہے۔ یہ دراصل اُس لمبے تاریخی عمل (historical process) کے نقطۂ انتہا (culmination) کو بتاتا ہے، جس کے نتیجے میں کسی رجلِ مومن کو یہ موقع ملے گا کہ وہ ہتھیار استعمال کئے بغیر صرف دلیل کی طاقت سے دجالی فتنہ (عظیم ترین شیطانی فتنہ) کا خاتمہ کردے۔ اِس قسم کا دعوتی موقع چوں کہ پہلی بار وجود میں آئے گا، اِس لیے اُس کو حدیث میں عظیم ترین شہادت (greatest witness) کا نام دیا گیا ہے۔

یہ عظیم دعوتی موقع اکیسویں صدی عیسوی میں پوری طرح ظہور میں آچکا ہے۔ آج کے اہلِ ایمان پر فرض کے درجے میں ضروری ہے کہ وہ اِن جدید امکانات کو دریافت کریں اور پُرامن منصوبہ کے ذریعے اُس کو استعمال کرتے ہوئے وہ عظیم دعوتی رول انجام دیں جس کا آج کی تاریخ کو انتظار ہے۔

8- پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک پیشین گوئی اِن الفاظ میں آئی ہے: **إذا هلك كسرىٰ فلا كسرىٰ بعده، وإذا هلك قيصر فلا قيصر بعده، (صحيح البخاري، رقم الحديث: 6629)** یعنی جب قیصر ہلاک ہوجائے گا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہ ہوگا۔ اور جب کسریٰ ہلاک ہوجائے گا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہوگا۔

اِس حدیثِ رسول میں جو بات کہی گئی ہے، اُس کا تعلق ایک بادشاہ کے خاتمے سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق ایک دور کے خاتمہ سے ہے۔ اِس حدیث میں دراصل یہ پیشین گوئی کی گئی ہے کہ اسلامی انقلاب کے بعد دنیا کی سیاسی تاریخ میں ایک نیا عمل شروع ہوگا جو آخرکار یہاں تک پہنچے گا کہ دنیا میں شخصی حکمرانی (dynasty) کا دور ختم ہوجائے گا اور عوامی حکمرانی (democracy) کا دور آجائے گا۔

اِسی طرح ایک اور حدیثِ رسول میں یہ پیشین گوئی کی گئی ہے کہ — اہلِ ایمان پیش قدمی کرتے ہوئے ایک شہر تک پہنچیں گے۔ وہ نہ کسی ہتھیار سے جنگ کریں گے اور نہ وہ تیر چلائیں گے۔ وہ صرف لا الٰہ إلا اللہ، واللہ أکبر کہیں گے اور شہر کی دیواریں گر جائیں گی، یہاں تک کہ وہ اس کے اندر داخل ہوجائیں گے (صحيح مسلم، رقم الحديث: 7517)

اِن روایات میں مستقبل کے بارے میں ایک پیشین گوئی کی گئی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ انسانی میں ایک نیا عمل (process) جاری ہوگا۔ اِس عمل کا نقطہ انتہا یہ ہوگا کہ دنیا سے مطلق العنان بادشاہت (dictatorship) کا دور ختم ہوجائے گا، یعنی وہ دور ختم ہوجائے گا جب کہ سیاسی طاقت ہی اصل طاقت ہوا کرتی تھی۔ اِس کے بعد وہ حالات پیدا ہوں گے جب کہ نظریہ (ideology) کو طاقت کا درجہ حاصل ہوجائے گا۔ پر امن فکری جدوجہد کے ذریعے اُن مقاصد کو حاصل کرنا ممکن ہوجائے گا جن کو پہلے صرف سیاسی طاقت کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا تھا۔

یہ انقلابی دور اب دنیا میں پوری طرح آچکا ہے۔ موجودہ زمانے میں ایک طرف طاقت کا ڈی سنٹرلائزیشن (de-centralization of power) پوری طرح واقعہ بن چکا ہے۔ آج وہ دور ختم ہوچکا ہے جب کہ طاقت صرف ایک سیاسی حاکم کے پاس ہوا کرتی تھی۔ اب ہر انسان کو یہ موقع ہے کہ وہ سیاسی عہدہ (political seat) پر قابض نہ ہوتے ہوئے بھی جس مقصد کے لیے چاہے کام کرے۔ وہ ہتھیار کا استعمال کئے بغیر صرف امن کی طاقت سے اپنے مطلوب کو حاصل کرسکے۔

اِسی طرح یہ پیشین گوئی بھی موجودہ زمانے میں پوری طرح ایک واقعہ بن چکی ہے کہ لا إلٰہ إلا اللہ واللہ أکبر کا مشن لے کر اٹھنے والے لوگ کسی قسم کا مسلح ٹکراؤ کئے بغیر شہروں میں نُفوذ کریں اور لوگوں کے دلوں میں داخل ہوجائیں۔ حدیثِ رسول کی اِس پیشین گوئی کو دوسرے الفاظ میں اِس طرح بیان کیا جاسکتا ہے — دورِ شمشیر کا خاتمہ، دورِ دعوت کا آغاز۔

اکیسویں صدی میں اب اہلِ ایمان کا کام یہ ہے کہ وہ اس تاریخی تبدیلی کو دریافت کریں، وہ اِن جدید امکانات کو استعمال کرکے دعوت الی اللہ کے کام کو عالمی سطح پر انجام دیں۔ موجودہ زمانے میں

ایک عظیم دعوتی امکان پیدا ہوا ہے، مگر اِس عظیم دعوتی امکان کو صرف وہی لوگ استعمال کرسکیں گے جو اپنے شعور کے اعتبار سے اُس کے فکری وارث بن سکیں۔

9 - قرآن کی سورہ النساء میں داعیانِ اسلام کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

أولـئك الذين يعلم الله ما في قلوبهم، فأعرض عنهم وعِظْهُم، وقل لهم في أنفسهم قـولاً بـليغـا (4: 63) یعنی اُن کے دلوں میں جو کچھ ہے، اللہ اُس سے خوب واقف ہے۔ پس تم اُن سے اعراض کرو اور اُن کو نصیحت کرو اور ان سے ایسی بات کہو جو اُن کے دلوں میں اتر جائے:

Speak to them in such terms as will address their minds.

قرآن کی اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت الی اللہ کا حق ادا کرنے کے لیے داعی کو یہ کرنا ہے کہ وہ ایسے اسلوب میں کلام کرے جو مدعو کے مائنڈ کو ایڈریس کرنے والا ہو۔ قدیم زمانہ روایتی اسلوب کا زمانہ تھا۔ قدیم زمانے میں روایتی اسلوب بھی مدعو کے مائنڈ کو ایڈریس کرنے والا بن سکتا تھا، مگر آج کا دور تعقل کا دور (age of reason) ہے۔ آج کے انسان کا مائنڈ صرف اُس وقت ایڈریس ہوتا ہے جب کہ اس کے سامنے کسی بات کو عقلی اسلوب میں بیان کیا جائے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ایک پہلو ہے کہ جب وہ ایک چیز کا حکم دیتا ہے تو اِسی کے ساتھ وہ اُس کے اسباب بھی فراہم کردیتا ہے۔ اسلامی دعوت، اہلِ ایمان کی ابدی ذمے داری ہے۔ موجودہ زمانے میں بھی اہلِ ایمان کو اُسی طرح اپنا دعوتی فریضہ انجام دینا ہے جس طرح دورِ قدیم کے اہلِ ایمان نے اِس فریضے کو انجام دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے داعیانِ حق کی اِس ضرورت کو سمجھا اور موجودہ زمانے میں عالمی سطح پر وہ فکری تبدیلی پیدا کردی جس کو استعمال کرکے اسلامی دعوت کو عقلی اسلوب میں پیش کیا جاسکے۔

اسلام کے بعد کے زمانے میں ایک فکری عمل شروع ہوا۔ اکیسویں صدی میں یہ فکری عمل اپنے نقطۂ اختتام تک پہنچ چکا ہے۔ اب یہ پوری طرح ممکن ہوگیا ہے کہ اسلام کی دعوت کو اُس اعلیٰ عقلی اسلوب پر پیش کیا جاسکے جو دورِ جدید کے مائنڈ کو ایڈریس کرنے والا ہو۔ ضرورت ہے کہ آج کے داعیانِ حق اِس حقیقت کو جانیں اور اس کو جدید دور میں دعوتِ حق کے لیے استعمال کریں۔

10- پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک پیشین گوئی حدیث کی کتابوں میں اِن الفاظ میں بیان ہوئی ہے: **إن الله ليؤيّد هذا الدين بالرجل الفاجر (صحيح البخاري، كتاب الجهاد)** یعنی اللہ تعالیٰ ضرور اِس دین کی تائید فاجر آدمی کے ذریعے کرے گا۔

اِس حدیثِ رسول میں جو پیشین گوئی کی گئی ہے، اس کا تعلق ایک پوری تاریخ سے ہے۔ رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے عرب میں جو انقلاب آیا، اس کے بعد تاریخ میں ایک نیا عمل (process) شروع ہوا۔ اِس عمل کا نشانہ یہ تھا کہ تاریخ میں ایسی تبدیلیاں پیدا ہوں جس کے بعد اسلامی دعوت کو اس کی اعلیٰ ترین سطح پر انجام دینا ممکن ہو جائے۔ حقائق ربانی کے عالمی اظہار کے تمام ممکن ذرائع وجود میں آجائیں، تاکہ دورِ آخر کے اہلِ ایمان اتمامِ حجت کی سطح پر دعوتِ حق کا کام انجام دے سکیں۔

یہ منصوبہ کوئی معمولی منصوبہ نہ تھا۔ یہ تاریخ کے رخ (cause of history) کو انقلابی طور پر بدل دینے کے ہم معنی تھا۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ ہزاروں سال سے جاری روایتی دور ختم ہو جائے اور ایک نیا دور شروع ہو۔ یہ وہی دور ہے جس کو عام طور پر سائنسی دور کہا جاتا ہے۔ اِس دور کو وجود میں لانا کوئی سادہ بات نہ تھی۔ یہ اتنا بڑا کام تھا جس کو تنہا اہلِ ایمان انجام نہیں دے سکتے تھے۔ ضرورت تھی کہ اِس میں پوری انسانیت شامل ہو، حتی کہ ایسے محرکات پیدا ہوں کہ فاجر (secular) طبقہ بھی اِس عمل میں یکساں طور پر شریک ہو جائے — مذکورہ حدیثِ رسول میں اِسی عمومی انسانی عمل کا ذکر کیا گیا ہے۔

موجودہ زمانے میں یہ پیشین گوئی آخری حد تک مکمل ہو چکی ہے۔ لمبے تاریخی عمل کے نتیجے میں وہ تمام اسباب واقعہ بن چکے ہیں جو دعوتِ حق کے لیے تائید کی حیثیت رکھتے تھے۔ اب ضرورت ہے کہ اہلِ ایمان زمانے کی اِس تبدیلی کو سمجھیں اور اُس کو دعوتِ حق کے لیے استعمال کرکے دورِ جدید میں اتمامِ حجت کا وہ مطلوب کام انجام دیں جس کا خدائی منصوبے کے مطابق، قیامت سے پہلے ظہور میں آنا ضروری ہے۔

تاریخ کائنات کا دوسرا دور

تاریخ کائنات کے پہلے 6 دور گویا کہ اس کے مادّی دور تھے۔ اِس کے بعد تاریخ کائنات کا

دوسرا دور شروع ہوا۔ یہ دوسرا دور بھی 6 دوروں پر مشتمل ہے۔ اِس دوسرے دور کو تاریخِ کائنات کا فکری دور کہا جاسکتا ہے۔ یہ دوسرے 6 دور حسب ذیل ہیں:

1- پیغمبروں کا دور	2- بنو اسماعیل کا دور	3- اصحابِ رسول کا دور
4- مسلم تہذیب کا دور	5- مغربی تہذیب کا دور	6- اخوانِ رسول کا دور

پیغمبروں کا دور

پیغمبروں کا دور آدم سے شروع ہوا جو پہلے انسان بھی تھے اور پہلے پیغمبر بھی۔ آدمی کی پیدائش کی تاریخ معلوم نہیں۔ یہ دور آخر کار محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب پر ختم ہوا، جو آخری پیغمبر کی حیثیت رکھتے تھے۔ قرآن میں صرف 25 پیغمبروں کا ذکر ہے۔ البتہ بائبل میں مزید پیغمبروں کا تذکرہ ہے جن کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا۔ تاہم تمام پیغمبروں میں صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات استثنائی طور پر محفوظ ہیں۔ اب قیامت تک کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ہی ہدایتِ الٰہی کا واحد مستند ماخذ (authentic source) کی حیثیت رکھتا ہے۔

بنو اسماعیل کا دور

بنو اسماعیل کا دور اُس وقت شروع ہوتا ہے جب کہ حضرت ابراہیم نے اپنی اہلیہ ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو عرب کے صحرا میں بسا دیا۔ اِس کا مقصد عرب میں ایک نئی نسل تیار کرنا تھا۔ یہ واقعہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے پیش آیا۔ اُس کا مقصد دراصل پیغمبر اسلام کے لیے ایک تیار شدہ نسل (prepared generation) فراہم کرنا تھا۔ یہ منصوبہ پوری طرح کامیاب ہوا۔ بنو اسماعیل کی اِسی نسل میں پیغمبر اسلام پیدا ہوئے اور اِسی نسل میں کام کر کے آپ کو ساتھیوں کی وہ ٹیم حاصل ہوئی جس نے تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

اصحابِ رسول کا دور

اصحابِ رسول سے مراد اصحابِ محمد ہیں۔ اصحابِ محمد، پیغمبروں کی تاریخ میں ایک مستثنیٰ گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی اجتماعی کوشش سے، تاریخ میں پہلی بار یہ کارنامہ انجام دیا کہ توحید کے

مشن کو دعوت کے مرحلے سے آگے بڑھا کر، انقلاب کے مرحلے تک پہنچا دیا۔ اصحابِ رسول کی کوششوں سے تاریخ میں ایک نیا عمل (process) جاری ہوا۔ بعد کے تمام سماجی اور سیاسی اور سائنسی انقلابات اِسی تاریخی عمل کا نتیجہ ہیں۔

مسلم تہذیب کا دور

مسلم تہذیب کے دور سے مراد وہ دور ہے جو رسول اور اصحابِ رسول کے لائے ہوئے انقلاب کے بعد شروع ہوا۔ یہ دور مکہ اور مدینہ میں شروع ہوا، پھر دمشق اور بغداد اور قرطبہ ہوتے ہوئے وہ مغربی یورپ تک پہنچ گیا۔ اِس دور کو مسلم تہذب کا دور کہا جا سکتا ہے۔

مسلم تہذیب کے دور میں، فطرت (nature) کو پرستش کے بجائے تدبر اور تسخیر کا موضوع بنایا گیا۔ جن ستاروں کو اِس سے پہلے انسان دیوتا سمجھ کر پوجتا تھا، ان کے مطالعے اور مشاہدے کے لیے مسلم شہروں میں رصدگاہیں قائم ہوئیں، وغیرہ۔ مسلم تہذیب کے رول کا اعتراف مورخین نے واضح طور پر کیا ہے۔ مثال کے طور پر بریفالٹ (Robert Briffault) نے لکھا ہے کہ — یہ بہت زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ عربوں کے بغیر جدید صنعتی تہذیب سرے سے وجود ہی میں نہ آتی:

> It is highly probable that but for the Arabs, modern industrial civilization would never have arisen at all. (*The Making of Humanity,* p. 202)

مغربی تہذیب کا دور

مغربی تہذیب (western civilization) کو عام طور پر قدیم یونانی تہذیب کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کہا جاتا ہے، مگر یہ انتساب درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید مغربی تہذیب دراصل قدیم مسلم تہذیب کی نشاۃِ ثانیہ ہے۔ مغربی تہذیب نے اُس سائنسی علوم کو تکمیل تک پہنچایا، جس کا آغاز مسلم تہذیب کے زمانے میں ہوا تھا۔ مغربی تہذیب نے فطرت (nature) میں چھپے ہوئے قوانین (laws of nature) کی دریافت کر کے یہ کیا کہ اسلام کی صداقت اور اسلام کی دعوت کے تمام امکانات اعلیٰ ترین سطح پر کھول دئے۔ غالباً یہی تاریخی واقعہ ہے جس کی پیشین گوئی حدیثِ رسول میں

اِن الفاظ میں کی گئی تھی: إن الله ليؤيد هذا الدين بالرجل الفاجر۔

اِس حدیثِ رسول میں جس تائیدِ دین کا ذکر ہے، اُس سے مراد تہذیب (civilization) کے ذریعے وجود میں آنے والی تائید ہے، یعنی فکر وعمل کی سطح پر دینِ حق کے لیے تمام مواقع کا کھل جانا۔ تائید دین کے اِس واقعے کا ابتدائی نصف حصہ مسلم تہذیب کے زمانے پیش آیا، اور تائید دین کے اِس واقعے کا بقیہ نصف حصہ مغربی تہذیب کے ذریعے انجام پایا۔ مذکورہ حدیثِ رسول میں، فاجر انسان سے مراد دراصل سیکولر انسان ہے۔

اخوانِ رسول کا دور

اخوانِ رسول سے مراد امتِ محمدی کا وہ دوسرا گروہ ہے جو تاریخِ انسانی کے آخری دور میں قیامت سے پہلے غالباً اکیسویں صدی میں ظاہر ہوگا۔ وہ حالات کے اعتبار سے اکیسویں صدی عیسوی میں وہی دعوتی جہاد کرے گا جو ساتویں صدی عیسوی میں اصحابِ رسول نے اپنے حالات کے اعتبار سے انجام دیا تھا۔ اصحابِ رسول اپنے زمانے سے پہلے کی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ کے وارث بنے تھے۔ اخوانِ رسول اپنے زمانے سے پہلے کی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ کے وارث ہوں گے۔

اصحابِ رسول اور اخوانِ رسول دونوں میں سے کسی کا کام پراسرار کام نہیں ہوگا، بلکہ دونوں ہی کا یہ معاملہ ہوگا کہ وہ اپنے زمانے کے معلوم مواقع کو دریافت کریں گے اور اُن کو استعمال کر کے انسانیت کے معاملے میں خدا کے منصوبہ کو پورا کریں گے۔

اخوانِ رسول

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق، دورِ آخر میں اہلِ ایمان کے درمیان ایک دعوتی گروہ ظاہر ہوگا۔ حدیث میں اِس گروہ کو اخوانِ رسول کہا گیا ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: وددتُ أنا قد رأينا إخواننا۔ قالوا: أولسنا إخوانك يا رسول الله، قال: بل أنتم أصحابي، وإخواننا الذين لم يأتوا بعد (صحيح مسلم، رقم الحديث: 607) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں اپنے اخوان (بھائیوں) کو دیکھوں۔ صحابہ نے کہا

کہ اے خدا کے رسول، کیا ہم آپ کے اخوان (بھائی) نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ تم میرے اصحاب ہو۔ ہمارے اخوان وہ ہوں گے جو ابھی ظاہر نہیں ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دینِ توحید کی جو تاریخ شروع ہوئی، اُس میں دو گروہ ایسے ہیں جن کے لیے مقدر تھا کہ وہ دینِ توحید کے دعوتی اظہار میں نمایاں رول ادا کریں۔ اِن میں سے ایک گروہ وہ ہے جس کو اصحابِ رسول کہا جاتا ہے۔ اصحابِ رسول نے ساتویں صدی کے نصف اول میں اپنا خصوصی رول ادا کیا۔ موجودہ زمانے میں دعوت واظہار دین کا یہی رول وہ دوسرا گروہ انجام دے گا جس کو اخوانِ رسول کہا گیا ہے۔

دونوں گروہوں میں سے کسی گروہ کا رول پراسرار کرامت کے طور پر نہیں ہوگا، بلکہ وہ معلوم اسباب کے تحت ہوگا۔ دونوں زمانوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے حالات پیدا کئے جائیں گے جن کو استعمال کرتے ہوئے دونوں گروہ اپنا مطلوب رول انجام دیں گے۔ دونوں گروہ دراصل دو الگ الگ تاریخی عمل کے نقطۂ انتہا (culmination) ہوں گے۔

اخوانِ رسول کی صفات

اخوانِ رسول کی دو خاص صفتیں ہوں گی — ایک صفت کا تعلق معرفتِ دین سے ہے، اور دوسری صفت کا تعلق دعوتِ دین سے۔ یہ دونوں صفات یکساں طور پر ضروری ہیں۔ اِن میں سے کسی ایک صفت کا فقدان بھی کسی گروہ کو اخوانِ رسول کا رول ادا کرنے کے لیے نااہل بنا دیتا ہے۔

پہلی صفت کو سمجھنے کے لیے اِس حدیث رسول کا مطالعہ کیجئے: **بدأ الإسلام غريباً وسيعود كما بدأ، فطوبىٰ للغرباء (صحيح مسلم، رقم الحديث: 232)** یعنی اسلام شروع ہوا تو وہ اجنبی تھا۔ اِسی طرح دوبارہ اسلام اجنبی ہو جائے۔ پس مبارک باد ہو اجنبیوں کے لیے۔

اِس حدیثِ رسول میں بتایا گیا ہے کہ عام قانونِ فطرت کے مطابق، مسلمانوں کی اگلی نسلوں کے اندر زوال (de-generation) پیدا ہوگا۔ وہ بدستور اسلام کا نام لیں گے، لیکن وہ حقیقی اسلام سے نا آشنا ہو چکے ہوں گے۔ وہ لوگ قابلِ مبارک باد ہیں جو بعد کے زمانے میں اصل اسلام کو دریافت

کریں اور از سرِ نو اُس پر قائم ہو جائیں۔

بعد کے مسلمانوں میں اِس قسم کا زوال کیوں پیش آئے گا۔ اِس کا سبب رسول کے زمانے سے دوری ہے۔ اصل یہ ہے کہ بعد کے زمانے کے مسلمانوں کے لیے اسلام کو سمجھنے کا قریبی ماخذ رسول نہیں ہوتا، بلکہ بعد کے زمانے کے اکابر اُن کے لیے اُن کے دین کا قریب ماخذ بن جاتے ہیں، جن کو قرآن میں اَحبار ورُھبان (10:30) کہا گیا ہے۔

صحابہ کے لیے ان کے دین کا قریبی ماخذ رسول تھا۔ تابعین کے لیے اُن کے دین کا قریبی ماخذ صحابہ بن گئے۔ اس کے بعد تبع تابعین کے لیے اُن کے دین کا قریبی ماخذ تابعین بن گئے۔ اِسی طرح ہر نسل کے لیے اس کے دین کا قریبی ماخذ بدلتا رہا۔ یہ تبدیلی ہمیشہ تدریجی طور پر ہوتی ہے۔ اِس بنا پر وہ غیر محسوس طور پر جاری رہتی ہے۔ اِس کا اندازہ لوگوں کو صرف اُس وقت ہوتا ہے جب کہ بڑھتے بڑھتے وہ بڑی تبدیلی تک پہنچ جائے۔

مثلاً رسول سے جو دین صحابہ کو ملا، اُس میں سارا زور اسپرٹ (spirit) پر تھا۔ اِس کے بعد ہر نسل میں اس کے اندر تبدیلی آتی رہی، یہاں تک کہ عباسی دور میں جب فقہاء کا زمانہ آیا تو اب سارا زور مسائل، بالفاظ دیگر فارم (form) پر دیا جانے لگا۔ رسول کے زمانے میں، دین مبنی بر روح (spirit-based) تھا۔ فقہاء کے زمانے میں، دین مبنی بر مسائل (form-based) بن گیا ہے۔

اِسی طرح رسول کے زمانے میں اسلام کا خارجی نشانہ صرف دعوت تھا۔ اُس زمانے میں اسلام ایک دعوتی مذہب کی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر بعد کی نسلوں میں دھیرے دھیرے دعوتی ذہن کم ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ جب آٹھویں صدی میں مسلمانوں کا سیاسی ایمپائر قائم ہو گیا تو مسلمانوں کے اندر دعوتی نشانہ سرے سے ختم ہو گیا۔ اب صرف ایک چیز اُن کا نشانہ بن گئی اور وہ تھا سیاسی اقتدار۔

اِسی طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسلام کا کوئی کلچر نہیں تھا۔ اُس زمانے میں رسول اور اصحاب رسول اسلام کو ایک مشن کے طور پر اختیار کئے ہوئے تھے۔ پھر جب اسلام مختلف ملکوں میں پھیلا اور دوسری قوم کے لوگوں سے مسلمان کے تعلقات قائم ہوئے۔ اس کے بعد مسلسل انٹرایکشن (interaction) کے ذریعہ مسلمانوں کے درمیان ایک کلچر بننے لگا۔ یہ عمل جاری رہا، یہاں تک کہ وہ چیز

وجود میں آگئی جس کو مسلم کلچر کہا جاتا ہے۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے درمیان یہ تبدیلیاں پوری طرح واقع ہو چکی ہیں، یہاں تک کہ رسول والا اصل اسلام مسلمانوں کے لیے اب اجنبی (غریب) بن چکا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اسلام پر ہیں، حالاں کہ باعتبار حقیقت وہ ایک بدلے ہوئے اسلام پر ہیں، نہ کہ اصل اسلام پر۔

اب اگر چہ اخوانِ رسول کا رول ادا کرنے کا وقت آ گیا ہے، لیکن اخوانِ رسول کا رول ادا کرنے کی توفیق صرف اُن لوگوں کو ملے گی جو رسول اور اصحابِ رسول والے اسلام کو دوبارہ دریافت (rediscover) کریں، موجودہ مسلمانوں کا زمانہ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے درمیان جو دوری (distance) واقع ہو چکی ہے، اس کو عبور کر کے وہ دوبارہ عہد صحابہ میں پہنچیں۔

اخوانِ رسول کا رول ادا کرنے والے اگر چہ اکیسویں صدی میں ہوں گے، لیکن اپنی فکر اور اپنی سیرت اور اپنے مشن کے اعتبار سے وہ اپنے آپ کو اصحابِ رسول کے ہم زمانہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اصحابِ رسول اور اخوانِ رسول کا رول اگر چہ زمانے کے اعتبار سے مختلف ہے، لیکن اپنی نوعیت کے اعتبار سے، دونوں کا رول ایک ہے۔

سیرتِ رسول کے موضوع پر راقم الحروف کی ایک کتاب ''پیغمبر انقلاب'' (صفحات 208) پہلی بار 1982 میں چھپی۔ اِس کتاب کے آخری باب میں دو بڑے دعوتی گروہوں کا ذکر تھا جو پیغمبرانہ مشن میں عظیم تاریخی رول ادا کرے گا۔ کتاب کی یہ سطریں یہاں نقل کی جاتی ہیں:

''سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ بدر کے میدان میں جب طاقت ور اہلِ کفر بظاہر کمزور اہلِ ایمان کے اوپر ٹوٹ پڑے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدتِ احساس کے تحت سجدے میں گر گئے اور اللہ تعالیٰ سے نصرت کی دعائیں مانگنے لگے۔ اِس نازک لمحہ میں آپ کی زبان سے جو کلمات نکلے، ان میں سے ایک جملہ یہ تھا: **اللهم إن تهلك هذه العصابة، لا تُعبد بعدها فی الارض (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4687)** یعنی خدایا، اگر یہ گروہ ہلاک ہوگا تو اس کے بعد زمین پر تیری عبادت نہ ہوگی۔ یہ کوئی مبالغہ نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تین سو تیرہ روحیں جو بے سروسامانی کے

باوجود بدر کے معرکہ میں کھڑی ہوئی تھیں، یہ محض عام قسم کے تین سو تیرہ لوگ نہ تھے۔ یہ عصابہ دراصل وہ گروہ تھا جس پر ڈھائی ہزار سالہ تاریخ منتہی ہوئی تھی۔ اِسی طرح آج دوبارہ ایک نیا عصابہ (گروہ) درکار ہے جس پر پچھلی ہزار سالہ تاریخ منتہی ہوئی ہو، جو اپنے شعور کے اعتبار سے پچھلی ہزار سالہ تاریخ کا وارث ہو، جو اپنے کردار کے اعتبار سے اُن امکانات کو واقعہ بنانے کا اٹل ارادہ اپنے اندر لئے ہوئے ہو، جو سنجیدہ فیصلے کی اُس حد پر پہنچا ہوا ہو جہاں پہنچ کر آدمی اِس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مقصد سے پوری طرح وابستہ رہے، کوئی بھی خارجی واقعہ اس کو اس کے نشانے سے ہٹانے والا ثابت نہ ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کے کاگ (cog) میں اپنا کاگ ملائیں گے، اور بالآخر یقینی کامیابی کی منزل تک پہنچیں گے''۔ (صفحہ 204)

اِس اقتباس میں جن دو عصابہ کا ذکر تھا، اُن میں سے پہلا عصابہ وہ ہے جس کو اصحابِ رسول کہا جاتا ہے۔ دوسرا عصابہ وہ ہے جس کا ذکر پیشین گوئی کے طور پر حدیثِ رسول میں آیا ہے۔ اِس دوسرے عصابہ کو حدیث میں اخوانِ رسول (**إخواننا الذين لم ياتوا بعد**) کہا گیا ہے— اصحابِ رسول وہ گروہ ہے جس نے ساتویں صدی عیسوی میں اپنا معلوم تاریخی رول ادا کیا۔ اخوانِ رسول غالباً وہ گروہ ہوگا جو اکیسویں صدی عیسوی میں اپنا مطلوب رول ادا کرے گا۔

اِس قسم کا رول ادا کرنا کوئی سادہ بات نہیں ہے۔ ایسا گروہ ہمیشہ ایک لمبے تاریخی عمل کا نقطۂ انتہا ہوتا ہے۔ اصحابِ رسول اپنے سے پہلے کی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ کا نقطۂ انتہا تھے، اِسی طرح اخوانِ رسول اپنے سے پہلے کے ایک ہزار سال سے زیادہ لمبے تاریخی عمل کا نقطۂ انتہا ہوں گے۔ پہلے عصابہ (اصحابِ رسول) نے اپنا مطلوب رول پیغمبر کی رہنمائی میں ادا کیا۔ بار بار ایسا ہوا کہ صحابہ پر یہ امر واضح نہ تھا کہ پیش آمدہ صورتِ حال میں اُنھیں کیا کرنا چاہیے۔ پیغمبر پر خدا نے وحی بھیجی اور پیغمبر نے اس کے مطابق، صحابہ کی رہنمائی کی۔ اس کی ایک مثال معاہدہ حدیبیہ کا واقعہ ہے۔ اُس وقت صحابہ میں سے کسی بھی شخص کو یہ معلوم نہ تھا کہ اِس نازک موقع پر اُنھیں کیا کرنا چاہیے۔ آخر کار، پیغمبر کی رہنمائی میں فیصلہ کیا گیا۔ اِسی طرح صحابہ کا پورا رول پیغمبر کی رہنمائی میں انجام پایا۔

دوسرے عصابہ (اخوانِ رسول) کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ اخوانِ رسول کا رول تمام تر اجتہادی رول ہوگا۔ اُن کو یہ کرنا ہوگا کہ وہ حالات کے گہرے مطالعہ کے ذریعے اپنا رول دریافت کریں اور اُس کے مطابق، عمل کر کے اخوانِ رسول کے درجے کے مستحق ٹھہریں۔ اِس معاملے میں اخوانِ رسول کے لیے صرف دو ہی چیزیں مددگار ہوسکتی ہیں، وہ دو چیزیں ہیں— دعا، اور اجتہاد۔

راقم الحروف نے اِس موضوع پر بہت زیادہ غور کیا ہے۔ اس تمام متعلق لٹریچر کو پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ اِسی کے ساتھ لمبی مدت تک اپنے دن اور اپنی راتوں کو دعا میں گزارا ہے۔ اِن مسلسل کوششوں کے بعد ذاتی طور پر میں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اکیسویں صدی میں وہ تمام حالات پوری طرح ظاہر ہو چکے ہیں جو اخوانِ رسول کو اپنا تاریخی رول ادا کرنے کے لیے درکار ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق، اب انتظار کا وقت ختم ہو چکا ہے اور عمل کا وقت آخری طور پر آچکا ہے۔

اخوانِ رسول کے لیے خوش خبری

قرآن کی سورہ الفیل (105) اور سورہ قریش (106) دو تَوَام (twin) سورتیں ہیں۔ یہ دونوں سورتیں تقریباً ایک ہی وقت میں مکی دور کی ابتدا میں نازل ہوئیں۔ یہ دونوں صورتیں اصحاب رسول کے لیے خوش خبری کی حیثیت رکھتی تھیں۔

اِن سورتوں میں یہ بتایا گیا تھا کہ اصحاب رسول کو اپنے زمانے میں جو رول ادا کرنا ہے، اُس میں خدا پوری طرح اُن کے ساتھ ہے۔ اصحابِ رسول خدا کے ایک عظیم منصوبے کا حصہ ہیں۔ خدا نے اُن کے لیے پیشگی طور پر وہ اسباب مہیا کر دئے ہیں جن کی تائید سے وہ اپنے مطلوب رول کو بخوبی طور پر ادا کر سکیں۔

سورہ الفیل میں کعبہ کے تحفظ کا ذکر ہے۔ کعبہ دراصل وہ تاریخی عمارت تھی جس کے لیے یہ مقدر تھا کہ وہ اسلام کی تحریکِ توحید کا عالمی مرکز بنے۔ اِسی مقصد کے تحت اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو معجزاتی طور پر ابرہا کے حملے سے بچایا۔ اِس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ اصحابِ رسول، کعبہ اور بلدِ امین کو مرکز بنا کر مبنی بر توحید انقلاب برپا کریں۔

سورہ قریش میں، قریش کے لیے خدا کی خصوصی نصرت کا ذکر ہے۔ یہ قریش کون لوگ تھے، یہ اسماعیلی نسل کے وہ منتخب لوگ تھے جو دراصل مستقبل کے اصحاب رسول تھے۔ خدا کو مطلوب تھا کہ وہ محفوظ

رہیں اور آخر کار پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دے کر وہ تاریخی رول ادا کریں جو اُن کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔ قرآن کے ساتھ خدا کا جو خاص معاملہ ہوا، اُس میں سے ایک معاملہ وہ تھا جس کو سورہ قریش کے اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **أطعمهم من جوع، و آمنهم من خوف** (106:4) یعنی اُن کے لیے خصوصی طور پر رزق کی فراہمی اور خصوصی طور پر امن کی فراہمی کا انتظام کیا گیا۔

قرآن کی اِن دونوں سورتوں میں براہِ راست طور پر اُس تاریخی معاملے کا ذکر ہے جو اصحابِ رسول کے ساتھ پیش آیا۔ اسی کے ساتھ بالواسطہ طور پر اِن دونوں سورتوں میں اُس واقعے کی طرف بھی اشارہ ہے جو بعد کے اخوانِ رسول کے ساتھ پیش آنے والا تھا، یعنی اخوانِ رسول کے لیے ایک طرف مرکزِ عمل کی فراہمی اور دوسری طرف مواقعِ کار کے دروازے کا کھل جانا۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکیسویں صدی میں نصرتِ الٰہی کا یہ وعدہ امکانی طور پر ایک واقعہ بن چکا ہے۔ اصحابِ رسول کے بارے میں حضرت عمر فاروق نے کہا تھا کہ: **مَن سرّہ أن یکون من تلك الامّة، فلیؤدّ شرط الله فیها** (**کنز العمال في سنن الأقوال والأفعال، رقم الحدیث**: 4293)۔

یہ بات جو عمر فاروق نے قدیم زمانے میں اصحابِ رسول کے بارے میں کہی تھی، اُسی کو موجودہ زمانے میں اِس طرح کہا جا سکتا ہے کہ — جو لوگ اخوانِ رسول کی جماعت میں شامل ہونے کی خوش قسمتی حاصل کرنا چاہتے ہوں، اُن کو چاہیے کہ وہ عصرِ حاضر کو سمجھیں اور جدید مواقع کو استعمال کر کے وہ رول ادا کریں جو اخوانِ رسول کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔

اصحابِ رسول کے لیے ساتویں صدی عیسوی میں تین خاص امکانات فراہم کئے گئے تھے۔ اکیسویں صدی عیسوی میں اخوانِ رسول کے لیے بھی جدید حالات کے اعتبار سے تین خاص مواقع پوری طرح فراہم ہو چکے ہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ کچھ باحوصلہ اہلِ ایمان اِن مواقع کو دریافت کریں اور اپنے حکیمانہ عمل کے ذریعہ اِس امکان کو واقعہ بنائیں۔ اِن تینوں امکانات کو حسبِ ذیل الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے:

1- متلاشیٔ حق نسل (seeker generation) 2- الیکٹرانک مرکز (electronic centre)

3- امن اور کشادہ رزق (peace and plenty)

متلاشی حق نسل

مکہ میں قبائلِ قریش کے جو لوگ تھے، وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، حق کے متلاشی (truth seeker) لوگ تھے۔ روایات میں ایسے لوگوں کو حُنَفاء کہا گیا ہے، یعنی متلاشی۔

اِنھیں حنفاء میں سے ایک زید بن عمر بن نُفیل تھے۔ اسماء بنت ابی بکر کہتی ہیں کہ میں نے زید بن عمرو بن نفیل کو دیکھا ہے۔ وہ کعبہ کی دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے اور یہ کہہ رہے تھے: **اللهم إنّي لو أعلم أحبَّ الوجوه إليك، عبدتك به، ولكني لا أعلم** (**السيرة النبوية لابن كثير**، جلد 1، صفحہ 154) یعنی اے اللہ، اگر میں جانتا کہ تیری عبادت کرنے کا سب سے اچھا طریقہ کیا ہے تو میں اُسی طرح تیری عبادت کرتا، لیکن میں اس کو نہیں جانتا۔

شعوری یا غیر شعوری طور پر بنواسماعیل کے تقریباً تمام افراد کا یہی حال تھا۔ اپنی خصوصی صحرائی تربیت کے نتیجے میں یہ لوگ متلاشیٔ حق (truth seeker) تھے، نہ کہ منکرِ حق۔ یہی وجہ ہے کہ دھیرے دھیرے اُن کے تقریباً تمام عورتوں اور مردوں نے اسلام قبول کرلیا۔ ابتدا میں اُن کی مخالفت بے خبری کی بنا پر تھی، نہ کہ حقیقۃً سرکشی کی بنا پر۔ موجودہ زمانے کی جدید نسل کا کیس بھی عام طور پر یہی ہے۔ موجودہ زمانے میں سائنسی انقلاب اور دوسرے فکری انقلابات کے نتیجے میں لوگوں کا جو ذہن بنا ہے، وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، منکرِ حق کا کیس نہیں ہے، بلکہ وہ متلاشیٔ حق (truth seeker) کا کیس ہے۔ اس معاملے کو ایک حالیہ مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔

ایک انگریز جوڑا مغربی تہذیب سے غیر مطمئن تھا۔ آخر کار دونوں لندن چھوڑ کر دہلی آ گئے۔ دہلی میں آج کل وہ بیمار حیوانات کا ایک اسپتال چلا رہے ہیں۔ وہ حیوانات کی خدمت میں اپنے لیے اطمینان تلاش کررہے ہیں۔ ہماری دعوتی ٹیم کے ایک صاحب اُن سے ملے اور اُن کو قرآن کا انگریزی ترجمہ پیش کیا۔ انھوں نے اس کو نہایت شوق سے لیا اور کہا کہ میں اس کو ضرور پڑھوں گا۔ انھوں نے کہا کہ — میری ہمیشہ یہ خواہش تھی کہ میں سچائی کے دوسرے تصور کو جانوں:

I always wanted to know another version of the truth.

یہی موجودہ زمانے کے تقریباً تمام عورتوں اور مردوں کا حال ہے۔ نئے افکار اور نئے تجربات نے اُن کو شعوری یا غیر شعوری طور پر سچائی کا متلاشی بنا دیا ہے۔ یہ صورتِ حال اکیسویں صدی کے اخوانِ رسول کو عین وہی موقع فراہم کر رہی ہے جو ساتویں صدی کے اصحابِ رسول کے حصے میں آیا تھا۔ جو لوگ اِس موقع کو دریافت کر کے اس کو استعمال کریں، وہی دراصل اخوانِ رسول کا رول ادا کریں گے۔

الیکٹرانک مرکز

دعوتی کام کو منظّم کرنے کے معاملے میں بھی یہی امکان پوری طرح پیدا ہو چکا ہے۔ قدیم زمانے میں کوئی دعوتی کام عملاً صرف محدود علاقے میں ہوسکتا تھا۔ حدیث کے الفاظ میں، آج یہ مطلوب ہے کہ سطحِ زمین کے تمام چھوٹے اور بڑے گھروں میں اسلام کا کلمہ داخل کر دیا جائے۔ (**لایبقیٰ علی ظهر الأرض بیت مدر ولا وبر إلا أدخله اللّٰه کلمةَ الإسلام**) ۔اس سے کم درجے کے کسی کام کو مطلوب درجے کا کام قرار نہیں دیا جا سکتا۔

موجودہ زمانے میں جو دعوتی کام مطلوب ہے، وہ عالمی دعوت کا کام ہے۔ اِسی مصلحت کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے موجودہ زمانے میں ایسے حالات پیدا کئے جس کی بنا پر پوری دنیا ایک گلوبل ولیج (global village) بن گئی۔ آج یہ ممکن ہو گیا کہ جدید وسائل کو استعمال کر کے عالمی دعوت کا کام کیا جائے۔ آج عالمی دعوت کے مشن کو مقامی مرکز درکار نہیں ہے، بلکہ اس کو عالمی مرکز درکار ہے۔

خدا کی خصوصی نصرت کا یہ امکان آج پوری طرح وجود میں آ چکا ہے۔ اِس امکان کو ایک لفظ میں، دعوت کا الیکٹرانک سنٹر کہا جا سکتا ہے۔ دورِ جدید کا الیکٹرانک سنٹر بظاہر ایک محدود رقبۂ زمین پر ہوگا، لیکن اپنے دعوتی رول کے اعتبار سے وہ عالمی سطح پر اپنے کام کو منظّم کرنے کا اہل ہوگا۔

امن اور کشادہ رزق

امن اور رزق کی کشادگی کے اعتبار سے بھی یہی معاملہ پیش آیا ہے۔ موجودہ زمانہ پورے معنوں میں وہ زمانہ ہے جب کہ امن اور رزق کی کشادگی دونوں کے مواقع پوری طرح حاصل ہو چکے ہیں۔ اصولی طور پر آج کے انسان کے لیے صرف امن کا چوائس (choice) باقی رہا ہے۔ تشدد اور جنگ کا چوائس

اب اصولی طور پر ختم ہو چکا ہے۔ عمومی تباہی کے ہتھیار (weapons of mass destruction) کے وجود میں آنے کے بعد اب صرف پر امن طریقِ کار ہی کے ذریعے کوئی مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اب متشددانہ طریقِ کار کے ذریعے کسی مثبت مقصد کا حصول ممکن ہی نہیں رہا۔

مزید یہ کہ آج مذہبی آزادی (religious freedom) کا حق ایک مطلق حق کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اگر آدمی اپنی طرف سے جارحانہ انداز اختیار نہ کرے تو وہ کسی بھی رکاوٹ کے بغیر عالمی سطح پر دعوتی کا کام انجام دے سکتا ہے۔ گویا کہ قدیم عرب (قریش) کو جو امن محدود طور پر کعبہ کی نسبت سے ملا تھا، وہ امن اب جدید دنیا میں ایک زمانی انقلاب کے نتیجے میں عالمی سطح پر حاصل ہو چکا ہے۔

یہی معاملہ رزق کی کشادگی کا ہے۔ موجودہ زمانے میں اہلِ اسلام کے لیے رزق کی کشادگی کا واقعہ اتنے بڑے پیمانے پر ہوا ہے جیسا واقعہ اس سے پہلے تاریخ میں کبھی نہیں ہوا تھا۔

اِس کشادگی کا ایک پہلو یہ ہے کہ مسلم ملکوں کی زمین کے نیچے تیل کا خزانہ دریافت ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کے تیل کے ذخائر کا 75 فی صد حصہ مسلم ملکوں میں واقع ہے۔ دوسری طرف، جدید صنعتی انقلاب نے کسبِ رزق کے مواقع سیکڑوں گنا زیادہ بڑھا دئے ہیں۔ اگر اہلِ اسلام اپنی طرف سے کوئی مسئلہ پیدا نہ کریں تو آج وہ دعوت الی اللہ کا کام رزق کی فراوانی کے ماحول میں انجام دے سکتے ہیں، جب کہ پچھلے لوگوں کو رزق کی تنگی کے ماحول میں دعوت الی اللہ کا کام انجام دینا پڑتا تھا۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ جدید دور (modern age) ہر اعتبار سے ایک نیا دور ہے۔ ایک لفظ میں، اس کو روایتی دور کا خاتمہ اور غیر روایتی دور کا ظہور کہہ سکتے ہیں۔ آج کا دور فکر و عمل کے تمام پہلوؤں کے اعتبار سے کامل طور پر ایک بدلا ہوا دور ہے۔ یہ تبدیلی اتنی زیادہ بڑھ چکی ہے کہ قدیم زمانے کا آدمی اگر اچانک زندہ ہو کر آج کے زمانے میں آئے تو وہ سمجھے گا کہ شاید میں ایک خواب دیکھ رہا ہوں، کیوں کہ یہاں کی ہر چیز اس کو ناقابلِ قیاس حد تک بدلی ہوئی دکھائی دے گی۔

جدید تبدیلی کا مقصد

یہ تبدیلیاں دنیا میں کس لیے آئی ہیں۔ اس کا مقصد لوگوں کو آرام و عیش فراہم کرنا نہیں ہے۔

اِس کا مقصد یہ ہے کہ اِن تمام مواقع اور اِن تمام امکانات کو دعوت الی اللہ کے کام میں استعمال کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت کا کام اتنا زیادہ مطلوب کام ہے کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے پورے دور کو بدل دیا۔ موجودہ زمانے میں زندگی کے تمام پہلوؤں میں ہر اعتبار سے تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ یہ تبدیلیاں تمام تر دعوت الی اللہ کے حق میں ہیں۔ یہ تبدیلیاں دعوت الی اللہ کے کام ہی کے لیے ظہور میں آئی ہیں۔ جو لوگ اِن تبدیلیوں کو جانیں اور اُن کو بھرپور طور پر دعوت الی اللہ کے مقصد کے لیے استعمال کریں، وہی آخری دور کے وہ خوش قسمت لوگ ہوں گے جن کو حدیث میں اخوانِ رسول کہا گیا ہے۔

ادخالِ کلمہ

اخوانِ رسول کو جو کام کرنا ہے، اس کو واحد نام دینا ہو تو وہ 'ادخالِ کلمہ' ہوگا۔ حدیث میں اِس سلسلے میں **أدخله الله كلمة الإسلام** کا لفظ آیا ہے۔ اِس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ادخالِ کلمہ کے اِس عمل میں مُدخِل خود اللہ ہوگا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام اسباب خود اللہ کی طرف سے مہیا کیے جائیں گے جو عالمی ادخالِ کلمہ کے لیے ضروری ہیں۔ ادخالِ کلمہ کا پورا پراسس خدا کی طرف سے ہوگا۔ اخوانِ رسول کو صرف یہ سعادت ملے گی کہ وہ اِس عمل کا ایک شعوری حصہ قرار پائیں گے۔

دعوت الی اللہ کا کام ہمیشہ خدا کی نصرتِ خاص کے تحت انجام پاتا ہے۔ تاریخ کے آخری دور میں دعوت الی اللہ کا جو کام ہوگا، وہ بھی خدا کی خصوصی نصرت کے تحت انجام پائے گا۔ یہ نصرتِ خاص ہمیشہ معجزہ کی سطح پر ظاہر ہوتی ہے۔ اِس معاملے میں، معجزہ سے کم درجے کی کوئی چیز نصرت کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ البتہ یہ فرق ہے کہ قدیم زمانے میں دعوت کے حق میں یہ معجزاتی نصرت خرقِ عادت کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی، اب موجودہ زمانہ میں یہ معجزاتی نصرت اسباب کی صورت میں ظاہر ہوگی، یعنی تاریخی عمل کے نتیجے میں ظاہر ہونے والے انفجارِ مواقع (opportunity explosion) کے ذریعے۔

اِس اعتبار سے، یہ کہنا صحیح ہوگا کہ قدیم زمانے کے داعیوں کو جو نصرت بذریعہ معجزات دی گئی تھی، موجودہ زمانے کے داعیوں کو وہ نصرت پورے دور کی تبدیلی کی صورت میں فراہم کردی گئی ہے۔ قدیم داعیوں کو یہ نصرت اگر وقتی معجزہ کے ظہور کے ذریعے ملی تھی، تو آج کے داعیوں کے لیے یہ نصرت

پورے دور کو اُن کے موافق بنانے کی صورت میں عطا کردی گئی ہے۔

ہندستان میں خصوصی مواقع

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **عصابتان من أمتي أحرزهما الله من النار: عصابة تكون مع عيسى بن مريم، وعصابة تغزوا الهند** (صحيح الجامع للألباني، رقم الحديث: 4012) یعنی میری امت میں دو گروہ ہیں جن کو اللہ نے آگ کے عذاب سے بچالیا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو عیسی بن مریم کے ساتھ ہوگا، اور دوسرا گروہ وہ ہے جو ہند میں غزوہ کرے گا۔

اِس حدیث رسول میں مستقبل کے بارے میں ایک پیشین گوئی کی گئی ہے۔ بظاہر اِس کا مطلب یہ ہے کہ دورِ آخر میں دعوت الی اللہ کا جو کام مقدر ہے، وہ غالباً ہندستان میں انجام پائے گا۔ دعوت الی اللہ کا یہ کام قیامت سے پہلے ہوگا۔ اِس کام کی انجام دہی کے بعد قیامت آجائے گی اور انسان کے لیے دوسرا دورِ حیات شروع ہوجائے گا، جہاں انسانوں کو ایک دوسرے سے الگ کردیا جائے، اور ایک گروہ کے لیے انعام اور دوسرے گروہ کے لیے سزا کا فیصلہ کیا جائے۔

موجودہ زمانے میں دنیا میں تقریباً 200 ممالک ہیں۔ اُن میں سے ایک ہندستان ہے۔ مختلف ممالک کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ بات بہت زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ قیامت سے پہلے دعوت الی اللہ کا جو آخری کام ہونے والا ہے، اس کا مرکز غالباً ہندستان ہوگا۔ دعوت الی اللہ کا یہ کام عالمی سطح پر انجام پائے گا، لیکن مرکزِ عمل کے اعتبار سے، ہندستان کو اُس میں خصوصی مقام حاصل ہوگا۔ کسی ملک کے حالات بہ ظاہر اِس قابل نہیں کہ وہاں کامیابی کے ساتھ دعوت الی اللہ کا کام انجام دیا جاسکے۔ البتہ مختلف اسباب نے ہندستان کو ایک خصوصی اہمیت دے دی ہے۔ موجودہ زمانے میں دعوت الی اللہ کا کام موثر طور پر انجام دینے کے لیے ہندستان واحد ملک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس اعتبار سے، یہ کہنا درست ہوگا کہ ہندستان وہ واحد ملک ہے جہاں پیغمبر اسلام کی مذکورہ پیشین گوئی واقعہ بن سکے۔

دور کی تبدیلی

قرآن کی سورہ النور میں اہل ایمان کے لیے **استخلاف في الارض** (24:55) کا وعدہ

کیا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں مستقبل کے لیے یہ خبر دی گئی ہے کہ — خدا اہلِ ایمان کی حالتِ خوف کے بعد اُس کو امن سے بدل دے گا (**ولیبدّلنهم من بعد خوفهم أمنا**)۔

قرآن کی اِس آیت میں جس تبدیلی کا ذکر ہے، اس کا تعلق نہ صرف سیاسی تبدیلی سے ہے اور نہ صرف زمانی تبدیلی سے۔ اِس آیت میں دراصل دور کی تبدیلی کی خبر دی گئی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ دورِاول میں اسلام کے ذریعے جو انقلاب آیا، اُس کے نتیجے میں انسانی تاریخ میں ایک پراسس (process) جاری ہوا۔ یہ پراسس آخر کار اِس انجام تک پہنچے گا کہ دنیا سے خوف کا دور ختم ہو جائے اور امن کا دور قائم ہو جائے۔ اِس کے بعد اہلِ ایمان توحید کے مشن کو مذہبی آزادی کے ماحول میں انجام دینے کے قابل ہو جائیں گے، جب کہ اِس سے پہلے توحید کے مشن کو مذہبی جبر کے ماحول میں انجام دینا پڑتا تھا۔

بیسویں صدی عیسوی میں یہ تبدیلی مکمل طور پر آچکی ہے۔ بیسویں صدی مذکورہ تاریخی پراسس کے نقطۂ انتہا (culmination) کی صدی ہے۔ اب لڑائی یا متشددانہ طریق کار کامل طور پر ایک غیر متعلق (irrelevant) طریقہ بن چکا ہے۔ اب اگر اہلِ ایمان کو دوبارہ ''خوف'' کی حالت پیش آئے گی تو وہ خود اُن کی اپنی غلط پالیسی کی بنا پر پیش آئے گی، نہ کہ زمانی حالت کی بنا پر۔

دَور کی یہ تبدیلی پُر امن دعوتی مشن کے لیے ایک عظیم تائید کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو لوگ اِس راز کو نہ سمجھیں اور بدستور متشددانہ کارروائی کرتے رہیں، وہ اپنے بارے میں اندھے پن کا ثبوت دے رہے ہیں۔ یہ اندھا پن اتنا زیادہ سنگین ہے کہ اُس کو قرآن کی مذکورہ آیت میں کفر وانکار کا نام دیا گیا ہے۔

لسانِ قوم میں دعوت

قرآن کی سورہ ابراہیم میں پیغمبروں کے بارے میں بتایا گیا ہے: **وما أرسلنا مِن رسول إلّا بلسانه قومه** (14:4) یعنی خدا کی طرف سے جو پیغمبر بھی آیا، وہ اپنی مخاطب قوم کی زبان میں کلام کرتا تھا۔ قرآن کی اِس آیت میں 'لسان' سے مراد صرف زبان (language) نہیں ہے، بلکہ اُس میں کلام کا اسلوب (idiom) بھی شامل ہے۔ مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عربی زبان میں کلام کیا۔ یہ آپ کے لیے قوم کی زبان (لسانِ قوم) میں بولنا تھا۔ حضرت ابراہیم نے زمین اور آسمان کے

ملکوت (6:76) سے استدلال کرتے ہوئے مدعو کے سامنے اپنے بات پیش کی۔ اور حضرت مسیح نے تمثیل (metaphor) کے انداز میں اپنی بات کہی۔ یہ دونوں اسلوب کی مثالیں ہیں، جو اپنے زمانے کے لحاظ سے استعمال کی گئیں۔

موجودہ زمانے میں دعوتی کلام وہ ہے جو وقت کی زبان میں ہو۔ وقت کی زبان کا ایک مطلب داعی کے اپنے علاقے کی زبان ہے۔ پھر یہ کہ موجودہ زمانہ گلوبلائزیشن کا زمانہ ہے۔ اِس لحاظ سے ضروری ہے کہ داعی آج کی انٹرنیشنل زبان میں کلام کرے۔ اور جیسا کہ معلوم ہے، آج کی انٹرنیشنل زبان صرف ایک ہے، اور وہ انگریزی زبان ہے۔

''لسان'' کے مسئلے کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ معاصر مخاطبین کے اسلوب میں ہو۔ آج کا اسٹینڈرڈ اسلوب وہ ہے جس کو سائنٹفک اسلوب کہا جاتا ہے۔ اگر آج کے انسان کو مخاطب کرنا ہے تو ضروری ہے کہ داعی کا کلام وقت کے اسلوب میں ہو، ورنہ یہ حال ہوگا کہ داعی بظاہر بولے گا، لیکن مدعو کا مائنڈ اس سے ایڈریس نہیں ہوگا۔ ایسے کلام کو دعوتی کلام نہیں کہا جاسکتا۔

سائنٹفک اسلوب کیا ہے اور قدیم روایتی اسلوب کیا تھا۔ قدیم روایتی اسلوب وہ تھا جس میں شعر، ادب، خطابت، رومانیت، تمثیل اور مبالغہ آرائی کی زبان میں کسی بات کے کہنے کو بھی کہنا سمجھا جاتا تھا۔ جذباتی طور پر پُرکشش الفاظ بولنے والے لوگ بھی داد کے مستحق قرار پاتے تھے۔ موجودہ زمانے میں اِس قسم کا اسلوب پوری طرح متروک ہو چکا ہے۔ موجودہ زمانے کا اسٹینڈرڈ اسلوب سائنٹفک اسلوب ہے۔ سائنٹفک اسلوب وہ ہے جو مبنی بر حقیقت اسلوب ہو۔ جس کے الفاظ اور معنی میں کامل مطابقت پائی جائے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ سائنٹفک اسلوب وہ ہے جو پورے معنوں میں علمی اور منطقی (rational) اسلوب ہو۔ موجودہ زمانے میں وہی لٹریچر دعوتی لٹریچر ہے جو اِس سائنٹفک اسلوب میں لکھا گیا ہو — یہی سائنٹفک اسلوب قرآن کا اسلوب ہے۔

جنتی تہذیب

تہذیب (civilization) کا آغاز قدیم زمانے میں اُس وقت ہوا جب کہ انسان نے لوہے کو

دریافت کیا۔ یہ دور ہزاروں سال تک چلتا رہا۔ ساتویں صدی عیسوی میں مسلم تہذیب کا آغاز ہوا۔ مسلم تہذیب کا بنیادی کارنامہ یہ تھا کہ اُس نے فطرت (nature) کو پرستش کے مقام سے ہٹا کر اس کو تحقیق (investigation) کے دور میں داخل کیا۔ اِس کے بعد سولھویں صدی میں مغربی تہذیب کا دور شروع ہوا۔ اِس دور کا خاص پہلو میکانائزیشن آف پاور (mechanization of power) تھا۔

تہذیب کا سفر امکان کے اعتبار سے، ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ بیسویں صدی عیسوی میں اس کی ترقی اپنی آخری حد پر پہنچ گئی۔ معلوم ہوا کہ انسان کی قائم کردہ میکانکل صنعت ایک لازمی مسئلے سے دوچار ہے، اور وہ کثافت (pollution) ہے۔

کثافت کے مسئلے نے موجودہ زمانے میں فضاؤں اور سمندروں کو آلودگی سے بھر دیا۔ قرآن کے یہ الفاظ آج پوری طرح واقعہ بن چکے ہیں: **ظهر الفساد فی البرّ والبحر بما کسبت أیدی الناس لیذیقهم بعض الذی عملوا، لعلم یرجعون** (30:41) یعنی خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے، تاکہ اللہ مزا چکھائے اُن کو اُن کے بعض اعمال کا، شاید کہ وہ باز آجائیں۔

عارفانہ دریافت کا سفر

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ: **ولو أن ما فی الأرض من شجرة أقلام والبحر یمدّه من بعده سبعة أبحر، ما نفدت کلمات الله، ولو جئنا بمثله مددا** (31:27) یعنی اگر زمین میں جو درخت ہیں، وہ قلم بن جائیں اور سمندر، سات مزید سمندروں کے ساتھ روشنائی بن جائیں، تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے۔

اِس آیت میں کلمات اللہ سے مراد وہی چیز ہے جس کو قرآن میں دوسرے مقام پر، آلاء اللہ کہا گیا ہے، یعنی عجائب خداوندی (wonders of God)۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے (51:56)۔

صحابی مفسر عبداللہ بن عباس نے اِس آیت میں، عبادت کا مطلب معرفت بتایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک خصوصی مخلوق کے طور پر پیدا کیا ہے، انسان کو سوچنے والا دماغ دیا ہے

جوکسی اورکونہیں دیا۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ غور وفکر کے ذریعے تخلیقات میں چھپے ہوئے آلاء اللہ کو دریافت کرے، اور استعجاب کے درجے میں اُن کا اعتراف کرے۔ گویا کہ قرآن کی مذکورہ آیت میں یہ کہا گیا ہے:

I created man only to discover
and appreciate the wonders of God.

تہذیب کا سفر دراصل اِسی عارفانہ دریافت کا سفر تھا، مگر اِس سفر کا ابھی ایک فی صد سے بھی بہت کم حصہ طے ہوا تھا کہ اس کی حد آ گئی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ کلمات اللہ یا آلاء اللہ ابھی لامتناہی حد تک باقی ہیں، پھر کیا ایسا ہوگا کہ انسانی تاریخ یوں ہی ناتمام طور پر ختم ہو جائے اور کلمات اللہ اِسی طرح مخفی حالت میں باقی رہیں۔ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ ضروری ہے کہ تخلیق کا منصوبہ پورا ہو، اتمامِ نور (61: 8) کا عمل اپنی آخری حد تک پہنچے، وہ خدائی پیشین گوئی واقعہ بنے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وأشرقت الأرض بنور ربها (39: 69)۔

قیامت کے بعد بننے والی دنیا دراصل اِسی ربانی تہذیب یا ان فولڈنگ کے عمل (process of unfolding) کا تسلسل (continuation) ہے۔ موجودہ دنیا دار الامتحان ہے۔ یہاں صالح انسان اور غیر صالح انسان دونوں ملے ہوئے ہیں۔ قیامت کے بعد دونوں کو چھانٹ کر ایک دوسرے سے الگ کردیا جائے گا۔ غیر صالح لوگوں کو ابدی طور پر محرومی کی دنیا میں ڈال دیا جائے گا اور صالح انسانوں کو الگ کرکے ایک کامل اور معیاری دنیا میں بسایا جائے گا، اِسی کا نام جنت ہے۔

ربانی تہذیب

جنت دوسرے الفاظ میں، ربانی تہذیب (divine civilization) کی دنیا ہے۔ ربانی تہذیب کے تحت جو عمل انجام پائے گا، اُس کو ایک لفظ میں، آلاء اللہ کی اَن فولڈنگ (unfolding of divine wonders) کہا جاسکتا ہے۔

یہ عمل سادہ طور پر ایک عمل نہیں ہوگا، بلکہ وہ اعلیٰ ترین مسرت (super joy) کا تجربہ ہوگا۔ یہاں انسان ہر لمحہ ایک نئی پر اہتزاز دریافت (thrilling discovery) کرے گا۔ لازوال مسرت کی

اِس دنیا کی کوئی انتہا نہ ہوگی اور نہ وہ کبھی ختم ہوگی۔ اِسی جنت کے بارے میں قرآن میں آیا ہے:
خالدین فیها لا یبغون عنها حولا (18: 108)۔

قرآن اور حدیث میں اہلِ جنت کے آرام وراحت کے لیے بہت سی چیزیں موجود ہوں گی۔ جنت میں آرام وراحت کی حیثیت دراصل خدائی ضیافت (divine hospitality) کی ہوگی، یعنی اہلِ جنت کی اصل سرگرمیاں اِس لیے ہوں گی کہ وہ ربانی تہذیب کو بروئے کار لائیں۔ اِسی کے ساتھ اہلِ جنت کے لیے خدا کی طرف سے ہر قسم کے آرام وراحت کا سامان فراہم کیا جائے گا، یہاں تک کہ اُن کی تمام خواہشیں کامل فل فل مینٹ (total fulfilment) کے درجے میں پوری ہونے لگیں۔

معرفت کا ابدی سفر

وہ کون خوش نصیب لوگ ہوں گے جو آخرت کی روحانی تہذیب (spiritual civilization) کو ظہور میں لائیں گے اور تخلیق میں خدائی عجائب کو اَن فولڈ (unfold) کرنے کا ابدی رول ادا کریں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں اِس انوکھی صلاحیت کا ثبوت دیں کہ وہ دنیا کے محدود حالات میں معرفتِ خداوندی کی دریافت کی آخری حد تک پہنچیں۔ یہی وہ صلاحیت ہے جو اُن کو اِس کا اہل ثابت کرے گی کہ وہ آخرت کے لامحدود حالات میں خدائی معرفت کی دریافت کا ابدی سفر طے کریں۔

ساتویں صدی عیسوی میں بنو اسماعیل کو یہ موقع ملا کہ وہ پیغمبر آخر الزماں محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب کے اصحاب بن کر روایتی دور میں وہ عمل (process) جاری کریں جو آخر کار جنت کی روحانی تہذیب (spiritual civilization) تک پہنچنے والا تھا۔

بنو اسماعیل کی وہ صفت کیا تھی جس کی بنا پر وہ اصحاب رسول کا درجہ پانے کے مستحق قرار پائے، اس کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ قدیم مکہ میں قبائل قریش کے جو لوگ تھے، وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، حق کے متلاشی تھے۔ روایات میں ایسے لوگوں کو حُنفاء کہا گیا ہے، یعنی متلاشی۔ اِنھیں حنفاء میں سے ایک زید بن عمر بن نُفیل تھے۔ اسماء بنت ابی بکر کہتی ہیں کہ میں نے زید بن عمر بن نفیل کو دیکھا ہے۔ وہ کعبہ کی دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے اور وہ یہ کہہ رہے تھے: **اللهم إنّي لو أعلم**

أحبَّ الوجوه إليك، عبدتك به، ولكني لا أعلم (السيرة النبوية لابن كثير، 1/154) یعنی اے اللہ، اگر میں جانتا کہ تیری عبادت کرنے کا سب سے اچھا طریقہ کیا ہے تو میں اُسی طرح تیری عبادت کرتا، مگر میں اس طریقے کو نہیں جانتا۔

یہ ایک شخصی واقعہ نہیں، یہ دراصل بنواسماعیل کی عمومی صفت کی ایک شخصی نمائندگی ہے۔ ساتویں صدی عیسوی کے بنواسماعیل قبل از اسلام کی مذہبی روایات میں آخری حد تک پہنچ چکے تھے، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے اُن کو چنا کہ وہ بعد از اسلام کے انقلابی مذہبی رول کو انجام دیں۔

آخرت کے دور میں جو مطلوب رول ادا کرنا ہے، اُس کو ایک لفظ میں، روحانی تہذیب (spiritual civilization) کو ظہور میں لانے کا رول کہا جاسکتا ہے۔ اِس رول کو انجام دینے کے لیے اعلیٰ سطح کے روحانی سائنس داں (spiritual scientists) درکار ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کا شعور موجودہ دنیا کے اعتبار سے، آخری دریافت کے مرحلے تک پہنچ گیا۔ یہ وہ اعلیٰ روحیں ہیں جو خدائی تخلیقات میں اس کے اندر چھپے ہوئے خدائی عجائب (divine wonders) کو دریافت کریں۔ اُن کی یہ دریافت اتنی گہری ہو کہ وہ محسوس کریں کہ اُس کے اظہار کے لیے اُن کے پاس الفاظ موجود نہیں ہیں۔ کائناتی عجائب کو دیکھنے کے بعد دوبارہ وہ کہہ سکیں کہ — خدایا، میں نہیں جانتا کہ میں تیرے تخلیقی عجائب کا بیان کس طرح کروں، اگر میں اس کو جانتا تو یقیناً میں اُنھیں مطلوب الفاظ میں اس کا اظہار کرتا:

O God, I don't know how to appreciate your wonders. If I had known it, I would certainly have appreciated it in those words.

موجودہ دنیا میں خدائی عجائب (divine wonders) کی اَن فولڈنگ (unfolding) عام انسانی الفاظ میں ہوئی تھی، آخرت کی دنیا میں خدائی عجائب کی ان فولڈنگ خدا کی طرف سے دئے ہوئے خصوصی الفاظ کے ذریعے ہوگی۔ دنیا میں یہ کام انسان کی مدد سے انجام پایا تھا، آخرت میں یہ کام فرشتوں کی مدد سے انجام پائے گا۔ اِس کے بعد عجائبِ خداوندی کے ظہور کا وہ واقعہ پیش آئے گا جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وأشرقت الأرض بنورِ ربها (39: 69)۔

خلاصہ

اسلام، تاریخ کا ایک عظیم ترین انقلاب تھا، لیکن اِس حقیقت کو نہ مسلم اہلِ علم نے سمجھا اور نہ غیر مسلم اہلِ علم نے۔ مسلمانوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کو صرف اپنے قومی فخر کے طور پر دریافت کیا۔ ڈاکٹر مائیکل ہارٹ صرف یہ دریافت کر سکے کہ رسول اللہ تاریخ کے سب سے زیادہ کامیاب انسان تھے:

Muhammad was the supremely successful man in history.

ساتویں صدی عیسوی میں پیش آنے والا اسلامی انقلاب دراصل مبنی بر توحید انقلاب تھا۔ اِس سے پہلے کی پوری تاریخ میں انسانی زندگی کا نظام شرک پر مبنی نظام ہوا کرتا تھا۔ اسلامی انقلاب نے پہلی بار مبنی بر شرک نظام کو توڑا اور اس کی جگہ تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا جس کو توحید پر مبنی دور کہا جا سکتا ہے۔ بعد کی صدیوں میں انسانی زندگی میں جو تعمیری واقعات ہوئے، وہ اِسی انقلاب کا براہِ راست یا بالواسطہ نتیجہ تھے، خواہ وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مذہبی ہوں یا سیکولر۔

یہ انقلاب اصلاً ایک نظری اور اعتقادی انقلاب تھا۔ اس کے اندر اعلیٰ معرفت کا سامان تھا، اس کے اندر ربانی غذائیں چھپی ہوئی تھیں، اس کے اندر وہ تمام اجزا موجود تھے جن کے ذریعے انسانی شخصیت کا مثبت ارتقا کیا جا سکے۔ مگر عملاً یہ ہوا کہ انسان اپنی مادّی خواہشوں کے پیچھے دوڑ پڑا۔ اس نے اِس انقلاب کے سیکولر پہلو کو لیا اور اس کے مذہبی اور روحانی پہلو کو چھوڑ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی تاریخ شرک کے دور سے نکل کر الحاد کے راستے پر چل پڑی۔

اب وقت آ گیا ہے کہ اِس غلطی کی تصحیح کی جائے۔ انسانی تاریخ کو دوبارہ الحاد کے راستے سے ہٹا کر توحید کے راستے پر لایا جائے، تاکہ انسان اُن نعمتوں کو پا سکے جو اُس کے لیے اِس دنیا میں مقدر کی گئی ہیں، یعنی خالق کی اعلیٰ معرفت، انسانی شخصیت کا ربانی ارتقاء، اعترافِ الٰہی کے اعلیٰ تجربات کو پانا، حقیقی معنوں میں ایک روحانی سائنس کو وجود میں لانا، اُس ربانی انسان کی تشکیل جو آخرت کی زندگی میں جنت میں داخلے کا مستحق قرار پائے، وغیرہ۔

تزکیہ نفس

تزکیۂ نفس

قرآن میں پیغمبر کے چار کام بتائے گئے ہیں، اُن میں سے ایک کام تزکیۂ نفس ہے (2:129)۔ اس سے تزکیہ کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ اہلِ ایمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ تزکیۂ نفس کو اپنی زندگی میں خصوصی حیثیت دیں۔ اِسی طرح داعی اور مصلح کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی جدوجہد میں تزکیہ کے عمل کو خصوصی اہمیت کے ساتھ شامل کرے۔

تزکیہ کے معنی تطہیر (purification) کے ہیں، یعنی پاک کرنا، نفس کی ترغیبات اور شیطان کے وساوس سے اپنے آپ کو بچانا، لوگوں کی طرف سے پیش آنے والے ناخوش گوار تجربات کے موقع پر اپنے آپ کو منفی ردِ عمل سے محفوظ رکھنا، اُن محرکات سے غیر متاثر رہ کر زندگی گزارنا جو آدمی کو صراطِ مستقیم سے ہٹانے والے ہیں، وغیرہ۔

اصل یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے صحیح فطرت پر پیدا کیا ہے، مگر دنیا کی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ مختلف خارجی اسباب کے تحت اِس صحیح فطرت پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ ایسے خارجی اثرات کو پہچانے اور اپنے آپ کو مسلسل طور پر اُس سے بچاتا رہے۔

پیغمبر کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اِس تزکیہ کے اصول سے باخبر کرے، وہ اِس اعتبار سے مسلسل طور پر لوگوں کی رہنمائی کرے۔ اِسی کے ساتھ وہ اِس پہلو سے لوگوں کے لیے ایک عملی نمونہ بن جائے۔

پیغمبر نے تزکیہ کے اِس کام کو اپنے معاصرین کے درمیان براہِ راست طور پر انجام دیا۔ بعد کی نسلوں کے لیے پیغمبر کا یہ کام بالواسطہ انداز میں جاری ہے۔ پیغمبر کے قول وعمل کا مکمل ریکارڈ حدیث اور سیرت کی کتابوں نیز آثارِ صحابہ میں موجود ہے۔ بعد کے لوگوں کا کام یہ ہے کہ وہ اِس تحریری ریکارڈ کو پڑھ کر اُس سے رہنمائی حاصل کریں۔ جو لوگ خود مطالعہ کر سکتے ہیں، وہ براہِ راست طور پر اس کا مطالعہ کریں اور جو لوگ خود مطالعہ نہیں کر سکتے، اُن کو مصلحینِ امت نصیحت اور تلقین کے ذریعے تزکیہ کے اِس کورس کو اپنی زندگی میں اختیار کرنے کی ترغیب دیتے رہیں۔

تزکیہ کی حقیقت

پیغمبر کے فرائض میں سے ایک فریضہ وہ ہے جس کے لیے قرآن میں تزکیہ (2:129) کا لفظ آیا ہے۔ ہر مومن کی یہ لازمی ضرورت ہے کہ وہ اپنا تزکیہ کرے۔ تزکیہ کے بغیر وہ اعلیٰ شخصیت نہیں بنتی جس کو قرآن میں ربانی شخصیت (3:79) کہا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تزکیہ ہی کسی انسان کے لیے جنت میں داخلے کا ذریعہ بنے گا (20:76)۔

تزکیہ کا لفظی مطلب نمو یا افزائش (growth) ہے۔ اِس نمو کی ایک مادّی مثال درخت ہے۔ درخت ایک بیج کی نمو پذیری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک بیج موافق ماحول پا کر بڑھنا شروع ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ ایک ہرا بھرا درخت بن جاتا ہے۔ یہی معاملہ انسانی تزکیہ کا بھی ہے۔ اِس اعتبار سے، تزکیہ کو روحانی ارتقا یا ذہنی ارتقا (intellectual development) بھی کہا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سے امکانات (potentials) کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ انسانی شخصیت کے اِن امکانات کو واقعہ (actual) بنانے کا نام تزکیہ ہے۔ اِس اعتبار سے، یہ کہنا درست ہوگا کہ تزکیہ کا مطلب ہے — ربانی بنیادوں پر انسانی شخصیت کی تعمیر۔

آدمی جب ایمان لاتا ہے تو وہ دراصل تزکیہ کے سفر کا آغاز کرتا ہے، یہاں تک کہ دھیرے دھیرے وہ ایک مُزکّیٰ انسان، یا ذہنی اور روحانی اعتبار سے ایک ارتقا یافتہ شخصیت (developed personality) بن جاتا ہے۔ یہی وہ انسان ہے جس کو آخرت کی ابدی جنت (eternal paradise) میں داخلہ ملے گا۔

تزکیہ کسی پُراسرار چیز کا نام نہیں۔ تزکیہ کا ذریعہ مراقبہ (meditation) نہیں ہے، بلکہ تزکیہ کا ذریعہ غور وفکر (contemplation) ہے۔ اپنی ذات اور کائنات کے بارے میں غور وفکر کرنا اور اُن سے معرفت کا ذہنی یا فکری رزق حاصل کرنا، یہی وہ عمل (process) ہے جس سے آدمی کے اندر مزکّٰی شخصیت بنتی ہے۔ تزکیہ ایک معلوم حقیقت ہے، نہ کہ کوئی مجہول حقیقت۔ یہ تزکیہ انسان کی اپنی کوشش سے حاصل ہوتا ہے، کسی مفروضہ بزرگ کے پُراسرار فیض سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

تزکیہ کی اہمیت

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں: **إذا دخل أهل الجنة الجنةَ، وأهل النار النارَ، يُجاء بالموت يوم القيامة كأنه كبش أملح، فيوقف بين الجنة والنار، فيقال: يا أهل الجنة، هل تعرفون هٰذا، فيشرئبون وينظرون ويقولون نعم، هٰذا الموت۔ قال: ثم يُقال: يا أهل النار، هل تعرفون هذا، فيشرئبون وينظرون ويقولون نعم، هذا الموت۔ قال : فيؤمر به فيُذبح، ثم يقال: يا أهلَ الجنة، خلود فلا موتَ، ويا أهل النار خلود فلا موت** (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2849)

یعنی قیامت میں جب جنت والے جنت میں داخل ہوجائیں گے اور جہنم والے جہنم میں داخل ہوجائیں گے تو وہاں موت کو لایا جائے گا۔ وہ ایک سفید مینڈھے کی صورت میں ہوگی۔ اس کو جنت اور جہنم کے درمیان کھڑا کیا جائے گا۔ پھر کہا جائے گا کہ اے جنت والو، کیا تم لوگ اس کو پہچانتے ہو، پھر وہ اس کو گردن اٹھا کر دیکھیں گے اور کہیں گے کہ ہاں، یہ موت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اِس کے بعد جہنم والوں سے کہا جائے گا کہ اے جہنم والو، کیا تم لوگ اِس کو پہچانتے ہو، پھر وہ سر اٹھا کر اس کو دیکھیں گے اور کہیں گے کہ ہاں، یہ موت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے بعد حکم دیا جائے گا اور موت کو ذبح کردیا جائے گا۔ پھر کہا جائے گا کہ اے جنت والو، اب تمھارے لیے ہمیشگی ہے، اب تمھارے لیے موت نہیں۔ اور اے جہنم والو، اب تمھارے لیے ہمیشگی ہے، اب تمھارے لیے موت نہیں۔

تزکیہ کیا ہے، تزکیہ کا مطلب ہے اپنے آپ کو وہ مزکّیٰ شخصیت (purified personality) بنانا جو جنت کے اعلیٰ ماحول میں بسائے جانے کے قابل ہو۔ قیامت میں یہ واقعہ پیش آئے گا کہ جب مزکّیٰ افراد جنت میں اور غیر مزکّیٰ افراد جہنم میں داخل کردئے جائیں گے تو اس کے بعد یہ اعلان کیا جائے گا کہ اب موت کا قانون ختم کردیا گیا ہے، اب دونوں گروہوں کو ابدی طور پر اپنی اپنی دنیا میں رہنا ہے۔ یہ بڑا عجیب لمحہ ہوگا۔ جنت والے مسرور ہوں گے کہ انھیں ابدی طور پر خوشیوں کی دنیا حاصل ہوگئی۔ دوسری طرف، جہنم والے ناقابلِ بیان حسرت میں مبتلا ہوجائیں گے۔ یہ سوچ ان کے لیے

ایک دائمی عذاب بن جائے گی کہ اپنا تزکیہ نہ کرنے کی وجہ سے وہ کتنی بڑی محرومی میں مبتلا ہو گئے۔ یہ احساس تزکیہ کے عمل کے لیے بلا شبہہ ایک طاقت ور محرک ہے۔ اُس وقت یہ آخری امید بھی ان کا ساتھ چھوڑ دے گی کہ شاید کبھی ہماری موت آجائے اور وہ ہمیں جہنم کے عذاب سے نجات دے دے۔ یہ اہلِ جنت کے لیے ابدی فرحت کا لمحہ ہوگا، اور اہلِ جہنم کے لیے ابدی حسرت کا لمحہ۔

جنت مزکّیٰ شخصیت کے لیے

قرآن کی سورہ طٰہ میں جنت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ: **ذلك جزاء من تزكىٰ** (20:76) یعنی جنت اُس شخص کے لیے ہے جو اپنا تزکیہ کرے:

Paradise is for one who purifies himself.

قرآن کی اِس آیت کے مطابق، جنت صرف اُس شخص کے لیے ہے جو موجودہ دنیا میں اپنا تزکیہ کرے اور ایک مزکّیٰ شخصیت کے ساتھ آخرت کی دنیا میں پہنچے۔ یہ حقیقت قرآن کی مختلف آیتوں میں واضح طور پر بیان کی گئی ہے۔ جنت میں داخلے کا فیصلہ انفرادی صفت کی بنیاد پر کیا جائے گا، نہ کہ گروہی تعلق کی بنیاد پر۔

جنت اُس شخص کے لیے ہے جو اپنے آپ کو پاک کرے۔ پاک کرنا یہ ہے کہ آدمی غفلت کی زندگی کو ترک کرے اور شعور کی زندگی کو اپنائے، وہ اپنے آپ کو اُن چیزوں سے بچائے جو حق سے روکنے والی ہیں، مصلحت کی رکاوٹ سامنے آئے تو وہ اُس کو نظر انداز کر دے، نفس کی خواہش ابھرے تو وہ اس کو کچل دے، ظلم اور گھمنڈ کی نفسیات جاگے تو وہ اُس کو اپنے اندر ہی اندر دفن کر دے، وغیرہ۔

تزکیہ کا مطلب ہے — کسی چیز کو غیر موافق عناصر سے پاک کر دینا، تاکہ وہ موافق فضا میں اپنے فطری کمال کو پہنچ سکے۔ پیغمبر کا ایک اہم کام تزکیہ ہے۔

پیغمبر کی آخری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایسے انسان تیار ہوں جن کے سینے اللہ کی محبت کے سوا ہر محبت سے خالی ہوں، ایسی روحیں وجود میں آئیں جو نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہوں، ایسے افراد پیدا ہوں جو کائنات سے وہ ربانی رزق پا سکیں جو اللہ نے اپنے مومن بندوں کے لیے رکھ دیا ہے۔

جنت کا معاملہ تزکیہ سے جڑا ہوا ہے۔ تزکیہ ہی جنت میں داخلہ کی واحد شرط ہے۔ تزکیہ کے بغیر ہرگز کسی شخص کو جنت میں داخلہ ملنے والا نہیں۔

حدیث تزکیہ کا ذریعہ

ایک عالم نے کہا ہے: **مَن کان فی بیته مجموعة من الأحادیث، فکأنما فیه نبیٌ یتکلم** (جس آدمی کے گھر میں حدیثِ رسول کا ایک مجموعہ ہو، گویا کہ اس کے گھر میں خود پیغمبر کلام کرتا ہوا موجود ہے)۔ مذکورہ عالم نے جو بات کہی، وہ صرف کلامِ رسول کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ توسیعی اعتبار سے وہ گویا صحبتِ رسول کے معنی میں بھی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اقوال حدیث کی کتابوں میں آئے ہیں، وہ مجرد اقوال نہیں ہیں، بلکہ ہر قول کا ایک پس منظر (background) ہے، یعنی رسول اللہ کسی مقام پر تھے، وہاں ایک صورتِ حال پیدا ہوئی، اس صورتِ حال کے تقاضے کے طور پر آپ نے لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے کلام کیا۔ اِس طرح آپ کا ہر قول کسی نہ کسی پس منظر سے جڑا ہوا ہے۔ آپ کا ہر قول کسی نہ کسی صورتِ حال کو بتاتا ہے۔

اگر آدمی اپنے شعورِ حدیث کو اتنا زیادہ بیدار کرے کہ وہ حدیث کے ساتھ اس کے بیک گراؤنڈ کو اپنے تصور میں لا سکے، تو یہ واقعہ اس کے لیے گویا صحبتِ رسول میں پہنچنے کے ہم معنیٰ بن جائے گا۔ وہ محسوس کرے گا کہ میں نہ صرف کلامِ رسول کو کتاب میں پڑھ رہا ہوں، بلکہ کلام کے بین السطور (between the lines) میں اس کے بیک گراؤنڈ کو بھی اپنے ذہن میں تازہ کر رہا ہوں۔ یہ احساس اگر آدمی کے اندر شدت کے ساتھ ابھر آئے تو مطالعۂ حدیث اس کے لیے صحبتِ رسول میں بیٹھنے کے مانند ہو جائے گا۔ اِس طرح حدیث کے بارے میں اس کا تاثر ہزار گنا زیادہ بڑھ جائے گا۔

اِس پہلو سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ حدیث کو پڑھنے والا صرف حدیث کو پڑھنے والا نہیں ہے، بلکہ وہ گویا صحابہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بیٹھنے والا ہے۔ حدیث

کے مطالعے کا یہ ایک تخلیقی (creative) اسلوب ہے، اور تخلیقی اسلوب میں حدیثِ رسول کا مطالعہ بلاشبہہ تزکیہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

تزکیہ ایک مسلسل عمل

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ حضرت عائشہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہتی ہیں: **كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يذكر الله على كلّ أحيانه** (**صحيح مسلم ، رقم الحديث**: 852) یعنی رسول اللہ ﷺ ہر موقع (occasion) پر اللہ کو یاد کرتے تھے۔ اِس روایت سے تزکیہ کا مسنون طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ معمولی لفظی فرق کے ساتھ، اِس روایت کا مطلب یہ ہے: **كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يزكّي نفسَه على كلّ أحيانه** (رسول اللہ ہر موقع پر اپنا تزکیہ کرتے تھے)۔ اِس سے معلوم ہوا کہ تزکیہ کسی وقتی تربیتی کورس کا نام نہیں، تزکیہ ایک مسلسل عمل کا نام ہے۔ جب ایک مومن سچائی کو دریافت کرتا ہے، تو شعوری بیداری کی بنا پر اُس کا حال یہ ہوجاتا ہے کہ ہر واقعہ اور تجربہ اس کے لیے تزکیہ کا پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) بن جاتا ہے۔ اِس طرح وہ ہر لمحہ اور ہر صبح وشام تزکیہ کی خوراک حاصل کرتا رہتا ہے۔

تزکیہ کا یہ عمل تا دمِ مرگ جاری رہتا ہے۔ جس طرح جسمانی توانائی مسلسل تغذیہ کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، اسی طرح تزکیہ ایک مسلسل عمل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وقتی نوعیت کا تربیتی کورس (training course) تزکیہ کا ذریعہ ہے، یعنی جس طرح مدرسے میں ایک متعین اور محدود کورس کے ذریعے دینی تعلیم حاصل کی جاتی ہے، اُسی طرح تزکیہ بھی ایک محدود مدت میں ایک متعین کورس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تزکیہ کی تصغیر (underestimation) ہے۔

تزکیہ ایک مسلسل ذہنی عمل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، نہ کہ کسی قسم کے وقتی کورس کے ذریعے۔ تزکیہ کے لیے ایک بیدار ذہن (awakened mind) درکار ہے۔ تزکیہ ایک اضافہ پذیر عمل ہے، وہ کسی جامد قسم کی مشق (excercise) کا نتیجہ نہیں۔

ڈی کنڈیشننگ کا عمل

تزکیہ ایک مسلسل عمل ہے۔ وہ ہر صبح وشام جاری رہتا ہے۔ اِس معاملے کو حدیث میں ایک مثال کے ذریعے اِس طرح بتایا گیا ہے: إنّ هٰذه القلوبَ تصدأ كما يصدأ الحديد إذا أصابه الماء. قيل: يا رسول الله، وما جِلاؤها. قال: كثرة ذكر الموت، وتلاوةُ القرآن (شعب الايمان، رقم الحديث : 1859) یعنی دلوں میں زنگ لگتا ہے، جیسے کہ لوہے میں زنگ لگتا ہے جب کہ اس پر پانی پڑ جائے۔ پوچھا گیا کہ اے خدا کے رسول، اس کو صاف کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ موت کو بہت زیادہ یاد کرنا اور قرآن کا مطالعہ کرنا۔

اِس حدیثِ رسول میں تمثیل کے ذریعے ایک نفسیاتی حقیقت کو بتایا گیا ہے، وہ یہ کہ سماج کے اندر رہتے ہوئے انسان بار بار ایسے حالات سے گزرتا ہے جو اُس کے اندر منفی جذبات پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً غصہ، نفرت، تشدد، انتقام، وغیرہ۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اِن جذبات کو فوراً ختم کرے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو یہ منفی جذبات انسانی ذہن کا مستقل حصہ بن جائیں گے، یہاں تک کہ اُن کو دور کرنا عملاً ناممکن ہو جائے گا۔

انسانی دماغ کے دو بڑے حصے ہیں — شعور (conscious mind)، اور لاشعور (unconscious mind)۔ فطری نظام کے تحت، کوئی منفی احساس پہلے ذہن کے شعوری حصے میں داخل ہوتا ہے۔ اگر اس کو فوراً ذہن سے نکالا نہ جائے تو وہ دھیرے دھیرے ذہن کے لاشعوری حصہ میں پہنچ جاتا ہے، جہاں سے اس کو نکالنا سخت مشکل ہو جاتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ ہر لمحہ اپنا نگراں بنا رہے، وہ ہر لمحہ اپنے منفی احساس کو پراسس (process) کرکے مثبت احساس میں تبدیل کرتا رہے، یعنی وہ اپنے کنڈیشنڈ مائنڈ کی ڈی کنڈیشننگ (de-conditioning) کرے، وہ اپنے ذہن کی تطہیر کرکے اس کی آلودگی کو ختم کرتا رہے۔ اِس تطہیر یا ڈی کنڈیشننگ کا ذریعہ ہے — اپنی موت کو بار بار یاد کرنا اور قرآن کی روشنی میں زندگی کے انجام پر غور وفکر کرتے رہنا۔

تزکیہ: روحانی خوراک

جسم کی ایک خوراک ہے۔ یہ خوراک جسم کو پہنچائی جائے تو جسم صحت مند ہو جائے گا۔

اِسی طرح روح کی ایک خوراک ہے۔ یہ خوراک جب روح کو پہنچائی جاتی ہے تو روح صحت مند ہوجاتی ہے۔ اِسی عمل کا نام تزکیۂ نفس ہے اور اِسی صحت مند روح کو مصفّٰی اور مزکّٰی روح کہا جاتا ہے۔

قرآن کے مطابق، روح کی یہ خوراک تفکیر (3: 191) ہے۔ آدمی کے اردگرد ہر وقت کچھ واقعات پیش آرہے ہیں۔ سماجی، تاریخی، کائناتی، ہر سطح پر اور ہر آن ان واقعات کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ اِن واقعات کو لے کر سوچنا اور اُن سے عبرت اور نصیحت لینا، یہی روح کی خوراک ہے۔

جو شخص اپنے شعور کو اتنا ترقی دے کہ اُس کو گردوپیش کے واقعات میں خدائی کرشمے دکھائی دیں، جو اُس کے لیے خدا کو یاد دلانے کا ذریعہ بن جائیں تو ایسے شخص نے گویا اپنی روح کے لیے رزقِ ربانی کا ایک دسترخوان حاصل کرلیا۔ اس کی روح اِس دسترخوان سے اپنی صحت مندی کی خوراک حاصل کرتی رہے گی، یہاں تک کہ وہ اپنے رب سے جاملے۔

تزکیہ کا اہم ترین ذریعہ یہ ہے کہ اپنے اندر عبرت پذیری کے مزاج کو جگایا جائے۔ عبرت پذیری گویا تزکیہ کی زمین ہے۔ یہی وہ زمین ہے جس پر تزکیہ کی فصل اگتی ہے۔ کسی اور جگہ اس کو اگانا ایسا ہی ہے جیسے پتھر کی چٹان پر ایک ہرا بھرا درخت اگانے کی کوشش کرنا۔

تزکیہ کا ذریعہ رزقِ رب ہے، نہ کہ رزقِ شیخ۔ تزکیہ اُس عمل کا نتیجہ ہے جو بندہ اور خدا کے درمیان نفسیاتی تعلق کے ذریعے براہِ راست قائم ہوتا ہے، تزکیہ کسی واسطے کے ذریعے نہیں ملتا۔ تزکیہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، ایک خدائی عطیہ ہے، نہ کہ ایک انسانی عطیہ۔

تزکیہ وہ نعمت ہے جو کسی انسان کو براہِ راست خدا سے ملتی ہے۔ کسی انسان کے واسطے سے جو تزکیہ ملے، وہ کچھ اور ہوسکتا ہے، لیکن وہ تزکیہ نہیں ہوسکتا۔

عبادت میں اجتہاد نہیں

ایک عالم ایک مشہور صوفی بزرگ کی خانقاہ میں گئے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ لوگ ذکر بالجہر اور دوسرے متصوفانہ اعمال میں مشغول ہیں۔ مذکورہ عالم نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے: **مَن أحدث فی أمرنا هذا مالیس منه فهو رد (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 2697)** یعنی جو شخص

ہمارے دین میں کوئی نئی بات نکالے، جو اس میں نہ ہو، تو وہ قابلِ رد ہے۔ عالم نے کہا کہ یہ متصوفانہ اعمال جو آپ کے یہاں رائج ہیں، وہ رسول اور اصحابِ رسول کے زمانے میں نہیں تھے، اِس لیے وہ اِحداث (innovation) کا درجہ رکھتے ہیں۔ مذکورہ بزرگ نے جواب دیا کہ حدیث میں ”إحداث فی الأمر“ (دین میں بدعت) کی ممانعت ہے، اُس میں ”إحداث للأمر“ (دین کے لیے بدعت) کی ممانعت نہیں ہے اور تصوف کے یہ طریقے احداث للامر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مذکورہ حدیثِ رسول کی یہ توجیہہ غیر علمی توجیہہ ہے، وہ حدیث کے الفاظ سے ہرگز نہیں نکلتی۔ حدیث میں یہ لفظ آیا ہے کہ: ما لیس منہ (جو اُس میں نہ ہو)، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دین چھوڑا ہے، اُس دین میں وہ موجود نہ ہو۔ ایسی حالت میں اصل مسئلہ فی یا لام کے صلہ (preposition) کا نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو دین ہم کو ملا ہے، اس میں بعد کا یہ اضافہ موجود تھا یا موجود نہیں تھا۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ذکر بالجہر جیسی چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چھوڑے ہوئے دین میں موجود نہیں، اور جب وہ رسول اللہ کے چھوڑے ہوئے دین میں موجود نہیں ہیں، تو فی اور لام جیسے نکتوں کے ذریعے اس کو دینِ محمدی میں شامل کرنا، صرف ایک مبتدعانہ جسارت ہے۔ اِس قسم کا نکتہ ایسے اضافوں کے لیے کوئی قابلِ قبول وجہِ جواز نہیں۔

علماء کا اتفاقی مسلک ہے کہ — عبادات میں قیاس نہیں: **لا قیاسَ في العبادات** (**علم أصول الفقه لعبد الوهاب خلاف**، صفحہ 62)، یعنی تعبّدی امور میں صرف تقلید ہے، اس میں کوئی اجتہاد نہیں۔ تعبدی امور میں کوئی استدلال صرف صریح نص پر قائم ہوسکتا ہے، اُس کو لفظی نکتوں کی بنیاد پر قائم نہیں کیا جاسکتا۔ تعبدی امور میں لفظی نکتوں کی بنیاد پر اجتہاد کرنا عقلی اعتبار سے غیر علمی ہے اور دینی اعتبار سے ناقابلِ قبول جسارت۔

تزکیہ ہر وقت

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ تزکیہ کا ایک وقتی کورس ہے، یا کچھ اذکار و اَوراد ہیں جن کو متعین اوقات میں پڑھ لیا جائے، مگر یہ تزکیہ کا رسمی یا غیر فطری طریقہ ہے اور کوئی بھی چیز اِس طرح کے وقتی

طریقوں کے ذریعے حاصل نہیں ہوتی۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح آدمی ہر وقت سانس لیتا ہے، سانس لینے کا کوئی وقتی طریقہ نہیں، اسی طرح تزکیہ بھی ایک مسلسل عمل ہے۔ حقیقی تزکیہ صرف وہی ہے جو ہر وقت جاری رہے۔ مثال کے طور پر ایک فارسی شاعر کا شعر ہے کہ — مجھ غریب کی قبر پر نہ کوئی چراغ ہے اور نہ کوئی پھول، اِس لیے میری قبر پر نہ پروانہ رقص کرتا اور نہ کسی بلبل کے چہکنے کی آواز آتی:

برمزارِ ما غریباں، نے چراغے، نے گُلے — نے پرِ پروانہ رقصد، نے صدائے بلبلے

یہ شعر آپ کو یاد آیا تو آپ سوچنے لگے کہ شاعر کتنی زیادہ بڑی بھول میں مبتلا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر کوئی چراغ اور کوئی پھول نہیں، اس لیے وہاں نہ کوئی پروانہ آتا اور نہ کوئی بلبل۔ حالاں کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد آدمی ایک اور دنیا میں پہنچ گیا، جہاں کے تقاضے موجودہ دنیا سے مختلف ہیں، جہاں کامیابی کے لیے اُس سے مختلف ایک اور اہلیت (ability) درکار ہے جو موجودہ دنیا میں اس کے کام آرہی تھی۔ مزید یہ کہ اگلی دنیا میں دوبارہ تیاری کا موقع نہیں۔ اگلی دنیا میں صرف آج کے عمل کا انجام پانا ہے، نہ کہ دوبارہ کوئی عمل کرنا۔

اِس سوچ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو شعر صرف مشاعرے کا ایک آئٹم تھا، وہ آدمی کی زندگی کے لیے ایک بھونچال بن جائے گا۔ وہ اِس تیاری میں لگ جائے گا کہ وہ اپنے اندر ایک ایسی شخصیت کی تعمیر کرے جو موت کے بعد آنے والے مرحلۂ حیات میں اس کے کام آئے، جو آخرت کی دنیا میں اس کو کامیابی دلانے والی ہو۔ یہ سوچ کر وہ خود اپنے آپ پر گزرنے والے احوال کے بارے میں سوچنے لگے گا، نہ کہ قبر پر گزرنے والے احوال کے بارے میں۔

غلطی کے بعد محاسبہ

تزکیہ کا ایک بہت بڑا ذریعہ محاسبہ (introspection) ہے۔ محاسبہ کے ذریعے آدمی کا ذہن بیدار ہوتا ہے، اس کی شخصیت میں ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ اس کے اندر اپنی اصلاح کا داعیہ (incentive) جاگتا ہے۔ اِس طرح محاسبہ آدمی کو ذہنی اور روحانی ترقی کی طرف لے جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک شخص نے آپ کے بارے میں کوئی ایسی بات کہہ دی جو آپ کو ناگوار ہوئی۔ آپ کے جذبات بھڑک اٹھے، آپ نے منفی ردِ عمل کے انداز میں اس کا جواب دیا۔ بعد کو آپ کے اندر ندامت (repentance) پیدا ہوئی۔ آپ نے اپنی روش پر نظر ثانی کی۔ آپ نے سوچا کہ اِس طرح میں اپنے اندر ایک منفی شخصیت بنا رہا ہوں۔ ایسی منفی شخصیت موت کے بعد کی زندگی میں میرے لیے سخت تباہ کن ثابت ہوگی، ایسی منفی شخصیت مجھ کو جنت میں داخلے کے لیے نااہل بنا دے گی۔

آپ نے سوچا کہ قرآن کے مطابق، جنت والوں کا کلچر امن کلچر ہوگا۔ وہاں ایسے لوگ آباد کئے جائیں گے جو باہمی زندگی میں امن اور محبت کے ساتھ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ایسی حالت میں اگر میں نے اپنے اندر ایسی شخصیت بنائی جس کے اندر ٹالرنس (tolerance) نہ ہو، جو مشتعل ہوجانے والی ہو، جس کے اندر دوستانہ روش (friendly-behaviour) کی صلاحیت نہ پائی جاتی ہو، ایسا شخص جنت میں داخلے کے لیے نااہل قرار پائے گا، وہ ابدی طور پر مسرت اور کامیابی سے محروم رہے گا۔ یہ سوچ آپ کے لیے ایک تعمیری دھماکہ ثابت ہوگی۔ آپ خود اپنے نگراں بن جائیں گے۔ آپ کے اندر اپنی اصلاح کا شدید جذبہ پیدا ہو جائے گا۔

خود احتسابی کا یہی مزاج تزکیہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ تزکیہ ہمیشہ داخلی سوچ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، نہ کہ خارجی نوعیت کی کسی کارروائی کے ذریعے۔ تزکیہ وہ عمل ہے جس میں آدمی خود اپنا مُزکّی ہوتا ہے، وہ خود ہی طالب علم ہوتا ہے اور خود ہی اپنا استاد بھی۔

مبنی بر قلب، مبنی بر دماغ

قرآن کی سورہ آل عمران کے آخری رکوع کو پڑھیے۔ اِس رکوع میں اولوا الالباب (اہل عقل) کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے زمین و آسمان (کائنات) پر غور کرو۔ اس میں تم اللہ کی نشانیاں دیکھو گے۔ اس کے ذریعہ تم اپنے رب کو پہچانو گے۔ اس کے ذریعہ تم کو خدا کے تخلیقی منصوبہ کا علم حاصل ہوگا۔ اس کے ذریعہ تم جنت اور جہنم کو دریافت کرو گے۔ اس کے ذریعہ تم کو پیغمبر کی اہمیت معلوم ہوگی۔ غرض وہ تمام چیزیں جس کا تعلق براہِ راست یا بالواسطہ طور پر تزکیہ سے

ہے، اُن سب کو اس رکوع میں کائناتی تفکر سے وابستہ کیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ قرآن کا تزکیہ مبنی برعقل تزکیہ ہے، نہ کہ مبنی بر قلب تزکیہ۔ اِس سلسلے میں ''قلب'' کا لفظ قرآن اور حدیث میں لٹریری معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، نہ کہ سائنسی معنوں میں۔

بعد کے زمانے میں، صوفیا کے اثر سے مسلمانوں میں مبنی بر قلب تزکیہ کا تصور رائج ہو گیا۔ اس تصور کے تحت یہ سمجھ لیا گیا کہ انسان کا قلب تمام ربانی حقیقتوں کا خزانہ ہے۔ مراقبہ (meditation) کے ذریعہ اس خزانہ تک پہنچو، اور پھر تم کو وہ چیز حاصل ہو جائے گی جس کو اسلام میں تزکیہ کہا گیا ہے۔ مگر مبنی بر قلب (heart-based) تزکیہ کا یہ تصور قرآن سے ماخوذ نہ تھا، بلکہ اس کا ماخذ تاریخ تھا۔ قدیم زمانے سے چوں کہ مبنی بر قلب روحانیت (heart-based spirituality) کا تصور لوگوں کے درمیان چلا آرہا تھا، اس کے زیر اثر مضاہات (9:30) کے طور پر لوگوں نے اس کو اسلام میں داخل کر دیا۔

جدید سائنس نے وہ علمی بنیاد فراہم کر دی ہے جس کے تحت اسلامی تزکیہ کو دوبارہ مبنی بر دماغ تزکیہ کے طور پر زندہ کیا جائے۔ جدید تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ انسان کا قلب خون کی گردش (circulation of blood) کے لیے صرف ایک پمپ (pump) کا کام کرتا ہے، قلب کے اندر سوچنے کی صلاحیت موجود نہیں۔ سوچنے کی صلاحیت تمام تر صرف دماغ میں ہے۔ انسان کی زندگی کے تمام افعال سوچنے کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں۔ تزکیہ کا معاملہ کوئی مستثنیٰ معاملہ نہیں۔ تزکیہ کا مقصد بھی دماغ کی سطح پر سوچنے کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، نہ کہ قلب پر مفروضہ توجہ دینے سے۔ قلب پر توجہ دینا، اتنا ہی زیادہ بے بنیاد ہے، جتنا کہ حصولِ تزکیہ کے لیے ناخن یا بال پر توجہ دینا۔

رہنما کی ضرورت

تزکیہ کا ذریعہ اصولاً یہ ہے کہ آدمی قرآن میں غور کرے، وہ حدیث کا مطالعہ کرے، وہ اصحابِ رسول کی زندگیوں سے رہنمائی حاصل کرے۔ یہ تزکیہ کا اصولی ماخذ ہے۔ اس کی یہ حیثیت ابدی طور پر باقی رہے گی۔ اس کے علاوہ، تزکیہ کے حصول کی ایک عملی شرط بھی ہے، اور وہ ہے اپنے زمانے کے کسی رہنما یا مرشد کو تلاش کرنا اور اس کے علم اور اس کے تجربے سے فائدہ اٹھانا۔ آدمی کو جب

کوئی مرشد مل جائے تو اس کو چاہیے کہ وہ بلا شرط اس کو اپنا مرشد بنا لے۔ مرشد کو مشروط طور پر ماننا تزکیہ کے راستے میں ایک رکاوٹ ہے، نہ کہ مددگار۔ جب ایک شخص یہ کہے کہ میں نے فلاں انسان کو اپنا غیر مشروط رہنما مان لیا، تو اِس کا مطلب اندھا مقلد بننا نہیں ہوتا، اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ شعوری ارتقا کے نتیجے میں دو انسانوں کا ویولینتھ (wavelength) ایک ہو گیا۔ یہ ذہنی ہم آہنگی کا واقعہ ہے، نہ کہ ذہنی تقلید کا واقعہ۔ اصل یہ ہے کہ حقیقتِ نفس الامری میں تعدّد نہیں ہوتا، اِس لیے جب دو انسان اصل حقیقت تک پہنچ جائیں تو فطری طور پر ان کے درمیان ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے فکری توَام (intellectual twin) بن جاتے ہیں۔

تزکیہ کے لیے رہنما یا مرشد لازمی طور پر ضروری ہے، لیکن مرشد کی اہمیت عملی ہے، نہ کہ اعتقادی۔ مرشد کی اہمیت دراصل ایک عمومی سنت اللہ کے تحت ہے۔ اِس سنت اللہ کو سورہ الزخرف کی ایک آیت میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے: **ورفعنا بعضَهم فوق بعض درجات، ليتخذ بعضُهم بعضاً سُخريًّا** (43:32) یعنی ہم نے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہے، تا کہ وہ ایک دوسرے سے کام لیں۔

اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی یہ سنت نہیں ہے کہ وہ ہر شخص کو قائدانہ صفات کے ساتھ پیدا کرے۔ خدا کی سنت یہ ہے کہ وہ ایک شخص کو قائد بناتا ہے اور دوسروں سے یہ مطلوب ہوتا ہے کہ وہ اس کی پیروی کریں۔ خدا کی سنت کے مطابق، یہی زندگی کا فطری نظام ہے۔

مرشد کا معاملہ بھی اِسی سنت اللہ کے مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ خصوصی اہتمام کے ذریعے کسی کو مرشد کے مقام پر کھڑا کرتا ہے۔ دوسروں کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو پہچانیں اور اُس سے استفادہ کرتے ہوئے تزکیہ کا مقصد حاصل کریں۔ جو لوگ ایسا نہ کریں، وہ گویا کہ فطرت کی ایک آزمائش میں ناکام ہو گئے۔

مرشد کا معاملہ کوئی پراسرار معاملہ نہیں۔ یہ ایک معلوم عقلی معاملہ ہے۔ غور و فکر کے ذریعے اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔ مرشد سے جو چیز ملتی ہے، وہ پراسرار ''فیض'' نہیں ہے، وہ وہی چیز ہے جس کو عام طور پر تربیتی استفادہ کہا جاتا ہے۔ مرشد ایک زندہ رہنما ہوتا ہے، نہ کہ پراسرار طور پر کوئی مقدس شخصیت۔

تزکیہ کے لیے ربط کی اہمیت

تزکیہ لیے صحبت (companionship) ایک مددگار ذریعہ ہے۔ قدیم زمانے میں صحبت کا ذریعہ صرف ایک تھا، اور وہ ہے براہِ راست ملاقات۔ موجودہ زمانہ مواصلات (communication) کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانے میں یہ ممکن ہوگیا ہے کہ کوئی شخص دور رہتے ہوئے بھی اپنے مزکی یا مربی سے صحبت کا فائدہ حاصل کرسکے۔ اِس ربط کا ذریعہ خط و کتاب اور انٹرنیٹ اور ٹیلی فون، وغیرہ ہیں۔ اِسی کا ایک ذریعہ ٹیلی کاؤنسلنگ (tele-counselling) بھی ہے۔ اگر کوئی شخص حقیقی معنوں میں تزکیہ کا طالب ہو تو یہ چیزیں اس کے لیے صحبت کا بدل بن جائیں گی۔

اِنھیں جدید ذرائع میں سے ایک پرنٹنگ پریس ہے۔ پرنٹنگ پریس نے اِس کو ممکن بنادیا ہے کہ ماہانہ یا غیر ماہانہ میگزین کے ذریعے مسلسل طور پر تزکیہ کا مواد حاصل کیا جاتا رہے۔ موضوع سے متعلق مطبوعہ کتابوں کا مطالعہ بار بار کیا جائے۔ اِس طریقے کی اہمیت خود قرآن سے معلوم ہوتی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: **علّم بالقلم** (96:4) یعنی قلم کے ذریعہ لکھی ہوئی کتابوں سے دین کو اخذ کرنا۔

مطالعہ کی اہمیت ایک پہلو سے، صحبت سے بھی زیادہ ہے۔ صحبت میں آدمی کسی بات کو اپنے مرشد سے ایک بار سنتا ہے، لیکن کتاب کی صورت میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ بار بار اس کا مطالعہ کرے، وہ بار بار اس کو سامنے رکھتے ہوئے اُس پر غور وفکر کرے، وہ اس کو لے کر دوسروں سے اُس پر مذاکرہ (exchange) کرے۔ یہ ایک ایسا فائدہ ہے جو صرف کتابوں کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

تزکیہ کے لیے رابطہ انتہائی حد تک ضروری ہے، یعنی مرشد سے مسلسل طور پر استفادہ کرتے رہنا، اپنے مسائل مرشد کو بتا کر اُس سے رہنمائی حاصل کرنا۔ یہ ربط براہِ راست صحبت کے ذریعے بھی ہوسکتا ہے اور مواصلات کے ذریعے بھی۔ یہ ربط مسلسل طور پر مطلوب ہے۔ وقتی ربط سے تزکیہ کا فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

واسطہ کے بغیر

شعوری یا غیر شعوری طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ تزکیہ کے لیے ایک پُراسرار واسطہ یا وسیلہ درکار

ہے — اسلاف کا واسطہ، اکابر کا واسطہ، شیخ کا واسطہ، بزرگوں کا واسطہ، اہل اللہ کا واسطہ، وغیرہ۔ واسطے کے اِس پراسرار تصور میں شیخ بذاتِ خود مطلوب بن جاتا ہے، جب کہ رہنما کے تصور میں اصل مقصود خدا ہوتا ہے اور رہنما کی حیثیت صرف ذریعہ کی۔ واسطہ کا یہ تصور یقینی طور پر بے بنیاد ہے۔ تزکیہ بلا واسطہ اللہ سے تعلق کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، کوئی واسطہ اِس معاملے میں ہرگز کارآمد نہیں۔

حقیقی تزکیہ ہمیشہ اللہ کی توفیق سے ہوتا ہے۔ اللہ کی توفیق کے لیے کسی واسطہ کی ضرورت نہیں۔ اللہ کی توفیق ہر بندہ تک براہِ راست پہنچتی ہے۔ اس کی شرط صرف ایک ہے، اور وہ ہے حقیقی معنوں میں تزکیہ کا طالب بن جانا۔

قرآن کی سورہ البقرہ میں ارشاد ہوا ہے: **وإذا سألك عبادی عنّی فإنی قریب، أجیب دعوةَ الداعِ إذا دعانِ، فلیستجیبوا لی ولیؤمنوا بی، لعلهم یرشدون** (2: 186) یعنی جب میرے بندے تم سے میری بابت دریافت کریں تو (کہہ دو کہ) میں قریب ہوں، پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں، جب کہ وہ مجھے پکارتا ہے، تو چاہیے کہ میرے بندے میرا حکم مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں، تاکہ وہ راہ یاب ہوں۔

قرآن کی اِس آیت میں ''قریب'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ تزکیہ کا ذریعہ حصولِ قربت ہے، نہ کہ حصول وسیلہ۔ جو آدمی اپنا تزکیہ چاہتا ہو، اس کو چاہیے کہ وہ اپنے ذہن کو بیدار کرکے زیادہ سے زیادہ خدا کے قریب ہونے کی کوشش کرے۔

اِس مقصد کے حصول کے لیے کوئی بھی وسیلہ ہرگز مددگار نہیں ہوسکتا۔ تزکیہ یا تو براہِ راست تعلق باللہ کے ذریعے ملتا ہے، یا وہ سرے سے نہیں ملتا۔ حقیقت یہ ہے کہ واسطہ کا تصور تزکیہ کے راستے میں رکاوٹ ہے۔

خدا جب انسان سے حبل الورید (50: 16) سے بھی زیادہ قریب ہے تو اس سے قریب ہونے کے لیے کسی واسطے کی کیا ضرورت — واسطہ یا وسیلہ کا تصور پراسرار نسبت کے عقیدہ پر قائم ہے، جب کہ رہنما یا مرشد کا تصور شعوری تعلق کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔

تزکیہ سے پہلے

تزکیہ کا اصل محرک احتیاج (destitution) ہے۔ جو آدمی جتنا زیادہ اپنے احتیاج کو جانے گا، اتنا ہی زیادہ وہ تزکیہ کی طرف راغب ہوگا۔ ایسا انسان فطری طور پر اپنے احتیاج کی تکمیل تلاش کرے گا، اور اسی تلاش کے نتیجے کا نام تزکیہ ہے۔

اِس دریافت کا آغاز خود اپنے وجود سے ہوتا ہے۔ سب سے پہلے انسان شعوری طور پر خود اپنی موجودگی (existence) کو دریافت کرتا ہے۔ یہ دریافت اس کے اندر یہ تجسس (curiosity) پیدا کرتی ہے کہ مجھ کو وجود بخشنے والا کون ہے۔ اِس طرح وہ اپنے خالق کو دریافت کرتا ہے۔ اِس کے نتیجے میں اس کے اندر اپنے خالق کے لیے بے پناہ عظمت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

پھر وہ سوچتا ہے کہ میں مکمل طور پر ایک ضرورت مند شخص ہوں۔ میں خود اپنی طاقت سے اپنی کوئی ضرورت پوری نہیں کرسکتا۔ اِس کے باوجود میری ضرورت کی تمام چیزیں یہاں پیشگی طور پر موجود ہیں — زمین، پانی، ہوا، آکسیجن، روشنی، خوراک اور دوسری بے شمار چیزیں جن کو لائف سپورٹ سسٹم کہا جاتا ہے، وہ سب یہاں یک طرفہ عطیہ کے طور پر میرے لیے موجود ہیں۔ اِس دریافت کے بعد وہ یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ اِن تمام عطیات کا مُعطی (giver) کون ہے۔ اِس طرح وہ اپنے رب کو دریافت کرتا ہے۔ اِس دریافت کے نتیجے میں اس کے اندر اپنے رب سے بے پناہ محبت پیدا ہوجاتی ہے۔ اِس طرح آدمی کی جستجو اُس کو اِس سوال تک پہنچاتی ہے کہ میری منزل (goal) کیا ہے۔ پھر اس کو معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا میں وہ اپنی مطلوب منزل کو نہیں پا سکتا۔ یہ دریافت اس کو آخر کار جنت کا طالب بنا دیتی ہے، جہاں وہ اپنی منزل کو پالے اور اپنے تمام تقاضوں کی تکمیل کر سکے۔

اِسی طرح آدمی جب سوچتا ہے تو وہ دریافت کرتا ہے کہ اس کو اپنی زندگی کے لیے ایک مستند رہنمائی درکار ہے۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام تر تلاش کے باوجود خود اپنی بنیاد پر اپنے لیے مستند رہنمائی معلوم نہیں کرسکتا۔ اِس دریافت کے بعد مزید تجسس اس کو اِس حقیقت تک پہنچاتا ہے کہ مستند رہنمائی کا واحد ذریعہ پیغمبر (prophet) ہے۔ اِس طرح وہ اپنے دل کی پوری آمادگی کے ساتھ پیغمبر کو اپنا رہنما بنالیتا ہے۔ اِن

دریافتوں کے بعد فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے اندر تواضع (modesty) پیدا ہوتی ہے۔ وہ خالق کی عظمتوں میں جینے لگتا ہے۔ خدا کا تخلیقی نظام اس کے لیے خدا کی مسلسل یاد کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جنت اس کے لیے اس کے سب سے بڑے مطلوب کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ پیغمبر کو وہ اپنے رہبرِ کامل کے طور پر قبول کر لیتا ہے— یہی وہ تمام عارفانہ تجربات ہیں جن کے مجموعے کا نام تزکیہ ہے۔

تزکیہ اور محاسبہ

تزکیہ کوئی ایک بار کا عمل نہیں، یعنی ایسا نہیں ہے کہ کوئی شخص ایک بار کوئی کورس کرے اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے ایک مزکیّٰ انسان بن جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تزکیہ ایک مسلسل عمل ہے۔ یہ عمل (process) آدمی کی زندگی میں ساری عمر جاری رہتا ہے، موت سے پہلے وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

تزکیہ ایک خود احتسابی کا عمل ہے۔ اِس عمل میں آدمی کو خود اپنا نگراں بننا پڑتا ہے۔ جو آدمی تزکیہ کا طالب ہو، اس کو چاہیے کہ وہ ہر لمحہ اپنے قول وعمل کی نگرانی کرتا رہے، وہ انتہائی بے لاگ انداز میں بار بار اپنا جائزہ لیتا رہے۔ خود احتسابی کا یہ عمل صرف اُس شخص کے اندر جاری ہوتا ہے جس کے اندر ندامت (repentance) اور محاسبہ (introspection) کی صلاحیت پائی جائے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اِس دنیا کو بنانے والے نے اس کو اِس طرح بنایا ہے کہ یہاں ہر لمحہ آدمی کے لیے آزمائش کی صورتیں پیش آئیں، بار بار وہ نفس کے تقاضوں سے متاثر ہو، شیطان کی ترغیبات اس کو کسی غیر مطلوب چیز میں ملوث کردیں، ماحول کے اثر سے وہ کسی غلط چیز کا شکار ہو جائے، وغیرہ۔ اِس قسم کی تمام چیزیں تزکیہ کی ضد ہیں۔

آدمی کو اتنا زیادہ حساس ہونا چاہیے کہ وہ ہر ایسے موقع پر جاگ اٹھے، وہ ہر موقع پر اپنی تطہیر کی کوشش میں لگ جائے، وہ ہر ایسی آلودگی کے موقع پر دوبارہ اپنے آپ کو پاکیزہ بنائے۔ یہی تزکیہ ہے۔ اِس قسم کی خود احتسابی کے بغیر کوئی شخص مزکیّٰ شخصیت (purified personality) کا درجہ حاصل نہیں کرسکتا۔ محاسبہ سے ذہنی ارتقا (intellectual development) حاصل ہوتا ہے، اور ذہنی ارتقا اِس بات کا ضامن ہے کہ تزکیہ کا عمل کسی رکاوٹ کے بغیر آدمی کے اندر جاری رہے۔

تزکیہ اور تواضع

فصل کے لیے موافق زمین درکار ہے۔ فصل ہمیشہ زرخیز زمین پر اگتی ہے، بنجر زمین پر کبھی فصل نہیں اگتی۔ اِسی طرح تزکیہ کے لیے بھی موافق زمین درکار ہے۔ تواضع (modesty) تزکیہ کے لیے موافق زمین ہے۔ جس آدمی کے اندر تواضع کی صفت ہوگی، اس کے لیے تزکیہ کا حصول آسان ہوجائے گا۔ اِس کے برعکس، کبر (arrogance) تزکیہ کے لیے ایک غیر موافق زمین ہے۔ جس آدمی کے اندر کبر کا مزاج ہو، وہ کبھی تزکیہ کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ تواضع (modesty) سے آدمی کے اندر کمی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ متواضع انسان کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ مجھے کچھ اور پانا ہے جو میرے اندر نہیں ہے۔ اِس احساس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے سامنے جب سچائی آتی ہے تو وہ کسی تحفظِ ذہنی (reservation) کے بغیر اس کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ وہ بے لاگ انداز میں اس کا جائزہ لیتا ہے۔ وہ بہت جلد دریافت کر لیتا ہے کہ سچائی اس کے لیے اس کی کمی کی تلافی ہے۔ وہ سچائی کو خود اپنی چیز سمجھ کر اس کو قبول کر لیتا ہے۔ یہی صفت تزکیہ کی روح ہے۔ اِس کے برعکس معاملہ متکبر انسان کا ہے۔ متکبر انسان کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ میرے پاس پہلے ہی سے سب کچھ موجود ہے، مجھے کسی سے کچھ اور لینے کی ضرورت نہیں۔ اِس نفسیات کی بنا پر وہ باہر کی کسی چیز کو لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ مصلح کی بات کو آسانی کے ساتھ رد کر دیتا ہے۔ اس کا یہ مزاج اس کے لیے تزکیہ کے حصول میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تزکیہ ایک مسلسل عمل ہے۔ تزکیہ کا یہ عمل صرف اُس شخص کے اندر جاری ہوتا ہے جو تواضع کا مزاج رکھتا ہو۔ تواضع کا مزاج آدمی کے اندر قبولیت کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ ایسا آدمی نفسیاتی پیچیدگی (complex) سے آزاد ہوگا اور جو آدمی نفسیاتی پیچیدگی سے آزاد ہو، وہی تزکیہ کے درجے تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کرتا ہے۔

مسنون اذکار

حدیث کی کتابوں میں ایسی روایتیں آئی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

مختلف اوقات میں کچھ کلمات ادا کرتے تھے، جن کو ذکر ودعا کے کلمات کہا جاتا ہے۔ یہ کلمات عام طور پر مسنون ذکر یا مسنون دعا کے نام سے مشہور ہیں۔ عام تصور یہ ہے کہ یہ مسنون اذکار تزکیہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں اور تزکیہ یہ ہے کہ آدمی ان اذکار کو یاد کرلے، اور مختلف موقع پر ان کو دُہراتا رہے۔

مسنون اذکار کا یہ تصور ایک ناقص تصور ہے۔ مسنون اذکار دراصل مسنون کیفیات ہیں، نہ کہ سادہ معنوں میں صرف مسنون الفاظ۔ اِس معاملے میں اصل حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اعلیٰ معرفت کی بنا پر ربّانی کیفیات سے معمور رہتے تھے، آپ کی یہ داخلی حالت مختلف مواقع پر آپ کی زبان سے نکل پڑتی تھی۔ آج جو لوگ حدیث کی کتابوں کو پڑھتے ہیں، وہ صرف الفاظِ نبوی سے واقف ہوتے ہیں، وہ کیفیاتِ نبوی سے واقف نہیں ہو پاتے۔ اِس بنا پر وہ الفاظ کو اصل سمجھ لیتے ہیں، کیوں کہ وہ کتاب میں درج نہیں۔ مسنون اذکار کا یہ تصور مسنون اذکار کی تصغیر ہے، وہ مسنون اذکار کا صحیح تعارف نہیں۔

حقیقت کے اعتبار سے مسنون اذکار کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے شعور کو جگائے، وہ مسلسل تفکیری عمل کے ذریعے اپنے اندر ایسی شخصیت کی تعمیر کرے جو ربّانی کیفیات میں جینے والی ہو، یہ گویا کہ مسنون اذکار سے پہلے کی سنت ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ مسنون اذکار سے پہلے کی سنت کو اپنے اندر زندہ کرے، اس کے بعد اس کی زبان سے ذکر ودعا کے جو کلمات نکلیں گے، وہی اس کے لیے مسنون اذکار ہوں گے۔ اس طرح کی ربّانی شخصیت تیار کیے بغیر جو آدمی مسنون اذکار کو دہرائے، وہ صرف الفاظ کی تکرار ہے، نہ کہ حقیقی معنوں میں مسنون اذکار پر عمل۔

لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ مسنون اذکار ذکر کے مقدّس الفاظ ہیں، ان الفاظ میں پراسرار طور پر کچھ خواص چھپے ہوئے ہیں، مگر یہ درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسنون اذکار دراصل مسنون کیفیات کو بتانے والے الفاظ ہیں، نہ کہ مجرد طور پر صرف مسنون الفاظ۔

تزکیہ اور دعا

دعا کیا ہے، دعا اُس کیفیت کے لفظی اظہار کا نام ہے جو ایک طرف اپنی عبدیت اور دوسری طرف

خدا کی ربوبیت کو دریافت کرنے کے بعد ایک انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے۔مسنون دعاؤں کا معاملہ بھی اِس سے مختلف نہیں۔ مسنون دعا، معروف معنوں میں، مسنون الفاظِ دعا کا نام نہیں۔ مسنون دعا اپنی حقیقت کے اعتبار سے، اکتشافی دعا کا نام ہے۔ ایک ربانی دریافت جب الفاظ میں ڈھل جائے تو یہی وہ دعا ہے جس کو مسنون دعا یا اکتشافی دعا کہا جاسکتا ہے۔ ایک حدیثِ قدسی میں آیا ہے کہ: **أنا عند ظَنِّ عبدی بی، فلیظن بی خیر ما أحبّ۔** (ذخیرة الحفاظ لابن القیسرانی، 5/2793)۔ یعنی میں بندے کے گمان کے ساتھ ہوں، تو اس کو چاہیے کہ وہ میرے بارے میں اچھا گمان کرے۔ یہ گمان کیا ہے، یہ دراصل خدا کی صفات میں سے کسی ایک صفت کو دریافت کرنے کا نام ہے، جو آدمی کو یہ موقع دے کہ وہ خدا کے بارے میں اچھا گمان کرے، وہ اُس سے خیر طلب کرے۔

مثال کے طور پر قرآن میں بتایا گیا ہے کہ: **و آتاکم من کلّ ما سألتموہ** (14: 34) یہ آیت کسی بندے کو دعا کا ایک پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) دیتی ہے جس کے حوالے سے وہ خدا کی رحمت کو انووک (invoke) کرسکے۔ وہ یہ کہے کہ خدایا، دنیا کی زندگی میں اپنی ضرورتوں سے واقف بھی نہ تھا کہ میں تجھ سے اُس کا سوال کروں۔ تو نے میری فطرت کے تقاضوں کو سوال کا درجہ دے کر میری تمام دنیوی ضرورتوں کا انتظام کردیا۔ آخرت کے معاملے میں بار بار میں تجھ سے سوال کررہا ہوں، اب تو میرے سوال کو لازم کا درجہ دے کر آخرت میں بھی مجھے میری تمام مطلوب چیزیں عطا کردے۔

اِس قسم کی ایک دعا ہمیشہ ایک نفسیاتی طوفان کے بعد کسی آدمی کی زبان سے نکلتی ہے۔ اِسی نفسیاتی واقعہ کا دوسرا نام تزکیہ ہے۔ تزکیہ اور دعا دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ جہاں تزکیہ کا واقعہ ہوگا، وہاں دعا بھی لازماً ظاہر ہوگی، اور جب دعا کا ظہور ہو تو وہ اِس بات کا ثبوت ہوگا کہ اس سے پہلے آدمی کے اندر تزکیہ کا واقعہ پیش آچکا ہے۔ تزکیہ کے بغیر دعا نہیں، اور دعا کے بغیر تزکیہ نہیں۔

تزکیہ کا ظاہری فارم

تزکیہ کا کوئی ظاہری فارم نہیں۔ اگر تزکیہ کا ظاہری فارم ہو تو اس کو پورا کرکے آدمی

شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھ لے گا کہ میں نے اپنا تزکیہ کرلیا۔ اِس طرح اس کے اندر قناعت (contentment) کا مزاج پیدا ہو جائے گا۔ حالاں کہ اس معاملے میں قناعت کا مزاج تزکیہ کے لیے ایک قاتل جذبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ تزکیہ کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر مسلسل طور پر عدم قناعت (discontent) کا احساس پایا جاتا ہو۔ عدم قناعت کا جذبہ تزکیہ کے عمل کو مسلسل طور پر جاری رکھنے کا باعث ہے، جب کہ قناعت کی نفسیات میں اِس قسم کے تسلسل کا محرک ہی ختم ہو جاتا ہے۔

تزکیہ کا گہرا تعلق عبادات کے مقرر نظام سے ہے۔ تزکیہ اور اسلامی عبادات دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم اور ملزوم ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی بھی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرا تزکیہ مکمل ہو چکا ہے اور اب مجھے عبادات کی ضرورت نہیں۔

مگر اِس کا یہ مطلب نہیں کہ عبادات کی ظاہری ادائیگی سے اپنے آپ تزکیہ کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسا سمجھنا ایک غیر فطری بات ہے۔ صحیح یہ ہے کہ عبادات روحِ تزکیہ کا خارجی ظہور ہیں، وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، تزکیہ کا وسیلہ نہیں۔ اگر کسی شخص کے اندر تزکیہ کی روح حقیقی طور پر پیدا ہو جائے تو لازمی طور پر ایسا ہوگا کہ وہ خدا کا عبادت گزار بن جائے گا۔

عبادت گزاری کو تزکیہ سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اِس لیے سارا زور روحِ تزکیہ کے تحقق پر دینا چاہیے، نہ کہ صرف عبادات کے ظاہری فارم پر۔ یہ درست ہے کہ عبادات کے بغیر تزکیہ کا دعویٰ صرف ایک جھوٹا دعویٰ ہے، مگر یہ بھی درست ہے کہ عبادات کا ظاہری فارم آٹو میٹک طور پر تزکیہ کی روح پیدا نہیں کرسکتا۔

ضمیر رہبرِ تزکیہ

انسان کے اندر فطری طور پر ایک فیکلٹی (faculty) ہے جس کو ضمیر (conscience) کہا جاتا ہے۔ یہ ضمیر ایک خدائی معلم ہے۔ وہ انسان کے لیے رہبرِ تزکیہ (tazkia guide) کا کام کرتا ہے۔ ضمیر ہر موقع پر خاموش زبان میں انسان کو بتاتا ہے — یہ کرو اور وہ نہ کرو، یہ تزکیہ

کے موافق روش ہے اور وہ تزکیہ کے خلاف روش ہے۔ یہ پاکیزہ شخصیت بنانے والی روش ہے اور وہ غیر پاکیزہ شخصیت بنانے والی روش، وغیرہ۔

لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ بیشتر لوگوں کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ضمیر ان کے لیے رہبر تزکیہ کا کام نہیں کرتا۔ اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر آدمی کے اندر ضمیر کے ساتھ ایک اور برعکس فیکلٹی موجود ہے۔ یہ ایگو (ego) ہے۔ آدمی اکثر نفس اور شیطان کے زیر اثر آجاتا ہے۔ وہ ضمیر کو اپنا کام کرنے نہیں دیتا۔ ضمیر کی خاموش آواز ہر موقع پر ابھرتی ہے، لیکن ایگو (ego) اس آواز کو دبا کر اس کو بے اثر بنا دیتا ہے۔

طالبِ تزکیہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اِس حقیقت سے باخبر ہو۔ وہ اپنی قوتِ فکر کو بیدار کرے۔ وہ ہر موقع پر اپنے ایگو کو زیر و کرتا رہے۔ ایگو کو زیرو کرتے ہی یہ ہوگا کہ ضمیر اپنا فطری رول ادا کرنے لگے گا اور تزکیہ کے راستے پر آدمی کا سفر بھٹکے بغیر جاری رہے گا۔

ایگو کو زیرو کرنے کا یہ کام اس معاملے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ کام کوئی دوسرا شخص انجام نہیں دے سکتا۔ ہر آدمی کو خود یہ کام کرنا ہے کہ جیسے ہی اس کا ایگو جاگے، وہ فوراً متنبہ ہو جائے اور اپنی قوتِ ارادی (willpower) کو استعمال کرتے ہوئے اپنے ایگو کو زیرو کر دے۔

تزکیہ کا طریقہ

کچھ لوگوں نے تزکیہ کے مختلف طریقے بیان کرنے کی کوشش کی۔ اس ذیل میں انھوں نے تزکیہ کے طریقوں کی ایک فہرست بھی تیار کی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ تزکیہ کے طریقوں کی کوئی فہرست نہیں۔ آپ خواہ کتنی ہی لمبی فہرست بنالیں، مگر کوئی بھی فہرست تزکیہ کے طریقوں کی جامع نہیں بن سکتی، کوئی بھی فہرست تزکیہ کے طریقوں کا احاطہ نہیں کرسکتی۔ طویل ترین فہرست کے بعد بھی کچھ ایسے اجزا باقی رہیں گے جو تجربہ کے بعد یہ ثابت کریں گے کہ یہ فہرست ایک ناقص فہرست تھی۔

اصل یہ ہے کہ تزکیہ کا تعلق کسی فہرست سے نہیں ہے، بلکہ انسان کے اپنے ارادے سے ہے۔ اگر انسان فی الواقع تزکیہ کے معاملے میں سنجیدہ ہو اور وہ دیانت دارانہ طور پر اپنا تزکیہ کرنا چاہتا ہو تو وہ ضرور اپنا تزکیہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گا، لیکن اگر آدمی اِس معاملے میں پوری طرح سنجیدہ نہ ہو اور وہ اپنا

تزکیہ کرنے کے لیے حریص نہ ہوتو کوئی بھی تحریر یا تقریر اس کا تزکیہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہوسکتی۔

انسان کی ایک انوکھی صفت یہ ہے کہ وہ اپنی ہر غلطی کی توجیہہ (justification) تلاش کر لیتا ہے۔ وہ اپنی ہر غلطی کو درست ظاہر کرنے کے لیے خوب صورت الفاظ پالیتا ہے۔ ایسی حالت میں کوئی بھی مصلح یا مربی اس کا تزکیہ نہیں کرسکتا۔ تزکیہ کے لیے ضروری ہے کہ آدمی خود اپنے بارے میں ایک باشعور فیصلہ کرے۔ اس کا یہ فیصلہ اتنا زیادہ محکم ہو کہ وہ ہر حال میں اس پر قائم رہے، اِس معاملے میں کسی بھی عذر (excuse) کو وہ اپنے لیے عذر نہ بنائے۔

تزکیہ کے معاملے میں اصل چیز تزکیہ کا ارادہ ہے۔ یہ ارادہ اتنا زیادہ قوی ہونا چاہیے کہ کوئی بھی چیز آدمی کو اس سے ہٹا نہ سکے۔ کوئی بھی اندیشہ اس کے ارادے کو کمزور نہ کر سکے۔ اِس معاملے میں وہ کسی بھی دباؤ کو قبول کرنے پر راضی نہ ہو۔ اس کا یہ قول ہو کہ — مجھے لازمی طور پر اپنا تزکیہ کرنا ہے، خواہ مجھے اس کی کوئی بھی عملی یا نفسیاتی قیمت دینا پڑے۔

تزکیہ کا زیادہ موثر طریقہ

تزکیہ کا ایک طریقہ یہ ہے کہ مجرد (abstract) طور پر اس کے کچھ اصول مقرر کر دئے جائیں اور اس کو لکھ کر لوگوں کو پڑھنے کے لیے دے دیا جائے۔ یہ بھی تزکیہ کا ایک طریقہ ہوسکتا ہے، لیکن تزکیہ کا زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ اس کو کسی پیش آمدہ صورتِ حال سے وابستہ (relate) کر کے بتایا جائے۔ اس دوسرے طریقے کی ایک صورت یہ ہے کہ اس کے لیے ایک زندہ مربی یا مزکی موجود ہو۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آدمی خود اپنے شعور کو اتنا زیادہ ترقی یافتہ بنائے کہ وہ خود ہی ہر تجربہ اور ہر مشاہدہ میں تزکیہ کا پہلو دریافت کرے اور اس کو اپنے ذہن کا جزو بنا لے۔

حضرت ابوذر ایک صحابی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اگر ایک چڑیا کو ہوا میں اپنے پروں سے اڑتے ہوئے دیکھتے تو اس سے آپ ہمیں کوئی معرفت کی یاددہانی کراتے: **وما يقلب طائر جناحيه في السماء إلا ذكر لنا منه علماً۔ (الطبقات لابن سعد، رقم الحديث:2354)**۔ یہ پیش آمدہ صورت حال کے حوالے سے تزکیہ کی تعلیم دینے کی ایک مثال ہے۔

تزکیہ کا کوئی مجرد طریقہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی مجرد طریقہ تزکیہ کا موثر ذریعہ نہیں بن سکتا۔ تزکیہ کا موثر طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اتنا زیادہ باشعور بنائے کہ اس کے اندر توسم (15: 75) کی صفت پیدا ہو جائے۔ وہ پیش آمدہ واقعات کو تزکیہ سے وابستہ (relate) کر کے اُس سے ربانی سبق لے سکے۔ تزکیہ کا مواد روزمرہ کے تجربات میں ہوتا ہے۔ روزمرہ کے تجربات کو تزکیہ کی نظر سے دیکھنا سیکھ لیجئے، اِس کے بعد ہر تجربہ اور ہر مشاہدہ آپ کے لیے تزکیہ کا ذریعہ بن جائے گا۔

تزکیہ کا وسیلہ

تزکیہ کا وسیلہ کیا ہے۔ روایتی طور پر کچھ چیزوں کو تزکیہ کا وسیلہ سمجھا جاتا ہے— نوافل، تلاوت، مسنون اذکار، مراقبہ، صحبت، بزرگوں کے واقعات، وغیرہ۔ اِس سوچ کا مطلب تزکیہ کو ایک مقرر کورس یا مینول (manual) جیسا معاملہ سمجھنا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ تزکیہ کا کوئی متعین کورس نہیں۔ تزکیہ ایک زندہ واقعہ ہے، اور زندہ عمل ہی کے ذریعے اس کو حقیقی طور پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔

تزکیہ کے مقصد کو حاصل کرنے کا اصل ذریعہ یہ ہے کہ آدمی خدائی باتوں میں تدبر کرے، وہ اپنی سوچ کو متحرک کرے، وہ مسلسل غور وفکر کے ذریعے ہر ظاہر میں اس کے باطن کو دریافت کرے۔ یہی دریافت تزکیہ پسند آدمی کی غذا ہے۔ مثلاً آپ نے ایک چڑیا کو دیکھا۔ چڑیا کو دیکھ کر آپ کو یہ حدیثِ رسول یاد آئی کہ اہلِ جنت کے دل چڑیا کے مانند ہوں گے (أفئدتهم مثل أفئدة الطير)۔

اِس کے بعد آپ اپنے بارے میں غور کرنے لگے کہ کیا میرا دل بھی چڑیا کے مانند ہے، کیا میں بھی اُسی طرح منفی سوچ سے خالی ہوں جس طرح چڑیا کا دل منفی سوچ سے خالی ہوتا ہے، کیا میں بھی اُسی طرح حرص سے پاک ہوں جس طرح چڑیا حرص سے پاک ہوتی ہے، کیا میں بھی اُسی طرح بے ضرر (harmless) ہوں جس طرح چڑیا بے ضرر ہوتی ہے، کیا میں بھی اُسی طرح قانونِ فطرت کی پیروی کرتا ہوں جس طرح چڑیا قانونِ فطرت کی پیروی کرتی ہے۔ یہی سوچ، تزکیہ کی اصل روح ہے۔ اِس قسم کی احتسابی سوچ کے بغیر کسی شخص کا تزکیہ نہیں ہوسکتا۔

تزکیہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، اپنی تعمیر آپ کا ایک عمل ہے۔ تزکیہ میں آدمی کو خود اپنا مزکّی اور

معلم بننا پڑتا ہے۔ کسی دوسرے شخص کی صحبت یا کسی دوسرے شخص کی تبلیغ بذاتِ خود کسی کے لیے موثر نہیں بن سکتی۔ دوسرا کوئی شخص آپ کو ابتدائی رہنمائی دے سکتا ہے، لیکن اِس رہنمائی کو تکمیل تک پہنچانا، آپ کا اپنا کام ہے۔ تزکیہ کے عمل میں کسی دوسرے شخص کا حصہ اگر ایک فی صد ہے تو آپ کا اپنا حصہ ننانوے فی صد۔

تزکیہ ذہنی ارتقا

تزکیہ کے اصل معنی تطہیر (purification) کے ہیں۔ اِسی سے اس میں ایک اور مفہوم شامل ہوا ہے اور وہ بڑھنا یا نُمو (growth) ہے۔ اِس اعتبار سے، یہ کہنا درست ہوگا کہ تزکیہ سے مراد وہی چیز ہے جس کو ذہنی ارتقا (intellectual development) یا روحانی ارتقا کہا جاتا ہے۔

ذہن (mind) کوئی جامد چیز نہیں، وہ ایک نمو پذیر چیز ہے۔ وہ درخت کی طرح مسلسل بڑھتا رہتا ہے۔ اسی عمل کو قرآن میں ازدیادِ ایمان (48: 4) کہا گیا ہے۔ ازدیادِ ایمان سے مراد ازدیادِ شعور ہے، اور ازدیادِ شعور ہی کا دوسرا نام ذہنی ارتقا ہے۔ حقیقی ایمان وہی ہے جو کبھی جمود (stagnation) کا شکار نہ ہو، جو یقین اور ایمان باللہ کے اعتبار سے مسلسل بڑھتا رہے۔

یہ تزکیہ یا شعوری اضافہ کس طرح ہوتا ہے۔ اس کا ذریعہ غور وفکر (contemplation) ہے۔ یہ غور وفکر اپنے آپ میں ایک مسلسل عمل ہے — قرآن اور حدیث میں غور وفکر، سیرتِ رسول میں غور وفکر، صحابہ کی زندگی میں غور وفکر، دوسرے موضوعاتِ انسانی پر غور وفکر، کائنات پر غور وفکر، غرض ذرہ سے لے کر آفتاب تک ہر چیز پر غور وفکر۔ اِس کے علاوہ، سنجیدہ مذاکرات کے دوران غور وفکر۔

اِس غور وفکر کے درمیان ایسا ہوتا ہے کہ ذہن میں نئے نئے خیالات آتے ہیں، معلوم باتوں کی نئی نئی توجیہات سمجھ میں آتی ہیں، واقعات وحقائق کے نئے نئے رخ علم میں آتے ہیں، وغیرہ۔

جس آدمی کو سچا ایمان حاصل ہو، اس کا حال یہ ہوگا کہ ہر مطالعہ اور مشاہدہ اس کے لیے ربانی دریافت کا سبب بنتا رہے گا، ہر تجربہ اس کے لیے خدا سے قربت کا ذریعہ بن جائے گا۔ اُس کا ایمان ابتداءً اگر ایک بیج تھا تو اِس طرح بڑھتے بڑھتے وہ ایک پورا درخت بن جائے گا۔ اِسی فکری اور روحانی عمل کا اسلامی نام تزکیہ ہے — ایمان اگر اسلام میں داخلے کا عنوان ہے، تو تزکیہ ایمان کے ارتقا کا عنوان۔

تزکیہ اور علم

تزکیہ کے لیے ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ کسی صاحبِ کمال کی صحبت حاصل کی جائے، کیوں کہ صاحبِ کمال کی ایک نظر انسان کو بدلنے کے لیے کافی ہوتی ہے، لیکن یہ نقطۂ نظر قرآن اور حدیث سے ثابت نہیں۔ قرآن اور حدیث کے مطابق، تزکیہ کا مقصد آدمی کے خود اپنے غور وفکر سے حاصل ہوتا ہے۔ آدمی کے اندر صحیح مزاج ہو اور وہ کتابوں کا، نیز فطرت کا مطالعہ کرے تو اُس سے وہ ایسے معانی اخذ کرے گا جو اس کی شخصیت کا تزکیہ کرنے والے ہوں۔

قرآن کی سورہ فاطر میں پہاڑوں کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ آیت آئی ہے: **إنما یخشی الله من عباده العلماء** (35: 28)۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ پہاڑوں کا علم یا واقعاتِ فطرت کا علم آدمی کے اندر اللہ کا خوف پیدا کرتا ہے، یعنی خوف کا ماخذ علم (learning) ہے۔ آدمی کے اندر جتنا زیادہ علم ہوگا، اتنا ہی زیادہ وہ اللہ کی تخلیقی حکمتوں کو سمجھے گا اور اِس طرح وہ اپنی معرفت میں اضافہ کرے گا۔ تزکیہ کسی آدمی کو ذاتی علم کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، نہ کہ مفروضہ باکمال کی نظر اور توجہ سے۔

مطالعہ آدمی کے اندر سوچنے کی صلاحیت کو بڑھاتا ہے۔ مطالعہ آدمی کو اِس قابل بناتا ہے کہ وہ زیادہ گہرے انداز میں چیزوں سے معرفت کی غذا لے سکے۔ مثلاً ہر آدمی ہوا میں سانس لیتا ہے۔ ہر آدمی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اِس پر اللہ کا شکر ادا کرے، لیکن جو شخص نظامِ تنفس (respiratory system) کے بارے میں دریافت کردہ جدید معلومات کو جانتا ہو، اس کا شکر ہزاروں گنا زیادہ بڑھ جائے گا، اور اسی کے اعتبار سے اس کا تزکیہ بھی بہت زیادہ ترقی کرے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ علم آدمی کے تزکیہ کو زیادہ بڑا فریم ورک (framework) دیتا ہے۔ علم سے آدمی کو اپنے تزکیہ میں اضافے کے نئے گوشے معلوم ہوتے ہیں۔ تزکیہ کے لیے علم ایک قسم کے بوسٹر (booster) کا درجہ رکھتا ہے۔

ڈسٹریکشن سے بچیے

اِس دنیا میں کامیابی کا ایک اصول یہ ہے — ایک کام کو کرنے کے لیے دوسرے کام کو چھوڑنا۔

یہ انسانی نفسیات کا ایک خاصہ ہے کہ آدمی ایک ہی وقت میں دو چیزوں پر یکساں فوکس (focus) نہیں کرسکتا۔ وہ ایک چیز پر فوکس کرے گا تو دوسری چیز سے اس کا ذہن ہٹ جائے گا۔ یہی اصول تزکیہ کے لیے بھی درست ہے۔ جو آدمی اپنا تزکیہ کرنا چاہتا ہو، اس کو لازمی طور پر یہ بھی کرنا ہوگا کہ وہ تزکیہ کی نسبت سے غیر متعلق (irrelevant) چیزوں کو مکمل طور پر چھوڑ دے۔

تزکیہ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ڈسٹریکشن (distraction) ہے۔ تزکیہ کے طالب کے لیے ضروری ہے کہ وہ تزکیہ کو اپنا واحد نشانہ (supreme goal) بنائے، وہ ڈسٹریکشن کی تمام چیزوں سے مکمل طور پر اپنے آپ کو دور رکھے۔ تزکیہ کے لیے ذہنی یکسوئی یا ترکیز (concentration) لازمی طور پر ضروری ہے۔ جس آدمی کے اندر ترکیز کی صلاحیت نہ ہو، وہ یقینی طور پر تزکیہ کے حصول سے محروم رہے گا۔

ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے، اور تزکیہ کی بھی ایک قیمت ہے۔ وہ قیمت ہے— ہر قسم کے ڈسٹریکشن سے اپنے آپ کو دور رکھنا۔ مثلاً خاندانی رسومات، دوستی کا کلچر، کھانے اور کپڑے کا شوق، دولت اور شہرت (fame) کی رغبت، زندگی کے تکلفات، وغیرہ۔ اِس قسم کی تمام چیزیں تزکیہ کے طالب کے لیے ڈسٹریکشن (distraction) کا درجہ رکھتی ہیں۔ جو آدمی اپنا تزکیہ چاہتا ہو، اس پر لازم ہے کہ وہ اِس قسم کی تمام چیزوں سے مکمل طور پر دور رہے۔

تزکیہ کسی انسان کو اعلیٰ انسان بناتا ہے۔ تزکیہ آدمی کو اِس قابل بناتا ہے کہ اس کو فرشتوں کی صحبت مل جائے۔ تزکیہ کے ذریعہ آدمی اِس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ خدا کے پڑوس میں جینے لگے۔ تزکیہ کے بغیر آدمی سوکھی لکڑی کے مانند ہے، تزکیہ کے بعد آدمی ایک شاداب درخت بن جاتا ہے۔ تزکیہ کسی پُراسرار چیز کا نام نہیں، وہ وہی چیز ہے جس کو دوسرے الفاظ میں ایمانی شعور کی بیداری کہا جاسکتا ہے۔

تزکیہ اور عصری تقاضا

ہر زمانے کا ایک طرزِ فکر ہوتا ہے۔ آدمی کسی بات کو صرف اُس وقت قبول کرتا ہے جب کہ وہ اس کے طرزِ فکر کے مطابق ہو۔ اِسی کو مائنڈ کا ایڈریس ہونا کہتے ہیں۔ انسانی ذہن کی رعایت جس طرح

دوسرے معاملات میں ضروری ہے، اُسی طرح وہ تزکیہ کے معاملے میں بھی ضروری ہے۔

قدیم زمانہ روایتی طرزِ فکر کا زمانہ تھا، مگر موجودہ زمانہ سائنسی طرزِ فکر کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانے میں لوگوں کا تزکیہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بات کو اِس طرح کہا جائے جس سے اُن کا ذہن ایڈریس (address) ہوسکے۔

تزکیہ کی اصل موجودہ زمانے میں بھی عین وہی ہے جو کہ قدیم زمانے میں تھی، البتہ دونوں میں ایک فرق ہے اور وہ اسلوب کلام اور طرزِ استدلال (reasoning) کا فرق ہے۔ قدیم زمانے میں روایتی اسلوب لوگوں کے لیے موثر ہوسکتا تھا، لیکن موجودہ زمانے میں موثر تزکیہ کے لیے ضروری ہے کہ اسلوبِ کلام کو بدلا جائے۔ صرف اِسی صورت میں یہ ممکن ہے کہ آج کا انسان تزکیہ کی اہمیت کو سمجھے اور اس کو اپنی زندگی میں اختیار کرے۔

مثال کے طور پر قدیم زمانے میں ''اصلاحِ نفس'' کا لفظ بولا جاتا تھا۔ یہ لفظ قدیم روایتی ذہن کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھا، لیکن آج کا انسان اِس حقیقت کو اُس وقت زیادہ سمجھ پاتا ہے جب کہ اِس بات کو بتانے کے لیے لفظ بدل دیا جائے اور یہ کہا جائے کہ ہر انسان مختلف اسباب سے متاثر ذہن (conditioned mind) کا کیس بن جاتا ہے۔ اس کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ڈی کنڈیشننگ کی جائے، اس کے ذہن کی تشکیلِ نو (re-engineering) کرکے اس کو اِس قابل بنایا جائے کہ وہ چیزوں کو اُن کی اصل حقیقت کے اعتبار سے دیکھے اور زیادہ درست طور پر ان کے بارے میں رائے قائم کرے۔ اِس اسلوبِ تزکیہ پر لوگوں کو مخاطب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مزکّی کا مطالعہ وسیع ہو، وہ قدیم کے ساتھ جدید باتوں سے واقفیت رکھتا ہو۔ اِس کے بغیر موثر انداز میں جدید انسان کا تزکیہ نہیں کیا جاسکتا۔

تزکیہ کی شرط

تزکیہ کوئی فنّی علم نہیں۔ فنی علم کو لفظوں میں پوری طرح بیان کیا جاسکتا ہے، لیکن تزکیہ معرفت کا علم ہے اور معرت کے علم کو الفاظ میں صرف جزئی طور پر بیان کرنا ممکن ہے، نہ کہ کلی طور پر۔ تزکیہ کی ہر

تقریر یا تحریر ایک اور اضافہ چاہتی ہے، اور یہ اضافہ صرف وہ شخص کرسکتا ہے جو تزکیہ کا طالب ہو۔

تزکیہ کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ طالب تزکیہ اِس معاملے میں انتہائی حد تک سنجیدہ ہو، وہ ایک تیار ذہن (prepared mind) کی حیثیت رکھتا ہو، اُس کے اندر کامل آمادگی پائی جاتی ہو، وہ ہر قسم کے تعصّبات (prejudice) سے خالی ہو، وہ ایک کامپلکس فری (complex free) انسان ہو، وہ چیزوں کو اُسی طرح دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو، جیسا کہ وہ واقعۃً ہیں۔ وہ ذاتی رجحانات کو الگ کرکے چیزوں کو دیکھ سکے، وہ اپنے خلاف باتوں کو بھی اُسی طرح سنے، جس طرح وہ اپنے موافق باتوں کو سنتا ہے، وہ کسی شرط کے بغیر حق کو قبول کرنے کے لیے تیار رہو، وہ کھلے طور پر اپنی غلطی کو ماننے کا مزاج رکھتا ہو، وہ درست زاویہ نظر (right angle of vision) سے چیزوں کو دیکھ سکے، وغیرہ۔

تزکیہ کے عمل میں دو افراد شامل ہوتے ہیں — معلمِ تزکیہ، اور طالبِ تزکیہ۔ دونوں میں سے کسی کا رول بھی صد فی صد نہیں، اِس معاملے میں دونوں کا رول ففٹی ففٹی ہے۔ معلمِ تزکیہ کا رول یہ ہے کہ وہ تزکیہ کو حقیقی طور پر جانتا ہو، اس نے قرآن اور حدیث کے گہرے مطالعے کے ذریعے تزکیہ کو درست طور پر سمجھا ہو اور پھر وہ اس کو اس کے خالص انداز میں بیان کرسکے۔

اِس معاملے میں دوسرا نصف رول طالبِ تزکیہ کا ہے۔ تزکیہ کے طالب کے اندر یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ بھرپور طور پر قبولیت کی استعداد رکھتا ہو۔ وہ اپنے مانوس ذہن سے باہر آکر تزکیہ کے کلام کو سنے اور اس کو سمجھے۔ وہ پیشگی طور پر قائم کردہ معیار سے آزاد ہو، وہ یہ صلاحیت رکھتا ہو کہ وہ کلام کی نسبت سے اپنی رائے قائم کرے، نہ کہ متکلم کی نسبت سے۔ جس آدمی کے اندر یہ صفات موجود ہوں، وہی وہ شخص ہے جو تزکیہ کے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

اعترافِ حقیقت

اعلیٰ انسانیت یہ ہے کہ آدمی حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کرے۔ کسی انسان کے لیے اصل چیز یہی ہے۔ اکتشافِ حقیقت (discovery of reality) کا نتیجہ اعتراف (acknowledgement) ہے۔

آدمی اگر حقیقتِ واقعہ سے بے خبر ہوتو وہ ایک جاہل (ignorant) انسان شمار ہوگا۔ حقیقتِ واقعہ کی دریافت کے بعد اگر کسی شخص کا حال یہ ہو کہ وہ اس کو دل کے اندر تو محسوس کرے، لیکن زبان سے بول کر وہ اس کا اعلان نہ کرے تو یہ روش منافقت کی روش ہے۔ اور اگر ایسا ہو کہ حقیقت واقعہ کی دریافت کے بعد وہ اس کو اصل ہستی کے بجائے کسی اور سے منسوب کردے، یا وہ خود اس کا کریڈٹ لینے لگے تو ایسا آدمی جھوٹ (falsehood) پر کھڑا ہوا ہے۔

یہ عمل کوئی سادہ عمل نہیں۔ یہ دراصل صحیح رخ پر انسانی شخصیت کا ارتقا ہے اور اِسی کا دوسرا نام تزکیہ ہے۔ تزکیہ کسی پراسرار چیز کا نام نہیں ہے۔ تزکیہ اِس شعوری بیداری کا نتیجہ ہے کہ آدمی ہر چیز کو خدا کے خانے میں ڈال سکے، ہر تجربہ اس کے لیے خدا سے تعلق بڑھانے کا ذریعہ بن جائے۔ اِنھیں تجربات کے دوران وہ اعلیٰ شخصیت بنتی ہے جس کو مزکّیٰ شخصیت (purified personality) کہا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سارا معاملہ صحیح انتساب (right attribution) اور غلط انتساب (wrong attribution) کا معاملہ ہے۔ واقعات کو غلط طور پر کسی سے منسوب کرنا، اپنی روح کو آلودہ کرنا ہے، یہ تزکیہ کے موقع پر اپنے آپ کو تزکیہ سے محروم کر لینا ہے۔ اِس کے برعکس، جب آدمی واقعات کو خالقِ حقیقی کی طرف منسوب کرے تو اُس نے اپنی روح کو اوپر اٹھایا۔ تزکیہ کے موقع کو استعمال کرتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو وہ انسان بنایا جس کو تزکیہ یافتہ انسان کہا جاتا ہے۔ تزکیہ کسی خلا میں نہیں ہوتا، تزکیہ ہمیشہ حقیقی زندگی میں ہوتا ہے۔ تزکیہ کے لیے جو چیز مطلوب ہے، وہ بیدار ذہن (awakened mind) ہے، نہ کہ تخلیہ میں کیے ہوئے کسی قسم کے پُراسرار اعمال۔

تزکیہ اور قربانی

تزکیہ کا حصول کوئی سادہ بات نہیں۔ تزکیہ کے حصول کے لیے ہمیشہ ایک قربانی درکار ہوتی ہے، جسمانی قربانی نہیں، بلکہ نفسیاتی قربانی۔ وہ قربانی ہے — تزکیہ کے حصول کی خاطر خلافِ تزکیہ باتوں کو مکمل طور پر چھوڑ دینا۔ یہ فطرت کا ایک اصول ہے کہ ایک چیز کو پانے کے لیے دوسری چیز کو چھوڑنا پڑتا

ہے۔ یہ اصول تزکیہ کے معاملے میں بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ دوسرے معاملات میں۔

اِنھیں میں سے ایک چیز ہے غلط عادتوں (bad habits) کو چھوڑنا۔ ہر عورت اور مرد اپنے ماحول کے اثر سے ایسی چیز کے عادی ہوجاتے ہیں جو تزکیہ کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ تزکیہ کے طالب کے لیے لازم ہے کہ وہ ایسی عادتوں کو مکمل طور پر چھوڑ دے۔ مثلاً زیادہ بولنا اور کم سوچنا، خاندانی تقاضوں میں مشغول رہنا، کھانے اور کپڑے کا شوقین ہونا، تفریحی مجلسوں میں بیٹھنا، دوسروں کی کمیوں کا چرچا کرنا، شاپنگ اور آؤٹنگ، کفایت شعاری کے بجائے فضول خرچی، سطحی اور نمائشی ذوق، تنقید کو برا ماننا اور تعریف پر خوش ہونا، دنیوی چیزوں کا حریص ہونا، ضرورت پر قناعت نہ کرنا، سادگی (simplicity) کے بجائے تکلف کو پسند کرنا، وغیرہ۔

ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے اور تزکیہ کو پانے کی بھی ایک قیمت ہے، اور وہ قیمت ہے — خلافِ تزکیہ باتوں کو چھوڑنا۔ جو آدمی تزکیہ کی باتیں کرے، لیکن وہ خلافِ تزکیہ باتوں کو چھوڑنے پر راضی نہ ہو، ایسا آدمی بلاشبہہ ایک غیر سنجیدہ انسان ہے، اور غیر سنجیدہ مزاج کے ساتھ کبھی تزکیہ جمع نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ جو آدمی تزکیہ کی طلب میں سنجیدہ ہو، وہ خود ہی یہ جان لے گا کہ کیا چیزیں تزکیہ کے موافق ہیں اور کیا چیزیں تزکیہ کے خلاف۔ اس کی سنجیدگی لازمی طور پر اس کو مجبور کرے گی کہ وہ موافقِ تزکیہ باتوں کو اپنائے اور خلافِ تزکیہ باتوں کو مکمل طور پر چھوڑ دے۔ سنجیدگی اس بات کی ضمانت ہے کہ آدمی ضرور تزکیہ کے درجے تک پہنچ جائے، وہ ہرگز تزکیہ سے محروم نہ رہے۔

تزکیہ ایک نفسیاتی عمل

تزکیہ کا حصول کسی قسم کی لسانی تکرار یا کسی قسم کی جسمانی ورزش کے ذریعہ ممکن نہیں۔ تزکیہ تمام تر ایک نفسیاتی عمل ہے اور نفسیات کی سطح پر ہی اس کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔

نفسیاتی عمل سے مراد ذہنی عمل ہے۔ انسان کا ذہن ہر قسم کی سوچ کا مرکز ہے۔ یہ دراصل ذہن ہے جو کسی انسان کی شخصیت کی تشکیل کرتا ہے۔ غیر مزکّٰی شخصیت کو بھی اس کا ذہن بناتا ہے اور مزکّٰی شخصیت کو جو چیز بناتی ہے، وہ بھی اس کا ذہن ہے۔

تزکیہ کے لیے اصل چیز جو مطلوب ہے، وہ ذہنی ارتقا (intellectual development) ہے، یعنی شعور کو اِس طرح ترقی دینا کہ وہ چیزوں کو سارٹ آؤٹ (sortout) کرسکے، وہ منفی احساس کو مثبت احساس میں کنورٹ کرسکے، وہ چیزوں میں خالق کے جلوے کا مشاہدہ کرسکے، وہ مادی واقعات میں روحانی پہلو کو دریافت کرسکے، وہ خارجی اثرات سے محفوظ رہ کر سوچ سکے، وہ شیطان کی تزئین کو پہچان کر اُسے رد کرسکے، وہ نفس کی ترغیبات سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے، اس کو مستقبل بینی کی نظر حاصل ہوجائے، وہ بے نتیجہ کام سے اپنے آپ کو دور رکھے، وہ اپنے حقیقی خیر خواہ کو پہچاننے والا ہو، وہ نصیحت کو قبول کرے، خواہ وہ اس کے مزاج کے خلاف ہو، وہ اپنے خلاف سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہو، وہ مادیات سے گزر کر روحانیات کو اپنا نشانہ بنائے، اس کی سوچ آخرت رُخی سوچ بن جائے، وغیرہ۔

یہ تمام کام نفسیات کی سطح پر انجام پاتے ہیں، وہ انسان کی گہری سوچ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس آدمی کے اندر گہری سوچ نہ ہو، وہ کبھی تزکیہ کے اعلیٰ درجے تک نہیں پہنچ سکتا۔ جس آدمی کے اندر گہری سوچ ہو، اُسی کے اندر تزکیہ کا عمل جاری ہوگا۔ تزکیہ دراصل نفسیاتی تزکیہ کا دوسرا نام ہے۔ تزکیہ اولاً نفسیات کی سطح پر ہوتا ہے۔ اِس کے بعد یہ ممکن ہوتا ہے کہ انسان کے پورے وجود کی سطح پر تزکیہ کا اظہار ہو۔

مثبت نفسیات کی اہمیت

چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم نے اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو عرب کے صحرا میں بسا دیا اور خود شام واپس چلے گئے۔ بعد کو اسماعیل بڑے ہوئے تو انھوں نے قبیلہ جرہم کی ایک خاتون سے نکاح کرلیا۔ کچھ عرصہ بعد حضرت ابراہیم دوبارہ وہاں آئے۔ اُس وقت ان کی ملاقات اسماعیل کی بیوی سے ہوئی۔ انھوں نے سخت حالات کی شکایت کی۔ حضرت ابراہیم اُن سے یہ کہہ کر چلے گئے کہ جب اسماعیل واپس آئیں تو اُن کو میرا یہ پیغام دینا: غَيِّر عتبَةَ بابك (اپنے گھر کی چوکھٹ کو بدل دو)۔ اس کے بعد اسماعیل نے اپنی بیوی کو طلاق دے دیا اور ایک دوسری خاتون سے نکاح کرلیا۔ کچھ عرصہ بعد حضرت ابراہیم دوبارہ پھر وہاں آئے۔ دوسری خاتون سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کوئی شکایت نہیں کی، بلکہ حالات پر شکر کا اظہار کیا۔ یہ سن کر حضرت ابراہیم نے کہا کہ اسماعیل

آئیں تو اُن کو میرا یہ پیغام دے دینا: ثبّت عتبة بابك (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 3364) یعنی اپنے گھر کی چوکھٹ کو باقی رکھو۔

حضرت ابراہیم نے اپنی اولاد کو صحرا میں بسا دیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ فطرت کے سادہ ماحول میں ایک نئی نسل پیدا ہو جو توحید کے مشن کو لے کر اٹھے اور اس کو دنیا میں پھیلائے۔ حضرت ابراہیم کے مذکورہ واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس اعلیٰ کام کے لیے جو افراد مطلوب ہیں، اُن کے اندر سب سے زیادہ یہ صفت ہونا چاہیے کہ وہ مثبت نفسیات میں جینے والے ہوں، وہ شکایات کی نفسیات سے مکمل طور پر خالی ہوں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ تزکیہ کے عمل میں سب سے زیادہ اہمیت کس بات کی ہے، وہ یہ کہ آدمی مکمل طور پر اپنے آپ کو بے شکایت بنا لے، شکایت کے اسباب ہوتے ہوئے وہ پوری طرح مثبت سوچ والا انسان بن جائے۔ منفی سوچ تزکیہ کی قاتل ہے، جب کہ مثبت سوچ تزکیہ کے لیے سب سے ضروری شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔ منفی سوچ والا آدمی شیطان کا معمول (subject) بن جاتا ہے۔ اِس کے برعکس، مثبت سوچ والا آدمی فرشتوں کی صحبت میں جینے لگتا ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ تزکیہ کا حصول فرشتوں کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔

تزکیہ کی اصل محاسبہ

حضرت عمر فاروق کا ایک قول ہے: حاسبوا أنفسكم قبل أن تحاسبوا (مسند الفاروق 2/618) یعنی اپنا محاسبہ کرلو، اِس سے پہلے کہ تمھارا محاسبہ کیا جائے۔ یہی محاسبہ تزکیہ کی اصل ہے۔ تزکیہ کسی تربیتی کیمپ کے ذریعے نہیں ہوتا۔ تزکیہ درس و تدریس کے ذریعے نہیں ہوتا۔ تزکیہ کسی قسم کے اعمال و اشغال کے ذریعے بھی نہیں ہوتا۔ تزکیہ کا واحد ذریعہ محاسبہ ہے، یعنی اپنا احتساب (introspection) کرنا، خود اپنا نگراں بن جانا، اپنے بارے میں سوچ سوچ کر خود اپنی اصلاح کرنا۔

انسان واحد مخلوق ہے جو سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ انسان کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ انسان تصوراتی فکر (conceptual thought) رکھنے والا حیوان ہے۔ آپ ایک لکڑی کو گڑھ سکتے ہیں، آپ لوہے کو مولڈ کر سکتے ہیں، لیکن انسان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اپنا مالک آپ ہے۔ وہ اپنی تشکیل آپ

کرتا ہے۔ انسان اگر خود نہ چاہے تو کوئی دوسرا شخص اس کی شخصیت سازی نہیں کرسکتا۔

یہی وجہ ہے کہ انسان کے تزکیہ یا اس کی شخصیت سازی میں تمام تر دخل ذاتی محاسبہ کا ہے۔ مربی یا مزکّی کا کام صرف یہ ہے کہ وہ انسان کے اندر ذاتی محاسبہ کا طاقت ور محرک (incentive) پیدا کردے، وہ انسان کے اندر یہ طرزِ فکر پیدا کردے کہ اگر میں نے اپنا تزکیہ نہ کیا تو میں ہلاک ہوجاؤں گا، اگر میں نے اپنی اصلاح نہ کی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ میں ہمیشہ کے لیے برباد ہوکر رہ جاؤں گا۔ مجھے اپنا تزکیہ خود کرنا ہے اور مجھے جو کچھ کرنا ہے وہ آج کرنا ہے، کیوں کہ کل کبھی آنے والا نہیں۔

انسان کا یہ مزاج ہے کہ وہ اپنی ہر غلطی کی توجیہہ (justification) تلاش کرلیتا ہے، اس کو ہمیشہ اپنے آپ کو درست ثابت کرنے کے لیے کچھ الفاظ مل جاتے ہیں۔ تزکیہ کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے اِس مزاج کو مکمل طور پر ختم کردیا جائے۔ مگر اِس مزاج کا خاتمہ انسان کے خود اپنے اختیار میں ہے، وہ کسی بھی دوسرے شخص کے اختیار میں نہیں۔

محاسبہ کیسے

تزکیہ کا اصل ذریعہ ذاتی محاسبہ (self introspection) ہے، یعنی اپنے بارے میں سوچنا، اپنے قول وعمل کا تجزیہ (analysis) کرنا، دوسرے لفظوں میں، محاسبہ یہ ہے کہ آدمی اپنا جج آپ بن جائے، وہ اپنے خلاف سوچے اور اپنے بارے میں انتہائی بے لاگ انداز میں رائے قائم کرے۔ اِسی کا نام احتساب یا محاسبہ ہے، اور اِس قسم کے محاسبہ کے بغیر کسی کا تزکیہ نہیں ہوسکتا۔

انسان کے اندر سب سے زیادہ طاقت ور جذبہ انا (ego) کا جذبہ ہے۔ یہ جذبہ اتنا زیادہ شدید ہے کہ ہر آدمی شعوری یا غیر شعوری طور پر أنا ولا غیری (میں، میرے سوا کوئی نہیں) کی نفسیات میں جیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر آدمی کے اندر بہت جلد خود فکری (self-thinking) کی نفسیات پیدا ہوجاتی ہے، یعنی خود پسندی کی نفسیات۔ اِس قسم کی نفسیات تزکیہ کی قاتل ہے۔ صحیح یہ ہے کہ آدمی کے اندر اینٹی سیلف سوچ (anti-self thinking) پیدا ہو۔ وہ اپنے خلاف سوچے اور اپنے خلاف سن سکے۔ عمر بن الخطاب کے اندر یہ جذبہ اتنا زیادہ شدید تھا کہ انھوں نے کہا — خدا اُس انسان

پر رحم کرے جو مجھے میرے عیب کا تحفہ بھیجے (رحم الله امرءاً أهدیٰ إليّ عیوبي)

محاسبہ کا یہ مزاج ایک دریافت سے پیدا ہوتا ہے، اور وہ ہے اپنے عجز (helplessness) کی دریافت۔تزکیہ کے طالب کو چاہیے کہ وہ دریافت کے درجے میں اِس حقیقت کو جانے کہ اس کا احساسِ میں (sense of I) صرف احساس کی حد تک محدود ہے۔ اپنے احساس کے باہر کسی بھی چیز پر اس کو کوئی اختیار نہیں — اپنے وجود کو باقی رکھنے پر اس کو کوئی اختیار نہیں، موت کے معاملے میں اس کو کوئی اختیار نہیں، لائف سپورٹ سسٹم (life support system) پر اس کو کوئی اختیار نہیں، آخرت کی عدالت میں اس کو کوئی اختیار نہیں، وغیرہ۔ جب کوئی آدمی اپنی اِس کامل بے اختیاری کو دریافت کرتا ہے تو اس کے اندر لازمی طور پر عجز کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور یہی عجز کا احساس آدمی کو اپنا محاسبہ آپ کرنے پر مجبور کردیتا ہے — اِسی دریافت میں تزکیہ کا اصل راز چھپا ہوا ہے۔

پرچہ آؤٹ

تزکیہ کے سچے طالب کے لیے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کو خدا کی طرف سے خواب دکھایا جاتا ہے۔ اِس خواب میں اس کو واضح رہنمائی دی جاتی ہے کہ اس کو آگے مزید کیا کرنا چاہیے۔ اِس طرح طالب کو یقین کے ساتھ اپنا چوائس (choice) لینے کا موقع مل جاتا ہے۔ تزکیہ کے ایک طالب کے لیے اس طرح کا خواب آنا اُسی طرح کی ایک خصوصی مہربانی ہے جیسے کسی اسٹوڈنٹ کے لیے اس کے امتحان کا پرچہ پیشگی طور پر آؤٹ کردیا جائے۔ جو شخص تزکیہ کا طالب ہو، اس کے سامنے کئی بار مختلف قسم کے سوالات آتے ہیں۔ اس کو دو میں سے ایک کا فیصلہ لینا ہوتا ہے۔ طالب اگر اِس طرح کے مواقع پر خدا سے دعا کرے تو عین ممکن ہے کہ خدا اس کی دعا کو قبول کرتے ہوئے اُس کو ایک ایسا خواب دکھا دے جس میں اس کے لیے رہنمائی موجود ہو، جو اس کو شبہہ اور تردد سے نکال کر یقین کی طرف لے جانے والا ہو۔

اس قسم کا خواب بلاشبہہ خدا کی ایک خصوصی رحمت ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص خواب دیکھنے کے باوجود اس سے رہنمائی حاصل نہ کرے تو اس کا معاملہ اُس طالب علم جیسا ہوجائے گا جس کا پرچہ آؤٹ کردیا جائے، اِس کے باوجود وہ امتحان میں ناکام رہے۔

تزکیہ پچاس فی صد بندے کا معاملہ ہے اور پچاس فی صد خدا کا معاملہ۔ تزکیہ کے طالب کو چاہیے کہ وہ مسلسل خدا سے دعا کرے۔ یہ دعا اس کے لیے خدا سے جوڑنے کا ذریعہ بنے گی۔ وہ اپنے معاملات میں خدا سے استخارہ کرے۔ استخارہ گویا کہ اپنے معاملات میں خدا کے ساتھ کاؤنسلنگ (counselling) کرنا ہے، اور خدا کے ساتھ کاؤنسلنگ کرنے والا کبھی بے راہ نہیں ہوتا۔ خدا اگر اس کو اس کے معاملے میں کوئی خواب دکھا دے تو اس کو سمجھنا چاہیے کہ خدا نے اس کے پرچے کو اس کے لیے آؤٹ کر دیا ہے، اب اس کے لیے کوئی دوسرا چوائس باقی نہیں رہا ہے۔ جس شخص کو خدا اِس حد تک رہنمائی دے دے، اور پھر بھی وہ اس رہنمائی کو قبول نہ کرے تو یہ اس کے لیے اتنا بڑا جرم ہوگا جو کسی بھی حال میں قابلِ معافی نہیں۔ خدا ایسے انسان سے کوئی عذر (excuse) قبول نہیں کرے گا، وہ اس کو ہمیشہ کے لیے اپنی قربت سے محروم کر دے گا۔

تزکیہ اور ترکِ دنیا

بعد کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے تزکیہ کے لیے ترکِ دنیا کا طریقہ اختیار کیا۔ لیکن تزکیہ کے لیے نفسیاتی معنوں میں دنیا سے بے رغبتی مطلوب ہے، نہ کہ عملی معنوں میں دنیا کو چھوڑ دینا۔ دنیا کو چھوڑنے کا نظریہ دراصل غیر داعیانہ ذہن کی پیداوار ہے۔ دنیا میں لازمی طور پر انسان بھی شامل ہیں۔ اِس لیے دنیا کو چھوڑنے کا مطلب انسان کو چھوڑنا بھی بن جاتا ہے۔ داعی اِس کا تحمل نہیں کر سکتا کہ وہ کسی بھی عذر کی بنا پر انسان کو چھوڑ دے۔ دوسرے لوگ انسان کو کسی اور نظر سے دیکھ سکتے ہیں، لیکن داعی انسان کو مدعو کی نظر سے دیکھتا ہے۔ داعی کی نظر میں ہر انسان مدعو ہے، خواہ وہ امیر ہو یا غریب، خواہ وہ عام ہو یا خاص، خواہ وہ حاکم ہو یا غیر حاکم، حتی کہ بظاہر وہ مخالف اور ظالم کیوں نہ ہو، داعی کی نظر میں ہر ایک صرف انسان ہے۔ داعی کی اولین خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر انسان تک سچائی کا پیغام پہنچائے۔

داعی اِس کا تحمل نہیں کر سکتا کہ وہ یہ کہے کہ فلاں شخص ایک دروازے سے آئے گا تو میں دوسرے دروازے سے نکل جاؤں گا۔ وہ یہ کہے گا کہ آنے والا شخص میرے لیے مدعو ہے، اس لیے میں آگے بڑھ کر اس سے ملوں گا اور حکمت کے ساتھ سچائی کا پیغام اس کو پہنچاؤں گا۔

ترکِ دنیا عملاً ترکِ مدعو ہے۔ ترکِ دنیا عملاً ان لوگوں سے دور جانا ہے جو ایک داعی کے لیے مطلوب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک تاجر ہر چیز کو چھوڑ سکتا ہے، لیکن وہ اپنے گاہک (customer) کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اِس طرح ایک داعی ہر دوسری چیز کو برداشت کرسکتا ہے، لیکن وہ اس کو برداشت نہیں کرسکتا کہ وہ مدعو کو چھوڑ کر کسی الگ تھلگ مقام پر چلا جائے۔ مدعو کے درمیان رہتے ہوئے اگر اس کو کوئی مصیبت پیش آتی ہے، اگر اس کے دامن پر کیچڑ کے دھبے لگ جاتے ہیں، تب بھی وہ کیچڑ کو نظر انداز کرے گا، لیکن وہ مدعو سے بے تعلقی کو برداشت نہیں کرسکتا۔ ایک مومن کا مطلوب جس طرح تزکیہ ہے، اسی طرح اس کا مطلوب دعوت بھی ہے، اور ایک سچے مومن کے لیے ممکن نہیں کہ وہ تزکیہ کو چھوڑ دے یا وہ دعوت سے دست بردار ہو جائے۔

تزکیہ کا محرک

اگر یہ کہا جائے کہ اسلام کا نشانہ (goal) صالح نظام قائم کرنا ہے۔ اِس صالح نظام کے لیے صالح افراد درکار ہیں۔ تزکیہ کا مقصد یہ ہے کہ ایسے صالح افراد تیار کئے جائیں جو صالح نظام بنا سکیں۔ یہ بات کہنے میں بظاہر بے ضرر معلوم ہوتی ہے، لیکن وہ تزکیہ کے پراسس کے لیے بلاشبہہ قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اِس قسم کے تصورِ اسلام کے تحت کبھی تزکیہ کا عمل موثر طور پر جاری نہیں ہوسکتا۔

اِس امتحان کی دنیا میں انسان کو ایسے حالات کے درمیان رہنا پڑتا ہے جہاں ہر طرف تزکیہ کے خلاف اسباب موجود ہیں۔ ایسی حالت میں تزکیہ کا عمل جاری کرنے کے لیے نہایت طاقت ور محرک (strong incentive) درکار ہے۔ اور طاقت ور محرک وہی ہوسکتا ہے جس میں سارا فوکس اپنی ذات پر ہو، نہ کہ کسی خارجی نظام پر۔

حقیقی تزکیہ کے لیے ضروری ہے کہ آدمی یہ محسوس کرے کہ تزکیہ کے بغیر وہ ہرگز کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔ تزکیہ نہ کرنے کی صورت میں اس کے لیے ابدی محرومی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اِس قسم کے طاقت ور محرک کے بغیر کبھی کوئی شخص تزکیہ پر کاربند نہیں ہوسکتا۔ حقیقی تزکیہ کے لیے شدید محاسبہ درکار ہوتا ہے اور شدید محاسبہ کبھی کسی خارجی نظام کی نسبت سے پیدا نہیں ہوسکتا۔

اگر میں نے اپنا تزکیہ نہ کیا تو میں ہلاک ہوجاؤں گا— اِس قسم کا گہرا محرک کسی شخص کے اندر صرف اُسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جب کہ تزکیہ اس کے لیے ایک انتہائی ذاتی مسئلہ ہو، نہ کہ کوئی خارجی مصلحت یا دُور کی کوئی ضرورت۔ نظام ایک خارجی چیز ہے جس کا تعلق پورے معاشرے سے ہوتا ہے۔ اِس قسم کا حوالہ کسی آدمی کے اندر طاقت ور محرک بن کر داخل نہیں ہوسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تزکیہ ہمیشہ اپنی ذات کے حوالے سے کسی کی زندگی میں شامل ہوتا ہے، نہ کہ کسی خارجی نظام کے حوالے سے۔

تزکیہ تیاری کا عمل

موجودہ مادی دنیا میں ہر آدمی کو روزگار کی ضرورت ہوتی ہے جس کو جاب (job) کہا جاتا ہے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ اس کو ایک اچھا جاب ملے۔ اس کے لیے ہر آدمی اپنے آپ کو جاب مارکیٹ کے تقاضے کے مطابق، ایک تیار انسان (professionally prepared person) بناتا ہے۔ جو آدمی اِس اعتبار سے اپنے آپ کو تیار نہ کر سکے، وہ ساری عمر کے لیے ایک ناکام انسان بن کر رہ جاتا ہے۔

یہی معاملہ شدید تر انداز میں آخرت کی دنیا کا ہے۔ آخرت کی دنیا نہایت اعلیٰ قسم کی ربانی سرگرمیوں کی دنیا ہے۔ آخرت کی دنیا میں وہی شخص کامیاب ہوگا جو موجودہ دنیا میں اس کے مطابق تیاری کرے، جو موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو روحانی اعتبار سے ایک تیار انسان (spiritually prepared person) بنائے۔ جو آدمی موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو اِس پہلو سے تیار نہ کرسکے، وہ آخرت میں ایک ناکام انسان بن کر رہ جائے گا۔

یہ سارا معاملہ لیاقت (competence) کا معاملہ ہے۔ ایک قسم کی لیاقت دنیا میں کام آتی ہے اور دوسری قسم کی لیاقت آخرت میں کام آئے گی— دنیا میں بظاہر شرک کام آتا ہے۔ آخرت میں توحید کام آئے گی۔ دنیا میں اپنے آپ کو کنسرن (concern) بنانا کام آتا ہے، آخرت میں خدا کو کنسرن بنانا کام آئے گا۔ دنیا میں چیزوں کو مادی اینگل (material angle) سے دیکھنا کام آتا ہے، آخرت میں چیزوں کو اسپریچول اینگل سے دیکھنا کام آئے گا۔ دنیا میں مفاد پرستی کام آتی ہے، آخرت میں وہ شخص کامیاب ہوگا جو اپنے آپ کو ایک اصول پسند انسان ثابت کرے۔ دنیا میں بظاہر بددیانتی

(dishonesty) کام آتی ہے، آخرت میں دیانت داری(honesty) کام آئے گی۔ دنیا میں حُبِّ عاجلہ (immediate interest) کا مزاج کام آتا ہے، آخرت میں وہ شخص کامیاب ہوگا جس نے حُبِّ آخرت کی بنیاد پر اپنی زندگی کی تعمیر کی ہو۔

تزکیہ کا مطلب اپنے آپ کو آخرت کے اعتبار سے تیار کرنا ہے، یعنی اپنے اندر وہ اوصاف پیدا کرنا جو موت کے بعد آنے والی دنیا میں آدمی کے کام آئیں۔

تزکیہ کا آئٹم تلاش کرنا

تزکیہ کا وسیلہ اپنی سوچ کو متحرک کرنا ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی زندگی کے اُن واقعات کو یاد کریں جب کہ آپ کسی بڑی مصیبت میں پھنسنے والے تھے، مگر اللہ نے اپنی خصوصی مدد سے آپ کو اُس سے بچالیا۔ ایسے حادثات اور واقعات ہر آدمی کی زندگی میں ہوتے ہیں، مگر بعد کو آدمی ان حادثات اور واقعات کو بھول جاتا ہے۔

تزکیہ کے طالب کو چاہیے کہ وہ بار بار سوچ کر ایسے واقعات کو اپنے ذہن میں تازہ کرے جب کہ وہ تباہی کے عین کنارے پر پہنچ چکا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے خصوصی مداخلت کرکے اس کو بچالیا۔ ان واقعات کو وہ شدت کے ساتھ یاد کرے اور پھر کہے کہ خدایا، تو نے مجھے دنیا کی زندگی میں بار بار بھیانک انجام سے بچالیا۔ اسی طرح تو مجھے آخرت میں جہنم کے ہولناک عذاب سے بچالے۔

اِسی طرح اِس معاملے کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ اپنی کوتاہیوں کو یاد کرکے اپنے اندر احساسِ خطا کو بیدار کریں۔ کسی معاملے میں اگر آپ محسوس کریں کہ آپ 99 فی صد درست تھے، صرف ایک فی صد آپ غلط تھے، تو ایسے موقع پر آپ یہ کریں کہ 99 فی صد کو بھلا دیں اور ایک فی صد کو اتنا زیادہ بڑھائیں کہ آپ کو محسوس ہو کہ گویا ساری غلطی آپ ہی کی تھی۔ اس طرح آپ کے اندر احساسِ خطا جاگے گا۔ آپ خوفِ خدا سے کانپ اٹھیں گے، آپ شدتِ انابت کے ساتھ اللہ سے توبہ کی درخواست کرنے لگیں گے۔

تزکیہ کوئی پراسرار چیز نہیں، تزکیہ کا ایک معلوم پراسس ہے، اور وہ ہے بار بار تزکیہ سے تعلق

رکھنے والے پہلوؤں پر سوچنا۔ تزکیہ ہمیشہ شعوری بیداری کا نتیجہ ہوتا ہے، نہ کہ کسی پر اسرار کرشمہ کا نتیجہ۔ کوئی شخص جتنا زیادہ اِس معاملے میں سوچے گا، اتنا ہی زیادہ اس کا تزکیہ ہوگا۔ تزکیہ پورے معنوں میں ایک شعوری عمل ہے۔ اِس شعوری عمل کے بغیر تزکیہ کو پانے کی امید رکھنا صرف ایک خوش خیالی (wishful thinking) ہے جو کبھی واقعہ بننے والی نہیں۔

تزکیہ ذریعۂ قربت

انسان مخلوق ہے اور خدا اس کا خالق ہے۔ اِس لحاظ سے انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ اپنے خالق سے آخری حد تک قریب ہو، مگر مختلف چیزیں انسان کو خدا سے دور کر دیتی ہیں۔ مثلاً فخر، منفی سوچ، وغیرہ۔ تزکیہ کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو اِس قسم کے منفی جذبات سے مکمل طور پر پاک کیا جائے۔ آدمی جیسے ہی اپنے آپ کو اس قسم کے غیر ربانی جذبات سے پاک کرتا ہے، اچانک وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے خالق سے آخری حد تک قریب ہوگیا ہے۔ وہ اپنے آس پاس خدا کی موجودگی (presence of God) کا تجربہ کرنے لگتا ہے۔

خدا سے گہری قربت صرف اُس وقت ہوسکتی ہے جب کہ انسان خدا کو اس کے اعلیٰ ترین اوصاف کے ساتھ دریافت کرے۔ مثلاً ہر انسان دنیا میں رہنے کے لیے بے شمار چیزوں کا محتاج ہے۔ یہ چیزیں اس نے خود نہیں پیدا کی ہیں، اس کا ایک دینے والا ہے اور وہ دینے والا بلاشبہہ خدا ہے۔ خدا ہی وہ ہستی ہے جو اس کا واحد منعم اور معطی (giver) ہے۔ یہ بلاشبہہ خدا کے یک طرفہ انعامات ہیں جن کی بنا پر وہ اِس دنیا میں زندہ اور قائم ہے۔ ایک لمحہ کے لیے اگر اِس یک طرفہ عطیہ کا سلسلہ ٹوٹ جائے تو انسان اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتا۔

جب ایک انسان اِس طرح خدا کو اپنے منعم کی حیثیت سے دریافت کرتا ہے تو اس کے فطری نتیجہ کے طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اس کی روح کے اندر خدا سے محبت کا چشمہ جاری ہوجاتا ہے۔ وہ اُس حقیقت کی تصویر بن جاتا ہے جس کو قرآن میں: والذین آمنوا أشدّ حبًّا لله (2:165) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ قرآن میں سجدۂ قربت (96:19) کا ذکر ہے۔ یہ سجدہ قربت کیا ہے۔ یہ سجدہ قربت دراصل اُس

انسان کا سجدہ ہے جو اپنے رب کے لیے محبت اور خشیت سے سرشار ہو اور اِس سرشاری کے تحت وہ اپنے رب کے سامنے سجدہ میں گر پڑے — اِس قسم کا سجدہ ایک مومن کے لیے گویا کہ تزکیہ کی معراج ہے۔

تزکیہ اور موت کی یاد

تزکیہ کے عمل کے لیے موت کی یاد بہت طاقت ور ذریعہ ہے۔ موت کی یاد تزکیہ کو فی الفور کرنے کے ایک کام کی حیثیت دے دیتی ہے۔ موت کی یاد آدمی کے اندر اِس پہلو سے ایک سینس آف ارجینسی (sense of urgency) پیدا کرتی ہے۔ موت آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ تزکیہ کے عمل میں تاخیر کا تم تحمل نہیں کر سکتے، تزکیہ کا کام آج کر ڈالو، کیوں کہ کل کے بارے میں نہیں معلوم کہ وہ تمھارے لیے موت کا دن ہوگا یا زندگی کا دن۔

موت کا تصور آدمی کو یاد دلاتا ہے کہ تم پر کسی بھی لمحہ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ تم مر جاؤ گے۔ اس کے بعد تم کو اُس سنگین صورتِ حال کا سامنا پیش آنے والا ہے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **یوم یقوم الناسُ لربّ العالمین** (83:6) یعنی مالکِ کائنات کے سامنے انسان کا کھڑا کیا جانا۔ یہ وہ دن ہوگا جب کہ فرشتے انسان کو لے جا کر خدا کے سامنے پیش کر دیں گے۔ خدا جو ہر کھلے اور چھپے کو جانتا ہے، وہ انسان سے اُس کے قول وعمل کا حساب لے گا۔ ایک حدیث کے مطابق، انسان کے قدم اُس وقت تک اللہ کے سامنے سے نہیں ہٹیں گے جب تک وہ اللہ کے سوالات کا جواب نہ دے دے (**لاتزول قدما عبد یوم القیامة حتی یُسأل عن أربع**) **الترمذي، رقم الحدیث**: 2417۔

موت کو یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے اِس نازک ترین لمحہ کو یاد کرے۔ وہ اُس آنے والے وقت کے بارے میں سوچتا رہے جو بہر حال اُس پر آئے گا۔ اُس دن اُس کے ابدی مستقبل (eternal future) کا فیصلہ کیا جائے گا۔

یہ سوچ بلاشبہہ ایک ایسی سوچ ہے جو آدمی کے اندر زلزلہ پیدا کر دے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص اِس طرح موت کے بارے میں سوچے، وہ اپنے تزکیہ کے بارے میں بے حد فکر مند ہو جائے گا۔ وہ

آخری حد تک یہ کوشش کرے گا کہ وہ ہر پہلو سے اپنا تزکیہ کر ڈالے، اِس سے پہلے کہ اُس پر موت آئے اور اس کے لیے اپنی اصلاح کا وقت باقی نہ رہے۔

تزکیہ کا مقصد

قرآن کی سورہ الزمر میں اہل جنت کے معاملہ کو اِس طرح بتایا گیا ہے: ''اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرے، وہ گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو جنت کے دروازے کھول دئے جائیں گے اور جنت کے محافظ اُن سے کہیں گے کہ سلام ہو تم پر، خوش حال رہو، پس تم جنت میں داخل ہو جاؤ ہمیشہ کے لیے۔ اور وہ کہیں گے کہ شکر ہے اُس اللہ کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور اُس نے ہم کو اِس زمین کا وارث بنا دیا۔ ہم جنت میں جہاں چاہیں، مقام کریں۔ پس کیا خوب بدلہ ہے عمل کرنے والوں کا۔ اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ وہ عرش کے گرد حلقہ بنائے ہوئے اپنے رب کی حمد و تسبیح کرتے ہوں گے۔ اور لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ ساری حمد اللہ کے لیے ہے، عالم کا خداوند''۔ (39: 73-75)

الحمدللہ رب العالمین کی آیت سورہ الفاتحہ میں موجود دنیا کی نسبت سے آئی ہے۔ سورہ الزمر کے مذکورہ اقتباس میں یہ آیت دوبارہ آخرت کی دنیا کے لیے آئی ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان سے اصل چیز جو مطلوب ہے، وہ حمدِ خداوندی ہے۔ یہی چیز موجودہ دنیا میں بھی مطلوب ہے اور آخرت میں بھی یہی چیز مطلوب ہوگی — تزکیہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ ایسی پاک روحیں (purified souls) وجود میں آئیں جو آخرت میں مبنی بر حمد نظامِ حیات کا حصہ بن سکیں۔

موجودہ دنیا میں انسان کا ایک کام یہ تھا کہ وہ ایک تہذیب (civilization) کو وجود میں لائے۔ انسان نے بڑے پیمانے پر یہ کام انجام دیا، حجری دور (stone age) سے آغاز کر کے اُس نے اس کو الیکٹرانک دور (electronic age) تک پہنچا دیا۔ یہ کام فطرت کے قوانین کو دریافت کرنے کے ذریعہ انجام پایا، لیکن عملاً یہ ہوا کہ انسان نے ایک صحیح کام میں غلط کام کو ملا دیا۔ فطرت کی طاقتوں پر قابو پانے کے بعد وہ سرکش بن گیا، اس نے استبدادی نظام (despotic system) قائم کیا، اس نے

آزادی کے نام پر انارکی (anarchy) پھیلائی، اس نے فیشن کے نام پر عریانیت (nudity) کو رواج دیا، وغیرہ۔ اِس لیے قیامت میں یہ ہوگا کہ صالح لوگوں کو منتخب کر کے ان کو یہ موقع دیا جائے گا کہ وہ ربانی تہذیب کو زیادہ بہتر طور پر قائم کریں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن کی ایک آیت میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے: أن الأرض یرثھا عبادي الصالحون (22: 105)

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی معرفت کا ایک سفر ہے۔ یہ سفر دنیا سے لے کر آخرت تک چلا جارہا ہے۔ دنیا میں معرفت کا سفر محدود طور پر انجام پاتا ہے، آخرت میں معرفت کا سفر لامحدود طور پر جاری رہے گا۔ اِس سفر کو کامیابی کے ساتھ وہی شخص طے کرسکتا ہے جو اپنا تزکیہ کر کے اپنے آپ کو اس کا اہل بنائے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے کلمات اتنے زیادہ ہیں کہ اگر دنیا کے تمام سمندروں کو اور ان کے برابر مزید سمندروں کو سیاہی (ink) بنا دیا جائے اور دنیا کے تمام درختوں کو قلم بنا دیا جائے اور پھر اللہ کے کلمات کو لکھنا شروع کیا جائے تو تمام سمندروں کی سیاہی ختم ہو جائے گی، مگر اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے (31: 27)۔

یہ بات جو قرآن میں کہی گئی ہے، وہ خبر نہیں ہے بلکہ وہ انشاء ہے، یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان کو چاہیے کہ وہ اللہ کے ان کلمات کو دریافت کریں اور اِس طرح وہ اپنی معرفت کو مسلسل بڑھاتے رہیں۔ قرآن کی پہلی آیت یہ ہے: الحمد للہ رب العالمین (1:1) یہ آیت بھی خبر نہیں ہے، بلکہ وہ انشاء ہے۔ یہ آیت دریافتِ معرفت کے دنیوی آغاز کو بتاتی ہے۔ دوسری جگہ قرآن میں آخرت کے حوالے سے یہی آیت اِس طرح آئی ہے: وقیل الحمد للہ رب العالمین (39:75)۔ یہ دوسری آیت دریافتِ معرفت کے اگلے مرحلے کو بتاتی ہے جو آخرت کے زیادہ بہتر ماحول میں ابد تک جاری رہے گا۔

ایک حدیث میں بتایا گیا ہے کہ: إن اللہ لیؤیّد ھذا الدین بالرجل الفاجر (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 3062) اِس حدیث میں جس دینی تائید کا ذکر ہے، اس کا سب سے بڑا مصداق غالباً انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے سائنس دانوں کا عمل ہے۔ انھوں نے معرفت کے حصول کے لیے ایک سائنٹفک فریم ورک دیا۔ آخرت میں اِس سفرِ معرفت کو

جاری رکھنے کے لیے اہلِ ایمان کو زیادہ اعلیٰ درجے کے مؤیدین حاصل ہوں گے۔ یہ ملائکہ ہوں گے، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: **نحن أولیائکم فی الحیاۃ الدنیا وفی الآخرۃ** (41: 31)۔

تزکیہ کا معیار

قرآن کی سورہ الشّمس میں ارشاد ہوا ہے: **قد أفلح مَن زکّاھا، وقد خاب مَن دسّاھا** (91: 9-10) یعنی کامیاب ہوا، وہ شخص جس نے اپنے آپ کو پاک کیا، اور ناکام ہوا وہ شخص جس نے اپنے آپ کو آلودہ کیا۔ قرآن کی اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تزکیہ اصل میں اِس بات کا نام ہے کہ آدمی اپنی خداداد شخصیت کو آلودگی سے بچائے۔ اپنی پیدائشی فطرت کے اعتبار سے، ہر انسان وہی پاک شخصیت لے کر اِس دنیا میں آتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ لیکن دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے وہ اپنی خداداد فطرت کو مسلسل آلودہ کرتا رہتا ہے۔ جدید اصطلاح میں، اِسی کا نام کنڈیشننگ (conditioning) ہے۔

اِس اعتبار سے، تزکیہ کا معیار یہ ہے کہ آدمی اپنا محاسبہ کرکے اپنی کنڈیشننگ کو جانے اور ''اپنی اصلاح آپ'' کے اصول پر، اپنی ڈی کنڈیشننگ (de-conditioning) کرکے وہ اپنے آپ کو اُس حالتِ فطری کی طرف واپس لے جائے جو اُس کو خالق کی طرف سے پیدائشی طور پر دی گئی تھی۔ مزکّٰی شخصیت (purified personality) دوسرے لفظوں میں، ڈی کنڈیشنڈ شخصیت (de-conditioned personality) کا دوسرا نام ہے۔ جو آدمی اِس طرح اپنا تزکیہ کرے، وہی وہ شخص ہے جو آخرت کی دنیا میں جنت میں داخلے کا مستحق قرار پائے گا۔

تزکیہ کا معیار (criterion) کیا ہے۔ تزکیہ کا معیار یہ ہے کہ آدمی کو اسلامی طرزِ فکر اور اسلامی طرزِ عمل سے اتنی زیادہ مناسبت پیدا ہو جائے کہ وہ اس کو اپنے دل کی آواز محسوس کرنے لگے۔ وہ کسی گرانی کے بغیر اس کو فوراً قبول کر لے، خواہ وہ اس کے موافق ہو یا اس کے خلاف۔

تزکیہ کا اصل مقصد تعلق باللہ بتایا گیا ہے۔ یہ بالکل درست ہے۔ اِس کو دوسرے لفظوں میں اِس طرح کہا جا سکتا ہے کہ تزکیہ کی پہچان یہ ہے کہ بندے کا سول کنسرن (sole concern) صرف

ایک ہستی بن جائے، اور وہ خدا کی ہستی ہے۔ اِسی کا اصطلاحی نام توحید ہے، یعنی شرک سے مکمل طور پر پاک ہونا اور اللہ کو مکمل طور پر اپنا مرکزِ توجہ بنالینا۔

خدا کو اپنا سول کنسرن بنانا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ آدمی کی ذات میں کامل انقلاب کے ہم معنیٰ ہے۔ ایسے انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ پورے معنوں میں خدا کو، دینے والا (giver) سمجھنے لگتا ہے، اور اپنے آپ کو پورے معنوں میں پانے والا (taker)۔ اس کی سوچ خدارخی سوچ بن جاتی ہے۔ اس کے جذبات کا مرکز خدا بن جاتا ہے، اس کی بات اور اس کے کردار میں خدا کا رنگ دکھائی دینے لگتا ہے، اس کے اندر کامل معنوں میں تواضع (modesty) پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ ایک کٹ ٹو سائز انسان (man cut to size) بن جاتا ہے، دوسروں کے لیے اس کے دل میں نفرت کے بجائے خیر خواہی پیدا ہوجاتی ہے، اس سے لوگوں کو اکڑ کے بجائے اعتراف کا تجربہ ہونے لگتا ہے، وہ ہر معاملے میں اپنی غلطی ڈھونڈنے لگتا ہے، بجائے اس کے کہ وہ دوسروں کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرے، وہ بولنے سے زیادہ خاموشی کو پسند کرنے لگتا ہے، آگے کی سیٹ حاصل کرنے کے بجائے پیچھے کی سیٹ اس کے لیے محبوب بن جاتی ہے، وہ بولنے سے پہلے یہ سوچتا ہے کہ میری بات خدا کے یہاں قابلِ قبول ہوگی یا وہ خدا کے یہاں رد کردی جائے گی، وہ تنہائی میں بھی اُسی طرح محتاط ہوجاتا ہے جس طرح کوئی شخص مجمع کے درمیان محتاط ہوتا ہے۔

اسپریچول سویلائزیشن کی طرف

انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ خدا کی تخلیق میں چھپی ہوئی نشانیوں کو دریافت کرے اور اعلیٰ معرفت کی سطح پر خدا کی حمد کرے، اِس طرح وہ ایک ربانی سویلائزیشن کو وجود میں لائے۔ موجودہ دنیا میں انسان کو امتحان کی وجہ سے آزادی دی گئی تھی۔ اِس آزادی کا غلط استعمال کرکے اس نے موجودہ دنیا میں ربانی سویلائزیشن کے بجائے سیکولر سویلائزیشن کی تشکیل کی۔

مگر خدا کا اصل مطلوب ربانی سویلائزیشن ہے، نہ کہ سیکولر سیولائزیشن۔ بہت جلد یہ ہونے والا ہے کہ موجودہ دنیا ختم کردی جائے اور ایک نئی بہتر دنیا بنائی جائے۔

اِسی نئی دنیا کو آخرت کہا جاتا ہے۔ آخرت میں یہ ممکن ہوگا کہ خدا کے مطلوب کے مطابق، ایک اعلیٰ ربانی سویلائزیشن کی تشکیل کی جائے۔ یہاں یہ ممکن ہوگا کہ خدا کی اعلیٰ معرفت ظاہر ہو۔ خدا کی مرضی کے مطابق، ایک آئڈیل معاشرہ (ideal society) بنے۔ یہ ایک پرفیکٹ دنیا ہوگی، جہاں انسان کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ اس کو ہر اعتبار سے فلفلمنٹ (fulfilment) کی زندگی حاصل ہوجائے۔

تزکیہ کا مقصد یہ ہے کہ اس آنے والے ربانی معاشرہ یا اسپریچول سویلائزیشن کے لیے صالح افراد حاصل کئے جائیں۔ صالح انسان کا مطلب ہے، درست انسان (right person)۔ تزکیہ کا مقصد یہ ہے کہ جنت کے معاشرے کے لیے ایسے افراد تیار کیے جائیں جو وہاں کے معیاری ماحول میں رہنے کے اہل ہوں جن کی سوچ، جن کی گفتگو، جن کی عادتیں، جن کا ذوق، غرض ہر اعتبار سے وہ اُس کردار کے مالک ہوں جو آخرت میں بننے والی جنت کے لیے مطلوب ہے۔

موجودہ دنیا اِسی قسم کے افراد کی تیاری کے لیے بنائی گئی ہے اور اِسی تیاری کا نام تزکیہ ہے۔ یہ تزکیہ ہر آدمی خود اپنے ذاتی محاسبہ کے ذریعے انجام دیتا ہے۔ جنت کے معاشرے میں جو اَحوال پیش آنے والے ہیں، وہ سب موجودہ دنیا میں بار بار پیش آتے ہیں۔ فرشتے اِس اعتبار سے ہر انسان کا ریکارڈ تیار کررہے ہیں، یعنی تعلقات اور معاملات کے دوران آدمی نے کس طرح کا رسپانس (response) دیا، جنتی رسپانس یا غیر جنتی رسپانس۔ ربانی رسپانس، یا غیر ربانی رسپانس۔ درست رسپانس یا نادرست رسپانس۔ ذمے دارانہ رسپانس یا غیر ذمہ دارنہ رسپانس۔ فرشتوں کے اِس ریکارڈ پر اُن لوگوں کو چُنا جائے گا جنھوں نے دنیا کی زندگی میں مطلوب رسپانس دیا تھا۔

یہی منتخب لوگ جنتی دنیا کے وارث ہوں گے اور یہی لوگ وہاں ربانی سویلائزیشن بنائیں گے جس کی تشکیل کا پراسس ابد تک جاری رہے گا۔ جس طرح خدا کے کلمات (31: 27) کی کوئی حد نہیں، اِسی طرح ربانی تہذیب کے پراسس (process) کی بھی کوئی حد نہیں۔

روحانی ترقی

روحانی ترقی کیا ہے۔ روحانی ترقی اپنی داخلی شخصیت میں ربانی بیداری لانے کا دوسرا نام ہے۔ مادی خوراک انسان کے جسمانی وجود کوصحت مند بناتی ہے۔ اسی طرح انسان کا روحانی وجودان لطیف تجربات کے ذریعہ صحت مند بنتا ہے جن کوقرآن میں رزقِ رب (20:131) کہا گیا ہے۔

16 جولائی 2004 کا واقعہ ہے۔ اس دن دہلی میں سخت گرمی تھی۔ دوپہر بعد دیر تک کے لیے بجلی چلی گئی۔ چھت کا پنکھا بند ہوگیا۔ میں اپنے کمرے میں سخت گرمی کی حالت میں بیٹھا ہوا تھا۔ دیر تک میں اسی حالت میں رہا یہاں تک کہ بجلی آگئی اور پنکھا چلنے لگا۔

یہ ایک اچانک تجربے کا لمحہ تھا۔ پنکھا چلتے ہی جسم کوٹھنڈک ملنے لگی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اچانک مصیبت کا دور ختم ہوگیا اور اچانک راحت کا دوسرا دور آگیا۔ اس وقت مجھے پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیثیں یاد آئیں جن میں بتایا گیا ہے کہ دنیا مومن کے لیے مصیبت کی جگہ ہے۔ جب مومن کی موت آئے گی تو اچانک وہ اپنے آپ کو جنت کے باغوں میں پائے گا۔ دنیوی زندگی کا پرمصیبت دور اچانک ختم ہوجائے گا اور عین اسی وقت اُخروی زندگی کا پُر راحت دور شروع ہوجائے گا۔

جب یہ تجربہ گزرا تو میری فطرت میں چھپے ہوئے ربّانی احساسات جاگ اٹھے۔ مادی واقعہ روحانی واقعہ میں تبدیل ہوگیا۔ میرے دل نے کہا کہ کاش، خدا میرے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرمائے۔ جب میرے لیے دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آئے تو وہ ایک ایسا لمحہ ہو جو اچانک دورِ مصیبت سے دورِ راحت میں داخلے کے ہم معنٰی ہوجائے۔

روحانیت دراصل ایک ذہنی سفر (intellectual journey) ہے، ایک ایسا سفر جو آدمی کو مادیت سے اوپر اُٹھا کر معنویت تک پہنچادے۔ یہ سفر داخلی سطح پر ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ بظاہر اس سفر کو نہیں دیکھتے، لیکن خود مسافر انتہائی گہرائی کے ساتھ اس کو محسوس کرتا ہے۔ روحانیت انسان کو انسان بناتی ہے۔ جس آدمی کی زندگی روحانیت سے خالی ہو، اُس میں اور حیوان میں کوئی فرق نہیں۔

محاسبہ کیا ہے

ایک روایت کے مطابق، خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق نے فرمایا: **حاسبوا أنفسکم قبلَ أن تحاسبوا، وزنوا أنفسکم قبل أن توزنوا** (شرح السنة للبغوی، رقم الحدیث: 4117) یعنی تم خود اپنا حساب کرلو، اِس سے پہلے کہ تمھارا حساب کیا جائے۔ اپنے آپ کو تول لو، اِس سے پہلے کہ تم کو تولا جائے۔

اِس قول سے اپنی اصلاح کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ آدمی اگر اِس اصول کو پکڑ لے تو یہی اصول اس کی اصلاح اور تزکیہ کے لیے کافی ہوجائے۔

محاسبہ (introspection) کا مطلب کیا ہے، محاسبہ دراصل اپنی غلطی کو دریافت کرنے کی کوشش کا نام ہے۔ انسان سے بار بار یہ غلطی ہوتی ہے کہ وہ سچائی کی صراطِ مستقیم سے ہٹ جاتا ہے۔ اِسی نقطۂ انحراف کو ڈسکور کرنے کا نام محاسبہ ہے:

Discover the point of your deviation from the truth.

غلطی کی نفسیات یہ ہے کہ اگر آدمی انحراف کے آغاز میں اس کو دریافت کرلے تو آسانی کے ساتھ وہ اس کی اصلاح کرسکتا ہے، لیکن جب اُسی حالت پر لمبی مدت گزر جائے تو اس کے بعد غلطی کی اصلاح تقریباً ناممکن ہوجاتی ہے۔ اِس لیے آدمی کو اِس معاملے میں بہت زیادہ چوکنا رہنا چاہیے۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ آغاز میں غلطی کا معاملہ صرف انحراف کا معاملہ ہوتا ہے، لیکن بعد کو وہ کنڈیشننگ (conditioning) کا معاملہ بن جاتا ہے۔ انحرافِ اول کے وقت آدمی کا ضمیر (conscience) اس کو متنبہ کرتا ہے، لیکن اگر وہ ابتدائی انتباہ (warning) کے وقت اپنی اصلاح نہ کرے تو دھیرے دھیرے اس کی غلطی اس کے معمول کی زندگی میں شامل ہوجاتی ہے، وہ اس کے ذہن کا حصہ بن جاتی ہے، حتی کہ وہ اس کے لاشعور (unconscious mind) میں داخل ہوجاتی ہے۔ جب ایسا ہوجائے تو اس کے بعد اصلاح کا امکان عملاً ختم ہوجاتا ہے۔

عادت کو چھوڑنا

اسلام کا کلمہ ہے: لا الٰہ الّا اللّٰہ ۔ اِس کلمے کے مطابق، پہلے نفی کا درجہ ہے اور اس کے بعد اثبات کا درجہ۔ کوئی آدمی جب تک غیر اللہ کی نفی نہ کرے، اُس کو اللہ کے اقرار کا درجہ نہیں مل سکتا۔ دونوں یکساں طور پر کلمۂ توحید کا جُز ہیں۔ اُن میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

یہ فطرت کا قانون ہے۔ یہ فطرت کا ابدی اصول ہے کہ ایک چیز کو چھوڑنے کے بعد ہی آدمی کو دوسری چیز ملے۔ خدا کی بنائی ہوئی اِس دنیا میں کسی انسان کو کوئی حقیقی چیز اُسی وقت مل سکتی ہے جب کہ وہ اس سے پہلے غیر حقیقی چیزوں کو چھوڑ چکا ہو۔ غیر حقیقی چیز کو نہ چھوڑنا اور حقیقی چیز کو پانے کی امید رکھنا، یہ دونوں چیزیں صرف ایک خوش فہم انسان کے دماغ میں فرضی طور پر اکھٹا ہوسکتی ہے، مگر حقیقت کی دنیا میں اِس طرح کی یکجائی ممکن نہیں۔

جو عورت یا مرد سچائی کا مسافر بننا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ فطرت کے اِس قانون کو جانے۔ مثلاً اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کی زندگی میں غلط عادتیں شامل ہوجاتی ہیں۔ یہ عادتیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ مثلاً ہنسی مذاق کی باتیں، پان سگریٹ کا استعمال۔ فضول خرچی، نمائشی کام، تفریحی مشغلے، لطیفہ گوئی، گپ شپ، رواجی تکلّفات، اور رسمی تحفے تحائف کی بے معنیٰ دھوم۔

اِس قسم کی مختلف عادتیں ہیں جن میں لوگ مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اِن عادتوں کا بیک وقت دو بڑا نقصان ہے۔ ایک، یہ کہ یہ عادتیں انسان کے اندر سطحیت پیدا کرتی ہیں۔ وہ آدمی کو اعلیٰ ذوق سے محروم کر دیتی ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ یہ عادتیں آدمی کے وقت اور اس کے وسائل کا بڑا حصہ کھا جاتی ہیں۔ آدمی اِس قابل نہیں رہتا کہ وہ کسی سنجیدہ کام میں اپنے آپ کو بھرپور طور پر لگا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ غلط عادتیں قاتل عادتیں ہیں۔ وہ انسان کو انسان کے درجے سے گرا کر حیوان کے درجے تک پہنچا دیتی ہیں۔

مثبت شخصیت کی تعمیر

روسو (Jean Jacques Rousseau) فرانس کا مشہور جمہوری مفکر ہے۔ وہ 1712 میں پیدا ہوا اور 1778 میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ شخصی بادشاہت کے مقابلے میں عوامی حکمرانی کا علم بردار تھا۔ وہ اپنی مشہور کتاب معاہدۂ عُمرانی (Social Contract) کا آغاز اس جملے سے کرتا ہے — انسان آزاد پیدا ہوا تھا، مگر میں اس کو زنجیروں میں بندھا ہوا دیکھتا ہوں:

Man was born free, but I see him in chain.

مگر انسان کا ایک اور مسئلہ ہے جو شاید اس سے بھی زیادہ سنگین ہے، اور وہ کنڈیشننگ ہے۔ ہر عورت اور مرد کسی ماحول میں رہتے ہیں۔ ماحول کی نسبت سے ہر ایک کے ذہن کی کنڈیشننگ ہو جاتی ہے جو اس کو صحیح طرزِ فکر سے محروم کر دیتی ہے۔ آدمی اس قابل نہیں رہتا کہ وہ فطری انداز میں سوچ سکے۔ اِس مسئلے کو دیکھتے ہوئے روسو کے جملے کو زیادہ بہتر طور پر اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ — انسان خدائی فطرت پر پیدا ہوا تھا، مگر وہ ہر جگہ کنڈیشنڈ دکھائی دیتا ہے:

Man was created on divine nature, but I
see him psychologically conditioned.

ایک بچہ جب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، اس وقت اس کو دیکھئے تو وہ معصومیت کا پیکر دکھائی دے گا۔ ایسا معلوم ہوگا جیسے کہ فرشتے نے انسان کی صورت اختیار کر لی ہے۔ پیدائش کے وقت انسان اپنے ذہن کے اعتبار سے خالص ذہن کا حامل ہوتا ہے۔ اس کی سوچ عین وہی فطری سوچ ہوتی ہے جو بطور واقعہ ہونا چاہیے۔

مگر انسان ایک سماجی حیوان (social animal) ہے۔ اس کو اپنی ساری زندگی دوسروں کے بنائے ہوئے سماج کے اندر گزارنا ہوتا ہے۔ اس بنا پر اس کا ذہن ہر آن خارجی تأثر قبول کرتا رہتا ہے۔ اسی کو کنڈیشننگ (conditioning) کہا جاتا ہے۔ یہ تاثر پذیری بڑھتی رہتی ہے، یہاں تک کہ انسان

مکمل طور پر کنڈیشننگ کا کیس بن جاتا ہے۔

سن شعور کو پہنچنے کے بعد ہر عورت اور مرد کی یہ لازمی ذمّے داری ہے کہ وہ اس کنڈیشننگ کو سمجھے اور اپنے ذہن کی ڈی کنڈیشننگ (de-conditioning) کرکے دوبارہ وہ اپنے آپ کو حالتِ فطری کی طرف واپس لے جائے، وہ اپنے آپ کو انسانِ مصنوعی کے بجائے انسانِ فطری بنائے۔

ماحول کی کنڈیشننگ اصل انسان کے اوپر ایک مصنوعی پردے کی حیثیت رکھتی ہے۔ گویا انسان کی شخصیت پیاز کی مانند ہے۔ پیاز کے اندر مٹر کی مانند ایک مغز ہوتا ہے۔ اس داخلی مغز کے اوپر خارجی پردے کے مانند بہت سے چھلکے ہوتے ہیں۔ اگر ان چھلکوں کو ہٹایا جائے تو پیاز کا اندرونی مغز کھل کر سامنے آجائے گا۔ یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان کی شخصیت کے اوپر ماحول کے اثر سے مصنوعی پردے پڑ جاتے ہیں۔ ان پردوں کو ہٹا دیا جائے تو انسان کی اصل شخصیت کھل کر سامنے آجائے گی۔

انسانی شخصیت کے انھیں خارجی پردوں کو ہٹانے کا نام ڈی کنڈیشننگ ہے۔ جو آدمی سچائی کا طالب ہو، اس پر لازم ہے کہ وہ اپنی ڈی کنڈیشننگ کرکے مصنوعی پَردوں کو ختم کرے تاکہ اس کی اصل شخصیت سامنے آسکے۔

مذہب میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ انسان خدا کی خاص تخلیق ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اسی خدائی شخصیت (Divine Personality) پر پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے داخلی وجود کے اعتبار سے ایک صحیح اور کامل شخصیت ہوتا ہے۔ ابدی کامیابی کے لیے لازمی شرط یہ ہے کہ آدمی سب سے پہلے اپنی اس فطری شخصیت کی حفاظت کرے۔ وہ اپنے آپ کو اس حالتِ فطری پر قائم کرے جس پر اس کے پیدا کرنے والے نے اس کو پیدا کیا ہے۔ اسی خودتعمیری جدوجہد کا نام ڈی کنڈیشننگ ہے۔

حق کی تلاش یا حق کی یافت دونوں ہی مثبت شخصیت کا فعل ہیں۔ یہ دراصل مثبت شخصیت ہے جس کے اندر تلاشِ حق کا اعلیٰ جذبہ جاگتا ہے۔ اور یہ مثبت شخصیت ہی ہے جو اپنی سلامتِ فکر کی بنا پر آخرکار حق کی یافت کے مرحلے تک پہنچتی ہے۔

روحانیت کیا ہے

ایک مجلس میں ایک صاحب نے یہ سوال کیا کہ اسلام میں روحانیت کا تصور کیا ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے روحانیت کو پانے کا کیا اصول ہے۔ اس معاملہ کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ روحانیت(spirituality) کا لفظ بعد کی تاریخ میں بولا جانے لگا۔ قرآن میں اس مفہوم کے لئے جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ ربانیت ہے(3:79)۔ روحانیت بلاشبہ ایک مطلوب چیز ہے۔

عام تصور یہ ہے کہ روحانیت کا مقام پانے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ترک دنیا (renunciation) ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ ترک دنیا سے جو چیز ملتی ہے وہ روحانیت نہیں ہے بلکہ وہ رہبانیت ہے اور رہبانیت اسلام میں نہیں (**لا رھبانیة فی الاسلام، مسند احمد، 6/226**)۔

روحانیت یا ربانیت یہ ہے کہ آدمی کی داخلی شخصیت ربانی شخصیت بن جائے۔ وہ خدا اور آخرت کے تصور میں جینے لگے۔ روحانیت کا یہ درجہ فکری انقلاب کے ذریعہ آتا ہے نہ کہ مادی دنیا کو چھوڑنے کے نتیجہ میں۔ یہ فکری انتقال کا ایک عمل ہے نہ کہ جسمانی انتقال کا کوئی عمل۔ قرآن کے مطابق، اس فکری انتقال کا ذریعہ توسم ہے۔ یہ روحانیت کسی کو اس ذہنی بیداری کے ذریعہ ملتی ہے جس کو قرآن میں ذکر کثیر (62:10) کہا گیا ہے۔

یہ ذکر کثیر کوئی لسانی تکرار نہیں، وہ دراصل ایک فکری عمل ہے۔ یعنی مادی چیزوں میں خدا کی نشانیاں دیکھنا۔ مادی تجربات سے آخرت کا سبق نکالنا۔ دنیا کی ہر چیز میں یہ ربانی پہلو چھپا ہوا ہے۔ روحانیت یہی ہے کہ آدمی دنیوی یا مادی سرگرمیوں کے درمیان رہتے ہوئے ان نشانیوں کو دیکھے۔ وہ مادی تجربہ کو روحانی تجربہ میں کنورٹ کر سکے۔ روحانیت دراصل کنورژن کی اسی ذہنی صلاحیت کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ روحانیت نہ دنیا کو ترک کرنے سے ملتی ہے اور نہ الفاظ کی لسانی تکرار سے۔ روحانیت کا درجہ اُس کو ملتا ہے جو مادی دنیا کو اپنے لیے روحانی خوراک(spiritual food) بنا سکے۔

ایک مہلک عادت

زندگی کی ایک صراطِ مستقیم ہے، یعنی سیدھا راستہ جو شخص اِس صراطِ مستقیم پر چلے، وہ لازمی طور پر کامیابی کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ اِس سفر میں رکاوٹ ڈالنے والی صرف ایک چیز ہے، اور وہ ڈسٹریکشن (distraction) ہے، یعنی اِدھر اُدھر کی چیزوں کی طرف بھٹک جانا اور صراطِ مستقیم سے منحرف ہوجانا۔ جنت میں آدمی کے لیے جو شجرِ ممنوعہ تھا، وہ دراصل اِسی ڈسٹریکشن کی علامت تھا۔ اِس کے ذریعے آغازِ حیات ہی میں انسان کو بتا دیا گیا کہ جس دنیا میں تم کو امتحان کے لیے بسایا جارہا ہے، وہاں تمھارے لیے بہت سے اشجارِ ممنوعہ، یعنی ڈسٹریکشن کے اسباب ہوں گے۔ اگر تم نے اپنے آپ کو اِن اشجارِ ممنوعہ کی طرف بھٹکنے سے بچایا تو تم کامیابی کے ساتھ دوبارہ اپنی منزل پر پہنچ جاؤ گے، ورنہ دوبارہ تم کو جنت ملنے والی نہیں۔

یہ ڈسٹریکشن مختلف صورتوں میں ہوتا ہے۔ آدمی اگر غور وفکر سے کام لے تو پہچان کر اپنے آپ کو ڈسٹریکشن سے بچا سکتا ہے۔ مگر سب سے زیادہ خطرناک ڈسٹریکشن وہ ہے جو آدمی کی زندگی میں عادت بن کر داخل ہوجائے۔ آدمی جس چیز کا عادی ہوجاتا ہے، وہ اُس کو سوچے بغیر کرنے لگتا ہے، وہ اس کے غیر شعوری عمل کا حصہ بن جاتا ہے۔

موجودہ زمانے میں اِس قسم کی بہت سی نئی عادتیں پیدا ہوئی ہیں۔ لوگ بری طرح اُن کے عادی ہوگئے ہیں۔ اُنھیں میں سے ایک یہ ہے کہ بہت سے لوگ ٹیلی فون اڈکٹ (telephone-addict) بنے ہوئے ہیں۔ وہ اتنے زیادہ ٹیلی فون کے عادی ہوگئے ہیں کہ ٹیلی فون کے بغیر ان کو چین نہیں آتا۔ اِس تباہ کن عادت نے لوگوں کو ایک بہت بڑی محرومی میں مبتلا کردیا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دماغ دیا تھا، تاکہ وہ بڑی بڑی باتوں کو سوچے اور بڑی بڑی حقیقتوں کو دریافت کرے، لیکن ہر آدمی موبائل لیے ہوئے چھوٹی چھوٹی بے کار باتوں میں مشغول رہتا ہے، اس کے پاس بڑی بڑی باتوں پر غور کرنے کے لیے وقت ہی نہیں۔

ڈی کنڈیشننگ کا طریقہ

ہر آدمی کسی ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔ یہی ماحول ہر آدمی کا ذہن بناتا ہے۔ ذہنی تاثر پذیری کے اِسی عمل کو کنڈیشننگ (conditioning) کہا جاتا ہے۔ یہی بلا استثنا ہر آدمی کا معاملہ ہے۔ ہر آدمی کا ذہن کنڈیشنڈ ذہن (conditioned mind) ہے۔ یہی ہر آدمی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ یہ کنڈیشننگ ہر آدمی کو فطرت سے ہٹا دیتی ہے۔ اِس لیے ضرورت ہوتی ہے کہ ہر آدمی کی ڈی کنڈیشننگ (de-conditioning) کرکے اس کو فطرت کی طرف واپس لایا جائے۔

اِس ڈی کنڈیشننگ کا صرف ایک طریقہ ہے، اور وہ محاسبہ (introspection) ہے، یعنی سخت انداز میں مسلسل طور پر اپنی اصلاح کا عمل جاری رکھنا۔ کسی آدمی کی یہ اصلاح دو طریقے سے ہوتی ہے— یا تو وہ دوسرے شخص کی سخت تنقید کو برداشت کرے، یعنی خارجی ہیمرنگ (hammering) کو کھلے ذہن کے ساتھ قبول کرے۔ وہ برا مانے بغیر دوسرے شخص کی سخت تنقید کو سن کر اپنے آپ پر نظر ثانی (reassessment) کا عمل کرے۔

اس ڈی کنڈیشننگ کا دوسرا طریقہ وہ ہے جس کو شدید خود احتسابی (self-hammering) کہا جاسکتا ہے، یعنی آدمی اپنے آپ کو دشمن جیسی نظر سے دیکھے۔ وہ ہر صبح و شام اپنا جائزہ لیتا رہے، وہ اپنی ہر غلطی کو شدت کے ساتھ محسوس کرے اور اس کو لے کر اپنا سخت محاسبہ کرے، وہ اپنے اوپر بے رحمانہ تنقید (merciless hammering) کرتا رہے، کسی معاملے میں وہ ہرگز اپنے آپ کو رعایت نہ دے، وہ دوسرے کو الزام دینے کے بجائے ہمیشہ خود اپنے آپ کو ملزم ٹھہرائے، وہ اپنے بارے میں اتنا سخت ناقد بن جائے جیسے کہ وہ اپنا ذبیحہ کررہا ہے۔

ڈی کنڈیشننگ کے یہی دو ممکن طریقے ہیں— آدمی یا تو دوسرے کی بے رحمانہ تنقید کو برداشت کرے، یا وہ خود اپنا بے رحم ناقد بن جائے۔ جو آدمی دوسروں سے میٹھی بات سننا چاہے اور خود ہمیشہ اپنی رعایت کرتا رہے، ایسا آدمی ہمیشہ کنڈیشننگ میں جئے گا، اس کی کبھی ڈی کنڈیشننگ ہونے والی نہیں۔

ذہنی انقلاب کے بغیر روحانیت

روحانیت(spirituality) ہمیشہ سے انسان کی دل چسپی کا موضوع رہا ہے۔ اس کے نام ہر حلقے میں الگ الگ لیے جاتے رہے ہیں۔ مثلاً مسٹسزم(Mysticism) اور مراقبہ(Meditation) اور تصوّف(Sufism)، وغیرہ۔ روحانیت کے محاذ پر ہزاروں سال سے زبردست سرگرمیاں جاری ہیں، مگر ابھی تک ان سرگرمیوں کا کوئی حقیقی فائدہ حاصل نہ ہوسکا۔ تمام کوششوں اور ریاضتوں کے بعد جو چیز حاصل ہوئی، وہ صرف بے شعور وجد(ecstasy) ہے، نہ کہ روحانی ارتقاء جو کہ ان سرگرمیوں کا اصل مطلوب تھا۔

اصل یہ ہے کہ قدیم زمانے سے لوگ یہ ماننے لگے کہ انسان کا ذہن سوچ کا مرکز ہے، اور انسان کا دل جذبات وعواطف کا مرکز۔ کیوں کہ روحانیت کو عواطف کی نوعیت کی چیز سمجھ لیا گیا، اس لیے انسان ہمیشہ مبنی بَر قلب روحانیت (heart-based spirituality) پر عقیدہ رکھتا رہا۔ اس مفروضے کی بنیاد پر باقاعدہ فلسفہ وضع کیا گیا۔ یہ مان لیا گیا کہ انسان کا دل ہر قسم کے روحانی خزانوں کا سرچشمہ ہے۔ اور دل میں چھپے ہوئے احساسات کو جگا کر روحانی فیض حاصل کیا جاسکتا ہے۔

لیکن موجودہ زمانے میں سائنسی تحقیقات نے اس مفروضے کو بے بنیاد ثابت کردیا۔ اب یہ قطعیت کے ساتھ معلوم ہو چکا ہے کہ فکر اور جذبات دونوں کا واحد مرکز صرف انسان کا ذہن(mind) ہے۔ جہاں تک دل کا تعلق ہے، وہ صرف گردش خون(circualtion of blood) کا ذریعہ ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: الرسالہ، نومبر 2004، صفحہ 23؛ جون 2005، صفحہ 6؛ فروری 2006، صفحہ 28؛ اگست 2006، صفحہ 33)

یہی وجہ ہے کہ ہزاروں سال کی روحانی ریاضت کے نتیجے میں انسان کو جو چیز ملی، وہ صرف وجد(ecstasy) تھا، نہ کہ روحانی بنیاد پر ذہنی ارتقاء۔ اس قسم کی روحانیت دراصل، روحانیت کی ایک کم تر صورت(reduced form) ہے، نہ کہ حقیقی معنوں میں روحانی ارتقاء۔

جیسا کہ معلوم ہے، وجد ایک مبہم کیفیت کا نام ہے، جب کہ انسان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایسا ذہن رکھتا ہے جس کے اندر سوچنے کی صلاحیت ہے۔ انسانی تاریخ کی تمام ترقیاں سوچ کی صلاحیت کو عمل میں لانے سے حاصل ہوئی ہیں۔

ایسی حالت میں، روحانیت اگر کوئی چیز ہے تو اس کو بھی ذہن کی سطح پر حاصل ہونا چاہیے۔ تمام انسانی ترقیوں کا سرچشمہ انسان کے ذہن میں تفکیری عمل ہے، اِسی طرح روحانی ترقی کا ذریعہ بھی تفکیری عمل کو ہونا چاہیے۔ روحانیت دراصل معرفتِ حقیقت کا اعلیٰ درجہ ہے، وہ مبہم بےخودی جیسی کوئی چیز نہیں۔ اس لیے حقیقی روحانیت وہی ہے جو کسی آدمی کو ذہن کی سطح پر حاصل ہو، نہ کہ قلب کی سطح پر۔

اس حقیقت سے بےخبری کی بنا پر ایسا ہوا کہ پوری تاریخ میں انسان حقیقی روحانیت کے حصول سے محروم رہا۔ اس نے جس چیز کو روحانیت سمجھا، وہ روحانیت نہیں تھی۔ اور جو اصل روحانیت تھی، اس سے بےخبری کی بنا پر وہ اس کو حاصل کرنے کی طرف اپنا سفر ہی شروع نہ کر سکا۔ تاریخِ انسانی کا یہ شاید سب سے بڑا المیہ ہے، اس سے بڑا المیہ اور کوئی نہیں۔

ربانیات

ربانیت، رہبانیت

قرآن کی سورہ الحدید میں بتایا گیا ہے کہ مسیحی لوگوں نے بعد کے زمانے میں رہبانیت کا طریقہ اختیار کرلیا، جس کی تعلیم ان کو پیغمبر کے ذریعے نہیں دی گئی تھی (57:27)

رہبانیت (monasticism) کیا ہے۔ رہبانیت دراصل، خدا کی طلب میں دنیا کو چھوڑنے کا نام ہے۔ اِسی لیے ایسے افراد کو تارک الدنیا کہا جاتا ہے۔ رہبانیت کا فلسفہ یہ ہے کہ ترکِ دنیا سے خدا کی قربت حاصل ہوتی ہے۔ اِسی ذہن کے تحت لوگوں نے وہ طریقے ایجاد کیے جن کو تجرد اور میڈی ٹیشن اور مراقبہ، وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اِس ذہن کی انتہا پسندانہ صورت یہ ہے کہ آدمی انسانی آبادیوں کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں چلا جائے اور وہاں وہ روحانی ورزشوں کے ذریعے خدا کی قربت تلاش کرے۔ اِسی کے اثر سے، مسلمانوں کے اندر تصوف یا صوفی ازم کا نظریہ پیدا ہوا۔

اسلام میں اِس قسم کی رہبانیت نہیں (لا رَهبانيّةَ في الإسلام۔ مسند احمد، جلد6، صفحہ 226)۔ اسلام کی رہبانیت فکری رہبانیت (intellectual monasticism) ہے، نہ کہ جسمانی یا مقامی رہبانیت، یعنی ذکر وفکر کی سطح پر خدا سے تعلق قائم کرنا، دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے بے رغبت ہو کر زندگی گزارنا۔ اِسی کو قرآن میں ربانیت (3: 79) کہا گیا ہے، یعنی خدا رخی سوچ (God-oriented thinking) کے ساتھ دنیا میں زندگی گزارنا۔

قرآن کے مطابق، موجودہ دنیا کی زندگی امتحان کی زندگی ہے (67:2)۔ یہاں ملنا بھی آزمائش ہے اور نہ ملنا بھی آزمائش۔ اسلامی رہبانیت یہ ہے کہ آدمی کی سوچ اتنی بلند ہو جائے کہ وہ دونوں حالتوں پر یکساں طور پر راضی رہے، وہ منفی تجربات کو بھی مثبت تجربے میں تبدیل کر سکے، وہ دنیا میں رہتے ہوئے مکمل طور پر آخرت کا طالب بن جائے، وہ انسانوں کے درمیان اِس طرح رہے کہ ہر چیز اُس کو خدا کی یاد دلانے والی بنی ہوئی ہو۔ ایسے افراد کو قرآن میں النفس المطمئنة (89:27) کہا گیا ہے، اور یہی وہ نفوس ہیں جن کو آخرت کی دنیا میں خدا کا پڑوس ملے گا۔ وہ جنت کے باغوں میں داخل کیے جائیں گے، جہاں وہ ہمیشہ راحتوں اور خوشیوں کی زندگی گزاریں گے۔

دو انتظامات

انسان کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی عنایات کے ساتھ پیدا کیا۔ یہ عنایتیں بنیادی طور پر دو قسم کی ہیں۔ اُن میں سے ایک کو قرآن میں احسنِ تقویم (95: 4) کہا گیا ہے۔ اور دوسری عنایت کے لیے قرآن کی اِس آیت میں اشارہ ہے: **واتاکم من کلّ ما سألتموہ** (14: 34) یعنی خدا نے تم کو وہ سب کچھ دیا جو تم نے اُس سے مانگا۔

احسنِ تقویم کو دوسری جگہ صورتِ احسن (39: 64) کے لفظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ انسان کو نہایت موزوں جسم دیا گیا ہے۔ انسانی جسم بہت سے آرگن (organs) یا نظامات کا مجموعہ ہے۔ مثلاً دیکھنے کا نظام، سننے کا نظام، سانس لینے کا نظام، بولنے کا نظام، ہضم کا نظام، گردشِ خون کا نظام، حرکت کا نظام، وغیرہ۔ انسان کی عمر جب بڑھتی ہے تو ایک ایک نظام معطّل ہونے لگتا ہے، یہاں تک کہ سارے نظام معطل ہو جاتے ہیں اور انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

دوسرا انتظام وہ ہے جو انسانی وجود کے باہر خارجی دنیا میں کیا گیا ہے۔ مثلاً روشنی اور حرارت کا نظام، ہوا کا نظام، آکسیجن کی سپلائی کا نظام، پانی اور بارش کا نظام، زراعت کا نظام، وغیرہ۔ یہ خارجی نظامات انسانی زندگی کے لیے لازمی طور پر ضروری ہیں۔ یہ نظامات اگر جزئی یا کلی طور پر معطل ہو جائیں تو انسانی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

مذکورہ تقسیم میں دوسرے نظام کو لائف سپورٹ سسٹم (life support system) کہا جاتا ہے۔ اِسی طرح پہلے نظام کو آرگن سپورٹ سسٹم (organ support system) کہا جا سکتا ہے۔ اِنھیں دونوں انتظامات پر انسان کی زندگی قائم ہے۔

اِن دونوں انتظامات کو گہرائی کے ساتھ جاننا، آدمی کے لیے معرفت کا دروازہ کھولتا ہے۔ اِس کے نتیجے میں شکر کے اعلیٰ جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اِس سے آدمی کے اندر تمام مثبت صفات پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً تواضع، سنجیدگی، اعترافِ حق، وغیرہ۔

تخلیقی کرشمہ، ذاتی کمال

انسان تخلیقِ خداوندی کا شاہ کار ہے۔ وسیع کائنات میں انسان جیسی کوئی مخلوق موجود نہیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو اس کے پیدا کرنے والے نے اس کو مکرّم مخلوق کے طور پر پیدا کیا ہے (17:70)۔ اِسی طرح انسان کو اس کے پیدا کرنے والے نے اس کو احسنِ تقویم کے ساتھ پیدا کیا ہے (95:4)۔ اِسی طرح انسان کو اس کے پیدا کرنے والے نے اس کو بہترین صورت کے ساتھ پیدا کیا ہے (40:64)۔ یہ بات قرآن میں مختلف انداز سے بار بار بیان کی گئی ہے۔

انسان بلاشبہہ تخلیقِ خداوندی کا شاہ کار ہے۔ اگر آپ اپنے وجود کو اِس حیثیت سے دریافت کریں تو آپ کے اندر حمدِ خداوندی کا ایک طوفان برپا ہوجائے گا۔ آپ محسوس کریں گے کہ یہ آپ کے اوپر خالق کا اتنا بڑا احسان ہے کہ اس کو بیان کرنے کے لیے تمام انسانی الفاظ بھی ناکافی ہیں۔ یہ دریافت آپ کو دعا کے لیے ایک عظیم پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) دے دے گی۔ آپ پکار اٹھیں گے کہ خدایا، تونے دنیا میں میرے ساتھ اتنی بڑی رحمت کا معاملہ فرمایا، اب کیا آخرت میں تو مجھ کو اپنی رحمتوں سے محروم کردے گا۔ کیا تو اپنی اِس شاہ کار تخلیق کو جہنم کے شعلوں کے حوالے کردے گا۔

مگر عجیب بات ہے کہ لوگ انسان کو تخلیقِ الٰہی کے شاہ کار کے طور پر دریافت نہیں کر پاتے۔ ہر ایک اس کو صرف انسان کے ذاتی کمال کے طور پر دریافت کئے ہوئے ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر آدمی اپنی ذات میں جیتا ہے۔ ہر آدمی اپنے وجود سے صرف عُجب (pride) کی غذا لیتا ہے۔ ہر آدمی شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے ہی کو سب کچھ بنائے ہوئے ہے۔ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو اِس سے شخصیت پرستی کی غذا لے رہے ہیں۔ وہ اپنے بڑوں میں جب یہ تخلیقی کمالات دیکھتے ہیں تو وہ اِن کمالات کو خود اِنھیں بڑوں سے منسوب کرکے ان کی تعظیم وتقدیس کرنے لگتے ہیں۔ جس کمال کو خالق کی طرف منسوب کرنا چاہیے، اس کو وہ مخلوق سے منسوب کردیتے ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خالق کی پرستش کے بجائے مخلوق کی پرستش میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

کائنات پر کنٹرول

قرآن کی پہلی آیت یہ ہے: الحمد للہ رب العالمین (1:1) یعنی ساری حمد اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ یہ دراصل وہ کلمہ ہے جو آدمی کی زبان سے اُس وقت بے اختیارانہ طور پر نکل پڑتا ہے، جب کہ وہ کائنات کا مشاہدہ کرے۔ دور بینی مشاہدہ بتاتا ہے کہ کائنات ناقابلِ قیاس حد تک وسیع اور عظیم ہے۔ دوسری طرف، خورد بینی مطالعہ بتاتا ہے کہ ناقابلِ مشاہدہ کائنات بھی اتنا ہی زیادہ عظیم ہے جتنا کہ قابلِ مشاہدہ کائنات۔ ساری ترقیوں کے باوجود ابھی تک انسان نہ کائنات کی وسعتوں کا اندازہ کرسکا ہے اور نہ وہ کائنات کی عظمتوں کو دریافت کرنے میں کامیاب ہوسکا ہے۔

یہ وسیع اور عظیم کائنات مسلسل طور پر متحرک ہے۔ اس کے اندر ہر لمحہ انتہائی بامعنی قسم کی سرگرمیاں (meaningful activities) جاری ہیں۔ مطالعہ مزید بتاتا ہے کہ یہ اتھاہ کائنات مکمل طور پر ایک بے نقص کائنات (faultless universe) ہے۔ بے نقص حالت میں کائنات کا اِس طرح قائم رہنا صرف اُس وقت ممکن ہے، جب کہ اِس نظام میں کوئی ادنیٰ تغیّر (alteration) نہ آئے۔ کائنات کے اندر ایک ادنیٰ تغیر بھی اس کے پورے نظام کو درہم برہم کرسکتا ہے۔

جدید مطالعہ بتاتا ہے کہ کائنات ناقابل قیاس حد تک وسیع ہونے کے باوجود آخری حد تک ایک ہم آہنگ (harmonious) کائنات ہے۔ وہ مکمل طور پر ایک واحد فورس سے کنٹرول ہو رہی ہے۔ اس کے تمام اجزا ایک دوسرے سے کامل طور پر جڑے ہوئے ہیں۔

کائنات کی اِس عالمی ہم آہنگی پر تمام سائنس داں حیرت زدہ ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اِس غیر معمولی ہم آہنگی کی توجیہہ کس طرح کی جائے۔ کائنات کے اندر یہ بے پناہ نظم اِس بات کا ثبوت ہے کہ یہ کائنات ایک قادرِ مطلق خدا کے زیر انتظام ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پوری کائنات ایک لمحے کے اندر منتشر ہو کر رہ جائے۔ کائنات کے اندر یہ کامل ہم آہنگی صرف اُس وقت ممکن ہے، جب کہ اُس کا ناظم اپنے اندر قدرتِ کاملہ کی صفت رکھتا ہو۔

معرفت کا آغاز

قرآن کی سورہ البلد میں ارشاد ہوا ہے: **لقد خلقنا الإنسان فی کبد، أیحسب أن لن یقدر علیه أحد** (90:4-5) یعنی ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ اُس کے اوپر کسی کو قدرت حاصل نہیں۔

موجودہ دنیا کا قانون اِس طرح بنا ہے کہ یہاں انسان کو مشقت (hardship) کے کورس سے لازمی طور پر گزرنا پڑتا ہے۔ اِس قانونِ عام سے کوئی بھی شخص مستثنیٰ نہیں۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ انسان کا کیس عجز (helplessness) کا کیس ہے۔ اِس دنیا میں صرف خالق ہے جس کو قادرِ مطلق کا درجہ حاصل ہے۔ یہ تقسیم اتنی زیادہ حتمی ہے کہ کوئی بھی شخص اپنے آپ کو اِس سے الگ نہیں کرسکتا۔

قرآن کی سورہ آلِ عمران میں ارشاد ہوا ہے: **کل نفس ذائقة الموت** (3:185) یعنی ہر شخص کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ اِس دنیا میں جو شخص بھی پیدا ہوتا ہے، وہ ایک محدود مدت کے بعد مرجاتا ہے۔

موت کا یہ واقعہ انسان کے عجز کو بتاتا ہے۔ یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ انسان کی طرف صرف عجز ہے۔ جہاں تک قدرت کا سوال ہے، وہ خالق کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں۔ یہ دونوں تجربات ہر عورت اور ہر مرد کے لیے حتمی تجربات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِس طرح ہر شخص خود اپنے ذاتی تجربہ کی روشنی میں یہ دریافت کرسکتا ہے کہ وہ عجزِ کامل کے مقام پر ہے اور اس کے مقابلے میں اس کا خالق قدرتِ کاملہ کے مقام پر۔

یہی دریافت معرفت کا آغاز ہے۔ جو آدمی اِس حقیقت کو دریافت کرلے، اس کا سفر معرفت کے راستے پر شروع ہوگیا۔ اِس کے بعد اس کی زندگی میں وہ تمام چیزیں آتی چلی جائیں گی جو خدا کی شریعت میں مطلوب ہیں۔ یہ معرفت گویا ایک فکری انقلاب (intellectual revolution) ہے، وہ آدمی کی پوری زندگی کو اللہ کے رنگ (2:138) میں رنگ دیتا ہے۔

عقل اور دین

قرآن کی سورہ ص میں قرآن کے بارے میں یہ آیت آئی ہے: **كتابٌ أنزلناه إليك مبارك ليدّبّروا آياته وليتذكر أولوا الألباب** (38:29) یعنی یہ ایک مبارک کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے، تا کہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں اور تا کہ عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔

اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن لفظی تلاوت (recitation) کے لیے نہیں ہے، بلکہ وہ اِس لیے ہے کہ پڑھنے والا اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے اس کی آیتوں پر غور کرے اور اُس سے وہ نصیحت حاصل کرے جو آیتوں کے اندر چھپی ہوئی ہے۔

عقل کی اہمیت کے بارے میں پیغمبر اسلام ﷺ کی بہت سی روایتیں آئی ہیں۔ اِن میں سے ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: **لكلّ شيئٍ دِعامة، ودعامة المؤمن عقله** (مسند الحارث للهيثمي، رقم الحديث: 840) یعنی ہر چیز کا ایک ستون ہوتا ہے، اور مومن کا ستون اس کی عقل ہے۔

اِس معاملے کی وضاحت ایک اور حدیث سے ہوتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے بارے میں فرمایا کہ قرآن کی ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک اس کا باطن ہے (**لكل آية منها ظهر وبطن**)۔

قرآن کی آیتوں کا ظاہری مفہوم تو اس کی آیتوں کے ترجمے سے معلوم ہوجاتا ہے، لیکن آیتوں کا جو باطن، یعنی اس کا جو گہرا مفہوم ہے، وہ صرف عقل کے استعمال کے ذریعے ہی معلوم ہوتا ہے۔ عقل کے ذریعے آدمی الفاظ پر مزید غور وفکر کرتا ہے۔ اِس غور وفکر کے ذریعے وہ آیتوں کے اندر چھپے ہوئے گہرے معانی تک پہنچتا ہے۔ قرآن کی یہ گہری معرفت ہی آدمی کے اندر اعلیٰ ایمانی کیفیت پیدا کرتی ہے — عقل کے استعمال کے بغیر کسی آدمی کو جو دین حاصل ہوتا ہے، وہ دین کا چھلکا ہے اور عقل کے استعمال کے بعد کسی آدمی کو جو دین حاصل ہوتا ہے، وہ دین کا مغز ہے۔

آزمائش کیوں

جاء في الآثار أن العبد إذا دعا ربَّه وهو يحبّه، قال: يا جبريل، لا تعجل بقضاء حاجة عبدي، فإني أحب أن أسمع صوته (جامع العلوم والحكم، رقم الحديث: 42) یعنی بندہ جب اپنے رب کو پکارتا ہے اور وہ بندہ خدا کو محبوب ہوتا ہے تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے جبریل، میرے بندے کی حاجت پوری کرنے میں جلدی نہ کر، مجھے محبوب ہے کہ میں اس بندے کی آواز کو سنوں۔ اِس روایت میں صوت (voice) کا لفظ سادہ طور پر صرف آواز کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ وسیع تر اعتبار سے، کلام کے معنی میں ہے۔ یہ صوت اُس مومن کے بارے میں ہے جو اللہ کے قانون کے مطابق، آزمائش سے دوچار ہو۔ اِس تجربے سے اس کا دل تڑپ اٹھے۔ اس کے ذہن میں ربانی افکار کا طوفان برپا ہوجائے۔ وہ اپنے عجز اور اللہ کی کبریائی کو دریافت کرے۔ اِس کے نتیجے میں اس کی روح کے اندر ایک نیا طوفان برپا ہوجائے۔

ایسے موقع پر ایک مومن کی زبان سے جو کلمات نکلتے ہیں، وہ انوکھے کلمات ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کی عظمت (glory of God) کی نئی دریافت کے ہم معنی ہوتے ہیں۔ ایسا مومن اُس خاص لمحہ میں پوری کائنات کے لیے قابلِ رشک بن جاتا ہے۔ اُس وقت وہ اللہ کا ایسا ذکر کرتا ہے جس سے زمین اور آسمان بھی عاجز ہوگئے۔ یہ ایک تخلیقی نوعیت کا اعلیٰ ربانی ذکر ہوتا ہے۔

آزمائش مومن کے لیے ایک ربانی تجربہ ہوتی ہے۔ آزمائش مومن کی حساسیت (sensitivity) میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ اُس وقت اس کی زبان سے ذکر ودعا کے جو الفاظ نکلتے ہیں، وہ صرف معلوم الفاظ کی تکرار نہیں ہوتے، بلکہ وہ تخلیقی نوعیت کی دعا ہوتی ہے۔ اُس وقت وہ اپنے رب کو ایسے الہامی الفاظ میں پکارنے لگتا ہے جس کو خود اس نے بھی اِس سے پہلے نہیں جانا تھا — علم جب تجربہ بن جائے اور الفاظ جب حساسیت میں ڈھل جائیں، اُس وقت مومن کی زبان سے جو کلمات نکلتے ہیں، وہ کلمات اتنے اعلیٰ ہوتے ہیں کہ خود اللہ کو اس کا سننا محبوب بن جاتا ہے۔

ایمان کا ذائقہ

حدیث میں آیا ہے کہ: **ذاق طعم الایمان من رضی باللہ رباً (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 160)** یعنی ایمان کا ذائقہ چکھا اُس شخص نے جو اللہ کو اپنا رب بنانے پر راضی ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ ایمان ایک ذائقہ ہے۔ یہ ذائقے مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ خدا نے ہماری دنیا میں طرح طرح کے مادی پھل پیدا کئے۔ ہر پھل کا ذائقہ الگ الگ ہے۔ جو ذائقہ کھجور میں ہے، وہ انجیر میں نہیں۔ جو ذائقہ انگور میں ہے وہ سیب میں نہیں۔ جو ذائقہ آم میں ہے، وہ کیلے میں نہیں۔ اسی طرح z ہر پھل کے الگ الگ ذائقے ہیں۔ جب آدمی کسی پھل کو کھاتا ہے تو وہ اس کے انفرادی ذائقہ کو پاتا ہے۔ یہی معاملہ ایمانی ذائقوں کا بھی ہے۔ خدا نے اہلِ ایمان کے لئے ایک ذائقہ خوشی میں رکھا ہے جو اس نے غم میں نہیں رکھا۔ ایک ایمانی ذائقہ محرومی میں ہے جو یافت میں نہیں۔ ایک ایمانی ذائقہ تنگی میں ہے جو آسودگی میں نہیں۔ ایک ایمانی ذائقہ بیماری میں ہے جو صحت میں نہیں۔ ایک ایمانی ذائقہ مشکل میں ہے، وہ آسانی میں نہیں۔ ایک ایمانی ذائقہ مقتدی بننے میں ہے وہ امام بننے میں نہیں۔ ایک ایمانی ذائقہ گم نامی میں ہے، وہ شہرت میں نہیں۔ ایک ایمانی ذائقہ بے اختیاری میں ہے، وہ اختیار میں نہیں۔ ایک ایمانی ذائقہ عجز میں ہے، وہ قدرت میں نہیں، وغیرہ۔

تاہم مختلف احوال میں مختلف ایمانی ذائقے ملنا اس پر منحصر ہے کہ آدمی کے اندر سچا ایمانی شعور زندہ ہو۔ کوئی ذائقہ اپنے آپ نہیں ملتا، بلکہ وہ ایمان کی بیداری کی شرط کے ساتھ ملتا ہے۔ جس طرح مادی پھلوں کے ذائقے صرف اُس آدمی کو ملتے ہیں جس کی زبان میں ذائقہ خانے (taste buds) زندہ ہوں۔ اسی طرح مختلف احوال میں چھپے ہوئے ایمانی ذائقے اسی آدمی کے حصہ میں آتے ہیں جو اپنے ایمانی احساس کو پوری طرح زندہ کئے ہوئے ہو۔ جو لوگ اپنے ایمانی احساس کو زندہ رکھیں، اُنھیں کے لیے اُن کے احوال مختلف ایمانی ذائقوں کا تجربہ کرائیں گے۔ اس کے برعکس، جو لوگ اپنے ایمانی احساس کو کُند کر لیں، اُن پر مختلف قسم کے حالات گزریں گے، مگر یہ حالات اُن کے لیے ایمانی ذائقوں کا تجربہ نہیں بنیں گے۔ وہ ایمان کے گلستاں میں رہ کر بھی ایمان کی خوشبو سے محروم رہیں گے۔

انسان ایک استثنائی مخلوق

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد حدیث کی مختلف کتابوں میں آیا ہے۔ اِس کے مطابق، آپ نے فرمایا: خلق اللہ آدم علیٰ صورتہ (صحیح البخاري، رقم الحدیث: 6227؛ صحیح مسلم، رقم الحدیث: 7342) یعنی اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جسمانی شکل وصورت کے اعتبار سے، انسان خدا کے مانند ہے۔ یہاں ''صورت'' سے مراد صفات (attributes) ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو محدود طور پر وہ صفات عطا فرمائی ہیں جو اللہ کی ذات میں اپنے کمال درجے میں موجود ہیں۔

انسان پوری کائنات میں ایک استثنائی مخلوق ہے۔ انسان ایک زندہ وجود ہے۔ انسان وہ واحد مخلوق ہے جس کو ایک جامع شخصیت (personality) عطا ہوئی ہے۔ انسان سوچتا ہے، انسان دیکھتا ہے، انسان سنتا ہے، انسان منصوبہ بند عمل کرتا ہے، انسان اپنے حواس خمسہ کے ذریعہ چیزوں سے انجوائے کرسکتا ہے۔ اِس قسم کی استثنائی خصوصیات ہیں جو پوری کائنات میں صرف انسان کا حصہ ہیں۔

انسان کو یہ استثنائی عطیات اِس لیے دیے گئے ہیں کہ وہ استثنائی عمل کا ثبوت دے۔ یہ استثنائی عمل خالق کی شعوری معرفت ہے۔ اِس طرح خداوندِ ذوالجلال نے انسان کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ معرفت کے درجے میں خدا کو دریافت کرے۔ وہ غیب کی حالت میں خدا کو دیکھے۔ وہ اختیار رکھتے ہوئے اپنے آپ کو خدا کے آگے بے اختیار کرلے۔ مجبوری کے بغیر وہ اپنے آپ کو خدا کے آگے سرینڈر کردے۔ وہ اپنے شعور کو بیدار کرکے اپنا ذہنی ارتقا کرے، وہ ذاتی دریافت کے درجے میں سچائی کو پائے۔ وہ سجدۂ معرفت کی سطح پر خدا کے آگے جھک جائے۔ وہ پورے عالمِ فطرت کو اپنی روحانی غذا بنالے۔ وہ اپنی شخصیت کا ارتقا اِس طرح کرے کہ وہ خداوندِ ذوالجلال کے پڑوس میں جگہ پانے کا مستحق بن جائے— جو آدمی اپنے اندر اِس قسم کی شخصیت (personality) نہ بنا سکے، وہ صرف انسان نما حیوان ہے، اس کی کوئی قیمت خدا کے یہاں نہیں۔

ارتقا کے تین درجے

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ مسند امام احمد کے الفاظ یہ ہیں — حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **النّاس مَعادِن، کمعادن الفِضّة والذّهب، خِيارُهم في الجاهلية خيارُهم في الاسلام إذا فقهوا** (مسند احمد، جلد 2 صفحہ 539) یعنی انسان دھات کی مانند ہیں، جیسے سونے اور چاندی کی دھات۔ جاہلیت میں جو بہتر ہیں، وہی اسلام میں بھی بہتر ہیں، جب کہ وہ اپنے اندر سمجھ پیدا کریں۔

اِس حدیث میں انسان کے فکری ارتقا کے مراحل کو بتایا گیا ہے۔ ایک درجۂ فکری وہ ہے جس پر انسان پیدا ہوتا ہے۔ دوسرا درجۂ فکری وہ ہے جو انسان خود اپنی کوششوں سے بناتا ہے۔ تیسرا درجہ معرفت کا درجہ ہے۔ معرفت کے درجے میں پہنچ کر انسان اپنے ارتقا کی آخری منزل کو پالیتا ہے، یعنی وہ درجہ جس کا دوسرا نام اسلام ہے۔

اِس اعتبار سے انسان کی مثال دھات (metal) جیسی ہے۔ لوہا زمین سے نکلتا ہے۔ ابتدائی حالت میں وہ خام لوہا (ore) ہوتا ہے۔ اِس کے بعد اُس کو پگھلا کر صاف کیا جاتا ہے۔ اب وہ ترقی پاکر اسٹیل بن جاتا ہے۔ اِس کے بعد وہ مزید صنعتی مراحل سے گزرتا ہے، یہاں تک کہ وہ باقاعدہ مشین کی صورت اختیار کرلیتا ہے — یعنی پہلے مرحلے میں خام لوہا، دوسرے مرحلے میں اسٹیل، اور تیسرے اور آخری مرحلے میں مشین۔

یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو گویا کہ وہ فطرت کی کان (mine) سے نکل کر باہر کی دنیا میں آتا ہے۔ اِس کے بعد وہ بڑا ہوتا ہے اور اپنی سوچ کو عمل میں لاتا ہے۔ وہ تعلیم و تربیت کے مراحل سے گزرتا ہے۔ اِس طرح پختگی کی عمر میں پہنچ کر وہ ایک باقاعدہ انسان بن جاتا ہے۔ یہ انسانی وجود کا درمیانی مرحلہ ہے۔ اِس کے بعد اگر وہ اپنی عقل کو صحیح رخ پر استعمال کرے تو وہ معرفتِ حق کے درجے میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ وہ درجہ ہے جب کہ کوئی پیدا ہونے والا، کمالِ انسانیت

کے مرحلے میں پہنچ کر عارف باللہ کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اِن تین ارتقائی مراحل کو حسب ذیل صورت میں بیان کیا جاسکتا ہے:

1- پیدائشی شخصیت (born personality)

2- تیارشدہ شخصیت (developed personality)

3- عارفانہ شخصیت (realized personality)

پیدائشی شخصیت، خدا کی دی ہوئی شخصیت ہوتی ہے۔ پیدائشی شخصیت کے اعتبار سے ہر آدمی یکساں ہوتا ہے۔ صلاحیت کے اعتبار سے اگر چہ ایک انسان اور دوسرے انسان میں ہمیشہ فرق ہوتا ہے، لیکن اِس فطری فرق کے باوجود تمام انسان اِمکانی استعداد (potential capacity) کے اعتبار سے یکساں حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔

اِسی بات کو ایک حدیث میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے: **المؤمن القوّی خیرٌ و أحبُّ إلی اللہ من المؤمن الضّعیف، وفی کلٍّ خیر۔ احرِص علیٰ ما ینفعك واستعن باللہ ولا تعجز۔ وإن أصابك شئ فلا تقُل: لَو أنّی فعلتُ کان کذا و کذا، ولکن قُل: قدّر اللہ وماشاء فعل۔ فإنّ ''لَو'' تفتح عملَ الشیطان (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 6945)۔**

یعنی قوی مومن، اللہ کے نزدیک ضعیف مومن سے زیادہ بہتر اور پسندیدہ ہے، اور ہر ایک میں خیر ہے۔ جو چیز تمھارے لیے نافع ہو، اس کے تم حریص بنو اور اللہ سے مدد چاہو اور عاجز نہ ہو۔ اور اگر تمھارے خلاف کوئی بات پیش آئے تو یہ نہ کہو کہ کاش، میں نے ایسا اور ایسا کیا ہوتا۔ بلکہ یہ کہو کہ یہ خدا کا تقدیری منصوبہ تھا، اسی نے جو چاہا کیا۔ کیوں کہ ''اگر'' کہنا شیطان کے عمل کا دروازہ کھولتا ہے۔

اِس حدیث میں مومن سے مراد انسان ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان اگر اپنے اندر ایک اعتبار سے کمی محسوس کرے تو اس کو مایوس نہیں ہونا چاہیے، کیوں کہ دوسرے اعتبار سے اُس کے اندر کوئی اور صفت زیادہ ہوگی۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیت کو دریافت کرے اور

حوصلہ مندانہ انداز میں اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔ جدوجہدِ حیات کے دوران اگر اس کو کوئی نقصان پہنچے تو اُس کو یقین کرنا چاہیے کہ اِس منفی تجربے میں بھی کوئی مثبت فائدہ شامل ہوگا۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے ہر منفی تجربے سے مثبت سبق لے، وہ کسی بھی حال میں پست ہمتی کا شکار نہ ہو۔

اس طرح آدمی اپنی شخصیت کی تعمیر کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنا محاسبہ کرکے اپنی کنڈیشننگ کو دور کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنے شعور کو بیدار کرکے اپنے اندر ایسی شخصیت کی پرورش کرتا رہتا ہے جس کے اندر قبولِ حق کی صلاحیت موجود ہو، جس کے اندر وہ صلاحیت ہو جس کو پیغمبر کی ایک دعا میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے: **اللّھم، أرنا الحقَّ حقّا، وارْزُقنَا اتّباعه، وأرِنا الباطل باطلاً، وارزقنا اجتِنابَه، وأرِنا الأشياءَ كما هِيَ** ۔یعنی اے اللہ، تو مجھے حق کو حق کے روپ میں دکھا، اور اس کی پیروی کی توفیق دے۔ اور اے اللہ، تو مجھے باطل کو باطل کے روپ میں دکھا، اور تو مجھے اُس سے بچنے کی توفیق عطا فرما۔ اور اے اللہ، تو مجھے چیزوں کو ویسا ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں۔

یہی وہ انسان ہے جس کو ہم نے اوپر کی تقسیم میں تیارشدہ شخصیت (developed personality) کا نام دیا ہے۔ وہی آدمی دانش مند آدمی ہے جو اپنے اندر اِس قسم کی شخصیت کی تعمیر کرے۔ جہاں تک فطری وجود کی بات ہے، ہر انسان کو فطری وجود کا عطیہ خالق کی طرف سے یکساں طور پر ملتا ہے، لیکن اُس کے بعد اپنے آپ کو ایک تیارشدہ شخصیت بنانا، یہ ہر انسان کا خود اپنا عمل ہے۔ ٹھیک اُسی طرح جیسے خام لوہا فطرت کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے، لیکن اِس خام لوہے کو اسٹیل اور مشین میں تبدیل کرنے کا عمل انسانی کارخانے میں انجام پاتا ہے۔

اِسی خود تیاری (self-preparation) کے عمل پر اگلے ارتقائی مرحلے کا انحصار ہے۔ جو لوگ خود شناس بنیں، جو لوگ اپنا بے لاگ محاسبہ کرتے رہیں، جو لوگ اپنی کمیوں کو ڈھونڈ کر اپنی ڈی کنڈیشننگ کریں، جو لوگ ہر قیمت کو ادا کرتے ہوئے اپنے ''خام لوہے'' کو ''اسٹیل'' بنانے کا کام کریں، جن لوگوں کا یہ حال ہو کہ وہ انانیت اور کبر اور لالچ اور حسد اور غصہ اور انتقام جیسے منفی جذبات کا کبھی شکار نہ بنیں، جو کہ شخصیت کی تعمیر میں ایک مہلک رکاوٹ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جو

لوگ مسلسل طور پر اپنے اوپر تزکیہ کا عمل جاری کیے ہوئے ہوں، وہی لوگ ہیں جو خدا کی توفیق سے حق کو دریافت کرتے ہیں اور اس کو پوری آمادگی کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں۔

تزکیہ کے لفظی معنٰی ہیں، پاک کرنا (purification)۔ یہ ہر آدمی کی لازمی ضرورت ہے۔ یہ ہر آدمی کا مسئلہ ہے کہ وہ اپنے ماحول سے اثر قبول کرتا رہتا ہے، جس کو کنڈیشننگ (conditioning) کہا جاتا ہے۔ اپنے جذبات اور خواہشات کے تحت، اس کی کچھ عادتیں بن جاتی ہیں۔ اپنے مفادات اور مصالح کے زیر اثر، شعوری یا غیر شعوری طور پر، اس کا اپنا ایک مزاج بن جاتا ہے۔ یہ تمام چیزیں آدمی کی روحانی ترقی میں رکاوٹ ہیں۔ اِن رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے آدمی کو خود اپنا نگراں (guard) بننا پڑتا ہے۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی غلطیوں کو نکالتا ہے۔ وہ ایک بے رحمانہ اصلاح (merciless deconditioning) کا عمل اپنے اوپر جاری کرتا ہے۔ یہ تزکیہ کی لازمی شرط ہے۔ اِس کے بغیر کسی کا حقیقی تزکیہ نہیں ہوسکتا — بے رحمانہ ذاتی اصلاح کے بغیر تزکیہ نہیں، اور تزکیہ کے بغیر جنت نہیں۔

جو لوگ اپنے آپ کو مذکورہ مراحل سے گزاریں اور اپنی تیاری کے نتیجے میں سچائی کو پالیں، اُنھیں کو قرآن میں النفس المطمئنة (89:27) کہا گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے تخلیقی نقشے پر راضی ہوئے، جنھوں نے اپنے آپ کو اِس نقشے پر ڈھال کر اپنے اندر مطلوب شخصیت کی تعمیر کی۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کی رضامندی پائیں گے اور خدا کے فضل سے جنت کے ابدی باغوں میں بسائے جائیں گے۔

شیطان کا پردہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک طویل حدیث مروی ہے۔ اُس کا ایک حصہ یہ ہے:
هذه الشياطين يحومون على أعيُنِ بني آدم أن لا يتفكروا في ملكوت السماوات والأرض۔ ولو لا ذلك لرأوا العجائب (مسند احمد، جلد2، صفحہ 353) یعنی یہ شیاطین، بنی آدم کی آنکھ کے سامنے منڈلاتے رہتے ہیں، تا کہ وہ آسمان وزمین میں خدائی قدرت پر غور نہ کریں۔ اگر ایسا نہ ہو تو یقیناً وہ عجائب کو دیکھیں۔

ہمارے گردوپیش جو کائنات ہے، اس کو علمی اصطلاح میں فطرت (nature) کہا جاتا ہے۔ اِس وسیع عالم فطرت میں بے شمار واقعات یا مظاہر ہیں جو ہر وقت انسان کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ ہر آنکھ والا انسان اُن کو دیکھتا ہے اور اُن کا تجربہ کرتا ہے، لیکن بیش تر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اِس آیت کا مصداق بنے رہتے ہیں: **وكأين مِن آيةٍ في السماوات والأرضِ يمرّون عليها، وهم عنها معرضون** (12:105)

یہ کائناتی واقعات دراصل خدائی نشانیاں (divine signs) ہیں، وہ تخلیق (creature) کی صورت میں اپنے خالق (Creator) کا تعارف ہیں۔ انسان اگر کھلی آنکھ سے دیکھے تو وہ اِن واقعات میں عجائب قدرت کا مشاہدہ کرے گا۔ لیکن شیطان آدمی کے ذہن میں ایسی باتیں ڈالتا ہے کہ وہ اِن کائناتی واقعات کو صحیح زاویۂ نظر سے نہ دیکھ سکے۔ شیطان، آدمی کے ذہن میں یہ تصور ڈالتا ہے کہ یہ سب واقعات خودکار قوانین کا نتیجہ ہیں، نہ کہ خدائی قدرت کا نتیجہ۔ شیطان یہ کوشش کرتا ہے کہ آدمی اِن واقعات کو نصیحت کے پہلو سے نہ دیکھے، بلکہ وہ صرف اِس نظر سے دیکھے کہ کس طرح اُن کے مادّی فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ شیطان یہ کوشش کرتا ہے کہ آدمی اپنے اردگرد کے واقعات کو فار گرانٹیڈ (for granted) طور پر لیتا رہے، وہ اُن کے بارے میں زیادہ غور وفکر نہ کرے۔ یہی وہ شیطانی وسوسے ہیں جو انسان کو حقائق کی صحیح معرفت سے محروم کر دیتے ہیں۔

تواضع ایک عظیم عبادت

حدیث میں آیا ہے کہ: كلّ ابن آدم خطّاء، وخير الخطّائين التوابون (الترمذي، رقم الحديث: 2499)۔ یعنی ہر انسان خطا کار ہے، اور سب سے اچھا خطا کار وہ ہے جو خطا کے بعد توبہ کرے۔ اعترافِ خطا، ایک عظیم عبادتی عمل ہے۔ یہ اعترافِ خطا، خدا کے مقابلے میں بھی ہوتا ہے اور انسان کے مقابلے میں بھی۔ جب خدا کے مقابلے میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا جائے تو اُس کو توبہ کہا جاتا ہے، اور یہی عمل جب انسان کے مقابلے میں کیا جائے تو اُس کا نام اعترافِ خطا ہے۔

اصحابِ رسول کی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ بہت زیادہ توبہ کرنے والے اور اعتراف کرنے والے تھے، حتیٰ کہ بہت سے ایسے واقعات ہیں جب کہ ایک صحابی نے کہا کہ مجھ سے غلطی ہوئی، مجھ کو معاف کرو۔ حالاں کہ خالص قانونی اعتبار سے اُس کو دیکھا جائے تو وہاں صحابی نے ایسی کوئی غلطی نہیں کی تھی۔

ایسا کیوں ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ یہ کہنا کہ میں غلطی پر تھا، دراصل اپنی تواضع کو ایسٹیبلشڈ (established) کرنا ہے۔ اسلامی عقیدے کے مطابق، ہر انسان کے پاس ہر وقت خدا کے فرشتے موجود رہتے ہیں، جو اُس کے ہر قول وعمل کا ریکارڈ تیار کرتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ بالکل فطری بات ہے کہ ایک سچا مومن اِس بات کا حریص ہو کہ فرشتے اپنے ریکارڈ میں اُس کو ایک متواضع انسان کی حیثیت سے درج کریں، نہ کہ ایک سرکش انسان کی حیثیت سے۔

یہ جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ ہر مومن کے اندر وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر موجود رہتا ہے۔ اِس بنا پر مومن طبعاً اِس کو پسند نہیں کرتا کہ وہ فرشتوں کی نظر میں ایک سرکش انسان دکھائی دے۔ کسی معاملے میں خواہ بظاہر اُس کی غلطی نہ ہو، تب بھی اُس کا متواضعانہ مزاج اُس کی زبان سے اِس طرح ظاہر ہوتا رہتا ہے کہ وہ بار بار یہ کہہ دیتا ہے کہ میں غلطی پر تھا۔ غلطی کا اعتراف نہ کرنے سے سرکشی کے جذبات کو تسکین ملتی ہے۔ اس کے برعکس، غلطی کا اعتراف مومن کی متواضعانہ نفسیات کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ بے اعترافی اگر سرکش انسان کی غذا ہے تو اعتراف اُس مومن کی غذا ہے جو اپنے آپ کو ہمہ تن خدا کے آگے جھکائے ہوئے ہو۔

تقویٰ کیا ہے

روایات میں آیا ہے کہ حضرت عمر فاروق نے حضرت اُبی بن کعب سے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کیا آپ کبھی کانٹے دار جھاڑیوں والے راستے سے گزرے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ ابی بن کعب نے کہا کہ پھر آپ نے اُس وقت کیا کیا۔ عمر فاروق نے کہا کہ میں نے اپنے کپڑے سمیٹ لیے اور کانٹوں سے بچتا ہوا گزر گیا (شمّرتُ و اجتهدتُ)۔ ابی ابن کعب نے کہا کہ یہی تقویٰ ہے (قال: فذالك التقویٰ)۔

اِس روایت سے تقویٰ کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ تقویٰ دراصل یہ ہے کہ آدمی اِس دنیا میں ہر قسم کے فتنوں سے بچتا ہوا گزر جائے۔ تقویٰ کو ایک لفظ میں محتاط طریقہ (cautious approach) کہا جا سکتا ہے۔ دنیا میں ہر وقت مختلف قسم کی ترغیبات (temptations) ہوتی ہیں، مختلف قسم کے چھوٹے یا بڑے فتنے پائے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں، تقویٰ کی روش یہ ہے کہ آدمی اُن سے بچتا ہوا گزرے، وہ ہر موقع پر پرہیزگارانہ طریقہ، یا محتاط طریقہ اختیار کرے۔

تقویٰ کی اِس روش پر قائم رہنے کے لیے دو چیزیں بہت زیادہ ضروری ہیں — سنجیدگی اور محاسبہ، یعنی چیزوں پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا اور ہر وقت اپنا محاسبہ کرتے رہنا۔ یہی دونوں صفتیں اِس بات کی ضامن ہیں کہ آدمی تقویٰ کے راستے پر قائم رہے گا، وہ غیر متقیانہ روش اختیار کرنے سے بچا رہے گا۔

تقویٰ کسی ظاہری وضع قطع کا نام نہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ تقویٰ کا تعلق دل سے ہے: **التقویٰ هٰهنا، و يُشير إلىٰ صدره (صحيح مسلم، رقم الحديث: 6706)** جو آدمی گہرائی کے ساتھ معاملات پر غور کرے گا، وہی تقویٰ کی روش پر قائم رہے گا۔ تقویٰ حقیقت میں ایک داخلی کیفیت کا نام ہے۔ داخلی طور پر اگر آدمی متقی نہ ہو تو کوئی بھی خارجی فارم خدا کے نزدیک اُس کو متقی کا درجہ نہیں دے سکتا۔ حدیث میں آیا ہے کہ: **إنّ الله لا ينظر إلى أجسامكم ولا إلى صُوركم، ولكن ينظر إلى قلوبكم (صحيح مسلم، رقم الحديث: 6707)**۔

شادابی لوٹ آئی

دہلی میں میری رہائش گاہ کے پاس ایک درخت ہے۔اس کو میں اسپریچول ٹری (spiritual tree) کہتا ہوں۔اس کے نیچے میں دیر تک بیٹھتا ہوں۔اس سے مجھے روحانی سکون ملتا ہے۔

برسات کے موسم سے پہلے یہ درخت بالکل سوکھ گیا تھا۔بظاہر وہ ٹھنٹھ (stem) دکھائی دیتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ درخت کی عمر شاید ختم ہوگئی ہے، وہ دوبارہ شاداب ہونے والانہیں، مگر برسات کا موسم آنے کے بعد وہ دوبارہ ہرا ہونے لگا۔اس کی شاخوں پر ہری پتیاں نکلنے لگیں، یہاں تک کہ اگست کے آخر تک دوبارہ وہ پوری طرح ہرا بھرا ہوگیا۔اس کی شادابی مکمل طور پر لوٹ آئی۔

یہ تمثیل کے روپ میں انسان کے لیے ایک سبق ہے۔انسان کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔انسان کی روحانی زندگی کے لیے ضرورت ہے کہ اس کو ''پانی'' ملتا رہے۔جو انسان اس پانی سے محروم جائے، اس کی شخصیت سوکھے درخت جیسی ہو جائے گی۔

انسانی زندگی کے لیے یہ حیات بخش پانی خدائی فیضان (divine inspiration) ہے۔انسان کو چاہیے کہ وہ خداوندِ ذوالجلال سے مسلسل روحانی ربط قائم رکھے۔اسی ربط سے اس کو شادابی ملے گی۔ یہ ربط کسی وجہ سے ٹوٹ جائے تو وہ سوکھے درخت کی مانند ہو کر رہ جائے گا۔

خداوند ذوالجلال سے اِس ربط کا ذریعہ ذکر ہے۔خداوندِ ذوالجلال کو یاد کرنا کیا ہے۔وہ کسی قسم کے اوراد کا نام نہیں ہے۔وہ مختلف حالات میں اس کو بار بار یاد کرنا ہے۔مثلاً مذکورہ قسم کے درخت کو آپ نے دیکھا تو اُس کے اندر آپ کو خدا کا کرشمہ نظر آیا۔آپ نے تڑپتے ہوئے دل کے ساتھ کہا کہ خدایا: تو نے جس طرح اِس درخت کو شاداب کیا ہے، اُسی طرح تو مجھے بھی شاداب کر دے۔میں ایک سوکھا ہوا درخت ہوں، تو اپنے فیضانِ رحمت سے مجھ کو ایک شاداب درخت بنا دے—اِس تجربے کا تعلق کسی ایک چیز سے نہیں، اس کا تعلق تمام چیزوں سے ہے۔اِس دنیا کی ہر چیز میں یہی ربانی غذا موجود ہے۔دانش مند انسان وہ ہے جو اِس ربانی غذا کو لیتے ہوئے اِس دنیا میں زندگی گزارے۔

ایمانی انفجار

ایک مومن وہ ہے جو رُٹین کی دین داری سے بنتا ہے۔ یہ وہ مومن ہے جس نے کلمہ پڑھا ہو، جو مقرر عبادتیں کرے، جو اخلاق اور معاملات میں شریعت کا پابند ہو، جو مومنانہ وضع قطع اختیار کرے۔ اِس قسم کی دین داری رٹین کی دین داری ہے۔ یہ دین داری بھی بلاشبہہ مطلوب ہے، لیکن اِس قسم کی دین داری سے وہ مومن نہیں بنتا جس کو اعلیٰ مومن کہا جاتا ہے۔ اعلیٰ مومن کیسے بنتا ہے، اس کو اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز (وفات: 101ھ) کی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز 93ہجری میں مدینہ کے گورنر تھے۔ اُس وقت وہاں ایک تابعی رہتے تھے جن کا نام خُبیب بن عبداللہ بن الزبیر تھا۔ دمشق کے اموی حکم راں الولید بن عبدالملک کو اُن سے شکایت ہوگئی۔ الولید نے عمر بن عبدالعزیز کو یہ حکم بھیجا کہ خبیب کو سو کوڑے مارو اور سردی کے موسم میں اُن کے سر پر ٹھنڈا پانی گراؤ۔ عمر بن عبدالعزیز نے ایسا ہی کیا۔ اِس کے بعد خبیب کی وفات ہوگئی۔ اِس واقعے نے عمر بن عبدالعزیز کو اتنا زیادہ تڑپایا کہ ان کی زندگی میں انقلاب آ گیا۔ اُن کا حال یہ ہوگیا کہ اگر اُن کو ان کے کسی کارِ خیر پر آخرت کے انعام کی بشارت دی جاتی تو وہ کہہ اٹھتے کہ ایسا کیوں کر ہوسکتا ہے، جب کہ خبیب میرے راستے میں ہیں (**كيف و خُبيب لى بالطريق**)

یہ انقلابی واقعہ کیسے پیش آیا، اِس کو برین اسٹارمنگ (brainstorming) کے نظریے سے سمجھا جاسکتا ہے۔ آدمی کو جب کوئی سخت جھٹکا لگتا ہے تو اس کے دماغ میں ایک بھونچال آجاتا ہے۔ اس کے دماغ کے تمام امکانات جاگ اٹھتے ہیں۔ پہلے اگر وہ انسان تھا تو اب وہ سُپر انسان بن جاتا ہے۔ اُس کے اندر انتہائی شدید قسم کا محاسبہ (introspection) جاگ اٹھتا ہے۔ اس کا خوفِ خدا اپنی آخری حد تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ ذہنی بھونچال اس کے ایمان کو بڑھاتا ہے۔ اِس کے بعد اس کے اندر وہ بے قراری پیدا ہوتی ہے جو اس کو ایمانی ترقی کے اعلیٰ درجے تک پہنچا دیتی ہے۔ وہ خدا سے قربت کا اعلیٰ تجربہ کرتا ہے۔ وہ تقویٰ کے بلند ترین مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ رٹین کی دین داری سے کسی آدمی کے اندر ایمانی انفجار پیدا نہیں ہوتا، اِس لیے رٹین کی دین داری سے کسی کو اعلیٰ ایمان کا تجربہ بھی نہیں ہوتا۔

متوقّع اعتراف کی قیمت

ایک شخص اگر چاند کے اوپر پیدا ہو، یا وہ پیدا ہونے کے بعد اپنے آپ کو زمین کے سوا کسی اور سیارے پر پائے تو یہ اس کے لیے ایک بے حد سنگین تجربہ ہوگا۔ وہ دیکھے گا کہ چاند پر یا دوسرے سیارے پر اُن چیزوں میں سے کوئی چیز موجود نہیں، جو انسان جیسی مخلوق کے زندہ رہنے کے لیے درکار ہے۔ اِس معاملے کی ایک مثال اُس مچھلی میں نظر آتی ہے جو پانی کے باہر خشک زمین پر تڑپ رہی ہو۔

اِس کے برعکس، آدمی جب زمین پر پیدا ہوتا ہے تو اچانک وہ پاتا ہے کہ یہاں وہ تمام چیزیں وافر مقدار میں موجود ہیں جو اس کے زندہ رہنے کے لیے درکار ہیں۔ مثلاً روشنی، پانی ہوا، غذا، وغیرہ۔ ایسا کیوں ہے کہ انسان کے لیے زمین پر تمام موافق اسبابِ حیات پیشگی طور پر موجود ہیں۔ یہ دراصل متوقع اعتراف کی قیمت ہے جو پیشگی طور پر اس کے لیے سیارۂ ارض پر مہیا کردی گئی ہے۔

کائنات میں بہت سی چیزیں ہیں۔ مثلاً ستارہ، سیارہ، سمندر، پہاڑ، وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں خدا کی مخلوق ہیں۔ وہ سب کی سب خدا کی خدائی کا اعتراف کررہی ہیں، لیکن ان کا اعتراف مجبورانہ اعتراف ہے، نہ کہ اختیارانہ اعتراف۔

انسان کو خدا نے استثنائی طور پر آزاد مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے خالق کا اختیارانہ اعتراف کرے، وہ سیارۂ ارض (planet earth) پر کھڑا ہو کر یہ کہہ سکے کہ — خدایا، میں نے دیکھے بغیر تیرے وجود کو مانا۔ خدایا، میں نے کسی مجبوری کے بغیر تیرے آگے سرینڈر کیا، خدایا، میں نے تیری قدرت کے ظہور سے پہلے، تیری قدرت کے مقابلے میں اپنے عجز کا اعتراف کیا۔ انسان کا یہی وہ متوقع اعتراف ہے، جس کی پیشگی قیمت کے طور پر زمین کی تمام نعمتیں اس کے لیے فراہم کی گئی ہیں۔ جو لوگ اِس اعتراف کا ثبوت دیں گے، ان کے لیے یہ نعمتیں مزید اضافے کے ساتھ جاری رہیں گی، اور جو لوگ اِس اعتراف میں ناکام رہیں، وہ ہمیشہ کے لیے اِن نعمتوں سے محروم کردئے جائیں گے۔

ایمان ایک زلزلہ خیز عقیدہ

آپ اپنے گھر میں اپنے بچے کے ساتھ ہیں۔ اتنے میں زمین سے گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ دیواریں اور چھتیں ہلنے لگیں۔ کھڑکیاں زور زور سے کھلنے اور بند ہونے لگیں۔ بچہ پوچھتا ہے کہ ابا، یہ کیا چیز ہے۔ آپ اس کو جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ بھونچال ہے۔

غور کیجئے کہ اس طوفان خیز لمحہ میں آپ کا یہ کہنا کہ ''یہ بھونچال ہے'' کیا صرف چند الفاظ کا مجموعہ ہوگا۔ آپ یہ جملہ بول کر بھی سکون کے ساتھ اپنے گھر میں بیٹھے رہیں گے۔ یقیناً ایسا نہیں ہوسکتا۔ ''یہ بھونچال ہے'' کا جملہ بظاہر ایک لفظی جملہ ہے، مگر وہ ایک عظیم واقعہ کا اعلان ہے۔ وہ ایسا جملہ ہے جس کو زبان سے ادا کرتے ہی آدمی کے اوپر کپکپی طاری ہوجائے۔

''یہ بھونچال ہے'' کا لفظ بولتے ہی خود آپ کے اندر بھی ایک بھونچال آجائے گا۔ آپ کی پوری شخصیت ہل جائے گی۔ سر سے پیر تک آپ کا پورا وجود ایک نیا وجود بن جائے گا۔ اس کے بعد آپ ایک ایسے انسان بن جائیں گے جو آپ اس سے پہلے نہیں تھے۔

اسی طرح آپ اپنے دوست کے ساتھ ایک جنگل میں چل رہے ہیں۔ اچانک آپ دیکھتے ہیں کہ پاس کی جھاڑیوں میں ایک خوف ناک شیر کھڑا ہوا ہے۔ آپ اپنے دوست سے کہتے ہیں کہ ''یہ ایک شیر ہے''۔ یہ جملہ بھی اس وقت محض ایک لفظی کلمہ نہیں ہوگا بلکہ وہ ایک طوفان خیز تجربہ ہوگا۔ آپ کے جسم میں خون کی گردش خون کا طوفان (blood storm) بن جائے گی۔ یہ ایک ایسا لمحہ ہوگا جو آپ کو اندر سے باہر تک ایک نیا انسان بنا دے گا۔ اس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ جب ایک انسان کہتا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ تو اس کا مطلب کیا ہے۔ یہ محض چند الفاظ کو اپنی زبان سے دہرانا نہیں ہے، بلکہ یہ اس خدا کی موجودگی اور کارفرمائی کا اقرار کرنا ہے جو شیر کا اور بھونچال کا اور ہر چیز کا خالق ہے۔ کیسی عجیب بات ہوگی اگر شیر اور زلزلے کی موجودگی کا اقرار آدمی کے اندر طوفان برپا کردے اور خداوند ذوالجلال کی موجودگی کا اقرار آدمی کے اندر کوئی ہلچل برپا نہ کرے۔

خدا کا وجود

پچھلے تقریباً پانچ سو سال سے کائنات کا سائنسی مطالعہ جاری ہے۔ اِس مطالعے میں بڑے بڑے دماغ شامل رہے ہیں۔ آخری بات جہاں یہ سائنسی مطالعہ پہنچا ہے، وہ یہ ہے کہ کائنات اتنی زیادہ وسیع ہے کہ انسان کے لیے اُس کو اپنے احاطے میں لانا بظاہر ناممکن ہے۔ تازہ ترین سائنسی تحقیق کے مطابق، انسان کا علم بہ مشکل کائنات کے صرف پانچ فی صد حصے تک پہنچا ہے۔ اِس پانچ فی صد حصے کے معاملے میں بھی انسانی علم کی محدودیت کا یہ عالم ہے کہ ایک سائنس داں نے کہا کہ ہم جتنا دریافت کر پاتے ہیں، اُس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریافت شدہ چیزیں بھی ابھی تک غیر دریافت شدہ چیزوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم کم سے کم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان رہے ہیں:

We are knowing more and more about less and less.

خدا کے بارے میں جاننا خالق (Creator) کے بارے میں جاننا ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ ابھی تک انسان خالق کی تخلیق (creation) کے بارے میں بھی صرف چند فی صد جان سکا ہے۔ ایسی حالت میں کسی انسان کا یہ مطالبہ کرنا کہ خالق کے بارے میں ہم کو قطعی معلومات دو، سرتاسر ایک غیر علمی مطالبے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب انسان کا حال یہ ہے کہ وہ ابھی تک تخلیق کے بارے میں پورا علم حاصل نہ کرسکا تو وہ خالق کے بارے میں پورا علم کیسے حاصل کرسکتا ہے۔

تخلیق کا وجود زمان ومکان (space and time) کے اندر ہے، اور خالق کا وجود ماورائے زمان ومکان (beyond space and time) سے تعلق رکھتا ہے، پھر جو انسان اتنا محدود ہو کہ وہ زمان ومکان کے اندر کی چیزوں کا بھی احاطہ نہ کرسکے، وہ زمان ومکان کے باہر کی حقیقت کو اپنے احاطے میں کس طرح لاسکتا ہے — حقیقت یہ ہے کہ اِس دنیا میں انسان، خدا کو صرف عجز کی سطح پر دریافت کرسکتا ہے، نہ کہ علم کی سطح پر۔

خدا کا اعتراف نہیں

آج کل یہ رواج ہے کہ ایک شخص پیسہ کمائے گا اور اس کے بعد وہ ایک کار خرید کر اپنے بیٹے کو دے گا۔ کار کے شیشہ پر لکھا ہوا ہوگا — باپ کی طرف سے تحفہ (Dad's Gift)۔ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ناشکری کا کلمہ ہے۔ ایک نعمت جو حقیقۃً خدا کی طرف سے ملی ہے، اس کو خدا کی طرف منسوب نہ کرنا، بلکہ اس کو خود اپنے کمالات کے خانے میں ڈال دینا، یہ خدا کے ساتھ بے اعترافی کا معاملہ کرنا ہے، اور خدا کے ساتھ بے اعترافی بلاشبہہ خدا کی اس دنیا میں سب سے بڑے جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔

قرآن کی سورہ النمل میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبر سلیمان بن داؤد کو ایک مادّی نعمت ملی تو انھوں نے فوراً کہا: ھٰذا من فضل ربّی (27:40) یعنی یہ میرے رب کے فضل میں سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ پیغمبر نے اس کو خدا کی طرف سے عطیہ (God's gift) قرار دیا۔ یہی صحیح ایمانی طریقہ ہے۔ صاحبِ ایمان وہ ہے جو ہر چیز کو خدا کی چیز سمجھے، جو ہر ملی ہوئی چیز کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہوئے خدا کا اعتراف کرے۔

دنیا میں انسان کو جو چیزیں ملتی ہیں، وہ بہ ظاہر خود اپنی کوشش کے ذریعے ملتی ہیں، لیکن یہ صرف اس کا ظاہری پہلو ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہر چیز مکمل طور پر خدا کا عطیہ ہوتی ہے۔ انسان کا امتحان یہ ہے کہ وہ ظاہری پردے کو پھاڑے، وہ اصل حقیقت کو دریافت کرتے ہوئے ہر ملی ہوئی چیز پر یہ کہہ دے کہ یہ میرے رب کا عطیہ ہے جو براہِ راست طور پر خدا کی طرف سے مجھ کو دیا گیا۔

اِسی اعتراف (acknowledgment) کا مذہبی نام شکر ہے۔ یہاں اُسی شخص کو جائز طور پر رہنے کا حق حاصل ہے جو شکر واعتراف کی نفسیات کے ساتھ اِس دنیا میں رہے۔ شکر کی یہی نفسیات موجودہ دنیا میں کسی کو جائز طور پر جینے کا حق دیتی ہے۔ اِس کے برعکس، جن لوگوں کے اندر ناشکری اور بے اعترافی کی نفسیات ہو، وہ خدا کی اِس دنیا میں مجرم اور درانداز (intruders) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

انسان نما حیوان

فروری 2008 میں پرگتی میدان (نئی دہلی) میں ایک انٹرنیشنل بک فیر کا انعقاد کیا گیا۔ میں 9 فروری 2008 کو یہ بک فیر دیکھنے کے لیے وہاں گیا۔ پرگتی میدان کے وسیع رقبے میں ہر طرف کتابوں کے شان دار اسٹال لگے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے نئی دہلی کا پرگتی میدان علم کا شہر (city of knowledge) بن گیا ہے۔ کثیر تعداد میں لوگ کتابوں کو پڑھتے ہوئے اور خریدتے ہوئے نظر آئے۔

جب میں بک فیر کے اندر چل پھر رہا تھا، اس وقت مجھے وہاں ایک انوکھا منظر دکھائی دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں انسانوں کے علاوہ ایک کتّا بھی ہے۔ وہ لوگوں کے درمیان اِدھر اُدھر دوڑتا ہوا نظر آیا۔ بظاہر وہ بھی انسانوں کی طرح چل پھر رہا تھا، لیکن اس کو نہ اِس بات کا علم تھا کہ یہاں کتابوں کی صورت میں دنیا بھر کا علم موجود ہے، اور نہ اس کو یہ شوق تھا کہ وہ اس اتھاہ علمی ذخیرے سے اپنے لیے کوئی روشنی حاصل کرے۔

بک فیر (book fair) کی دنیا میں ایک حیوان کی موجودگی دیکھ کر مجھے قرآن کی سورہ طٰہٰ کی ایک آیت یاد آئی، جس میں بتایا گیا ہے کہ بہت سے لوگ بظاہر انسان دکھائی دیتے ہیں، لیکن وہ حیوان کی مانند ہیں۔ وہ اِس دنیا میں صرف کھاتے پیتے ہیں اور پھر مرجاتے ہیں (47:12)۔ ایسے لوگ آخرت میں اندھے پن کے ساتھ اٹھائے جائیں گے (20:125)۔

موجودہ دنیا میں ہر طرف خالق کی نشانیاں (signs) بکھری ہوئی ہیں۔ یہ نشانیاں مخلوق کی صورت میں خالق کا تعارف کرارہی ہیں۔ جو لوگ اِس تعارف میں خالق کو دریافت کریں اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالیں، وہ بینا لوگ ہیں۔ اور جو لوگ اِس تعارف میں خالق کو نہ دیکھیں، وہ گویا کہ اندھے تھے۔ وہ دنیا میں اندھے بن کر رہے، اِس لیے وہ آخرت میں بھی اندھے پن کی حالت میں اٹھائے جائیں گے۔ ایسے لوگ بظاہر انسان، مگر حقیقت میں وہ حیوان ہیں۔ دنیا میں ان کی یہ حقیقت چھپی ہوئی ہے، لیکن آخرت میں ان کی یہ حقیقت عیاں ہو کر سامنے آجائے گی۔

دریافت، دریافت، دریافت

جاپان کی ایک مثل ہے کہ — ہر دن کوئی نئی بات دریافت (discover) کرو، خواہ سوئی میں دھاگہ ڈالنے کا نیا طریقہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ مثل مادّی دریافتوں کے بارے میں ہے۔

یہی اصول زیادہ بڑے پیمانے پر معرفت (realization) اور روحانیت (spirituality) کے معاملے پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ روحانیت اور معرفت کوئی جامد چیز نہیں۔ وہ درخت کی مانند ایک مسلسل ترقی پذیر چیز (growing entity) ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان کے دماغ میں لامحدود صلاحیت موجود ہے۔ انسانی دماغ کے باہر جو حقائق کی دنیا (universe of facts) ہے، وہ بھی لامحدود ہے۔

ایسی حالت میں جو آدمی اپنے ذہن کو مسلسل طور پر بیدار رکھے اور یکسوئی کے ساتھ غور وفکر کرتا رہے، وہ ہر دن بلکہ ہر لمحہ نئی حقیقتوں کو دریافت کرتا رہے گا۔ اس کے لیے دریافتوں کا خزانہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

جس طرح مادی خوراک جسم کی غذا ہے، اُسی طرح روحانی دریافتیں معرفت کی غذا ہیں۔ مسلسل مادی خوراک جسم کی زندگی کی ضمانت ہے۔ اِس طرح مسلسل روحانی دریافتیں کسی انسان کے لیے معرفت اور روحانیت کی زندگی اور ارتقا کی ضمانت ہیں۔

یہ دریافت گویا کہ ایک فکری پراسس (intellectual process) ہے۔ اِس پراسس کو مسلسل طور پر جاری رکھنے کی شرطیں صرف دو ہیں — غور وفکر کرنا، اور اپنے آپ کو ڈسٹریکشن سے بچانا۔

جس آدمی کے اندر یہ دو چیزیں پائی جائیں، وہ ضرور دریافتوں والا انسان بن جائے گا۔ اس کے بعد کوئی بھی چیز اس کو نئی نئی دریافتوں تک پہنچنے سے روکنے والی نہیں۔

دریافت روح کی زندگی ہے، دریافت ذہن کے لیے ذریعۂ ارتقا ہے۔ دریافت کسی انسان کو مکمل انسان بناتی ہے۔ دریافت کے بغیر کوئی انسان ایسا ہی ہے جیسے روح کے بغیر جسم۔

صبر، محاسبہ، توسم

ایمان کے بعد مطلوب زندگی کی تعمیر کے لیے تین بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے۔ اِن تینوں چیزوں کو اختیار کیے بغیر کوئی شخص سچا مومن نہیں بن سکتا۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں — صبر، محاسبہ، توسم۔

ایمان لانے کے بعد ہر مومن کے لیے سب سے پہلا مرحلہ یہ پیش آتا ہے کہ اپنے ماحول کے اندر وہ کس طرح مومنانہ زندگی گزارے۔ قانونِ فطرت کے مطابق، یہاں ہر لمحہ غیر موافق باتیں پیش آتی ہیں، ایسی باتیں جو آدمی کو بے برداشت کردیں۔ ایسے تمام مواقع پر آدمی کو صبر کرنا پڑتا ہے، تاکہ انحراف کے بغیر وہ مسلسل طور پر ایمان کے راستے پر قائم رہے۔

دوسری چیز محاسبہ (introspection) ہے۔ امتحان کی اِس دنیا میں آدمی بار بار غلطی کرتا ہے۔ اُس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ بے لاگ محاسبہ کرکے اپنی اصلاح کی جاتی رہے۔ فوری محاسبہ کے اِس عمل کے بغیر، یہ ہوگا کہ غلطیاں آدمی کی شخصیت کا حصہ بن جائیں گی اور پھر وہ کبھی اس سے جدا نہ ہوں گی۔

اِس سلسلے میں تیسری چیز توسم ہے۔ توسم کا مطلب ہے۔ غور وفکر کی زندگی گزارنا، اپنے تجربات اور اپنے آس پاس کی دنیا سے مسلسل طور پر نصیحت اور سبق لیتے رہنا۔ یہ توسم مومن کے لیے اس کی ایمانی غذا ہے۔ مسلسل توسم کے بغیر کوئی شخص اپنے آپ کو ایمانی ترقی کے راستے کا مسافر نہیں بنا سکتا۔

اسلامی زندگی، ایمان سے شروع ہوتی ہے۔ مگر ایمان، اسلامی زندگی کا صرف آغاز ہے، وہ اس کی آخری منزل نہیں۔ اِس آغاز کے بعد آدمی کو مسلسل طور پر ایک کورس سے گزرنا پڑتا ہے۔ اِس کورس کی تکمیل کے بغیر حقیقی معنوں میں کوئی شخص مومن و مسلم کے درجے تک نہیں پہنچ سکتا۔ اِس کورس کے اجزا بنیادی طور پر یہی تین ہیں — صبر اور محاسبہ اور توسم۔ یہ کورس کسی قسم کے رسمی اعمال (rituals) کے ذریعے انجام نہیں پاتا۔ یہ مکمل طور پر ایک شعوری سفر ہے۔ اپنے شعور کو متحرک کرکے ہی آدمی اس امتحان میں کامیاب ہوسکتا ہے۔

خدا اور انسان

مسٹر اے اور مسٹر بی کے درمیان ایک پراپرٹی کے بارے میں نزاع ہوئی۔ مسٹر اے کا کہنا تھا کہ یہ پراپرٹی ان کی ہے اور مسٹر بی نے غلط کارروائی کرکے اُس پر ناجائز قبضہ کرلیا ہے۔ دونوں کے درمیان کافی بات چیت ہوئی، لیکن مسٹر بی اپنی غلطی ماننے پر تیار نہیں ہوئے۔ آخر کار مسٹر اے نے مسٹر بی سے کہا کہ اگر آپ خدا کی کتاب اپنے ہاتھ میں لے کر یہ کہہ دیں کہ یہ پراپرٹی آپ کی ہے، تو میں آپ کے دعوے کو مان لوں گا اور پراپرٹی پر آپ کا قبضہ تسلیم کرلوں گا۔ مسٹر بی نے اس کے جواب میں کہا — اِس میں خدا کہاں سے آ گیا:

How does God come into the picture.

موجودہ زمانے میں یہی تقریباً تمام لوگوں کا حال ہے۔ ہر ایک اپنی مرضی کے مطابق، جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے، اور جب اس کو خدا سے ڈرایا جائے تو وہ زبانِ حال یا زبانِ قال سے کہہ دیتا ہے کہ — اِس میں خدا کہاں سے آ گیا۔

یہ معاملہ صرف عوام کا نہیں ہے، بلکہ خواص بھی اِسی میں مبتلا ہیں۔ مثلاً موجودہ زمانے میں جب طبیعی سائنس میں ترقی ہوئی اور فطرت کے قوانین دریافت کیے گئے، تو جدید تعلیم یافتہ طبقے نے عام طور پر، خدا کو کائنات سے خارج کردیا۔ انھوں نے کہا جب سارے واقعات فطرت کے قوانین کے تحت ہو رہے ہیں، تو پھر کائنات کی توجیہہ کے لیے خدا کو ماننے کی کیا ضرورت۔

خدا اِس دنیا کا خالق اور مالک ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ ساری تاریخ میں انسان، خدا کو وہ اہمیت نہ دے سکا جو اہمیت اس کو دینا چاہیے تھا۔ انسان کا اپنا وجود مکمل طور پر خدا کا عطیہ ہے۔ مال اور اولاد کی صورت میں جو کچھ بھی اس کے پاس ہے، وہ خدا کا دیا ہوا ہے۔ روشنی اور آکسیجن اور غذا اور پانی جیسی ان گنت چیزیں انسان کو مسلسل طور پر حاصل رہتی ہیں۔ اِن چیزوں کا دینے والا بھی صرف خدا ہے۔ مگر اِس سب سے بڑی حقیقت کا پوری تاریخ میں سب سے کم اعتراف کیا گیا ہے۔ انسان کے پاس خدا کو دینے کے لیے صرف ایک ہی چیز تھی اور وہ تھا اس کا اعتراف، مگر انسان اِسی واحد چیز کو دینے میں ناکام ہوگیا۔

اضافۂ ایمان

سورج ہماری زمین سے نو کرور تیس لاکھ میل دور ہے۔ سورج ہماری زمین سے ایک لاکھ تیس ہزار گنا بڑا ہے۔ سورج زمین کی مانند ٹھوس نہیں ہے، بلکہ وہ پورا کا پورا ایک عظیم دہکتا ہوا شعلہ ہے۔ اس کی گرمی گیارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ ہے۔ یہ گرمی اتنی زیادہ ہے کہ سخت ترین مادہ بھی اس میں پگھلے بغیر نہیں رہ سکتا۔ زمین اگر اس کے قریب کی جائے تو وہ ایک سکنڈ سے بھی کم عرصے میں پگھل کر گیس بن جائے گی۔

سورج کیسے چمکتا ہے اور کیسے اتنی بڑی مقدار میں وہ روشنی اور گرمی دے رہا ہے۔ قدیم خیال یہ تھا کہ سورج مسلسل جل رہا ہے، جیسے کوئی لکڑی یا کوئلہ جلتا ہے۔ مگر جب فلکیاتی تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ ہزاروں ملین سال سے اسی طرح روشن ہے تو یہ خیال غلط ثابت ہو گیا۔ سورج میں اگر کوئی مادہ جل رہا ہوتا تو اب تک سورج بجھ چکا ہوتا، کیوں کہ کوئی چیز اتنی زیادہ لمبی مدت تک جلتی ہوئی حالت میں نہیں رہ سکتی۔

اب سائنس دانوں کا نظریہ یہ ہے کہ سورج کی گرمی اُسی قسم کے ایک عمل (process) کا نتیجہ ہے جو ایٹم بم کے اندر وقوع میں آتا ہے، یعنی سورج، مادہ کو توانائی میں تبدیل کرتا ہے۔ یہ عمل جلنے سے مختلف ہے۔ جلنا مادہ کو ایک صورت سے دوسری صورت میں تبدیل کرتا ہے، مگر جب مادہ کو توانائی میں بدلا جائے تو بہت زیادہ توانائی صرف تھوڑے سے مادہ کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے۔ مادہ کا ایک اونس اتنی زیادہ توانائی پیدا کر سکتا ہے جو ایک ملین ٹن سے زیادہ چٹان کو پگھلا دے:

The sun changes matter into energy. This is different from burning. Burning changes matter from one form to another. But when matter is changed into energy, very little matter is needed to produce a tremendous amount of energy. One ounce of matter could produce enough energy to melt more than a million tons of rock.

کائنات میں اس قسم کی ان گنت نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ نشانیاں بتاتی ہیں کہ کائنات کے پیچھے ایک عظیم خالق کی ہستی کام کر رہی ہے۔ عظیم خالق کے بغیر کبھی اس قسم کی عظیم تخلیق ظہور میں نہیں آ سکتی۔ قرآن میں بار بار کائناتی نشانیوں پر غور کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ یہ غور وفکر ایک خالص دینی عمل ہے، وہ مومن کے ایمان میں غیر معمولی اضافے کا سبب بنتا ہے، وہ مومن کے یقین کو بے پناہ حد تک بڑھا دیتا ہے۔

حرص کا روحانی نقصان

آدمی کی سب سے بڑی کمزوری حرص ہے۔ اِس بنا پر ہر شخص کا یہ حال ہے کہ وہ ملے ہوئے کو کافی نہیں سمجھتا۔ ہر ایک اور زیادہ، اور زیادہ کی طلب میں مبتلا رہتا ہے۔ یہ نفسیات ایک تباہ کن نفسیات ہے۔ اِس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ آدمی اعلیٰ دعا کی توفیق سے محروم ہوجاتا ہے۔

اگر آدمی شکر کی نفسیات میں جئے، یعنی اس کا احساس یہ ہو کہ دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے جو کچھ مطلوب تھا، وہ خدا نے اس کو دے دیا۔ اگر آدمی اِس احساس میں جی رہا ہو تو یہ احساس اُس کے لیے ایک اعلیٰ دعا کا پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) بن جائے گا۔

اس کے دل کی گہرائیوں سے یہ الفاظ نکلیں گے کہ — خدایا، دنیا میں تو نے میرے ساتھ **وآتاکم من کلّ ماسألتموہ** (14:31) کا معاملہ فرمایا۔ اب آخرت میں تو میرے ساتھ وہ معاملہ فرما۔ تو نے اپنی کتاب میں اِس طرح بیان فرمایا ہے: **ولکم فیھا ما تشتھی أنفسکم، ولکم فیھا ما تدعون** (41:31)

پوائنٹ آف ریفرنس کے ساتھ جو دعا کی جائے، وہ ایک اعلیٰ دعا ہوتی ہے، ایسی دعا ایک گہرے احساس کے تحت نکلتی ہے۔ ایسی دعا ہمیشہ کسی تیار ذہن (prepared mind) کا نتیجہ ہوتی ہے، ایسی دعا آدمی کے پورے وجود کی نمائندہ ہوتی ہے۔

ایسی دعا میں الفاظ کی حیثیت محض ثانوی ہوتی ہے اور اصل حیثیت اُن داخلی کیفیات کی ہوتی ہے جو آدمی کے دل ودماغ کو بے چین کردینے والی ہوں۔ ایسی دعا اُس وقت نکلتی ہے جب کہ خدا اور بندے کے درمیان اتنی قربت ہوجائے کہ کوئی درمیانی فاصلہ باقی نہ رہے۔ ایسی دعا میں الفاظ محض علامتی (symbolic) ہوتے ہیں۔ اصل دعا وہ ہوتی ہے جس کو صرف فرشتے سنتے ہیں اور اس کو بلا تاخیر رب العالمین تک پہنچا دیتے ہیں۔

حرص کا روحانی نقصان

آدمی کی سب سے بڑی کمزوری حرص ہے۔ اِس بنا پر ہر شخص کا یہ حال ہے کہ وہ ملے ہوئے کو کافی نہیں سمجھتا۔ ہر ایک اور زیادہ، اور زیادہ کی طلب میں مبتلا رہتا ہے۔ یہ نفسیات ایک تباہ کن نفسیات ہے۔ اِس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ آدمی اعلیٰ دعا کی توفیق سے محروم ہوجاتا ہے۔

اگر آدمی شکر کی نفسیات میں جئے، یعنی اس کا احساس یہ ہو کہ دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے جو کچھ مطلوب تھا، وہ خدا نے اس کو دے دیا۔ اگر آدمی اِس احساس میں جی رہا ہو تو یہ احساس اُس کے لیے ایک اعلی دعا کا پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) بن جائے گا۔

اس کے دل کی گہرائیوں سے یہ الفاظ نکلیں گے کہ — خدایا، دنیا میں تو نے میرے ساتھ **وآتاکم من کلّ ماسألتموہ** (14:31) کا معاملہ فرمایا۔ اب آخرت میں تو میرے ساتھ وہ معاملہ فرما جس کو تو نے اپنی کتاب میں اِس طرح بیان فرمایا ہے: **ولکم فیھا ما تشتھی أنفسکم، ولکم فیھا ما تدعون** (41:31)

پوائنٹ آف ریفرنس کے ساتھ جو دعا کی جائے، وہ ایک اعلیٰ دعا ہوتی ہے، ایسی دعا ایک گہرے احساس کے تحت نکلتی ہے۔ ایسی دعا ہمیشہ کسی تیار ذہن (prepared mind) کا نتیجہ ہوتی ہے، ایسی دعا آدمی کے پورے وجود کی نمائندہ ہوتی ہے۔

ایسی دعا میں الفاظ کی حیثیت محض ثانوی ہوتی ہے اور اصل حیثیت اُن داخلی کیفیات کی ہوتی ہے جو آدمی کے دل و دماغ کو بے چین کردینے والی ہوں۔ ایسی دعا اُس وقت نکلتی ہے جب کہ خدا اور بندے کے درمیان اتنی قربت ہوجائے کہ کوئی درمیانی فاصلہ باقی نہ رہے۔ ایسی دعا میں الفاظ محض علامتی (symbolic) ہوتے ہیں۔ اصل دعا وہ ہوتی ہے جس کو صرف فرشتے سنتے ہیں اور اس کو بلا تاخیر رب العالمین تک پہنچادیتے ہیں — حرصِ دنیا کی یہ نفسیات اِس قسم کی اعلیٰ دعا کے لئے قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔

عقلی علم، داخلی معرفت

کسی چیز کو جاننے کے دو درجے ہیں — ایک ہے عقلی علم (rational knowledge) اور دوسرا ہے داخلی معرفت (inner realization)۔ عقلی علم صرف ابتدائی علم ہے۔ اعلیٰ علم یہ ہے کہ آدمی کو داخلی بصیرت کی سطح پر حقیقت کا یقین حاصل ہوجائے۔ مثلاً اپنے ایک پڑوسی کے بارے میں آپ کی واقفیت صرف عقلی علم کی سطح پر ہوتی ہے۔ لیکن اپنی ماں کے بارے میں آپ کی واقفیت اِس سے آگے بڑھ کر یقین (conviction) کی سطح پر ہوتی ہے۔ عقل اور منطق کے استعمال کے بغیر ہی آدمی کامل یقین کے درجے میں کسی ادنیٰ شبہہ کے بغیر یہ جان لیتا ہے کہ فلاں خاتون میری ماں ہے۔

یہی معاملہ خدا کے بارے میں ہے جو انسان کا خالق اور مالک ہے۔ خدا کی ابتدائی دریافت انسان کو عقل کی سطح پر ہوتی ہے۔ لیکن یہ دریافت ترقی کرتی رہتی ہے، یہاں تک کہ آدمی اس یقین کے درجے پر پہنچ جاتا ہے، جب کہ وہ اپنی داخلی بصیرت (inner perception) کے ذریعے کسی شک و شبہہ کے بغیر یقین کرلیتا ہے کہ خدا موجود ہے، ٹھیک اُسی طرح جس طرح میں خود موجود ہوں۔

یہی معاملہ خدا سے تعلق رکھنے والی تمام سچائیوں (truths) کا ہے۔ مثلاً قرآن اور رسول کا کلام، وغیرہ۔ اِن متعلق سچائیوں کے بارے میں ابتدائی علم کسی آدمی کو عقلی غور وفکر کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ لیکن یہ معرفتِ حق کا ابتدائی درجہ ہے۔ معرفتِ حق کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی کو ان حقیقتوں پر اس طرح کامل یقین ہوجائے کہ اس کی داخلی بصیرت (perception) ہی ان کی واقعیت پر بلا شک وشبہہ اعتراف کے لیے کافی ہوجائے۔ اِس معاملے میں علم کے دو درجے ہیں — عقلی علم، اور ملکوتی علم۔ عقلی علم خارجی معلومات (data) پر مبنی ہوتا ہے۔ اِس کے مقابلے میں، ملکوتی علم حقیقت کے علم کا وہ درجہ ہے جب کہ انسان خود اپنی داخلی بصیرت کی بنیاد پر یقین کے اُس مقام تک پہنچ جائے جہاں وہ خارجی معلومات (data) کا محتاج نہ رہے۔ اُس کا اپنا داخلی احساس ہی اس کے لیے کامل یقین کا ذریعہ بن جائے، یعنی علم کا وہ درجہ جو ہر انسان کو اپنی ماں پر یقین کرنے کے لیے حاصل ہوتا ہے۔

اسلام کیا ہے

اسلام کے لفظی معنیٰ ہیں: سب مشن (submission)، یعنی سب مشن ٹو گاڈ۔ سب مشن، دراصل انسان کی طرف سے خدا کے لیے اُس فطری رسپانس کا نام ہے جو خدا کی معرفت کے بعد انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ اِسی سب مشن سے وہ زندگی بنتی ہے جس کو اسلامی زندگی کہا جاتا ہے۔

خدا کی معرفت کیا ہے۔ خدا کی معرفت اُس ہستی کی معرفت ہے جس نے انسان کو پیدا کیا، جس نے انسان کو ایک ایسی شخصیت عطا کی، جیسی شخصیت وسیع کائنات میں کسی اور کو عطا نہیں ہوئی، جس نے انسان کے لیے وسیع کائنات میں زمین جیسا استثنائی کُرہ بنایا، جس نے ہماری دنیا میں وہ انوکھا سسٹم قائم کیا جس کو لائف سپورٹ سسٹم کہا جاتا ہے۔

اُس کی یہ دریافت یہیں تک نہیں رُکتی، بلکہ وہ دریافتوں کے ایک پراسس کی صورت میں اُس کی زندگی میں شامل ہوجاتی ہے۔ اب وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو دریافت کرتا ہے۔ وہ اس حقیقت کو دریافت کرتا ہے کہ میں آزاد نہیں ہوں، بلکہ میں خدا کے حکم کے ماتحت ہوں۔ دریافت کا یہ پراسس (process) آگے بڑھتا ہے۔ وہ اُس کو بتاتا ہے کہ وہ آزاد نہیں ہے، بلکہ وہ خدا کے سامنے جواب دہ (accountable) ہے۔۔موت اُس کی زندگی کا خاتمہ نہیں ہے، بلکہ موت کے بعد ایک اور زندگی شروع ہوتی ہے جہاں وہ خدا کے سامنے حاضر ہوجاتا ہے، تاکہ خدا اس کے ابدی مستقبل کے بارے میں اپنے آخری فیصلے کا اعلان کرے۔

یہ پراسس جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ دریافت کرتا ہے کہ زندگی کا خاتمہ یا تو ابدی جنّت کی صورت میں ہونے والا ہے، یا ابدی جہنّم کی صورت میں۔ یہ دریافت اُس کو بے حد سنجیدہ بنادیتی ہے۔ اب وہ اپنی زندگی کی نئی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ اب وہ ہر چیز کو ری ڈفائن (redefine) کرتا ہے۔ پہلے اگر اُس کی سرگرمیاں خود رُخی (self-oriented) تھیں تو اب اُس کی تمام سرگرمیاں خدا رُخی (God-oriented) بن جاتی ہیں۔ اِسی طرزِ حیات کا نام اسلام ہے۔

ایک سنگین مغالطہ

لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے دنیوی معاملات میں خوب عقل لگاتے ہیں، زیادہ سے زیادہ سوچتے ہیں، ہر پہلو سے سمجھ کر منصوبہ بندی (planning) کرتے ہیں، لیکن دین کے معاملے میں ان کا طریقہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ یہاں وہ سمجھتے ہیں کہ کسی حضرت کی دعا لے لو، کسی درگاہ میں چلے جاؤ، کسی بزرگ کی زیارت کرلو، تسبیح کے دانے پر کچھ الفاظ پڑھ لو، کچھ رسمی اعمال (rituals) کو دہرالو اور پھر تمام دینی معاملات خود بخود درست ہوجائیں گے۔ مگر یہ دوطرفہ طریقہ سرتاسر بے بنیاد ہے۔ اِس طریقے کا کوئی فائدہ کسی کو ملنے والا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آدمی جس طرح دنیا کے معاملات میں اپنی عقل لگاتا ہے، اُسی طرح اس کو دین کے معاملے میں بھی اپنی عقل لگانا ہوگا۔ دین کے معاملے میں بھی اس کو اپنے شعور کی پوری طاقت استعمال کرنا ہوگا۔ اِس کے بغیر نہ کوئی شخص حقیقی معنوں میں دین دار ہوسکتا ہے اور نہ وہ جنت کا مستحق بن سکتا ہے۔

دین دار بننے کا عمل پورے معنوں میں، ایک شعوری عمل ہے۔ ہر عورت اور مرد کے لیے لازم ہے کہ وہ شعوری سطح پر دین کو دریافت کرے۔ وہ دین داری کو شعوری دین داری بنائے، نہ کہ رسمی دین داری۔ وہ دین کو پورے معنوں میں، اپنے دل ودماغ کا حصہ بنائے۔ وہ اپنی دینی زندگی کو بھی اُسی طرح ایک باشعور زندگی بنائے جس طرح وہ اپنی دنیا کی زندگی کو ایک باشعور زندگی بنائے ہوئے ہے۔ اِس معاملے میں کسی بھی شخص کا کوئی استثنا نہیں۔

خدا نے انسان کو جو سب سے بڑی چیز دی ہے، وہ اس کا عقل وشعور ہے۔ جو لوگ عقل وشعور کی برتر سطح پر دین کو نہ پائیں اور دین کو اختیار نہ کریں، وہ خدا کے یہاں بے دین قرار پائیں گے، خواہ رسمی سطح پر بظاہر وہ دین دار کیوں نہ بنے ہوئے ہوں۔ دین داری ایک شعوری عمل ہے، نہ کہ صرف ایک رسمی عمل۔

سچائی کی طرف

خالد بن ولید مکّہ میں پیدا ہوئے۔ پہلے وہ پیغمبر اسلام کے مخالف تھے۔ وہ پیغمبر اسلام کے خلاف کئی لڑائیوں میں شریک رہے۔ فتحِ مکّہ (8 ہجری) سے کچھ پہلے انھوں نے مدینہ آکر اسلام قبول کرلیا۔ انھوں نے اپنے اسلام کا قصہ بتاتے ہوئے کہا کہ قبولِ اسلام سے پہلے میں اسلام کے خلاف سرگرمیوں میں مشغول تھا، مگر مجھے بار بار یہ احساس ہوتا تھا کہ میں اپنے آپ کو غلط جگہ پر رکھے ہوئے ہوں (أنّي موضع في غير شيئ، البداية والنهاية، جلد4، صفحہ 238)

اِس واقعے میں ایک نفسیاتی حقیقت بتائی گئی ہے۔ خدا نے ہر انسان کو فطرت پر پیدا کیا ہے۔ یعنی اُس فطرت پر جو خالق کو مطلوب ہے۔ اِس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ ہر آدمی جو خدا کے راستے پر نہ ہو، وہ کہیں نہ کہیں اِس احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ میں جس راستے پر چل رہا ہوں وہ میرا راستہ نہیں۔ میں اِس کے سوا کسی اور چیز کے لیے پیدا کیا گیا ہوں۔ یہ احساس، فطرت کا انتباہ ہوتا ہے۔ یہ احساس آدمی کو موقع دیتا ہے کہ وہ اپنی روش پر نظر ثانی کرے، اور صحیح راستے کو دریافت کرکے اُس پر چلنے لگے۔ مگر انسان اِس انتباہ پر چَوکنا نہیں ہوتا، وہ بدستور اپنے غلط راستے پر چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ مَر جاتا ہے۔

مذکورہ احساس دراصل انسان کی زندگی میں ایک نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ نقطۂ آغاز ہر آدمی کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اپنی سمتِ سفر کو درست کرکے اپنی حقیقی منزل کی طرف چل پڑے۔ مگر خواہشات کا غلبہ، مفادات کی فکر، سماجی تعصّبات، خاندانی دَباؤ وغیرہ رُکاوٹ بن جاتے ہیں۔ آدمی جاگنے کے باوجود دوبارہ سو جاتا ہے۔

ہر آدمی ایک ایسے کام میں مشغول ہے جس کے بارے میں اس کا دل مسلسل یہ کہہ رہا ہے کہ تم غلط جگہ پر ہو۔ کچھ لوگ اِسی حالت میں جیتے ہیں اور اسی حالت میں مرجاتے ہیں، اور کچھ لوگ اس فکری دلدل سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور اپنے آپ کو اس راستے کا مسافر بنا لیتے ہیں جس کا تقاضا ان کی فطرت کررہی تھی۔

کیفیات، کمّیات

موجودہ زمانے میں بہت سی مسلم جماعتیں اور مسلم تنظیمیں وجود میں آئی ہیں۔ ان میں ایک اور دوسرے کے درمیان بہت سے فرق پائے جاتے ہیں۔ مگر ایک چیز سب میں مشترک ہے، اور وہ یہ کہ ہر ایک نے کسی نہ کسی پہلو سے اسلام کی کمّیاتی تعبیر کر رکھی ہے۔ کیفیات پر مبنی تعبیر کے بجائے کمّیات پر مبنی تعبیر میرے نزدیک سرتاسر گمراہی ہے۔ اس نے موجودہ زمانے میں زبردست نقصان پہنچایا ہے۔

کیفیاتی تعبیر کی صورت میں آدمی ہمیشہ اپنی دین داری کے بارے میں شک میں مبتلا رہتا ہے۔ کیوں کہ کیفیات (تقویٰ، اور خشیّت) داخلی چیزیں ہیں، ان کو ناپا اور تولا نہیں جاسکتا۔ لیکن کمّیاتی تعبیر میں دین داری ایک ایسی چیز بن جاتی ہے جس کو خارجی اعتبار سے ناپا اور تولا جاسکے۔ اس کے نتیجے میں یہ ہوتا ہے کہ آدمی بے خوف ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے عمل کو ناپ تول میں ڈھال کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ جو عمل مجھے کرنا تھا وہ میں نے کر دیا۔ کیفیت پر مبنی سوچ خدا کا خوف پیدا کرتی ہے اور کمّیت پر مبنی سوچ آدمی کے اندر فرضی یقین پیدا کرکے اس کو خدا سے بے خوف بنا دیتی ہے۔

اصحابِ رسول ہمیشہ لرزاں اور ترساں رہتے تھے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک، دین داخلی کیفیت کا نام تھا، اور داخلی کیفیت کو ناپ تول کی زبان میں معلوم نہیں کیا جاسکتا۔ موجودہ زمانے کے مسلمان خدا سے بے خوف ہوگیے ہیں کیوں کہ وہ اپنے کمیاتی ذہن کی بنا پر سمجھتے ہیں کہ جو کچھ کرنا تھا وہ ہم نے کر دیا۔ اب ہمارا معاملہ بالکل درست ہے۔

سیاست پر مبنی تعبیر، مسائل پر مبنی تعبیر، فضائل پر مبنی تعبیر، برکت پر مبنی تعبیر، وسیلے پر مبنی تعبیر، عشقِ رسول پر مبنی تعبیر، مظاہرِ شرک پر مبنی تعبیر، خیر امت پر مبنی تعبیر، وغیرہ۔

یہ تمام تعبیریں ظواہرِ دین پر مبنی تعبیریں ہیں۔ دین مسلّمہ طور پر داخلی حقیقت کا نام ہے۔ اس لیے ہر وہ تعبیرِ دین جو ظواہر یا فارم پر مبنی ہو وہ بلاشبہہ باطل قرار پائے گی، اور ظواہر دین پر چلنا خود ساختہ دین پر چلنا ہے نہ کہ خدا کے بھیجے ہوئے دین پر چلنا۔

متواضع انسان

احساسِ خویش (یا احساس برتری) ایک فطری جذبہ ہے جو ہر آدمی کے اندر موجود رہتا ہے۔ اس جذبہ سے آدمی کے اندر حوصلہ اور خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ اگر احساس خویش آدمی کے اندر نہ ہو تو اس کے اندر خود اعتمادی بھی نہ رہے گی اور جب خود اعتمادی نہیں ہوگی تو وہ اس دنیا میں کوئی کام بھی نہیں کرسکتا۔ مگر یہ ضروری ہے کہ آدمی کا احساس خویش یا احساس برتری بے قید نہ ہونے پائے، وہ تواضع کے جذبہ کے تحت دبا رہے۔ اگر یہ دباؤ نہ ہو تو آدمی اجتماعی زندگی میں اپنی افادیت کھو دے گا۔ وہ اہنکار میں مبتلا ہو جائے گا۔ اور بلاشبہہ اہنکار سے زیادہ تباہ کن کوئی چیز اس دنیا میں نہیں۔

اس دنیا میں صرف دو چیزیں ہیں جو آدمی کو متواضع بناتی ہیں۔ ایک، سائنٹفک ذہن، دوسرے متقیانہ مزاج۔ سائنٹفک ذہن علم کی معرفت سے بنتا ہے اور متقیانہ ذہن خدا کی معرفت سے۔

آدمی کے اندر جب اہنکار کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے معاملے کو انسان کی نسبت سے دیکھتا ہے۔ چوں کہ انسانوں میں بہت سے لوگ اس کو اپنے آپ سے کم تر دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے اس کے اندر اپنی بڑائی کا جذبہ ابھر آتا ہے۔ مگر جس آدمی کے اندر حقیقی معنوں میں سائنٹفک ذہن ہو، وہ اپنے معاملے کو علم کی نسبت سے دیکھتا ہے نہ کہ عالِم کی نسبت سے۔ عالم محدود ہوسکتا ہے، مگر علم لامحدود ہے۔ عالم کی نسبت سے ایک آدمی اپنے کو زیادہ سمجھ سکتا ہے مگر وسیع تر علم کی نسبت سے ہر آدمی کم ہے۔ یہ احساس ایک سائنٹفک انسان کے اندر فطری طور پر تواضع کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

اسی طرح جس آدمی کے اندر تقویٰ کی صفت ہو۔ وہ اپنے معاملے کو خدائے بزرگ و برتر کی نسبت سے دیکھنے لگتا ہے۔ یہاں بھی وہی بات مزید بے پناہ اضافہ کے ساتھ موجود ہے۔ مخلوق کی نسبت سے دیکھنے میں ایک شخص کو اپنی ذات بڑی دکھائی دے سکتی ہے، مگر خدا کی نسبت سے دیکھا جائے تو ہر آدمی چھوٹا ہو جاتا ہے، خدا کی نسبت سے کوئی آدمی بھی بڑا آدمی نہیں۔ اس طرح متقی آدمی کے لیے اس کا عقیدہ اس کو ایک متوازن انسان بنا دیتا ہے۔

فائنل توجیہہ

اِس دنیا کی ہر چیز اپنے فائنل ماڈل پر ہے۔ شمسی نظام (solar system) اتنا زیادہ مکمل ہے کہ اس سے بہتر کوئی اور شمسی نظام سوچا نہیں جاسکتا۔ ہماری زمین اپنے بے شمار اجزا کے ساتھ کامل معیار کا آخری نمونہ ہے۔ ہماری دنیا میں جو لائف سپورٹ سسٹم ہے، اُس سے بہتر لائف سپورٹ سسٹم کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اِسی طرح، پہاڑ، دریا، درخت، حیوانات اور انسان، سب اپنے آخری معیاری ماڈل پر ہیں، حتی کہ گھاس کا جو ماڈل ہے، وہ بھی اپنے فائنل ماڈل پر ہے۔ کوئی آرٹسٹ کبھی گھاس کا اِس سے بہتر ماڈل نہیں بنا سکتا۔ یہی معاملہ خدا کے تخلیقی نقشہ (creation plan) کا ہے۔ یہ تخلیقی نقشہ بھی اپنے آخری کمال کی حد تک معیاری نقشہ ہے، حتی کہ اِس سے بہتر تخلیقی نقشے کا تصور ممکن نہیں۔

انسان کو خدا نے احسنِ تقویم کی صورت میں پیدا کیا، پھر موجودہ زمین پر اس کو عارضی طور پر ٹسٹ کے لیے رکھا اور یہ مقدر کیا کہ موت کے بعد کی ابدی دنیا میں ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق، سزا یا انعام دیا جائے۔ اِسی کا نام تخلیقی نقشہ ہے۔ انسان جیسی مخلوق کے لیے بلاشبہہ یہ اعلیٰ ترین تخلیقی نقشہ ہے۔ اِس سے بہتر تخلیقی نقشے کا تصور یقینی طور پر ممکن نہیں۔

مثلاً انسان اپنے اندر بہت سی خواہشات (desires) رکھتا ہے۔ یہ خواہشات انسان کے دماغ میں ایک حسین تصور کے طور پر بسی ہوئی ہیں۔ ہر عورت اور مرد چاہتے ہیں کہ اُنھیں ایک ایسی دنیا ملے، جہاں ان کی تمام خواہشیں کسی روک ٹوک کے بغیر پوری ہوں۔ فلسفیوں اور مفکروں نے زندگی کے جتنے نقشے بنائے ہیں، اُن میں انسان کی اِن خواہشوں کی تکمیل (fulfilment) ممکن نہیں۔ مثلاً آواگون کا نظریہ (rebirth cycle) اور اِفادی نظریہ (utilitarianism)، وغیرہ۔ آخرت کے نظریے کی صورت میں جو تخلیقی نقشہ سامنے آتا ہے، اُس میں آخری معیاری درجے میں اِن خواہشوں کی تکمیل کا سامان موجود ہے۔ نظریۂ آخرت کا یہ پہلو اِس بات کا آخری ثبوت ہے کہ وہی زندگی کا حقیقی نظریہ ہے۔ اِس کے سوا جو نظریات ہیں، وہ سب فرضی قیاسات ہیں، اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

اللہ اکبر کی اسپرٹ

اسلام کی اسپرٹ کو ایک لفظ میں، اللہ اکبر اسپرٹ کہہ سکتے ہیں۔ اسلام کی سب سے بڑی عبادت نماز ہے، جو رات دن میں پانچ بار ادا کی جاتی ہے۔ نوافل کی صورت میں جو نمازیں پڑھی جاتی ہیں، وہ اِن کے علاوہ ہیں۔ اِن نمازوں میں اور اذان واقامت میں اللہ اکبر کا لفظ روزانہ تقریباً تین سو بار دہرایا جاتا ہے۔

اللہ اکبر کا مطلب ہے— اللہ بڑا ہے۔ اِس میں اپنے آپ یہ بات شامل (implicit) ہے کہ میں بڑا نہیں ہوں۔ اِس طرح ہر صاحبِ ایمان روزانہ بار بار اِس بات کو اپنے ذہن میں تازہ کرتا ہے کہ بڑائی صرف ایک خدا کے لیے ہے، میرے لیے کوئی بڑائی نہیں۔ باجماعت نماز اِسی حقیقت کا ایک عملی مظاہرہ ہے۔ باجماعت نماز میں یہ ہوتا ہے کہ تمام اہلِ ایمان اپنے درمیان سے ایک شخص کو آگے بڑھا کر سب اس کے پیچھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ اکبر اسپرٹ کے اظہار کی ایک اجتماعی صورت ہے۔

اللہ اکبر کا مقصد دراصل آدمی کے اندر تواضع (modesty) کی اسپرٹ پیدا کرنا ہے۔ تواضع کی اسپرٹ حقیقی معنوں میں جب آدمی کے اندر پیدا ہو جاتی ہے، تو وہ کسی حد پر نہیں رکتی، یہ اسپرٹ جس طرح خدا کے سامنے ظاہر ہوتی ہے، اُسی طرح وہ انسان کے مقابلے میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اہلِ ایمان کی پہچان یہ ہے کہ اللہ اکبر کی اسپرٹ، یا تواضع کی اسپرٹ ان کی عملی زندگی میں پوری طرح شامل ہو جائے۔

اللہ اکبر کی اسپرٹ والے لوگ کبھی انانیت اور کبر کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ وہ ہرگز وہ کام نہیں کریں گے جس کو ''ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانا'' کہا جاتا ہے۔ دوسروں کی ماتحتی قبول کرنا ان کو ایک عبادتی فعل معلوم ہوگا۔ ان کی روح کو خود جھکنے میں خوشی ہوگی، نہ کہ دوسروں کو اپنے آگے جھکانے میں۔ وہ اپنی غلطی کا فوراً اعتراف کرلیں گے۔ وہ قیادت کے شوق سے آخری حد تک خالی ہوں گے۔

شکایت کا مزاج

ایک شخص نے کسی کے بارے میں کچھ شکایت کی بات کی۔ میں نے کہا کہ شکایت قاتلِ روحانیت ہے۔ شکایت اتنی زیادہ بری چیز ہے کہ آپ کو مطلقاً اُس سے دور رہنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ شکایت سے مطلقاً کیسے بچا جاسکتا ہے، کیوں کہ شکایت کے اسباب اِس دنیا میں ہمیشہ پیش آتے رہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہی تو آپ کا امتحان ہے کہ آپ شکایت کے باوجود بے شکایت بن کر اِس دنیا میں رہیں، منفی تجربات کے باوجود آپ مثبت نفسیات میں جینا سیکھیں۔ یہی اِس دنیا میں انسان کا امتحانی پرچہ (test-paper) ہے۔ ہر ایک کو اِس امتحان سے گزرنا ہے۔ اِس امتحان میں کامیاب ہونے والا ہی کامیاب ہے، اور اِس امتحان میں ناکام ہونے والا ہی ناکام۔ مزید یہ کہ یہ ناکامی بھی ابدی ہے، اور یہ کامیابی بھی ابدی۔

شکایت کوئی سادہ چیز نہیں۔ شکایت کے ساتھ ناشکری جڑی ہوئی ہے۔ جس دل میں شکایت ہوگی، وہ شکر کے جذبات سے محروم ہوجائے گا۔ مزید یہ کہ شکایت گندگی کے مانند ہے۔ گندگی کی ایک بوند پانی کے پورے ٹب کو گندا کردیتی ہے۔ اِسی طرح شکایت کی تھوڑی مقدار بھی شکر کی نفسیات سے آدمی کو محروم کردیتی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اِس معاملے میں اتنا زیادہ حساس ہو کہ وہ کسی بھی حال میں شکر کا ایروژن (erosion) گوارا نہ کرسکے۔ وہ شکایت کی باتوں کو نظر انداز کرتا رہے، تاکہ اس کے شاکرانہ مزاج میں کوئی کمی نہ آنے پائے۔

اِس مہلک برائی سے بچنے کا طریقہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے آغاز ہی میں اُس کا خاتمہ کردینا — تھوڑی سی شکایت کو بھی اتنا گھٹائیے، اتنا گھٹائیے کہ اس کو زیرو کے درجے تک پہنچا دیجئے۔ اور شکر کی تھوڑی سی بات کو بھی اتنا بڑھائیے، اتنا بڑھائیے کہ اس کو صد فی صد تک پہنچا دیجئے۔ یہی واحد تدبیر ہے جس کے ذریعے آپ اپنی شخصیت کو ایسا بنا سکتے ہیں کہ آپ کے اندر صرف شکر ہی شکر ہو، ناشکری کا ایک ذرہ بھی آپ کی شخصیت کے اندر باقی نہ رہے۔ شکر کے احساس میں جینے والوں کے لیے ابدی جنت ہے، اور ناشکری کے احساس میں جینے والوں کے لیے ابدی جہنم۔

آج کی سب سے بڑی خبر

اخبار کا ہاکر (hawker) آواز لگا کر اخبار بیچ رہا تھا— آج کی سب سے بڑی خبر، آج کی سب سے بڑی خبر۔ میں نے سوچا کہ اخبار کے ہاکر کے لیے آج کی سب سے بڑی خبر وہ ہے جو اس کے اخبار میں پہلے صفحے پر چھپی ہے۔ لیکن آج کی سب سے بڑی خبر وہ ہے جو کائناتی سطح پر ظہور میں آئی ہے۔

یہ کائناتی خبر کیا ہے۔ وہ خبر یہ ہے کہ کل کا ڈوبا ہوا سورج آج دوبارہ روشنی اور حرارت دینے کے لیے طلوع ہو گیا ہے، ہواؤں کے ذریعہ انسان کے لیے آکسیجن کی سپلائی آج بھی مسلسل جاری ہے، زمین کی گردش (routation) کل کی طرح آج بھی نہایت صحت کے ساتھ ہو رہی ہے، دریاؤں میں تازہ پانی کے چشمے بدستور بہہ رہے ہیں۔ ہوائیں کل کی طرح آج بھی بدستور چل رہی ہیں، زمین کی سطح پر زندگی کی سرگرمیاں آج بھی بدستور جاری ہیں۔ ہماری دنیا میں لائف سپورٹ سسٹم جو کل شام تک قائم تھا، وہ آج بھی بدستور قائم ہے، وغیرہ۔

ایک شخص نے کہا ہے کہ صبح کے وقت جب تم دیکھو کہ سورج کی کرنیں تمھارے کمرے میں داخل ہو گئی ہیں تو تم اپنے بستر سے اٹھو اور چلا کر کہو کہ —ایک اور سنہری صبح۔ یہ بات صرف سورج کے لیے نہیں ہے، بلکہ وہ فطرت (nature) کے ہر واقعہ کے لیے ہے، حتی کہ بہت سے واقعات جو بظاہر چھوٹے واقعات معلوم ہوتے ہیں، وہ بھی اپنی حقیقت کے اعتبار سے اتنا ہی بڑے ہیں جتنا کہ دوسرے بڑے بڑے واقعات۔

ایک عام واقعے میں خاص پہلو کو دریافت کرنا، یہی توسم (15:75) ہے اور یہی توسم معرفت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

معرفت ایک زندہ تجربہ ہے۔ معرفت ایک مسلسل دریافت کا نام ہے۔ معرفت یہ ہے کہ آدمی مادّی دنیا سے روحانی غذا حاصل کر سکے۔ معرفت کوئی پر اسرار چیز نہیں، معرفت وہی چیز ہے جس کو دوسرے الفاظ میں، ذہنی ارتقا (intellectual development) کہا جاتا ہے۔

آفاقی آواز

آپ کی میز پر ایک ریڈیو سیٹ رکھا ہوا ہے۔ بظاہر وہ خاموش ہے۔ اس میں کوئی آواز نہیں۔ لیکن جب آپ نے اس کو کھولا تو اچانک اس میں سے آوازیں آنے لگیں، بامعنیٰ آوازیں جس کا ایک ایک لفظ آپ سمجھ رہے تھے، جس کی ایک ایک بات آپ کے ذہن میں اترتی چلی جارہی تھی۔ اس کے بعد جب آپ نے اس کا سوئچ دبا کر اس کو بند کیا تو دوبارہ اچانک تمام آوازیں بند ہو گئیں۔ اب بولتا ہوا ریڈیو خاموش ہو گیا۔ اب بھی وہی مشین آپ کی میز پر رکھی ہوئی ہے، مگر اس سے کوئی آواز نہیں آرہی ہے جس کو آپ سن سکیں۔

کائنات بھی اسی قسم کا ایک بہت بڑا خدائی ریڈیو سیٹ ہے۔ وہ ہر آن پیغامات نشر کر رہا ہے۔ کسی وقفہ کے بغیر، ہر لمحہ اس سے آوازیں نکل رہی ہیں۔ وہ ہر صبح وشام یہ اعلان کر رہا ہے کہ یہ دنیا کیا ہے۔ انسان کو یہاں کیوں پیدا کیا گیا ہے۔ انسان کی کامیابی کیا ہے اور ناکامی کیا۔ انسان کہاں سے آیا ہے اور کہاں وہ دوبارہ لوٹ کر جائے گا۔ حق وباطل کا وہ کون سا خدائی معیار ہے جس پر موت کے بعد انسان کو جانچا جائے گا اور جس کے مطابق اس کے ابدی انجام کا فیصلہ ہوگا۔

جس طرح انسانی ریڈیو کی آوازیں ہم صرف اُس وقت سنتے ہیں جب کہ ہم ریڈیو کو آن (on) کریں اور اِسی کے ساتھ ہم اپنے کان کھلے رکھیں۔ اِسی طرح کائنات کے عظیم تر ریڈیو سے نکلنے والی آوازیں بھی وہی لوگ سنتے ہیں جو اس کی طرف دھیان لگائیں اور اپنے دماغ کی کھڑکیاں اس کو سننے کے لیے کھلی رکھیں۔ کائناتی ریڈیو بظاہر اپنا پیغام خاموش انداز میں نشر کر رہا ہے، مگر سننے والوں کے لئے وہ ہر دوسری آواز سے زیادہ قابلِ سماعت ہے۔ وہ آسمان کی وسعتوں میں پھیلا ہوا ہے، وہ سورج کی روشنی میں نمایاں ہے، وہ پانی کی لہروں میں موج زن ہے، وہ ہوا کی صورت میں ہمارے چاروں طرف داخل ہو رہا ہے۔ غرض زمین کے پودوں سے لے کر آسمان کے ستاروں تک کوئی چیز ایسی نہیں جو اِس آفاقی پیغام رسانی میں مصروف نہ ہو——سننے والا صرف وہ ہے جو اِس کائناتی آواز کو سنے اور اس کو اپنی زندگی کے لئے نشانِ راہ بنالے۔

درخت کی مثال

درخت خدا کی ایک انڈسٹری ہے۔ درخت کا آغاز ایک چھوٹے بیج سے ہوتا ہے۔ بیج کے اندر وہ تمام امکانات نہایت کاریگری کے ساتھ سموئے ہوتے ہیں کہ جب بھی اس کو موافق حالات ملیں وہ ایک درخت کی صورت میں اپنے آپ کو ظاہر کرنا شروع کردے۔

بیج کے بونے کی جگہ مٹی ہے۔ آپ بیج کو پتھر میں ڈال کر اس کے متوقع نتائج حاصل نہیں کرسکتے۔ بیج کو جب مٹی میں ڈالا جاتا ہے تو اچانک وہ پوری کائنات سے اس طرح جڑ جاتا ہے جیسے کہ ساری کائنات صرف اسی کی پرورش کے لئے بنائی گئی تھی۔ مٹی نرم ہو کر اس کو موقع دیتی ہے کہ وہ اس کے اندر اپنی جڑیں داخل کرے۔

اس کے بعد بیکٹیریا کروڑوں کی تعداد میں اس کی جڑوں میں جمع ہو جاتے ہیں تاکہ وہ فضا سے نائٹروجن الگ کرکے اس کی خوراک فراہم کریں۔ زمین کی تہیں اپنی معدنیات اور نمکیات کو پانی میں گھول کر اس کی جڑوں کو پہنچاتی ہیں، تاکہ وہ کھنچ کھنچ کر اوپر کی طرف جائے اور درخت کی نشو ونما کا ذریعہ بنے۔ زمین سے لے کر سورج تک کائنات کا پورا کارخانہ متحرک ہو جاتا ہے تاکہ اس کے لئے مختلف موسم پیدا کرے اور گرمی اور سردی اور بارش کے حالات سے گزارتے ہوئے اس کو ایک مکمل درخت کی صورت میں کھڑا کردے۔

یہ درخت پوری کائنات سے اس طرح ہم آہنگ ہوتا ہے کہ کہیں بھی ماحول کی دوسری چیزوں سے اس کا ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ وہ اگر زمین سے پانی لیتا ہے تو وہ خود بھی زمین سے لی ہوئی رطوبت کو اپنے پتوں کے ذریعہ خارج کرکے بارش کے عمل میں معاون بنتا ہے۔

درخت اگر زمین سے اپنی خوراک حاصل کرتا ہے تو خود بھی اپنے پتوں اور پھولوں کو زمین پر گرا کر اس کی زرخیزی میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ اگر ہوا سے کاربن ڈائی آکسائڈ لیتا ہے تو وہ ایک اور مفید چیز آکسیجن کی صورت میں ہوا کو لوٹا دیتا ہے۔ وہ کائنات سے الگ ہوتے ہوئے پوری کائنات سے

اس طرح جڑا ہوا ہوتا ہے کہ کسی چیز سے بھی کبھی اس کا ٹکراؤ نہیں ہوتا۔

درخت سایہ تلاش کرنے والے کے لئے سایہ مہیا کرتا ہے۔ وہ اپنے پاس سے گزرنے والوں کے لئے مہک اور سرسبز منظر کا تحفہ پیش کرتا ہے۔ جو شخص اس سے غذا حاصل کرنا چاہے، اس کے لئے اس کے پاس لذیذ پھل موجود ہوتا ہے، حتی کہ جو لوگ اس کو کاٹ ڈالتے ہیں ان کو بھی وہ لکڑی مہیا کرتا ہے جس سے وہ اپنی مختلف تمدنی ضرورتوں کو پوری کریں۔ جب بھی تجربہ کا کوئی لمحہ آتا ہے تو درخت عین وہی ثابت ہوتا ہے جس کی اس سے امید کی گئی تھی۔

ان سب کے ساتھ درخت ایک ایسا وجود ہے جو زمین میں اپنی جڑیں داخل کر کے خود اپنے بل پر کھڑا ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ درخت کا تقریباً نصف حصہ سطح زمین کے نیچے ہوتا ہے اور نصف حصہ سطح زمین کے اوپر۔ وہ زمین کی تہوں میں اس طرح گڑا ہوا ہوتا ہے کہ کوئی اس کو اکھاڑ نہ سکے اور فضا میں وہ اس طرح بلند ہوتا ہے کہ کائنات کی تمام چیزوں سے بے روک ٹوک اپنا رزق حاصل کرے۔

قرآن میں مومن کی مثال درخت سے دی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کو کن صفات کا حامل ہونا چاہئے۔ مومن وہ ہے جس کے اندر وہی صفتیں انسانی سطح پر موجود ہوں جو درخت کے اندر مادی سطح پر پائی جارہی ہیں۔ مومن کو وہی کام شعور کے تحت کرنا ہے جس کو درخت طبعی قانون کے تحت انجام دے رہا ہے۔ مومن کو خود اپنے ارادہ سے اسی سرسبز دنیا کی تخلیق کرنی ہے جس کو ایک درخت قانونِ فطرت کی پابندی کے تحت جبراً وجود میں لاتا ہے۔

عام درخت مٹی کے اندر سے نکلتا ہے۔ مومن کا درخت روحانیت کی ربانی زمین پر اگتا ہے۔ ایک دنیا کے مادی اجزا سے بنتا ہے اور دوسرا عالم آخرت کے جنتی اجزا سے۔ عام درخت مادی دنیا کا درخت ہے تو مومن انسانی دنیا کا درخت۔

درخت ایک نمو پذیر وجود ہے، اسی طرح مومن بھی ایک نمو پذیر وجود ہے۔ مومن وہ انسان ہے جو ربانی فکر کی بنا پر اس قابل ہو جاتا ہے کہ پوری کائنات اس کے لئے معرفت کا دسترخوان بن جائے۔

ذکر و دعا

ذکر کیا ہے

مولانا عبدالماجد دریابادی (وفات: 1977) نے قرآن کی آیت: **فاذکرونی، أذکرکم** (2:152) کی تشریح کے تحت اپنی تفسیر میں لکھا ہے:

''ابوبکر جصّاص رازی (وفات: 370ھ) نے ذکر سے مراد لیا ہے— آیاتِ الٰہی اوران کی عظمت وقدرت کا تفکّر، اور اِسی کو سارے اذکار سے افضل اوران کی اصل قرار دیا ہے (**وذکـــــره بـالـفکر فی دلائله وآیاته وقدرته وعظمته۔ وهو أفضل سائر وجوه الذکر مبنیة علیه وتابعة له**'' (أحکام القرآن 1/112)۔

اصل یہ ہے کہ اللہ کی ذات کا تصور ہم موجودہ دنیا میں صرف اللہ کی صفات کے اُن مظاہر کے ذریعے کرتے ہیں جو ہمارے وجود میں اور کائنات میں ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ اِن مظاہرِ فطرت میں تدبر کرنے سے ہم اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ذکر، اللہ کے اسمِ ذات کی لفظی تکرار کا نام نہیں ہے۔ ذکر یہ ہے کہ اللہ کے تخلیقی مظاہر میں غور کیا جائے، تخلیقی کمالات کے ذریعے اللہ کی عظمت کو دریافت کیا جائے۔ یہی ذکر ہے اور اِسی ذکر کے ذریعے کسی انسان کو اللہ کی اعلیٰ معرفت حاصل ہوتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم خدا کی ذات کا مشاہدہ نہیں کر سکتے، البتہ ہم خدا کی تخلیقات میں ضرور اس کی جھلک کو دیکھ سکتے ہیں۔ تخلیقاتِ الٰہی میں اِسی غور وفکر کا نام ذکر ہے، اور اِسی کے ذریعے کسی انسان کو وہ اعلیٰ درجۂ ایمان نصیب ہوتا ہے جس کو معرفت کہا گیا ہے۔

ذاتِ الٰہی کا مشاہدہ کرنے کی کوشش انسان کو یا تو وجد (ecstasy) تک پہنچاتی ہے، یا کنفیوژن (confusion) تک، اور یہ دونوں ہی بلاشبہہ غیر مطلوب ہیں— اِس معاملے میں اصل مطلوب چیز وہی معرفتِ ربانی (divine realization) ہے جو تدبر اور تفکر کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ اِس منزل تک پہنچنے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

ذکرِ کثیر

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ — اللہ کی یاد بلاشبہہ سب سے بڑی چیز ہے (ولذکر اللّٰہ أکبر) دوسرے لفظوں میں یہ کہ کسی انسان کے لیے سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ وہ اللہ کو یاد کرے:

And rememberance of God is the greatest thing. (29:45)

انسان سے یہ ذکر سب سے زیادہ مطلوب ہے۔ چناں چہ قرآن میں بار بار کہا گیا ہے کہ اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو (اذکروا اللہ ذکراً کثیرا)

ذکرِ کثیر سے کیا مراد ہے۔ اِس سے مراد کوئی عدد، یا شمار یاتی نصاب نہیں ہے، بلکہ اُس سے مراد ایک ذہنی کیفیت ہے۔ ایک روایت کے مطابق، حضرت عائشہ نے کہا: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یذکر اللہ علی کلّ أحیانہ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 852) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر موقع (occasion) پر اللہ کو یاد کرتے تھے۔ اِس روایت سے ذکرِ کثیر کا مفہوم سمجھا جا سکتا ہے۔

أحیانہ میں ہ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے۔ اِس کا مطلب ہے — أحیان اللہ، جیسے کہ قرآن میں آیا ہے: أیّام اللہ۔ اصل یہ ہے کہ کوئی بھی معاملہ جو انسان کے ساتھ پیش آتا ہے، اُس میں آلاء اللہ کا پہلو شامل رہتا ہے۔ آلاء اللہ سے مراد، اللہ کے کرشمے (wonders of God) ہیں جو ہر چیز میں شامل ہیں، کوئی بھی چیز اُس سے خالی نہیں۔

ذکرِ کثیر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس چیز کو بھی دیکھے، یا اُس پر جو بھی تجربہ گزرے، وہ اس کو اللہ کی یاد کے لیے ایک پوائنٹ آف ریفرنس بنا لے:

Make every experience a point of reference for the remebrance of God.

ہر چیز اس کو خدا کی یاد دلائے۔ ہر تجربہ اس کے ایمان میں اضافے کا سبب بنتا رہے۔ ہر مطالعہ اور مشاہدہ، اس کے لیے خدا سے قربت کے ہم معنٰی بن جائے۔

قانونِ شریعت، قانونِ رحمت

قرآن کی سورہ النساء میں قانونِ وراثت کے ذیل میں ایک آیت آئی ہے۔ اس کا ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے: ''اور جب حاضر ہوں تقسیم کے وقت رشتے دار اور یتیم اور محتاج تو اُن کو کچھ دے دو اُس میں سے اور کہہ دو اُن کو معقول بات'' (4:8)۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ تقسیم میراث کے وقت اگر خاندان کے ایسے افراد وہاں آجائیں جن کو ازروئے قانون میراث میں حصہ نہیں پہنچتا تو ان کو بھی ترکہ کے سامان میں سے کچھ دے دو، ان کو محروم نہ لوٹاؤ۔ بظاہر یہ میراث کی ایک آیت ہے، لیکن اِس میں دعا کے لیے ایک اہم پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) ملتا ہے۔ ایک مومن جب اِس آیت کو پڑھے گا تو وہ تڑپ اٹھے گا۔ وہ کہے گا کہ خدایا، یہی معاملہ میرا جنت کی نسبت سے ہے۔ میرے پاس کوئی بھی ایسا عمل نہیں جو مجھ کو جنت کا مستحق بنائے۔ لیکن میراث کی اس آیت میں تو نے یہ اصول بتایا ہے کہ تقسیم میراث کے وقت اگر کچھ ایسے افرادِ خانہ وہاں آجائیں جو ازروئے قانون اس میں حصہ پانے کے مستحق نہ ہوں، تب بھی ازراہِ شفقت اُن کو ترکہ کے سامان میں سے کچھ دے دو۔

قرآن کی اِس آیت میں ایک بندۂ مومن کے لیے عظیم تسکین (solace) کا سامان موجود ہے۔ اِس آیت کو لے کر ایک بندۂ مومن کہہ سکتا ہے کہ — خدایا، میں آخری حد تک ایک بے مایہ انسان ہوں، لیکن قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ تیری رحمت اتنی وسیع ہے کہ وہ غیر مستحق انسانوں تک بھی پہنچتی ہے۔ خدایا، تیری یہی رحمت میرے لیے امید کا سہارا ہے۔ تیرے اپنے قائم کردہ اِس اصول کے حوالے سے، میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ عدم استحقاق کے باوجود تو مجھ کو اپنی رحمتوں میں حصے دار بنا دے۔ میرے جیسے غیر مستحق کو بھی تو اُس جنت میں جگہ دے دے جو صرف مستحق افراد کے لیے بنائی گئی ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ قانون شریعت کے مطابق، میں جنت کا مستحق نہیں، لیکن قانونِ رحمت کے مطابق، تو مجھ کو اپنی جنت میں داخل کر دے۔

عجز اور اختیار

قرآن کی سورہ فاطر کی ایک آیت یہ ہے: **یا أیّھا الناس أنتم الفقراء إلی الله، والله ھو الغني الحمید** (35:15) یعنی اے لوگو، تم سب اللہ کے محتاج ہو۔ اور اللہ بہت بے نیاز اور تعریف والا ہے۔ یہی بات ایک حدیث میں اِن الفاظ میں آئی ہے: **یا عبادي، کلّکم ضالّ، إلا مَن ھدیتُه، فاستھدوني أھدِکم۔ یا عبادي، کلّکم جائع إلا من أطعمته، فاستطعموني أطعمکم۔ یاعبادي، کلّکم عارٍ إلاّ من کسوته، فاستکسوني أکسُکم (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 6737)** یعنی اے میرے بندو، تم سب کے سب بھٹکے ہوئے ہو، سوا اُس کے جس کو میں راہ دکھاؤں۔ تم مجھ سے رہنمائی مانگو، میں تم کو رہنمائی دوں گا۔ اے میرے بندو، تم سب کے سب بھوکے ہو، سوا اس کے جس کو میں کھلاؤں۔ تم مجھ سے کھانا طلب کرو، میں تم کو کھانا دوں گا۔ اے میرے بندو، تم سب کے سب عاری ہو، سوا اُس کے جس کو میں پہناؤں۔ تم مجھ سے طلب کرو، میں تم کو پہناؤں گا۔

اللہ نے انسان کو ہر اعتبار سے ایک کامل وجود دیا، لیکن انسان کو کسی بھی اعتبار سے ذاتی اختیار حاصل نہیں۔ انسان مکمل طور پر ایک عاجز مخلوق ہے۔ اِس عجز کی تلافی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ موجودہ دنیا میں اِس عجز کی تلافی بقدرِ ضرورت کی گئی ہے، جس کا اشارہ قرآن کی سورہ ابراہیم کی اِس آیت میں موجود ہے: **وآتاکم من کلّ ما سألتموہ** (14:34)۔ آخرت میں اہلِ جنت کے لیے اِس عجز کی تلافی بقدرِ خواہش کی جائے گی، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: **ولکم فیھا ما تشتھي أنفسکم** (41:31)۔

اِسی حقیقت کی دریافت سب سے بڑی معرفت ہے۔ قادرِ مطلق خدا کے مقابلے میں، اپنے عجزِ تام کو شعوری طور پر دریافت کرنا، یہی معرفت کا آغاز ہے۔ اِس دریافت کے بغیر کسی انسان کے اوپر معرفت کا دروازہ نہیں کھلتا — معرفت سے بہرہ مند لوگوں کے لیے جنت ہے، اور معرفت سے بے بہرہ لوگوں کے لیے جہنم۔

ربّانی دعا

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آدم سے جب یہ غلطی ہوئی کہ انھوں نے شجر ممنوعہ کا پھل کھالیا تو اچانک وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہوگئے۔ اس کے بعد ان کو سخت ندامت ہوئی اور انھوں نے اللہ سے معافی کی دعا کی۔ اِس سلسلے میں قرآن کے الفاظ یہ ہیں: **فتلقّی آدم من ربّه کلمات فتاب علیه، إنه هو التواب الرحیم** (2:37)۔

اِس آیت میں تلقّی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ تلقّی کے لفظی معنی ہیں ملنا (to receive)، یعنی آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات اخذ کئے، پھر اس کے مطابق، دعا کی تو اللہ نے ان کی دعا کو قبول فرمایا۔ یہاں یہ سوال ہے کہ اِس تلقّی کی صورت کیا تھی۔ اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ نے آواز دے کر آدم کو بتایا، یا کوئی فرشتہ آیا اور اس نے انھیں اِن کلمات کی تلقین کی۔ یہاں اِس قسم کا مفہوم لینا درست نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ الہام (inspiration) کا ایک معاملہ تھا۔ اِسی طرح کے معاملے کی بابت امام مالک بن انس نے کہا ہے: **نورٌ یُلقیٰ فی قلب المؤمن**۔ یعنی یہ ایک روشنی ہے جو مومن کے دل میں ڈالی جاتی ہے۔ جب کسی بندے پر شدید انابت طاری ہوتی ہے، وہ گریہ وزاری کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے، وہ آخری حد تک اپنے آپ کو اللہ کے آگے ڈال دیتا ہے، اُس وقت نفسیات کی سطح پر اس کے اوپر ربّانی کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ یہ کیفیات کچھ خاص الفاظ میں ڈھل جاتی ہیں۔ اِسی کو ربانی دعا کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی ربانی دعا اپنے آپ میں قبولیت کی پیشگی خبر ہوتی ہے۔

اِس قسم کی ربانی دعا کی توفیق کس کو ملتی ہے۔ یہ توفیق اُس شخص کو ملتی ہے جو اپنے آپ کو کامل عبدیت کے مقام پر پہنچائے، جو اِس حقیقت کو کامل سطح پر دریافت کرے کہ وہ پانے والا ہے اور خدا دینے والا۔ اِس قسم کا گہرا احساس جب آدمی کے اوپر طاری ہو تو وہ ایک ایسا لمحہ ہوتا ہے جب کہ بندے کا خصوصی تعلق اللہ سے قائم ہوجاتا ہے۔ اُس وقت اس کی زبان سے ذکر ودعا کے الہامی الفاظ نکلنے لگتے ہیں۔ ذکر ودعا کے انھیں الہامی الفاظ کا نام ربانی دعا ہے۔

ناشکری کے حالات میں شکر

قرآن میں آدم اور ابلیس کا قصہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ سجدہ نہ کرنے کے نتیجے میں ابلیس کو جب رحمتِ خداوندی سے محروم کیا گیا، اُس وقت ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے کہا: **قال فبما أغويتني لأقعدنّ لهم صراطك المستقيم. ثم لآتينهم من بين أيديهم ومن خلفهم وعن أيمانهم وعن شمائلهم، ولاتجد أكثرهم شاكرين** (7:16-17) یعنی ابلیس نے کہا کہ چوں کہ تو نے مجھ کو گمراہ کیا ہے، اِس لیے میں بھی لوگوں کے لیے تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا۔ پھر میں اُن پر آؤں گا اُن کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے، اور تو اُن میں سے اکثر لوگوں کو شکر گزار نہ پائے گا۔

اِس آیت میں گمراہ کرنے کا مطلب آزمائش (test) میں ڈالنا ہے۔ ابلیس کا مطلب یہ تھا کہ میں نارمل حالات میں درست تھا، لیکن سجدے کا حکم میرے لیے آزمائش کا سبب بن گیا۔ اِس آزمائش نے مجھے ناکام کر دیا اور میں تیری رحمت سے محروم ہو گیا۔ اب میں تمام انسانوں کے ساتھ یہی معاملہ کروں گا، یہاں تک کہ انسانوں کی اکثریت آزمائش میں ناکام ہو جائے گی، وہ شکر کے بجائے ناشکری کے راستے پر چل پڑے گی۔

قرآن سے ثابت ہے کہ ابلیس کو انسان کے اوپر کوئی اختیار حاصل نہیں (16: 99) پھر وہ کس طرح انسانوں کو شکر سے دور کرے گا۔ اصل یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں ہمیشہ ناشکری کے اسباب ہوتے ہیں۔ ناشکری کے حالات میں شکر گزار بننے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ناشکری کے اسباب کے باوجود شکر گزار بننے کا آرٹ جانے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں ابلیس کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ انسان کو بہکا کر ناشکر گزار بنا دے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ناشکری کو شکر میں تبدیل نہیں کر پاتا۔ وہ ناشکری کے ہر واقعے کو عذر بناتا رہتا ہے، اِس طرح وہ شکر کی سعادت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتا ہے۔

ذکر ایک تفکیری عمل

قرآن میں امر کی زبان میں جو احکام دیے گئے ہیں، اُن میں سے ایک حکم وہ ہے جس کے لیے ذکرِ کثیر کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ حکم قرآن کی مختلف آیتوں میں ہے۔ اُن میں سے ایک آیت یہ ہے: یٰأیّھا الذین آمنوا اذکروا اللہ ذِکراً کثیراً (33: 41) یعنی اے ایمان والو، خدا کا بہت زیادہ ذکر کرو۔

ذکر کے لفظی معنیٰ ہیں— یاد کرنا (to remember)۔ یاد ایک معنوی حقیقت ہے، نہ کہ صرف ایک لفظی حقیقت۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ انسان جب کسی کو یاد کرتا ہے تو وہ اس کو الفاظ کے وسیلے سے یاد کرتا ہے۔ مثلاً جب زید کو یاد کرنا ہو تو پہلے آدمی کے ذہن میں زید کا لفظ آئے گا۔ مگر یاد کے معاملے میں لفظ کی حیثیت صرف اضافی (relative) ہے، نہ کہ حقیقی (real)۔ اِسی طرح، جب آپ زید کو یاد کریں تو آپ کے ذہن میں ایک انسان کا تصور آئے گا۔ اور جب آپ خداوندِ ذوالجلال کو یاد کریں تو فطری طور پر آپ کے ذہن میں اُس عظیم ہستی کا تصور آئے گا جو سارے زمین وآسمان کا خالق اور مالک ہے، جس کے آلاء (7: 74) اتنے زیادہ ہیں جن کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ اِس طرح، ذکر میں اپنے آپ تفکر اور تدبر اور تعقل کا مفہوم شامل ہوجاتا ہے۔

حدیث کی مختلف کتابوں میں حضرت عائشہ کی یہ روایت آئی ہے کہ: کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یذکر اللہَ علیٰ کل أحیانہ (صحیح البخاري، کتاب الأذان) یعنی رسول اللہ ﷺ ہر موقع (occasion) پر اللہ کو یاد کرتے تھے۔ اِس روایت کے مطابق، ذکرِ کثیر یہ ہے کہ ہر تجربہ اور مشاہدہ آدمی کے اندر خدا کی سوچ پیدا کردے، اس کے اندر خدا رخی سوچ (God-oriented thinking) پیدا ہوجائے۔ پورا عالمِ کون (nature) اس کے لیے خدا کی یاد دلانے والا بن جائے۔ یہ ذکرِ کثیر کسی قسم کے تکرارِ الفاظ کا نام نہیں۔ ذکرِ کثیر کا فطری طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے ذہن کو اتنا زیادہ بیدار کرے کہ زندگی کے مختلف حالات کے درمیان وہ ہر چیز میں خدا کی یاد کا تجربہ کرنے لگے، ہر چیز اس کے لیے یادِ الٰہی کا ذریعہ بن جائے۔

توبۂ نصوح

قرآن کی سورہ التحریم میں بتایا گیا ہے کہ توبۂ نصوح کیا ہے۔ اِس سلسلے میں ارشاد ہوا ہے:

''اے ایمان والو، اللہ کے آگے توبۂ نصوح کرو۔ امید ہے کہ تمھارا رب تمھارے گناہ معاف کردے اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ جس دن اللہ، نبی کو اور اس کے ساتھ ایمان والوں کو رسوا نہیں کرے گا۔ ان کی روشنی ان کے آگے اور ان کے دائیں طرف دوڑ رہی ہوگی۔ وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب، ہمارے لیے ہماری روشنی کو کامل کردے اور ہماری مغفرت فرما، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے'' (66:8)۔

نصوح یا ناصح کے معنی خالص کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: **هذا عسل ناصحٌ**، یعنی یہ خالص شہد ہے۔ توبۂ نصوح کا مطلب خالص توبہ یا سچی توبہ ہے۔ مفسر القرطبی نے لکھا ہے کہ علما نے توبۂ نصوح کے 23 معانی بتائے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ 23 مختلف معانی نہیں، بلکہ وہ خالص توبہ کے مختلف مظاہر ہیں۔ یہ مظاہر صرف 23 تک محدود نہیں۔ وہ اس سے بہت زیادہ ہیں۔

آدمی کسی گناہ میں مبتلا ہوجائے۔ اس کے بعد اس کو اپنی گنہ گاری کا احساس ہو۔ وہ اپنے دل میں شدید طور پر شرمندہ (repentant) ہو اور پختہ عزم کے ساتھ وہ خدا کی طرف رجوع کرلے تو اسی کا نام توبۂ نصوح ہے۔

آدمی اگر حقیقی طور پر توبۂ نصوح کرے تو اس کے بعد اس کی پوری زندگی بدل جائے گی۔ اس کی سوچ کا رخ پہلے اگر غیر اللہ کی طرف تھا تو اب وہ اللہ کی طرف ہوجائے گا۔ پہلے اگر وہ غیر سنجیدہ تھا تو اب وہ سنجیدہ ہوجائے گا۔ پہلے اگر وہ غیر ذمے دارانہ زندگی گزارتا تھا تو اب وہ ذمے دارانہ زندگی گزارنے لگے گا۔ پہلے اگر وہ اپنے قول وعمل میں آزاد تھا تو اب وہ اپنے قول وعمل کا سخت پابند ہوجائے گا۔ پہلے اگر وہ آخرت سے بے خوف تھا تو اب وہ آخرت کے اندیشے میں زندگی گزارنے لگے گا— حقیقی توبہ آدمی کو بدل دیتی ہے اور جو توبہ آدمی کو بدل ڈالے، وہی توبۂ نصوح ہے۔

شکر کی اہمیت

قرآن کی پہلی آیت یہ ہے: الحمد للّٰہ ربّ العالمین (یعنی) شکر ہے خداوندِ عالم کے لیے۔ قرآن کی اِس آیت سے شکر کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے تمام اعمال میں شکر ہی ایک ایسا عمل ہے، جس کو انسان اپنی نسبت سے اعلیٰ ترین صورت میں کرسکتا ہے۔ دوسرے تمام اعمال، مثلاً عبادت اور اخلاق اور معاملات کی ادائیگی میں مختلف اسباب سے کچھ نہ کچھ کمی رہ جاتی ہے۔ لیکن شکر کا تعلق دل اور دماغ سے ہے اور جس چیز کا تعلق دل اور دماغ سے ہو، اُس کے بارے میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی اُس کو اُس کی کامل صورت میں ادا کر سکے۔ یہاں وہ اپنے تمام جذبات اور اپنی ساری سوچ کو خدا کے سامنے پیش کرسکتا ہے۔ یہ خصوصیت صرف شکر کو حاصل ہے۔

شکر کیا ہے، شکر دراصل اعتراف کا دوسرا نام ہے۔ انسانی معاملات میں جس چیز کو اعتراف کہا جاتا ہے، اُسی کا نام خدائی معاملے میں شکر ہے۔ ہر آدمی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے شعور کو اتنا زیادہ بیدار کرے کہ ہر ملی ہوئی چیز اُس کو کامل معنوں میں خدا کا عطیہ دکھائی دے۔ وہ کامل جذبۂ اعتراف کے ساتھ یہ کہہ سکے کہ خدایا، تیرا شکر ہے۔ خدا کی نعمتوں اور رحمتوں کا کامل احساس کرکے یہ کہہ پڑنا کہ الحمد للہ ربّ العالمین، یہی شکر ہے اور یہ شکر بلاشبہہ سب سے بڑی عبادت ہے۔

موجودہ دنیا میں وہ چیز بہت بڑے پیمانے پر موجود ہے جس کو لائف سپورٹ سسٹم کہا جاتا ہے۔ یہاں کی ہر چیز اِس طرح بنائی گئی ہے کہ وہ کامل طور پر انسان کے لیے موافق اسباب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ ہونا چاہیے کہ انسان جب اِس دنیا میں چلے پھرے اور اس کو استعمال کرے تو وہ شکر اور اعتراف کے جذبے سے سرشار ہو۔ موجودہ دنیا کی تمام قیمتی چیزیں انسان کو سرتاسر مفت میں ملی ہوئی ہیں، سچا شکر ہی اِن چیزوں کی قیمت ہے۔ جو آدمی یہ قیمت ادا نہ کرے، اُس کی حیثیت اِس دنیا میں غاصب کی ہے، اور غاصب کے لیے بلاشبہہ سزا ہے نہ کہ انعام۔ شکر کے احساس کے بغیر اِس دنیا میں رہنا بلاشبہہ ایک ناقابلِ معافی جرم کی حیثیت رکھتا ہے، عورت کے لیے بھی اور مرد کے لیے بھی۔

قرآن کا توسیعی مفہوم

قرآن ایک آفاقی کتاب ہے۔قرآن کا پیغام ایک ابدی پیغام ہے۔قرآن کی آیتوں کا ایک ابتدائی مفہوم ہوتا ہےاور دوسرا،اس کا توسیعی مفہوم (extended meaning)۔قرآن کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کے لیے اِس حقیقت کو جاننا بہت ضروری ہے۔

قرآن کی سورہ الاسراء میں نمازِ فجر کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: **وقرآنَ الفجر،إنّ قرآن الفجر کان مشهوداً** (17:78) یعنی نمازِ فجر میں قرآن کی طویل قرأت کرو۔کیوں کہ فجر کی قرأت حضوری کی قرأت ہوتی ہے۔اِس کا مطلب یہ ہے کہ فجر کا وقت سکون اور یک سوئی کا وقت ہوتا ہے۔اِس لیے اُس وقت کی قرأت خصوصی کیفیات کی حامل بن جاتی ہے۔

اِس آیت کا ایک توسیعی مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ آدمی صبح کی نماز اول وقت ادا کرے،اور پھر واک (walk) کرنے کے لیے وہ کسی پارک میں جائے،یا ایسے مقام پر جائے جہاں نیچر کی ہریالی ہو۔ایسے مقام پر صبح کے وقت ایک قسم کا ملکوتی ماحول ہوتا ہے۔اِس ماحول میں آدمی،خدا کی نشانیوں پر غور کرے۔وہ قرآن کی آیتوں کو پڑھے۔وہ تخلیق میں خالق کی معرفت حاصل کرے۔اِس کی ایک صورت یہ ہے کہ نمازِ فجر کی ادائیگی کے بعد کچھ لوگ اجتماعی طور پر ایسے مقامات پر جائیں۔وہاں فطرت کے ماحول میں وہ ذکر کا حلقہ قائم کریں۔وہ خدا کی باتوں کا چرچا کریں۔وہ درسِ قرآن،یا درسِ حدیث کی صورت میں نصیحت حاصل کریں۔وہ فطرت کے مناظر میں خدا کے کمالات کا ذکر کریں۔وہ روحانیت کی فضا میں اپنے لیے دینی غذا حاصل کرنے کی کوشش کریں۔یہ گویا کہ تذکیرِ فجر ہے،جو قرآنِ فجر کی ایک توسیعی صورت ہے۔اِس قسم کا عمل بلاشبہہ اضافۂ ایمان کا باعث ہے،خواہ وہ انفرادی طور پر ہو یا اجتماعی طور پر۔

یہی قرآن کی ہر آیت کا معاملہ ہے۔قرآن کی کسی آیت کا ایک مفہوم وہ ہے جو اس کے شانِ نزول،یا سببِ نزول کے ذریعے معلوم ہوتا ہے۔یہ آیت کا ابتدائی مفہوم ہے۔اِسی کے ساتھ قرآن کی ہر آیت کا ایک توسیعی مفہوم ہے۔اِس توسیعی مفہوم کے اعتبار سے ہر دور میں قرآن کے نئے معانی لوگوں پر کھلتے چلے جائیں گے۔

کتابِ تلاوت، یا کتابِ اطاعت

مسٹر اے اور مسٹر بی کے درمیان ایک جائداد (property) کو لے کر نزاع ہوئی۔ دونوں کا دعویٰ تھا کہ جائداد میری ہے۔ دونوں مسلمان تھے۔ مسٹر اے نے مسٹر بی سے کہا کہ اگر آپ قرآن کو ہاتھ میں لے کر کہہ دیں کہ یہ جائداد میری ہے، تو میں اپنا دعویٰ واپس لے لوں گا اور جائداد پر آپ کا حق تسلیم کرلوں گا۔ مسٹر بی نے کہا — اِس معاملے کا قرآن سے کیا تعلق۔

مسٹر بی ایک مسلمان شخص تھے، پھر انھوں نے ایسا کیوں کہا۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلمان، خدا کی کتاب کو وہی درجہ دے چکے ہیں جس کو قرآن میں کتابِ مہجور (25: 30) کہا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے لیے قرآن برائے تلاوت کتاب بن گیا ہے، نہ کہ برائے اطاعت کتاب۔ یہ ذہن موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں عام ہو چکا ہے۔ مذکورہ واقعہ اِسی ذہن کی ایک مثال ہے۔

بہت سے لوگ جو اسلام کے نام پر ادارے، یا تحریکیں چلا رہے ہیں، میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے اپنا کام شروع کرنے سے پہلے، قرآن کو بار بار اِس نظر سے پڑھا تھا کہ قرآن کے مطابق، میرے لیے کرنے کا کام کیا ہے۔ مگر غالباً کسی نے بھی یہ جواب نہیں دیا کہ ہاں، میں نے قرآن کو بار بار اِس نظر سے پڑھا اور پھر قرآن سے مجھ کو جو روشنی ملی، اس کے مطابق، میں نے اپنا یہ کام شروع کیا۔

ایسے لوگ بہت ملیں گے جو قرآن کی تفسیر پڑھیں گے، یا عربی زبان سیکھنے کی کوشش کریں گے، تاکہ وہ قرآن کو براہِ راست سمجھ سکیں۔ لیکن ایسا کوئی شخص مشکل سے ملے گا جو قرآن کو اپنے قول وعمل کے لیے ایک رہنما کتاب (guide book) بنائے ہوئے ہو۔

یہی موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی سب سے بڑی کوتاہی ہے۔ مسلمان جب تک قرآن کو اپنے لیے رہنما کتاب نہیں بنائیں گے، اُن کا کوئی معاملہ درست ہونے والا نہیں۔

مطالعہ قرآن کی اہمیت

عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **مـن قرأ القرآن لم يُرَدّ إلى أرذل العمر** (**صحيح الترغيب للألباني، رقم الحديث:** 1435) یعنی جس نے قرآن کو پڑھا، وہ کبھی ناکارہ عمر تک نہیں پہنچے گا۔

اِس حدیث میں قرآن پڑھنے سے مراد قرآن کا مطالعہ ہے۔ جو آدمی قرآن کا گہرا مطالعہ کرے گا، اس کو قرآن سے مسلسل فکری غذا (intellectual food) ملتی رہے گی۔ یہ فکری غذا آدمی کو مسلسل توانائی دیتی رہے گی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ناکارہ عمر (abject old age) تک نہیں پہنچے گا۔ اس کا ذہن مسلسل طور پر بیدار اور متحرک (active) رہے گا۔ ایسے آدمی کا جسم بوڑھا ہوگا، لیکن اس کا دماغ کبھی بوڑھا نہیں ہو سکے گا۔

ریسرچ کے ذریعے یہ معلوم ہوا ہے کہ انسان کے جسم اور دماغ میں ایک فرق ہے۔ خالص حیاتیاتی اعتبار سے جسم پر بڑھاپا آتا ہے، لیکن دماغ یا برین (brain) پر بڑھاپا نہیں آتا۔ کوئی آدمی اگر اپنے دماغ کو منفی سوچ (negative thinking) سے بچائے، وہ مکمل طور پر اس کو مثبت سوچ (positive thinking) کا حامل بنائے تو اس کے دماغ پر بڑھاپا نہیں آئے گا۔ کوئی شخص قرآن کا گہرا مطالعہ کرے تو اس کو ہر دن قرآن سے تخلیقی افکار کی غذا ملتی رہے گی۔ اس کو کبھی ذہنی فاقہ (intellectual starvation) کا تجربہ نہیں ہوگا۔ اس کا دماغ مسلسل طور پر سرگرم رہے گا، وہ مسلسل طور پر تخلیقی فکر سے بھرا رہے گا۔

مادی غذا جس طرح جسم کو طاقت دیتی ہے، اُسی طرح فکری دریافتیں انسان کو توانائی عطا کرتی ہیں۔ انسان کے لیے سب سے زیادہ پر جوش تجربہ، دریافت (discovery) کا تجربہ ہوتا ہے۔ قرآن کا گہرا مطالعہ کرنے والے کو مسلسل طور پر اِس قسم کا تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی تخلیقی تجربہ کسی آدمی کے لیے اِس امر میں مانع بن جاتا ہے کہ وہ بڑھاپے کی عمر تک پہنچے اور عملاً ناکارہ ہو کر رہ جائے۔

صبح کی تلاوت

قرآن کی سورہ الاسراء میں نمازِ فجر کی تلاوت کے بارے میں ارشاد ہوا ہے: **إنّ قرآن الفجر کان مشہوداً** (17:78) یعنی فجر کی قرأت حضوری کی قرأت ہے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صبح سویرے کا وقت ایک خصوصی وقت ہے۔ اُس وقت فرشتوں کا زیادہ بڑا اجتماع ہوتا ہے۔ اِس طرح فرشتوں کی زیادہ بڑی تعداد، نمازی کی قرأت کی گواہ بن جاتی ہے۔ صبح کے وقت فرشتوں کا زیادہ بڑا اجتماع کوئی پُر اسرار چیز نہیں۔ فرشتوں کا خاص کام یہ ہے کہ وہ انسان کے اندر ربانی کیفیات پیدا کریں۔ صبح کا پُرسکون وقت اِس ملکوتی عمل میں خصوصی طور پر مددگار بن جاتا ہے۔

اِس معاملے کی ایک توسیعی صورت بھی ہے۔ مثلاً آپ نے اول وقت میں فجر کی نماز ادا کی، اورامام کی زبان سے طویل قرأت کو سنا۔ اس کے بعد تلاوتِ قرآن سے احساس کو لے کر آپ مسجد سے باہر نکلے اور کسی کھلی فضا میں گئے، جہاں سرسبز درخت ہیں اور فطرت کا ماحول ہے۔ اُس وقت جب آپ قرآن کے پیدا کردہ ذہن کو لے کر فطرت پر غور کرتے ہیں تو آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی قرآنی سوچ اور خارجی ماحول دونوں ایک ہوگئے ہیں۔ فطرت کے مناظر خاموش زبان میں گواہی دے رہے ہیں کہ قرآنی فکر کے تحت جو کچھ تم سوچ رہے ہو، بلاشبہہ وہ ایک عالمی حقیقت ہے۔

جب ایک شخص صبح کے وقت فطرت کے ماحول میں خدا کی باتوں پر غور کرتا ہے، تو اُس وقت اس کو اپنے ماحول کے اندر خدا کی موجودگی (presence of God) کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اُس پر وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جس کو حدیث میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ: خدا کی عبادت اِس طرح کرو، جیسے کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو (**تعبد اللہ کأنك تراہ**)۔ یہ کیفیت کوئی انسان خود سے اپنے اندر پیدا نہیں کرسکتا، یہ کیفیت بلاشبہہ فرشتوں کی مدد سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ داخلی سوچ کا خارجی ماحول میں مشاہدہ کرنا ہے۔ یہ ایک اعلیٰ عبادت ہے، اور ایسی عبادت کا تجربہ فرشتوں کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔

قرآن میں تدبر

قرآن کی سورہ ص میں نزولِ قرآن کا مقصد بتاتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ: یہ ایک مبارک کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے، تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر تدبر کریں اور تاکہ عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں (38: 29)۔

تدبر سے کیا مراد ہے۔ تدبر کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے آپ اس کو دھیان کے ساتھ پڑھیں اور اس کے مفہوم کو سمجھتے ہوئے اس کی تلاوت کریں۔ یہ طریقہ بھی بلاشبہہ مفید ہے، لیکن قرآن کے اعلیٰ معانی تک رسائی کے لیے یہ طریقہ کافی نہیں۔

قرآن میں تدبر کے بنیادی طور پر دو پہلو ہیں — غور وفکر، اور دعا۔ غور وفکر کیا ہے، اس کو میں نے ایک واقعہ سے سمجھا۔ ایک بار میری ملاقات ایک مسلم ادیب سے ہوئی۔ اُن کے ساتھ مجھے کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ ان کا کہنا تھا کہ ''میں غالب کا عاشق ہوں''۔ میں نے پایا کہ وہ غالب کے اشعار کے نہایت گہرے معانی بتاتے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ غالب کے دیوان کو صرف پڑھتے نہیں، بلکہ وہ اسی میں جیتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں، ''غالب کے اشعار ہر وقت میرے ذہن میں گھومتے رہتے ہیں''۔

یہی تدبر ہے۔ تدبر کا مطلب صرف یہ نہیں کہ تلاوت کے وقت قرآن کے معانی پر دھیان دیتے ہوئے اس کی تلاوت کریں۔ تدبر یہ ہے کہ قرآن آپ کے دماغ پر چھایا ہوا ہو۔ قرآن کی آیتیں ہر وقت آپ کے ذہن میں گھومتی رہیں۔ آپ قرآن کی آیتوں کو لے کر سوئیں اور قرآن کی آیتوں کے ساتھ جاگیں۔ قرآن سے اِس طرح کے فکری تعلق پیدا ہو جانے کا نام تدبر ہے۔ تدبر کی دوسری لازمی شرط یہ ہے کہ آدمی برابر اللہ سے دعا کرتا رہے۔ دعا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ''رب زدنی علماً'' جیسے الفاظ اپنی زبان سے دہراتے رہیں۔ دعا کا آغاز اپنے عجز کی دریافت سے ہوتا ہے۔ جس آدمی نے دریافت کے درجے میں اپنے عجز کو نہیں جانا، وہ گویا کہ اللہ سے دعا کرنے کا اہل بھی نہیں۔

تلاوتِ قرآن

قرآن کی تلاوت وہ چیز ہے جس کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ — ایمان والے وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جائیں تو وہ ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں (8:2)۔ دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ اس سبب سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہم ایمان لائے۔ پس تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ لے (6:83-84)۔

قرآن براہِ راست خدا کا کلام ہے۔ اس میں خداوندی جلال کی گرج ہے۔ اس میں عبدیت کے احساس کو جگانے والی بجلیاں ہیں۔ اس میں وہ نور ربانی ہے جو کسی کے اندر اترے تو اس کے پورے داخلی وجود کو روشن کر دے۔ اس میں وہ شعلۂ حق ہے جو کسی قلب پر اترے تو وہ اس کو کوہ طور کی طرح ریزہ ریزہ کر دے۔ ایسے کلام کی تلاوت سادہ طور پر تکرار الفاظ کا نام نہیں ہوتی۔ وہ دل ودماغ میں آگ لگانے کے ہم معنی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کا بار بار پڑھنا شخصیت انسانی میں ایک انقلاب پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔

قرآن کی تلاوت سادہ طور پر ایک کتاب کی تلاوت نہیں ہے۔ یہ کلام الٰہی کا مطالعہ ہے۔ یہ گویا بالواسطہ انداز میں خدا سے ہم کلام ہونا ہے۔ ایسی حالت میں تلاوت قرآن کے درمیان اس کے مطابق کیفیات کا ظہور ہونا چاہیے۔ اگر اس غیر معمولی کلام سے مطابقت رکھنے والی کیفیات آدمی کے اندر پیدا نہ ہوں تو سمجھا جائے گا کہ وہ غفلت میں مبتلا ہے، اس نے زندہ شعور کے ساتھ قرآن کو نہیں پڑا۔

قرآن کو پڑھتے ہوئے ایسا ہونا چاہیے کہ آدمی کے اوپر خدا کی ہیبت طاری ہو۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے قریب محسوس کرنے لگے۔ قرآن کا پڑھنا اس کو خدا سے ملانے والا بن جائے۔ قرآن کو پڑھنا اس کے لیے خدا سے زندہ تعارف کے ہم معنی ہو۔ قرآن میں وہ ایک طرف اپنی عبدیت کو پالے اور دوسری طرف خدا کی معبودیت اور اس کے جلال کو۔

تدبرِقرآن

قرآن کی سورہ ص میں بتایا گیا ہے کہ: **كتاب أنزلناه إليك مبارك ليدبّروا اٰياته وليتذكر أولو الألباب** (38:29) یعنی یہ قرآن ایک بابرکت کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے، تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں اور تاکہ عقل والے اُس سے نصیحت حاصل کریں۔

اِس آیت میں تدبر سے مراد تفکر ہے۔ تفکر کیا ہے، تفکر دراصل عقل کو استعمال کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو پڑھتے ہوئے اپنی عقل کو کھلا رکھو، کیوں کہ عقلی غور وفکر کے ذریعے ہی کسی کو قرآن سے معنوی نصیحت ملتی ہے، نہ کہ محض لفظی تلاوت سے۔

اِس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی جب قرآن کی تلاوت کرے تو اُس وقت وہ اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے اس کی تلاوت کرے۔ اسی طرح جب وہ نماز میں قرآن کا کوئی حصہ پڑھے تو وہاں بھی وہ اپنی عقل وفہم کو کھلا رکھتے ہوئے قرآن کی تلاوت کرے۔

کوئی شخص جب اِس طرح قرآن کی تلاوت کرے گا تو بار بار ایسا ہوگا کہ قرآن کی کوئی آیت یا قرآن کا کوئی لفظ اس کی عقل کو اسٹرائک (strike) کرے گا۔ ایسے موقع پر آدمی کو چاہیے کہ وہ ٹھہر کر اُس پر غور کرے۔ اِس طرح اس کو قرآن سے نصیحت کی غذا ملتی رہے گی۔

مثال کے طور پر قرآن کو پڑھتے ہوئے یہ آیت آپ کے سامنے آئی: **فأثابهم الله بما قالوا جنات تجری من تحتها الأنهار** (5:85)۔ اِس آیت کو پڑھتے ہوئے آپ کو یہ حدیث یاد آئی: **مَن قال لا إلٰه إلا الله، دخل الجنة (الطبرانی، رقم الحديث: 2447)**۔

اس کے بعد آپ نے سوچا کہ دونوں آیتوں میں مطابقت کیا ہے۔ پھر غور کرنے کے بعد آپ کی سمجھ میں آئے گا کہ حدیث میں جس ''قول'' کا ذکر آیا ہے، اس کی تشریح قرآن سے ہوتی ہے، یعنی حدیث میں جس قول پر جنت کا وعدہ کیا گیا ہے، اُس سے مراد قولِ معرفت ہے، نہ کہ محض لفظی قول۔ یہی وہ چیز ہے جس کو تدبر اور تفکر (contemplation) کہا گیا ہے۔

آیت الکرسی

قرآن کی سورہ البقرہ میں ایک آیت ہے جس کو عام طور پر آیت الکرسی کہا جاتا ہے۔ اِس کا ترجمہ یہ ہے: ''اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ ہے، سب کا تھامنے والا۔ اس کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔ اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے، مگر جو وہ چاہے۔ اس کا اقتدار آسمانوں اور زمینوں پر پھیلا ہوا ہے۔ وہ تھکتا نہیں ہے اُن کے تھامنے سے۔ اور وہی ہے بلند مرتبہ، عظمتوں والا (2:255)۔

بلاغت کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر کسی حقیقت کو کامل صحت کے ساتھ بیان کر دیا جائے تو ایسا بیان اپنے آپ میں کافی ہو جاتا ہے، اس کے بعد اِس بیان کو مدلل کرنے کے لیے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔ مثلاً دوپہر کے وقت اگر کھلے آسمان میں سورج چمک رہا ہو تو یہ کہنا کافی ہے کہ سورج نکلا ہوا ہے۔ اِس کے بعد اِس بیان کو ثابت کرنے کے لیے کسی اور دلیل کی ضرورت نہ ہوگی۔

سورج کی مثال ایک حسّی مثال ہے۔ یہی معاملہ غیر حسّی حقیقتوں کا بھی ہے۔ اگر کسی غیر حسی حقیقت کو کوئی شخص پوری طرح دریافت کرلے اور پھر اس کو کامل صحت کے ساتھ الفاظ میں بیان کر دے تو ایسا بیان اپنے آپ میں ایک مدلل بیان بن جائے گا۔ یہی معاملہ قرآن کی مذکورہ آیت کا ہے جس کو آیت الکرسی کہا جاتا ہے۔ آیت الکرسی میں خداوند ذوالجلال کی جن صفتوں کو الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، ان میں صحتِ بیان اتنا زیادہ کمال درجے میں پایا جاتا ہے کہ اگر اس میں مزید وضاحت شامل کی جائے تو وہ اصل بیان کو کم تر کرنے کے ہم معنی بن جائے گی۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ آیت الکرسی کو یاد کر کے بار بار اس کو دہرائے۔ وہ محسوس کرے گا کہ وہ ایک ایسے کلام کو دہرا رہا ہے جو معروف قسم کے مدلل کلام سے بھی زیادہ مدلل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آیت الکرسی ایک ایسا کلام ہے جس کو تشریح کے بغیر پڑھنا چاہیے۔ اُس میں کسی تشریح کا اضافہ صرف اس کی عظمت کو گھٹانے والا ثابت ہوگا، نہ کہ اس کی عظمت کو بڑھانے والا۔

ممنونیتِ اُولیٰ، ممنونیتِ ثانیہ

قرآن کی سورہ طٰہٰ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: **ولقد مننا علیك مرّةً أخریٰ** (20:37)۔اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ پیغمبر موسیٰ قدیم مصر کے ایک اسرائیلی خاندان میں پیدا ہوئے۔ اُس زمانے کا بادشاہ فرعون اسرائیلی نسل کو ختم کرنا چاہتا تھا، اِس لیے اس نے یہ حکم دے دیا تھا کہ اسرائیلی گھروں میں جو لڑکا پیدا ہو، اس کو مار ڈالا جائے۔ موسیٰ کا انجام بھی یہی ہوسکتا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک مخصوص تدبیر کے ذریعہ ان کو بچالیا۔

یہ موسیٰ پر اللہ تعالیٰ کا پہلا احسان تھا۔ اس کے بعد جب حضرت موسیٰ کو نبوت عطا ہوئی اور آپ نے اللہ تعالیٰ سے یہ کہا کہ ہارون کو میرے مددگار کے طور پر مجھے دے دے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی۔ یہ حضرت موسیٰ کے لیے ایک استثنائی عطیہ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک پیغمبر کی درخواست پر دوسرے شخص کو پیغمبر بنا دینا۔ قرآن کے مذکورہ بیان میں اِسی دوسرے احسان کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت موسیٰ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا پہلا احسان یہ تھا کہ ان کو بچپن میں ہلاکت سے بچا لیا۔ اور دوسرا احسان یہ تھا کہ ان کی درخواست پر ایک غیر نبی کو نبی بنا دیا، تاکہ وہ ان کی بھرپور مدد کرے۔

قرآن کا ایک اسلوب یہ ہے کہ اس کی آیتوں کا ایک مصداقِ اوّل (first application) ہوتا ہے، اور اسی کے ساتھ اس کا ایک مصداقِ ثانی (second application) ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ کا مذکورہ واقعہ بھی اسی نوعیت کا ایک واقعہ ہے۔ ہر آدمی کی زندگی میں کوئی خاص واقعہ ایسا پیش آتا ہے، جب کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد کی بنا پر نقصان سے بچ جاتا ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے بارے میں خدا کی اس پہلی مدد کو دریافت کرے، تاکہ وہ اس کے حوالے سے خدا کی دوسری مدد کے لیے درخواست کر سکے۔ **ولقد مننا علیك مرّةً أخریٰ** میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

اگر کسی انسان کو ممنونیتِ اولی کی حقیقی دریافت ہوجائے تو اس کے اندر ایک گہرا جذبہ پیدا ہوگا، وہ اس قابل ہوجائے گا کہ وہ خدا کی ممنونیتِ اولیٰ کے حوالے سے، اپنے حق میں خدا سے ممنونیت ثانیہ کی

درخواست کر سکے۔ دعا کے لئے یہ ایک اہم حوالہ (point of reference) ہے جو ہر عورت اور مرد کی زندگی میں پایا جاتا ہے، بشرطیہ کہ وہ گہری سوچ کے ذریعہ اس حوالے کو دریافت کر سکے۔

ایک شخص کا واقعہ ہے۔ اپنی نوجوانی کی عمر میں کسی حادثے کی بنا پر وہ بہت زیادہ مایوس ہوا، حتی کہ اس نے خودکشی کا اقدام کرلیا۔ اللہ تعالیٰ نے بروقت اس کی مدد کی اور وہ خودکشی کی موت مرنے سے بچ گیا۔ بعد کو بڑی عمر میں جب اس کا مطالعہ بڑھا اور اس نے حقیقتوں کو جانا تو اس نے اپنی نوجوانی کی عمر کے واقعہ کو یاد کرتے ہوئے خدا سے یہ دعا کی کہ خدایا، اگر میں خودکشی کر کے مرگیا ہوتا تو آج میں جہنم کی آگ میں پڑا ہوا ہوتا۔ یہ تیرا احسان تھا کہ تو نے مجھ کو پہلی بار جہنم سے بچالیا۔ طبعی موت کے بعد دوبارہ مجھے اِسی قسم کی صورت حال کا سامنا ہوگا۔ اُس وقت تو دوبارہ مجھے جہنم کی آگ سے بچالے۔ تو نے پہلی بار میرے ساتھ احسان فرمایا، اب دوسری بار بھی تو میرے ساتھ احسان فرما اور میرے اوپر اپنی نعمت (blessing) کو مکمل کردے۔

سب سے زیادہ موثر دعا وہ ہوتی ہے جو کسی واقعے کے حوالہ (point of reference) کو لے کر کی جائے۔ مذکورہ قسم کا حوالہ ہر آدمی کی زندگی میں موجود ہوتا ہے جو اس کی دعا کو نہایت موثر بنادیتا ہے۔ لیکن عام طور پر لوگ اِس قسم کا غور وفکر نہیں کرتے، چناں چہ وہ اس قیمتی حوالے سے محروم رہتے ہیں۔ اس بے خبری کی بنا پر لوگوں کو دعا کا صرف ایک تصغیری فارم (reduced form) حاصل ہوتا ہے۔ وہ دعا کے نام پر کچھ الفاظ کو یاد کر لیتے ہیں اور ان یاد کئے ہوئے الفاظ کو دہراتے رہتے ہیں۔

یہ بلاشبہہ ایک بہت بڑی محرومی ہے۔ جب آدمی کے پاس دعا کا اعلیٰ فارم موجود ہو، لیکن وہ صرف دعا کے ادنی فارم کو دہراتا رہے تو یہ اس کے لیے اتنی بڑی محرومی ہوگی جتنی بڑی محرومی اور کوئی نہیں۔

دعا کے نام پر رٹے ہوئے الفاظ کو دہرانا، بلاشبہہ دعا کی تصغیر ہے۔ دعا کا اعلیٰ طریقہ ہے— ایک رحمتِ خداوندی کے حوالے سے، دوسری رحمتِ خداوندی کا طالب بننا:

Asking another blessing with reference to previous blessing.

غم کو دعا میں ڈھالنا

قرآن کی سورہ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ بیان ہوا ہے۔ اُن کے سوتیلے بھائیوں کے غلط سلوک کی وجہ سے وہ وقت آیا جب کہ حضرت یوسف کے والد حضرت یعقوب بظاہر اپنے دو عزیز بیٹوں سے محروم ہو گئے۔ اس حادثے کے وقت حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبان سے یہ دعائیہ کلمہ نکلا: إنما أشكو بثي وحزني الى الله (12: 86) یعنی میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کا شکوہ صرف اللہ سے کرتا ہوں۔

پیغمبر کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ ایک اہم حقیقت کو بتاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن جب کسی غم سے دوچار ہوتا ہے تو وہ عام انسان کی طرح آہ اور فریاد میں مبتلا نہیں ہوتا، بلکہ اس کا ایمانی شعور اس کے غم کو دعا میں ڈھال دیتا ہے۔ وہ اللہ کی طرف رجوع ہو کر اُس سے التجا کرنے لگتا ہے کہ وہ اُس کے کھونے کو یافت میں بدل دے، وہ اُس کی محرومی کی حسن تلافی فرمائے۔

کسی انسان کے ساتھ جب غم اور محرومی کا تجربہ پیش آتا ہے تو اُس کے لیے ردعمل کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک ہے، انسانوں کی طرف دیکھنا، اور دوسرا ہے، خدا کی طرف دیکھنا۔ جو لوگ حادثہ کے وقت انسان کی طرف دیکھیں، وہ صرف یہ کرتے ہیں کہ انسان کے خلاف فریاد و فغاں میں مبتلا ہو جائیں۔ مگر جس شخص کا یہ حال ہو کہ وہ اس قسم کے تجربہ کے بعد خدا کو یاد کرنے لگے، وہ چھیننے والے کے بجائے دینے والے کو اپنا مرکزِ توجہ بنا لے گا۔ اُس کا ذہن مایوسی کے بجائے اُمید کا آشیانہ بن جائے گا۔

دعا ایک طاقت ہے۔ نازک وقتوں میں دعا مومن کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ دعا اس اعتماد کا سرچشمہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی کھونا آخری نہیں، بلکہ ہر کھونے میں ازسرِ نو پانے کا راز چھپا ہوا ہے۔

ہر آدمی کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب کہ وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ ایسے لمحات میں خدا سے دعا کرنا آدمی کے دل کو سکون بخشتا ہے۔ دعا گویا کسی آدمی کے لیے کرائسس مینجمنٹ (crisis management) کا بہترین ذریعہ ہے۔

عدمِ قدرت کی دریافت

قرآن کی سورہ البلد میں ارشاد ہوا ہے: **لقد خلقنا الإنسان فی کبد، أیحسب أن لن یقدر علیه أحد** (95:4-5) یعنی ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا۔ کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے اوپر کسی کو قدرت حاصل نہیں۔

یہاں انسان سے مراد بنی نوعِ انسان ہے، اور کبد سے مراد سختی (sufferings) ہے۔ قرآن کے اِس حصے میں کبد کے ساتھ قدرت کا ذکر ہے۔ اِس سے کبد کی مصلحت معلوم ہوتی ہے۔ انسان کو اللہ نے غیر معمولی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا۔ اِسی کے ساتھ اس کو ایسے حالات میں ڈال دیا کہ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی کبد میں مبتلا رہے، بظاہر سب کچھ حاصل کرنے کے باوجود اس کی زندگی کبد سے خالی نہ ہو۔ ایسا اِس لیے کیا گیا کہ انسان اپنی عدم قدرت کو دریافت کرسکے۔ انسانی زندگی میں بظاہر قدرت کے باوجود کبد کے پائے جانے کی مصلحت یہی ہے:

Suffering is a compulsive reminder of God's absolute power.

اِس اعتبار سے دیکھئے تو انسانی زندگی میں کبد کا پایا جانا زحمت میں رحمت (blessing in disguise) کا معاملہ ہے۔ خدا سب سے بڑی حقیقت ہونے کے باوجود غیب میں ہے۔ لازمی کبد کی صورت میں خدا انسان کو اپنی موجودگی (presence) کا تجربہ کراتا ہے۔

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ینزل البلاء لیستخرج به الدعاء** (**الشکر للّٰہ لابن أبی الدنیا، رقم الحدیث**: 129) یعنی مصیبت اِس لیے آتی ہے تاکہ انسان کے دل سے دعا نکلے۔ دعا نکلنے کا مطلب صرف دعا کے الفاظ نکلنا نہیں ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا ذہن بیدار ہو، اس کے اندر اعلیٰ کیفیات پیدا ہوں، وہ خدا کی صفات کو نئی نئی صورتوں میں دریافت کرنے لگے، اور جب ایسا ہوگا تو اس کی زبان سے دعا کے ایسے الفاظ نکلیں گے جو عام حالات میں اس کی زبان سے نہیں نکلے تھے۔

ابلیس کا چیلنج

قرآن کی سورہ الاعراف میں بتایا گیا ہے کہ آدم کے آگے جھکنے کے سوال پر ابلیس (شیطان) غصہ ہوگیا۔ اُس نے خدا سے کہا کہ مجھے موقع دیا جائے تو میں ساری نسلِ آدم کو بہکا دوں گا۔ اُس وقت اُس نے چیلنج دیتے ہوئے کہا: **ولا تجد أکثرھم شاکرین** (7:17) یعنی تو اُن میں سے اکثر لوگوں کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا:

Most of them, You will not find grateful. (7:17)

انسان کے اوپر خدا کے ان گنت احسانات ہیں۔ اِس کے باوجود کیوں ایسا ہوتا ہے کہ انسان اِن نعمتوں کا اعتراف نہیں کرتا اور وہ ناشکر گزار بن جاتا ہے۔ اِس کا راز خود ابلیس کے کردار کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ ابلیس ایک جن تھا (17:50)۔ جنوں کے اوپر خدا کے بے شمار احسانات تھے۔ جن غیر موجود تھے، خدا نے اُن کو وجود دیا۔ جنوں کو آزادی کی نعمت دی۔ ان کو غیر معمولی اختیار بخشا۔ ان کو طویل زندگی عطا کی۔ خدا کی دنیا میں زندہ رہنے کے لیے ان کو تمام ضروری سامان دیے۔ اِس کے باوجود کیوں ایسا ہوا کہ ابلیس، خدا کا ناشکر گزار بن گیا۔ اِس کا راز یہ تھا کہ ابلیس پر شکایتی احساس اتنا زیادہ غالب ہوا کہ وہ خدا کے تمام انعامات کو بھول گیا۔ شکایت کے صرف ایک واقعے کو اُس نے اِس طرح جنرلائز کیا کہ اس کو شکایت کے سوا کوئی اور بات یاد ہی نہ رہی۔

ابلیس کا خاص طریقہ یہی ہے کہ وہ انسانوں کے اندر شکایتی مزاج اِس طرح بنائے کہ انسان شکایت کے ایک واقعے کو لے لے اور دوسری تمام اچھی باتوں کو نظر انداز کر کے اُسی ایک شکایتی بات کو اپنا مرکزی خیال بنا لے۔ وہ ایک منفی بات کو اِس طرح جنرلائز کرے کہ دوسری تمام مثبت باتیں اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں، یہاں تک کہ شکر گزاری کے بے شمار پہلوؤں کے باوجود وہ ناشکر گزار بن جائے۔ جو لوگ اپنے آپ کو اِس طرح کے احساسِ ناشکری میں پائیں، اُنھیں یقین کرنا چاہیے کہ وہ شیطان کے زیر اثر آ گئے ہیں۔ ایسے لوگوں کو فوراً توبہ کر کے اپنی اصلاح کرنا چاہیے، ورنہ وہ خدا کی سخت پکڑ کی زد میں آ جائیں گے۔

شکر سے اضافہ

قرآن کی سورہ ابراہیم میں ارشاد ہوا ہے: وإذ تأذن ربّکم لئن شکرتم لأزیدنّکم، ولئن کفرتم إنّ عذابی لشدید (14:7) اور جب تمھارے رب نے تم کو آگاہ کردیا کہ اگر تم شکر کروگے، تو میں تم کو زیادہ دوں گا۔ اور اگر تم ناشکری کروگے، تو میرا عذاب بڑا سخت ہے:

And remember also the time when your Lord declared: 'If you are grateful, I will surely bestow more favours on you; but if you are ungrateful, then know that My punishment is severe indeed'. (14:7)

قرآن کی اِس آیت میں نعمت میں اضافہ سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں جو انسان، خدا کی نعمتوں کا سچا شکر ادا کرے گا، اُس کو آخرت میں جنت کی صورت میں زیادہ بڑا انعام دیا جائے گا۔ شکر دراصل اعتراف (acknowledgement) کا دوسرا نام ہے۔ نعمت کے ملنے پر منعم کا اعتراف سب سے بڑی عبادت ہے۔ اور یہی عبادت وہ چیز ہے جو کسی انسان کو جنت کا مستحق بنائے گی۔

نعمت کیا ہے، نعمت دراصل احساسِ لذت (sense of enjoyment) کا دوسرا نام ہے۔ کوئی چیز پُرلذت اِسی لیے ہے کہ ہمارے اندر لذت کا احساس موجود ہے۔ اگر لذت کا احساس نہ ہو، تو کوئی بھی چیز لذت کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

کائنات میں انسان واحد مخلوق ہے جو لذت کا احساس رکھتا ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان کو عارضی طور پر اِسی لیے رکھا گیا ہے کہ وہ لذتوں کو محسوس کرکے، خدا کا شکر ادا کرے۔ جو انسان اِس دنیا میں حقیقی شکر کا ثبوت دے گا، وہ اگلی دنیا میں ابدی جنت میں بسایا جائے گا، جہاں وہ اپنے احساسِ لذت کی کامل تسکین پاسکے۔

موجودہ دنیا انسان کے لیے عارضی شکر کا مقام ہے۔ یہی عارضی شکر وہ قیمت ہے جو کسی انسان کو ابدی جنت میں داخلے کا مستحق بناتی ہے۔

ذکراور دعا

حضرت عائشہ کی ایک روایت ہے جو حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔اس کے الفاظ یہ ہیں: **كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يذكر الله على كل أحيانه (صحيح البخارى، كتاب الأذان؛ صحيح مسلم، أبو داؤد، ابن ماجه: كتاب الطهارة؛ الترمذى، كتاب الدعوات)** یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر موقع پر اللہ کا ذکر کرتے تھے۔

اِس روایت کو اکثر محدثین نے ابوابِ طہارت کے تحت نقل کیا ہے۔مگر اِس روایت کا مسائلِ عبادت سے کوئی تعلق نہیں۔ اِسی طرح کچھ لوگوں نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ بار بار آدمی کی زبان سے بسم اللہ، الحمد للہ، ان شاء اللہ، ماشاء اللہ اور اِسی طرح کے دوسرے مقرر کلمات نکلتے رہیں، مگر یہ شرح بھی اِس حدیث کی حقیقی معنویت کو بیان نہیں کرتی۔

اصل یہ ہے کہ ذکراور دعا صاحبِ معرفت انسان کے تخلیقی کلمات ہیں۔انسان کی زندگی میں بار بار مختلف قسم کے مواقع یا اَحیان (occasions) پیش آتے ہیں۔اگر آدمی کے اندر سوچنے کی اور توسّم کرنے کی صلاحیت ہوتو وہ پالے گا کہ اِن مواقع پر خدا کی یاد کا کوئی نہ کوئی پہلو موجود ہے۔آدمی اِن مواقع کو پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) بنا کر اُن کو اعلیٰ درجے کی کیفیتِ ذکر اور کیفیتِ دعا میں تبدیل کرسکتا ہے۔حضرت عائشہ نے پیغمبر اسلام کی زندگی میں یہی بات پائی تھی۔انھوں نے دیکھا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر موقع کو پوائنٹ آف ریفرنس بنا کر اللہ کا ذکر کرتے ہیں یا اللہ سے دعا فرماتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ذکراور دعا کچھ یاد کئے ہوئے الفاظ کو دہرانے کا نام نہیں، ذکراور دعا یہ ہے کہ مختلف مواقع اور مختلف حالات آدمی کے لیے اللہ کو یاد دلانے والے (reminder) بن جائیں، ہر واقعے اور ہر تجربے کو وہ اللہ سے رلیٹ (relate) کرکے دیکھ سکے، ہر تجربے میں اس کو خدا کی خدائی کا کوئی پہلو نظر آجائے۔ اِس طرح کے شعوری احساس کے تحت جو الفاظ آدمی کی زبان پر جاری ہوجائیں، اُنھیں کا نام ذکراور دعا ہے۔

دعا عبادت ہے

حدیث میں آیا ہے کہ دعا عبادت کا مغز ہے: **الدعاء مخ العبادة** (**الترمذي، رقم الحديث**: 3771) بلکہ دعا ہی اصل عبادت ہے: **الدعاء هو العبادة** (**الترمذي، رقم الحديث**: 2969) یہ بات قرآن وحدیث میں مختلف انداز میں بیان کی گئی ہے۔ دعا کا اصل عبادت ہونا عین فطری ہے۔ کیوں کہ آدمی جب خدا کے وجود کو اس کی صفات کمال کے ساتھ دریافت کرتا ہے تو اسی کے ساتھ وہ یہ بھی دریافت کرتا ہے کہ خدا کے مقابلہ میں میں بالکل بے حقیقت ہوں۔

خدا آقا ہے، میں بندہ ہوں۔ خدا دینے والا ہے، میں پانے والا ہوں۔ خدا قادر ہے، میں عاجز اور محتاج ہوں۔ یہ احساس اس کو فوراً ہی خدا کے سامنے دعا گو بنا دیتا ہے۔ دعا وہ سب سے بڑا رشتہ ہے جس کے ذریعہ بندہ اپنے رب سے مربوط ہوتا ہے۔ دعا خدا اور بندے کے درمیان اتصال کا ذریعہ ہے۔ انسان جو کچھ پاتا ہے، دعا سے پاتا ہے، اور تمام اعمال کا مقصد آدمی کو خدا سے دعا کرنے والا بنانا ہے تاکہ وہ خدا سے پانے والا بن جائے۔ مثال کے طور پر قرآن میں رمضان کے روزہ کا حکم دینے کے بعد یہ آیت آئی ہے: اور جب میرے بندے تم سے میری بابت پوچھیں تو میں قریب ہوں، پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں، تو چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں تاکہ وہ ہدایت پائیں (2:186)

یہی بات حضرت مسیح نے ان لفظوں میں کہی: مانگو تو تم کو دیا جائے گا۔ ڈھونڈو تو پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔ کیوں کہ جو کوئی مانگتا ہے اسے ملتا ہے، اور جو ڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے، اور جو کھٹکھٹاتا ہے اس کے واسطے کھولا جاتا ہے۔

دعا صرف کچھ الفاظ کی تکرار نہیں ہے، دعا ایک عمل ہے، بلکہ دعا سب سے بڑا عمل ہے۔ جس طرح حقیقی عمل کبھی بے نتیجہ نہیں رہتا اسی طرح حقیقی دعا کبھی بے نتیجہ نہیں رہتی۔

جب کوئی بندہ حقیقی دعا کرتا ہے تو وہ گویا اپنے معاملہ کو خدا کا معاملہ بنا دیتا ہے اور جب کوئی معاملہ خدا کا معاملہ بن جائے تو کوئی بھی نہیں جو اس کو پورا ہونے سے روک سکے۔

تجدید ایمان کی ضرورت

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **جدّدوا إیمانکم، قیل کیف نجدّد إیماننا، قال: أکثروا من قول لا إله إلاّ اللّٰه (مسند أحمد، رقم الحدیث: 8353)**۔ یعنی لا الٰہ الا اللہ کے کلمہ کے ذریعہ اپنے ایمان کی تجدید کرو۔ اِس حدیثِ رسول سے معلوم ہوتا ہے کہ کلمہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو ایک بار پڑھ لیا جائے اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے کافی ہو جائے، بلکہ بار بار اس کی تجدید ضروری ہے۔ تجدید کلمہ کا مطلب ہے شعور ایمان کو بار بار بیدار کرتے رہنا، تاکہ آدمی کے اوپر غفلت اور بے حسی کی حالت طاری نہ ہو۔ آدمی ہمیشہ زندہ اور متحرک ایمان کے ساتھ جی سکے۔

اِس حدیث کا ایک اور پہلو ہے جو اِس روایت سے معلوم ہوتا ہے: **الإسلام یهدم ما کان قبله (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 192)** یعنی اسلام قبل کی چیزوں کو ڈھادیتا ہے۔ اِس معاملے کا ایک پہلو وہ ہے جو اُس وقت سے تعلق رکھتا ہے، جب کہ آدمی کلمہ پڑھ کر مومن بنا ہو۔ اس کا دوسرا پہلو وہ ہے جو بعد کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ ایمان لانے کے بعد بھی بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی سے خطائیں سرزد ہوتی ہیں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ میں خدا کی رحمت سے دور ہو گیا۔ اُس وقت مومن کو یہ کرنا ہے کہ وہ خدا کو حاضر وناظر جان کر دوبارہ اپنی تنہائیوں میں زندہ شعور کے ساتھ کلمہ ادا کرے۔ وہ کہے کہ: **أشهد أن لا إله إلاّ الله، وأشهد أنّ محمداً عبده ورسوله**۔ یہ کہہ کر وہ خدا سے دعا کرے کہ خدایا، میرے گناہوں کو معاف کردے اور مجھ کو دوبارہ اپنی رحمتوں کے سایے میں لے لے۔ میں نے پھر سے ایمان قبول کیا، تاکہ پھر سے میں مومنین وصالحین کی جماعت میں شامل ہو جاؤں۔ خدایا، میں تیرے راستے سے بھٹک گیا تھا، تو میری پچھلی زندگی کو میرے دورِ جاہلیت میں شامل کردے اور مجھ کو دوبارہ ایمان واسلام کی زندگی عطا فرمادے۔

جو آدمی زندہ شعور کے ساتھ ایسا کرے، اُس کو بار بار نیا ایمان ملتا رہے گا۔ اِس تجدید ایمان کے نتیجے میں اُس کا وہ حال ہو جائے گا جس کو حدیث میں **کان کیوم ولدته أمه (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 1449)** کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی نومولود بچے کی طرح معصوم۔

دنیا کی حقیقت

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **الدنیا ملعونةٌ، ملعونٌ ما فیها إلاّ ذکر الله، وما والاه، وعالماً ومتعلما (الترمذي، رقم الحدیث: 2322)** یعنی دنیا ملعون ہے اور جو کچھ دنیا کے اندر ہے، وہ سب ملعون ہے، سوا ذکر اللہ کے اور وہ چیز جو اُس کے قریب ہو، اور عالم اور طالبِ علم۔

دنیا اور ذکر اللہ دونوں ایک دوسرے الگ نہیں ہیں۔ یادِ الٰہی کے لیے دنیا کو پوائنٹ آف ریفرنس بنا لینا، یہی وہ چیز ہے جس کو اِس حدیث میں ذکر اللہ کہا گیا ہے۔ اگر یہ یاد اللہ کے نام کے ساتھ ہو تو وہ براہِ راست ذکر ہے۔ اور اگر نام کے بغیر اللہ کو یاد کیا جائے تو وہ بالواسطہ ذکر۔ اِسی طرح، وہ عالم اور وہ طالبِ علم خدا کے نزدیک مطلوب عالم اور طالبِ علم ہیں جو اپنے علم کو ذکرِ الٰہی کا ذریعہ بنائیں۔

دنیا یا دنیا کی چیزوں کا خالق بھی اللہ ہے۔ اس لیے دنیا فی نفسہ ملعون نہیں ہوسکتی۔ یہ دراصل دنیا کا استعمال ہے جو اس کو ملعون یا غیر ملعون بناتا ہے۔ جو شخص دنیا کو پا کر خدا کو بھول جائے، اس کے لیے دنیا ملعون کا درجہ رکھتی ہے۔ اور جس شخص کے لیے دنیا کو پانا یادِ الٰہی کا ذریعہ بن جائے، اُس کے لیے دنیا رحمت اور سعادت کی چیز ثابت ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا آزمائش (test) کے لیے بنائی گئی ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں آزمائشی پرچے (test papers) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ پرچے اِس لیے ہیں، تاکہ ناکام ہونے والوں اور کامیاب ہونے والوں کو ایک دوسرے سے الگ کردیا جائے۔

جس شخص نے دنیا کی چیزوں سے یادِ خداوندی کی غذا لی وہ اِس آزمائش میں کامیاب ہوا۔ اِس کے برعکس، جس آدمی کے لیے دنیا کی چیزیں خالق سے دوری اور فراموشی کا سبب بن گئیں، وہی وہ انسان ہے جو آزمائش میں ناکام ہوگیا۔ اِس طرح، دنیا بہ اعتبارِ استعمال، کسی کے لیے ذریعۂ لعنت ہے اور کسی کے لیے ذریعۂ رحمت۔

شکرِ قلیل، شکرِ کثیر

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **من لم یشکر القلیل، لم یشکر الکثیر** (مسند احمد، جلد 4، صفحہ 278) یعنی جو شخص کم پر شکر نہیں کرے گا، وہ زیادہ پر بھی شکر نہیں کرے گا۔ اِس حدیثِ رسول میں فطرت کے ایک قانون کو بتایا گیا ہے، وہ قانون یہ ہے کہ چھوٹے واقعے کو یاد کرنے سے بڑے بڑے واقعات ذہن میں تازہ ہو جاتے ہیں۔

نفسیاتی مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کے دماغ میں بہت سے الگ الگ فائل (files) ہوتے ہیں۔ مثلاً محبت کا فائل، نفرت کا فائل، اعتراف (acknowledgement) کا فائل، ظلم کا فائل، وغیرہ۔ جو چیزیں انسان کے تجربے اور مشاہدے میں آتی ہیں، اُن کو دماغ الگ الگ ان کے متعلق فائل میں ڈالتا رہتا ہے۔ آدمی جب کسی ایک واقعے سے متاثر ہو تو اُس وقت انسان کا دماغ ٹریگر (trigger) ہو جاتا ہے اور پھر فوری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اُس نوعیت کا فائل کھل جاتا ہے اور اس نوعیت کے تمام واقعات آدمی کے ذہن میں تازہ ہو جاتے ہیں۔

فطرت کا یہ قانون شکر اور اعتراف کے معاملے میں بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ مثلاً آج آپ کو ایک موبائل ملا۔ اُس سے آپ نے دور کے ایک شخص سے بات کی۔ اُس وقت آپ نے سوچا کہ پہلے زمانے میں مجھ کو دوسرے کسی آدمی سے ربط کرنے میں کتنی مشکل پیش آتی تھی، اِس پر آپ نے گہرے تاثر کے ساتھ خدا کا شکر ادا کیا تو اس کے بعد فوراً یہ ہوگا کہ آپ کا دماغ ٹریگر ہو جائے گا۔ اُسی وقت دماغ کا وہ فائل کھل جائے گا جس میں آپ کی پوری زندگی میں پیش آنے والے شکر و اعتراف کے تمام آئٹم (item) محفوظ ہیں۔ فطرت کے اِس نظام کے تحت ایسا ہوتا ہے کہ شکر کے چھوٹے واقعے کی یاد، شکر کے دوسرے تمام واقعات یاد دلا دیتی ہے۔ اِس طرح شکر کا چھوٹا واقعہ بڑے شکر کا سبب بن جاتا ہے، یہاں تک کہ آدمی کے دل میں شکر کا چشمہ جاری ہو جاتا ہے۔ شکر کا احساس خدا سے آدمی کے تعلق کو بڑھاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اعلیٰ معرفت کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔

عافیت کی زندگی

عبداللہ بن عمر سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **مَن فُتح لہ منکم بابُ الدعاء، فتحت لہ أبواب الرّحمة. وما سُئل اللہ شیئاً یعني أحبَّ إلیہ من أن یسأل العافیة (الترمذی، رقم الحدیث: 3548)** یعنی تم میں سے جس کے لیے دعا کا دروازہ کھولا جائے، اُس کے لیے رحمت کے تمام دروازے کھول دئے گئے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب دعا یہ ہے کہ بندہ اُس سے عافیت مانگے۔

دعا دراصل اللہ کے مقابلے میں اپنے عجز کا اظہار ہے۔ عجز کا اظہار ہمیشہ اللہ کی عظمت کے کامل اعتراف سے پیدا ہوتا ہے۔ جو آدمی اللہ کی عظمت کو دریافت کرے، اُس کے نتیجے میں اس کے اندر اپنے بارے میں کامل عجز (total helplessness) کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ عجز کا احساس جب لفظوں میں ڈھل جائے تو اِسی کا نام دعا ہے۔

عافیت کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں آدمی کو صحت اور سکون کی زندگی حاصل ہوجائے۔ دنیا کی زندگی میں صحت اور سکون بلاشبہہ سب سے بڑی نعمت کی حیثیت رکھتی ہے۔ کوئی بھی کام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کو اِس قسم کی عافیت حاصل ہو۔ عافیت کا حصول انسان کے اپنے بس میں نہیں۔ جس طرح زندگی اللہ کی طرف سے ملتی ہے، اِسی طرح عافیت بھی اللہ کی طرف سے ملتی ہے۔ عافیت کی اِسی اہمیت کا تقاضا ہے کہ آدمی ہر وقت خدا سے عافیت کی دعا کرتا رہے۔

عافیت کا تعلق دولت (wealth) یا مادی سامانِ راحت سے نہیں ہے، عافیت کا تعلق تمام تر ذہنی سکون سے ہے۔ یہ ذہنی سکون کسی انسان کو اللہ کی خصوصی توفیق سے ملتا ہے۔ کوئی انسان ذکر اور دعا اور عبادت اور معرفت کا ثبوت اُسی وقت دے سکتا ہے جب کہ اس کو عافیت کی زندگی حاصل ہوجائے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا درست ہوگا کہ — اللہ سے مانگنے کی سب سے بڑی چیز عافیت ہے، نہ کہ دولت یا مادی سامانِ راحت۔

کلمۂ معرفت

صحیح البخاری میں روایات کی کُل تعداد (مکرّرات سمیت) 7563 ہے۔ اس مجموعہ کی آخری حدیث یہ ہے: **کلمتان حبیبتان إلی الرحمن، خفیفتان علی اللسان، ثقیلتان في المیزان: سُبحان اللہ وبحمدہٖ، سبحان اللہ العظیم** ۔(دو کلمے رحمٰن کو بہت محبوب ہیں، وہ زبان پر ہلکے ہیں مگر وہ میزان میں بھاری ہیں۔ وہ دو کلمے یہ ہیں: سبحان اللہ وبحمدہ، سبحان اللہ العظیم۔

اِس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ **سبحان اللہ و بحمدہ، سبحان اللہ العظیم** کے الفاظ میں پُر اسرار خواص (mysterious qualities) چھپے ہوئے ہیں اور ان الفاظ کو زبان سے ادا کرتے ہی طلسماتی طور پر ان کے یہ خواص ظاہر ہوجاتے ہیں۔

اسی طرح اس حدیث کا یہ مطلب بھی نہیں کہ **سبحان اللّٰہ وبحمدہ، سبحان اللہ العظیم** کے الفاظ میں پُر اسرار طور پر وزن چھپا ہوا ہے اور قیامت کے ترازو میں رکھتے ہی وہ پلڑے کو جھکا دیں گے۔ ترازو کی تَول میں ان الفاظ کا بھاری ہونا دراصل تمثیل کی زبان میں ہے، نہ کہ حقیقت کی زبان میں۔ اس سے مراد اس کلمہ کا معنوی وزن ہے، نہ کہ مادی وزن۔

اصل یہ ہے کہ انسان کے تمام اعمال میں سب سے بڑا عمل خدا کی معرفت ہے، یعنی خداوندِ عالم کو شعوری طور پر دریافت کرنا اور اس دریافت کا انسان کی پوری شخصیت میں اُتر جانا۔ **سبحان اللہ وبحمدہ، سبحان اللہ العظیم** دراصل معرفتِ خداوندی کے کلمے ہیں۔

جب ایک انسان خدا کی ذات کو اِس حیثیت سے دریافت کرتا ہے کہ وہ ہمہ تن پاک ہے، وہی ہر قسم کی تعریف اور شکر کا مستحق ہے، وہ تمام عظمتوں کا تنہا مالک ہے۔ یہ دریافت جب شدتِ یقین کے ساتھ کسی انسان کی زبان پر ایک شعوری اظہار کے طور پر جاری ہوجائے تو وہ کائنات کا سب سے بڑا عمل ہوتا ہے۔ وہ اتنا عظیم ہوتا ہے کہ ہر دوسری چیز اس کے مقابلہ میں چھوٹی قرار پائے۔

معرفت سب سے بڑی عبادت ہے۔ یہ شعور کی سطح پر خدا کو پالینا ہے۔ معرفت اپنی حقیقت

کے اعتبار سے کسی آدمی کی داخلی شخصیت کے اندر وجود میں آنے والا ایک واقعہ ہے۔ یہ واقعہ جب کسی انسان کے اندر وجود میں آتا ہے تو وہ اس کے اندر ایک روحانی طوفان برپا کر دیتا ہے۔ اس طوفانی تجربہ کے وقت اس کی زبان سے وہ روحانی الفاظ جاری ہو جاتے ہیں جن کا ذِکر اوپر کی حدیث میں کیا گیا ہے۔

مذکورہ کلمہ (**سبحان الله وبحمده، سبحان الله العظيم**) کے بارہ میں حدیث میں بتایا گیا ہے کہ وہ زبان سے کہنے میں ہلکے ہیں مگر وہ اجر کے اعتبار سے بھاری ہیں۔ میرے علم کے مطابق، شارحین اس بیان کی زیادہ بامعنٰی تشریح نہ کر سکے۔ اصل یہ ہے کہ اس کلمہ کا بھاری ہونا اس لیے نہیں ہے کہ خود یہ کلمہ بھاری ہے۔ اس کا تعلق کلمہ سے نہیں ہے بلکہ معرفت سے ہے۔

اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ **سبحان الله وبحمده، سبحان الله العظيم** کے الفاظ میں کوئی پُر اسرار صفت ہے۔ اس لیے وہ میزان میں بھاری ہو جاتے ہیں۔ اس کا تعلق کلمہ کی داخلی حقیقت سے ہے، نہ کہ کلمہ کے ظاہری الفاظ سے۔ یہ کلمہ معرفتِ الٰہی کا کلمہ ہے۔ معرفتِ الٰہی اور اس کا اظہار بلا شبہہ سب سے بڑی عبادت ہے۔ جن کلمات میں یہ معرفت شامل ہو جائے ان کلمات کو وہ ناقابلِ بیان حد تک عظیم بنا دیتی ہے۔

مزید یہ کہ ان کلمات کو محض زبان سے ادا کرنا کسی کو مذکورہ عظیم اجر کا مستحق نہیں بناتا۔ اس عظیم اجر کا مستحق صرف وہ شخص ہے جس نے مطلوب عارفانہ کیفیت کے ساتھ اُس کو ادا کیا ہو۔ ان کلمات کی ادائیگی کا معاملہ بھی وہی ہے جو دوسرے دینی اعمال کا معاملہ ہے۔

کوئی بھی دینی عمل اپنی کیفیت کے اعتبار سے عظیم یا غیر عظیم بنتا ہے۔ اسی طرح یہ کلمات بھی اُسی وقت عظیم ہیں جب کہ وہ داخلی کیفیت کے ایک فطری اظہار کے طور پر زبان سے نکلے ہوں۔ عارفانہ کیفیت کے بغیر صرف زبان سے الفاظ کی ادائیگی کوئی دینی قدر و قیمت نہیں رکھتی۔

دو بول

آپ امام البخاری کی کتاب ''صحیح'' کو پڑھنا شروع کریں تو جب آپ اس کے خاتمہ پر پہنچیں گے تو آخر میں آپ کو یہ حدیث لکھی ہوئی ملے گی: **کلمتان حبیبتان إلی الرحمٰن، خفیفتان علی اللّسان ثقیلتان فی المیزان۔ سُبحان اللّٰہ وبحمدِہ سُبحان اللّٰہ العظیم** (دو بول خدائے مہربان کو محبوب ہیں۔ وہ زبان پر ہلکے ہیں مگر قیامت کی میزان پر بھاری ہیں۔ وہ بول ہیں: **سبحان اللہ وَبحمدہ سبحان اللّٰہ العظیم**)۔

اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں بول زمین اور آسمان کی تمام چیزوں سے زیادہ وزنی ہیں۔ وہ قیامت میں اعمال کے ترازو کو جھکا دینے والے ہیں۔ مگر ان بولوں کی یہ اہمیت ان کے تلفّظ میں نہیں ہے، بلکہ ان کی حقیقت میں ہے۔ وہ اس لیے ہے کہ وہ جس معنویت کا اظہار ہیں، وہ معنویت اپنی اہمیت میں تمام چیزوں سے بڑھی ہوئی ہے۔

یہ دونوں بول دراصل معرفتِ خداوندی کے بول ہیں۔ ایک شخص کو ایمان کی معرفت حاصل ہوئی۔ اس نے اللہ کی پاک ہستی کا ادراک کیا۔ اس نے دیکھا کہ کائنات اپنے اَن گنت کرشموں کے ساتھ اس کی حمد میں نغمہ سنج ہے۔ اس صاحبِ معرفت انسان نے اپنے اندر اور اپنے باہر خدا کی عظمت وجلال کی نشانیاں دیکھیں۔ اس معرفت نے اس کے سینہ میں حمدِ الٰہی اور اعترافِ خداوندی کا طوفان برپا کر دیا۔ وہ بے اختیار پکار اٹھا کہ خدایا تو پاک ہے۔ ساری حمد تیرے لیے ہے۔ تو سب سے زیادہ عظمت والا ہے۔ اس کی زبان پر بے اختیار یہ کلمات جاری ہو گیے: **سبحان اللّٰہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم**۔

اس طرح کا ایک بول محض ایک انسانی بول نہیں، وہ خدا کی بے پایاں عظمتوں کا انسان کی زبان سے اظہار ہے۔ وہ تمام باوزن چیزوں سے زیادہ باوزن ہے۔ وہ بلاشبہہ اسی قابل ہے کہ وہ جس پلڑے میں رکھا جائے، وہ اس پلڑے کو جھکا دے۔

ایمانی کیفیات

ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **عرض عليّ ربي عزو جل ليجعل لي بطحاء مكة ذهبا، فقلت لا يا رب، ولكن أشبع يوماً و أجوع يوماً۔ فإذا جعتُ تضرعتُ إليك و ذكرتُك وإذا شبعتُ حمدتُك وشكرتُك** (مسند احمد 5/254)

یعنی اللہ نے میرے لئے یہ پیش کش فرمائی کہ تمھارے لیے مکہ کی وادی کو سونا بنا دیا جائے۔ میں نے کہا کہ اے میرے رب، نہیں۔ بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میں ایک دن سیر ہو کر کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں۔ پھر جب مجھے بھوک لگے تو میں تجھ سے تضرع کروں اور تجھ کو یاد کروں اور جب مجھے سیری حاصل ہو تو میں تیری حمد کروں اور تیرا شکر کروں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمانی کیفیات کا تعلق براہ راست طور پر حالات سے ہے۔ زندگی میں جب بھی کوئی صورت حال پیش آتی ہے تو اس کے لحاظ سے مومن کے لیے ایمانی کیفیات کا سرمایہ موجود رہتا ہے۔ جس طرح احوال کی بہت سی قسمیں ہیں، اسی طرح ایمانی کیفیات کی بھی بہت سی قسمیں ہیں، اور ہر قسم میں اُس کے مطابق، آدمی کے اندر ایمانی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ موجودہ دنیا میں آدمی کو امتحان کے لیے رکھا گیا ہے۔ اس لیے یہاں ہر عورت اور مرد کے ساتھ طرح طرح کے احوال پیش آتے ہیں۔ ایسا اسی لیے ہوتا ہے، تا کہ یہ دیکھا جائے کہ کون اپنی جانچ پر پورا اُترا اور کون اس میں ناکام ہو گیا۔

اس دنیا میں آرام کی حالت ہو یا تکلیف کی حالت ہو، دونوں حالتیں اضافی ہیں۔ دونوں حالتوں میں اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ کسی عورت یا مرد سے جو مطلوب رویہ درکار تھا، اس کا ثبوت اُس نے دیا یا نہیں دیا۔ اصل اہمیت حالات کے مقابلے میں آدمی کے رسپانس (response) کی ہے، نہ کہ خود حالات کی۔ یہ حقیقت جس عورت اور مرد پر واضح ہو جائے، اُس کا حال یہ ہو جائے گا کہ اُس کی نظر آرام اور تکلیف پر نہ ہوگی، بلکہ وہ یہ دیکھے گا کہ پیش آمدہ حالات میں اس نے کس قسم کے ردعمل کا ثبوت دیا، شکر کا یا ناشکری کا، صبر کا یا بے صبری کا۔ ایسے لوگ ہر حال میں اپنا احتساب کریں گے، نہ کہ خارجی حالات کا شکوہ۔

شعوری عبادت

عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **إنّ الرجل ليكون من أهل الصلاة والصوم والزكاة والحج والعمرة، حتى ذكر سهام الخير كلّها، وما يُجزىٰ يوم القيامة إلاّ بقدر عقله (رواه البيهقي في شعب الإيمان، رقم الحديث: 4637)** یعنی آدمی بظاہر نماز اور روزہ اور زکاۃ اور حج اور عمرہ کے عمل کرتا ہے، حتی کہ آپ نے تمام اعمالِ خیر کا ذکر کیا، پھر آپ نے فرمایا مگر قیامت کے دن وہ صرف اپنی عقل کے بقدر اُس کا بدلہ پائے گا۔

اِس حدیثِ رسول میں 'عقل' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ عقل سے مراد فہم (understanding) ہے۔ اِس روایت میں عقل سے مراد وہی چیز ہے جس کو شعور کہا جاتا ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ذکر وعبادت کے اعمال کرتا ہے، لیکن اِن اعمال کا انعام ان کے فارم یا کمیت (quantity) کے اعتبار سے نہیں دیا جاتا، بلکہ اعمال کی اصل اسپرٹ کے اعتبار سے دیا جاتا ہے، کسی آدمی نے جس درجۂ شعور کے ساتھ عبادت کی ہوگی، اُسی درجۂ شعور کے اعتبار سے اس کے عمل کا انعام مقرر کیا جائے گا۔

مثلاً ایک آدمی عبادت کرتا ہے، لیکن اُس کی عبادت، قرآن کے مطابق، سہو (absent-mindedness) کے ساتھ ہوتی ہے۔ بظاہر وہ عبادتی افعال کررہا ہوتا ہے، لیکن شعور کے اعتبار سے وہ غفلت کی حالت میں ہوتا ہے۔ ایسا آدمی غیر مطلوب عبادت کررہا ہے۔ ذکر وعبادت کی مطلوب صورت وہ ہے جب کہ آدمی کا وہ حال ہوجائے جس کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ خدا کی یاد سے اُس کا دل دہل اٹھے (8:2) اور اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں (39:23) یہ دوسرا آدمی زندہ شعور کے ساتھ ذکر وعبادت کا عمل کرتا ہے۔ خدا کے یہاں تمام بڑے بڑے انعامات اُس انسان کو دئے جائیں گے جس نے اِس طرح زندہ شعور کے ساتھ ذکر وعبادت کا عمل کیا ہو۔

عبادت کے اِس اعلیٰ درجے کو حاصل کرنے کے لیے آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو غیر متعلق چیزوں میں مشغول ہونے سے بچائے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ترقیٔ ایمان کی دعا کرتا رہے۔

دعا کیا ہے

دعا کوئی سادہ چیز نہیں، دعا دراصل خدا کو انووک (invoke) کرنا ہے۔ دعا گویا کہ خدا کی قدرت کو مخاطب کرنا ہے۔ بلاشبہہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک سچی دعا جب ایک عاجز انسان کی زبان سے نکلتی ہے تو بلاشبہہ وہ خدا کی غیرت کے لیے ایک چیلنج کے ہم معنی ہوتی ہے۔ جب ایک عاجز انسان حقیقی سائل بن کر اللہ کے آگے اپنا ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ اپنے مسئلے کو اللہ کا مسئلہ بنا دیتا ہے۔ اُس وقت گویا اللہ کے لیے ممکن نہیں رہتا کہ وہ اس کو خالی ہاتھ لوٹا دے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو ایک حدیثِ رسول میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **إن الله حييّ كريم يستحيي إذا رفع الرجل إليه يديه أن يردهما صفرا خائبتين (الترمذی ،رقم الحديث: 3556)**

دعا کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی **ربنا آتنا فی الدنیا حسنة الخ** جیسی دعائیں یاد کرلے اور اس کو پڑھتا رہے۔ دوسری زیادہ موثر صورت یہ ہے کہ کسی واقعے کو پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) بنا کر دعاء کی جائے۔ مثلاً برٹش دور میں لکھنؤ میں ایک کلکٹر تھے۔ ان کا نام صدیق حسن (آئی سی ایس) تھا۔ انھوں نے اُس زمانے کے ایک ڈاکو سُکھوا کو پکڑا اور اس کو ہتھکڑی لگا کر ڈاک بنگلہ کے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ یہ سخت سردی کا زمانہ تھا۔ رات کے وقت صدیق حسین صاحب راؤنڈ پر نکلے تو اُن کو دیکھ کر سکھوا ڈاکو نے کہا: جنٹ صاحب، آپ کا سکھوا سردی کھا رہا ہے۔ یہ سن کر صدیق حسن صاحب اپنے کمرے میں گئے اور خود اپنا کمبل لا کر سکھوا ڈاکو کو اڑھا دیا۔

اِس واقعے کو لے کر کوئی کہے کہ خدایا، سکھوا ایک مجرم تھا۔ اِسی کے ساتھ وہ ایک عاجز انسان تھا۔ کلکٹر نے سکھوا کے عاجز ہونے کی حیثیت کو اس کے مجرم ہونے کی حیثیت سے الگ کر کے دیکھا اور پھر اس کے ساتھ مہربانی کا معاملہ کیا۔ تو بھی میرے ساتھ اِسی طرح کا معاملہ فرما۔ میرے قصور وار ہونے کی حیثیت کو نظر انداز کر اور عاجز ہونے کی حیثیت سے میرے ساتھ رحمت کا معاملہ فرما۔ اگر کوئی بندہ اِس طرح کہے تو عین ممکن ہے کہ اللہ اس کی التجا کو قبول کرتے ہوئے اس کو معاف کر دے۔

جذبۂ شکر کی حفاظت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد حدیث کی مختلف کتابوں (البخاری، مسلم، الترمذی، ابن ماجہ، وغیرہ میں آیا ہے۔ مسند احمد کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: **انظروا إلى من هو أسفل منكم، ولا تنظروا إلىٰ من هو فوقكم، فإنّه أجدر أن لا تزدروا نعمةَ الله عليكم (مسند أحمد، رقم الحديث: 10246)** یعنی تم اس کو دیکھو جو تم سے نیچے ہے اور تم اس کو نہ دیکھو جو تم سے اوپر ہے، کیوں کہ اس طرح تم اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو کم نہیں سمجھو گے۔

اس حدیث کی مزید تشریح ایک اور حدیث سے ہوتی ہے۔۔ ایک مرفوع روایت کے مطابق، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **خصلتان من كانتا فيه كتبه الله شاكراً صابراً: من نظر في دنياه إلى من هو دونه فحمد الله على ما فضله به عليه، ومن نظر في دينه إلى من هو فوقه فاقتدىٰ به۔ وأما من نظر في دنياه إلى من هو فوقه فأسف على ما فاته فإنه لا يكتب شاكرا و لا صابرا (فتح الباري 11/330)** یعنی دو صفتیں ہیں جو کسی شخص کے اندر ہوں تو اللہ اس کو شاکر اور صابر لکھ دیتا ہے۔ جو دنیا کے معاملے میں اُس کو دیکھے جو اس سے کم ہے پھر وہ اللہ کا شکر کرے اُس نعمت پر جو اللہ نے اسے دی ہے۔ اور جو اپنے دین کے معاملے میں اُس کو دیکھے جو اس کے اوپر ہے پھر وہ اس کی پیروی کرے۔ مگر جو اپنی دنیا کے معاملے میں اس کو دیکھے جو اس کے اوپر ہے، پھر وہ اس پر افسوس کرے جو اس سے کھویا گیا تو وہ نہ شاکر لکھا جائے گا اور نہ وہ صابر لکھا جائے گا۔

شکر سب سے بڑی عبادت ہے۔ کسی بندے سے جو چیز سب سے زیادہ مطلوب ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اللہ کو ایک عظیم منعم کے طور پر دریافت کرے۔ اللہ کی نعمتوں کے احساس سے اس کا سینہ بھرا ہوا ہو۔ اس کی روح میں شکر کا ابدی چشمہ جاری ہو جائے۔ وہ اللہ کو ایک ایسی ہستی کے طور پر پائے جو اس پر بے پایاں نعمتوں کی بارش کر رہا ہے۔ یہ شعور اتنا زیادہ قوی ہو کہ کسی بھی حال میں اس کا سینہ شکر خداوندی کے احساس سے خالی نہ ہو۔

مگر یہ کوئی آسان بات نہیں۔ اپنے آپ کو شکر کے جذبے سے سرشار رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی کا شعور اس معاملے میں پوری طرح زندہ ہو۔ وہ اس کا مسلسل اہتمام کرے۔ وہ کسی ایسے خیال کو اپنے دل میں جگہ نہ دے جو اس کے جذبۂ شکر کو مجروح کرنے والا ہو۔ وہ سب کچھ برداشت کرلے، مگر وہ اپنے جذبۂ شکر کا کٹاؤ (erosion) کبھی برداشت نہ کرے۔

موجودہ دنیا میں فطری طور پر ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان نابرابری قائم رہتی ہے۔ اس بنا پر ہر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ مادی اعتبار سے کوئی اس سے کم ہے اور کوئی اس سے زیادہ۔ اب اگر آدمی اپنا مقابلہ اُس شخص سے کرے جو بظاہر اس سے زیادہ ہے تو اس کے اندر کمتری کا احساس پیدا ہوگا اور اس کا جذبۂ شکر دب کر رہ جائے گا۔ اس لیے آدمی کو ایسا کبھی نہیں کرنا چاہئے کہ وہ اپنا موازنہ اس شخص سے کرے جو مادی اعتبار سے بظاہر اس سے زیادہ ہے۔ اس کے بجائے آدمی کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ اپنا موازنہ ان لوگوں سے کرے جو مادی اعتبار سے اس سے کم ہیں۔ اس طرح اس کا جذبۂ شکر زندہ رہے گا۔ اس کا دل کبھی نعمت کے احساس سے خالی نہ ہو سکے گا۔

موجودہ دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ تمام لوگ مادی اعتبار سے یکساں نہیں ہوتے۔ کوئی زیادہ ہوتا ہے اور کوئی کم، کوئی پیچھے ہوتا ہے اور کوئی آگے، کوئی طاقت ور ہوتا ہے اور کوئی کمزور۔ اس قسم کے تمام فرق امتحان کی مصلحت کی بنا پر ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ آدمی مختلف قسم کے حالات سے گزرے، مگر وہ حالات سے متاثر ہوئے بغیر اپنے ایمانی شعور کو زندہ رکھے۔

وہ ناشکری والے حالات سے دوچار ہو، پھر بھی اس کے شکر کے جذبہ میں کوئی کمی نہ آئے۔ وہ بے اعترافی کی صورت حال سے گزرے، مگر وہ اپنے اعتراف کی صفت کو نہ کھوئے۔ وہ منفی جذبات پیدا کرنے والے حالات سے دوچار ہو، اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو مثبت طرز فکر پر قائم رکھے۔ شکر وہ سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے جس کو انسان اپنے رب کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ ایسی حالت میں عقل مند انسان وہ ہے جو اپنے سینہ کو شکر کے احساس سے خالی نہ ہونے دے، حتی کہ انتہائی غیر موافق صورت حال میں بھی۔

ذکرِ کثیر

مچھلی پانی سے باہر خشکی میں ہو تو وہ مسلسل تڑپتی ہے۔ یہ تڑپنا اس کی حالتِ فطری کا ایک خود بخود اظہار ہوتا ہے۔ یہی معاملہ ذکر کثیر کا ہے۔ ذکر کثیر دراصل تجربۂ کثیر کے ایک اظہار کا نام ہے۔ مچھلی کی مثال میں یہ اظہار مجبورانہ تجربہ کے تحت ہوتا ہے۔ اِس کے برعکس، مومن کی زندگی میں یہ اظہار ایک تجربہ کی شعوری دریافت کی صورت میں پیش آتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان اپنے خالق کے مقابلے میں کامل طور پر ایک عاجز مخلوق ہے۔ انسان کی بے شمار ضرورتیں ہیں۔ ان ضرورتوں کی تکمیل کے لیے وہ ہر لمحہ خدا کی مدد کا محتاج ہوتا ہے۔ خدا کے مقابلے میں اس حیثیتِ عجز کی دریافت کے بعد فطری طور پر انسان ہر لمحہ خدا کی یاد میں جینے لگتا ہے۔ اِسی کا نام ذکر کثیر ہے، یعنی ایک مسلسل تجربہ کا ایک مسلسل یاد میں ڈھل جانا۔ ذکر کسی قسم کے لفظی تکرار کا نام نہیں، ذکر ایک مسلسل احساس کا مسلسل اظہار ہے۔

اگر کسی شخص کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو اس کے بعد وہ ہر لمحہ اس کے درد کو محسوس کرتا رہے گا۔ اِسی طرح انسان کو ہر لمحہ خدا کی کسی نہ کسی رحمت کا تجربہ ہوتا ہے۔ صبح وشام کا کوئی لمحہ بھی اِن تجربوں سے خالی نہیں ہوتا۔ جس آدمی کو خدا کی شعوری معرفت حاصل ہو جائے، وہ ہر لمحہ اِن ربانی تجربات کو محسوس کرتا رہے گا۔ یہ تجربہ ہر لمحہ خدا کی یاد میں ڈھلنے لگے گا۔ وہ اُسی کو لے کر سوچے گا، اسی کے مطابق احساسات اس کے اندر ابلیں گے، یہی تجربات اس کی زبان سے الفاظ بن کر ظاہر ہوتے رہیں گے۔ خدا کی اسی دوامی یاد کا نام ذکر کثیر ہے۔

جس آدمی کو ذکر کثیر کی توفیق حاصل ہو جائے، اس کو وہ سب سے بڑی چیز حاصل ہو گئی جو اِس قابل ہے کہ اِس دنیا میں آنے والا انسان اُس کو پائے اور ہر لمحہ وہ اپنے منعم کی یاد میں جینے لگے۔ خدا کی یادوں میں جینے والا انسان اپنے محسن کی یادوں میں جینے والا انسان ہے، اور کسی انسان کا سب سے بڑا شرف یہی ہے کہ وہ اپنے محسنِ حقیقی کی یادوں میں جینے والا انسان بن جائے۔

اسمِ اعظم کے ساتھ دعا

سب سے بڑی دعا وہ ہے جو ایک حقیقی پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) کے حوالے سے کی جائے، موت اِسی قسم کا ایک بہت بڑا پوائنٹ آف ریفرنس ہے۔ اگر کوئی شخص اس پوائنٹ آف ریفرنس کو دریافت کرلے تو وہ ایک ایسی دعا کرسکتا ہے جس کو حدیث میں اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کرنا بتایا گیا ہے۔ موت کیا ہے۔ موت زندگی کا خاتمہ نہیں ہے، بلکہ وہ موجودہ زمین پر رہائش کا خاتمہ ہے۔ موجودہ زمین پر انسان کے لیے وہ سب کچھ مہیا کیا گیا ہے جس کی اسے بحیثیت انسان ضرورت ہے۔ موت جب آتی ہے تو یہ ہوتا ہے کہ اچانک مرنے والے کو موجودہ سیارۂ ارض سے محروم کردیا جاتا ہے۔ لیکن سیارۂ ارض پر جو کچھ انسان کو ملا ہے، وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اس کے اپنے کسب (earning) کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ وہ تمام تر اللہ کے یک طرفہ عطیہ کا نتیجہ ہے۔ آدمی ملی ہوئی چیزوں کو فارگرانٹیڈ (for granted) طور پر لیتا رہتا ہے، اس لئے وہ اِس حقیقت سے بے خبر رہتا ہے۔ اگر آدمی دنیا میں ملی ہوئی چیزوں کو عطیۂ الٰہی کی حیثیت سے دریافت کرلے تو یہ دریافت اس کے لئے ایک عظیم پوائنٹ آف ریفرنس بن جائے گی۔

جس انسان کو شعوری طور پر اِس حقیقت کی دریافت ہوجائے، وہ پکار اٹھے گا کہ خدایا، موت سے پہلے کی زندگی میں بھی میں کامل طور پر عاجز تھا، لیکن تو نے اپنی رحمت سے بلا استحقاق مجھے یک طرفہ طور پر تمام چیزیں دے دیں، موت کے بعد کی زندگی میں بھی دوبارہ میں اپنے آپ کو کامل طور پر عجز کی حالت میں پاؤں گا۔ خدایا، جس طرح تو نے موت سے پہلے کی زندگی میں میرے عجز کی کامل تلافی فرمائی، اسی طرح تو موت کے بعد کی زندگی میں بھی میرے عجز کی کامل تلافی فرما، مجھے وہ تمام چیزیں مزید اضافہ کے ساتھ دے دے جو تو نے موت سے پہلے کی زندگی میں مجھے عطا کی تھیں۔

اِس پوائنٹ آف ریفرنس کے ساتھ نجاتِ آخرت کی دعا کرنا، بلاشبہہ اسم اعظم کے ساتھ دعا کرنا ہے، جس کی قبولیت کی بشارت دی گئی ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس اسمِ اعظم کے حوالے سے دعا کرنے کی توفیق پائیں۔

غور و فکر ایک عبادت

أخرج أبو نُعیم في الحِلیة (164/1) عن محمد بن واسع: أنّ رجلاً من البصرة رکب إلی أمِّ ذر رضي الله عنها بعد وفاة أبي ذر رضي اللّٰہ عنه، یسألها عن عبادة أبي ذر، فأتاها فقال: جئتكِ لتخبرینی عن عبادة أبي ذر، قالت: کان النّھار أجمع خالیاً یتفکر (حیاة الصحابة، جلد2، صفحہ 627)۔

ترجمہ: محمد بن واسع کہتے ہیں کہ ابوذر صحابی کی وفات کے بعد ایک آدمی بصرہ سے سفر کر کے اُمِّ ذر (اہلیہ ابوذر) کے پاس آیا، تاکہ وہ ابوذر کی عبادت کے بارے میں اُن سے معلوم کرے۔ وہاں پہنچ کر اس نے کہا کہ میں آپ کے پاس اِس لیے آیا ہوں، تاکہ آپ مجھ کو ابوذر کی عبادت کے بارے میں بتائیں۔ اِمِّ ذر نے کہا کہ وہ سارے دن تنہائی میں بیٹھ کر غور وفکر کرتے تھے۔

اِس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ رسول کی خصوصی عبادت کیا ہوتی تھی۔ وہ وہی چیز ہوتی تھی جس کو قرآن میں، تفکر، تذکر، تدبر، توسم اور تعقل جیسے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی فطرت (nature) میں اور دینی امور میں غور کرتے رہنا، غور وفکر کے ذریعے ہر روز اپنے لیے ربانی غذا حاصل کرنا، متعین عبادات کے سوا، غیر متعین عبادت میں مشغول رہنا۔

انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے رُٹین (routine) کا طالب ہے۔ اُس کا ہر کام رٹین کے تحت ہوتا ہے۔ اِس لحاظ سے، پانچ وقت کی نماز گویا کہ رُٹین کی نماز ہے۔ یہ رٹین بلاشبہہ ضروری ہے، مگر عبادت اپنی حیثیت کے اعتبار سے، ایک مسلسل عمل کا نام ہے۔ یہی تسلسل، مومن کی زندگی میں غور وفکر کے ذریعے جاری رہتا ہے۔ آدمی ہر لمحہ مختلف قسم کے مشاہدات اور تجربات سے گزرتا ہے۔ اِس دنیا کے ہر مشاہدے اور تجربے میں خدا کی تجلی شامل رہتی ہے۔ یہی تجلیات جب زندہ احساس بن جائیں تو اُس کو ذکر وفکر کہا جاتا ہے۔ یہی وہ عبادت ہے جس کو قرآن کی اِس آیت میں انسان کی تخلیق کا مقصد قرار دیا گیا ہے: **وما خلقت الجنّ والإنس إلا لیعبدون (51:56)**۔

توبہ اسلام میں

توبہ کے لفظی معنی رجوع کے ہیں، یعنی لوٹنا۔ دینی اصطلاح میں توبہ کا مطلب ہوتا ہے— گناہ کے بعد دوبارہ اصلاح کی طرف لوٹنا۔ توبہ کی اصل ندامت ہے۔ چناں چہ حدیث میں آیا ہے: **الندم توبةٌ** (ابن ماجہ، کتاب الزہد؛ مسند احمد، جلد 1، صفحہ 376) یعنی توبہ یہ ہے کہ آدمی اپنے گناہ پر سخت شرمندہ ہو۔

توبہ اپنی زبان سے کسی لفظ کو دہرانے کا نام نہیں ہے۔ توبہ دراصل شدید طور پر احساسِ خطا کا نام ہے۔ جب آدمی اپنی غلطی پر شرمندہ ہو تو وہ اِس کا تحمل نہیں کرسکتا کہ وہ دوبارہ اپنی غلطی کا اعادہ کرے۔ اِس لئے توبہ کے ساتھ لازمی طور پر اصلاح کا تصور جڑا ہوا ہے۔ اگر توبہ کے باوجود آدمی اپنی اصلاح نہ کرے تو یہ اِس بات کا ثبوت ہوگا کہ اس نے حقیقی معنوں میں توبہ نہیں کیا۔

توبہ کرنے والوں کے ذکر کے تحت، قرآن میں یہ آیت آئی ہے: **فأولئك يبدّل الله سيّاٰتهم حسنات** (25:70) یعنی اللہ توبہ کرنے والوں کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا:

God will change the evil deeds of such people into good ones.

اگر ایک آدمی سے برائی ہوجائے۔ اس کے بعد اس کو خدا کی یاد آئے۔ وہ خدا کی باز پرس کو سوچ کر تڑپ اٹھے، وہ توبہ اور استغفار کرتے ہوئے خدا کی طرف دوڑ پڑے، تو خدا اپنی رحمت سے ایسی برائی کو نیکی کے خانے میں لکھ دے گا۔ کیوں کہ وہ برائی آدمی کے لیے خدا کی طرف رجوع کرنے کا سبب بن گئی۔

عربی میں کہا جاتا ہے کہ: **الإنسان مركّب من الخطأ والنّسيان**۔ اِسی طرح انگریزی زبان میں یہ مقولہ ہے کہ غلطی کرنا انسان کی خصلت ہے (to err is human)۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس دنیا میں معیاری طور پر صالح بننا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ جو چیز ممکن ہے، وہ یہ کہ آدمی توبہ کرنے والا بنے، غلطی کرنے کے بعد وہ فوراً چونکے، وہ اپنی غلطی پر شرمندہ ہو، وہ اپنی اصلاح کرکے دوبارہ خدا کی طرف رجوع کرنے والا بن جائے، یہی انسان سے مطلوب ہے۔ اگر کوئی شخص غلطی پر اصرار نہ کرے اور وہ توبہ کرکے اپنی اصلاح کرتا رہے تو وہ خدا کے یہاں قابلِ معافی قرار دیا جائے گا۔

اسبابِ شکر کو دریافت کیجیے

اگر آپ لذیذ کھانا کھائیں اور اس کو کھا کر الحمدللہ کہیں تو یہ حیوانی درجے کا شکر ہے۔ کیوں کہ یہ مشاہدہ اور ذائقہ پر مبنی ہے، اور مشاہدہ اور ذائقہ کے درجے کا شکر صرف حیوانی درجے کا شکر ہے، وہ اعلیٰ انسانی درجے کا شکر نہیں۔

انسان کے درجے کا شکر یہ ہے کہ جب کھانا آپ کے سامنے آئے تو اس کو دیکھ کر خدا کا پورا تخلیقی نظام آپ کو یاد آجائے۔ آپ سوچیں کہ یہ تمام غذائی چیزیں پہلے غیر غذائی چیزیں تھیں۔ خدا نے ایک برتر عمل (process) کے ذریعے ایک عظیم واقعہ برپا کیا، وہ تھا غیر غذا (non-food) کو غذا (food) میں تبدیل کرنا۔ اِس طرح ایک کائناتی عمل کے ذریعے یہ تمام غذائی چیزیں وجود میں آئیں۔

پھر آپ یہ سوچیں کہ یہ غذائی چیزیں اپنی ابتدائی صورت میں میرے لیے توانائی (energy) کا ذریعہ نہیں ہوسکتی تھیں۔ چناں چہ خدا نے مزید یہ کیا کہ اُس نے میرے جسم کے اندر ایک پیچیدہ قسم کا نظام ہضم (digestive system) رکھ دیا۔ یہ نظامِ ہضم ایک خودکار نظام ہے۔ جب میں کوئی چیز کھاتا ہوں تو یہ نظام ہضم اِن غذائی چیزوں کو حیرت انگیز طور پر زندہ خلیات (living cells) میں تبدیل کر دیتا ہے، پھر یہ زندہ خلیات میرے جسم میں گوشت اور خون جیسی چیزوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ سوچ کر آپ کے اندر شکر کا ایسا احساس امنڈے، جس کو الفاظ میں ظاہر کرنے کے لیے آپ اپنے آپ کو عاجز پاتے ہوں۔

اِس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی شکر کیا ہے اور حیوانی شکر کیا۔ اگر آپ کے اندر صرف حیوانی درجے کا شکر ہے تو آپ ہمیشہ ناشکری کے احساس میں جئیں گے۔ شکر کے اعلیٰ احساس میں جینے کے لیے انسانی درجے کا جذبۂ شکر درکار ہے۔ مگر یہی وہ چیز ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ کم پائی جاتی ہے (وقلیل من عبادي الشکور)۔ انسان سے اللہ تعالیٰ کو جو شکر مطلوب ہے، وہ انسانی درجے کا شکر ہے۔ صرف حیوانی درجے کا شکر انسان جیسی مخلوق سے قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔

شکر ایک قربانی کا عمل

شکر سب سے بڑی عبادت ہے۔ شکر جنت کی قیمت ہے۔ شکر کے بغیر ایمان نہیں۔ شکر کے بغیر سچی خدا پرستی نہیں۔ شکر کے بغیر آدمی اُن اعلیٰ کیفیات کا تجربہ نہیں کرسکتا جس کو قرآن میں ربّانیت (3:79) کہا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین داری کی اصل روح شکر ہے۔ شکر کے بغیر دین داری ایسی ہی ہے جیسے پھل کا اوپری چھلکا۔

لیکن شکر محض زبان سے کچھ الفاظ ادا کردینے کا نام نہیں، شکر ایک قربانی کا عمل ہے، بلکہ سب سے بڑی قربانی کا عمل۔ جو آدمی سب سے بڑی قربانی کردینے کے لیے تیار ہو، وہی اُس شکر کا تجربہ کرسکتا ہے جو خدا کو مطلوب ہے۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ہر انسان کسی نہ کسی اعتبار سے احساسِ محرومی کا شکار ہوتا ہے۔ ہر انسان کے دل میں کسی نہ کسی کے خلاف منفی جذبات موجود رہتے ہیں۔ ہر انسان مختلف اسباب سے شکایت اور نفرت کی نفسیات میں جینے لگتا ہے۔ یہی وہ صورتِ حال ہے جو شکر کو کسی انسان کے لیے مشکل ترین کام بنا دیتی ہے۔ آدمی زبان سے شکر کے الفاظ بولتا ہے، لیکن اس کا دل حقیقی جذباتِ شکر سے بالکل خالی ہوتا ہے۔

ایسی حالت میں صرف وہی انسان شکر کا عمل کرسکتا ہے جس کا شعور اتنا زیادہ بیدار ہو چکا ہو کہ وہ ناشکری کے اسباب کے باوجود شکر کرسکے، جو منفی خیالات کے جنگل میں رہتے ہوئے مثبت احساس میں جینے والا بن جائے۔ وہ اپنے اندر سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر خلافِ شکر چیزوں کو نکالے، وہ اپنے اندر حقیقی جذباتِ شکر کی تخلیق کرسکے۔

شکر ایک عبادت ہے جو ہر حال میں مطلوب ہے۔ جو آدمی یہ سمجھے کہ شکر اُس وقت کرنا ہے جب کہ ہر چیز اُس کو اس طرح حاصل ہو جائے جیسا کہ وہ انھیں حاصل کرنا چاہتا تھا، ملی ہوئی چیز اُس کی مرضی کے مطابق اُس کو مل جائے۔ ایسا آدمی کبھی شکر کرنے والا نہیں بن سکتا۔ خدا کا حقیقی شکر گزار وہی ہے جو شکایت کے باوجود شکر گزاری کا راز دریافت کرے۔

دعاءِ اعظم

دعا کا لفظی مطلب پکارنا (to call) ہے، یعنی بندے کا اپنے احساسِ بندگی کے تحت اپنے رب کو پکارنا۔ اِس دعا کی دو قسمیں ہیں۔ اس کی عام قسم یہ ہے کہ دعا کے مقرر الفاظ کو یاد کر لینا اور اِن مقرر الفاظ کے حوالے سے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا۔

دعا کی دوسری قسم وہ ہے جس کو دعاءِ اعظم کہا جا سکتا ہے۔ یہ دعا وہ ہے جب کہ بندے پر اپنی عبدیت کا گہرا احساس طاری ہو اور وہ ایسے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کو پکارے جو اللہ کی رحمت کو انووک (invoke) کرنے والے ہیں۔

مثال کے طور پر قرآن میں ایک دعا اِن الفاظ میں آئی ہے: **ربنا آتنا فی الدنیا حسنة، وفی الآخرة حسنة، وقنا عذاب النار** (2: 201)۔ آپ اِس دعا کو پڑھیں اور آپ کے اندر گہرا جذبۂ عبودیت جاگ اٹھے۔ اُس وقت آپ کو وہ نعمتیں یاد آئیں جو موجودہ دنیا میں آپ کو اللہ نے دی ہیں اور پھر آپ لرزتے ہوئے قلب کے ساتھ کہیں کہ خدایا، تو نے مجھے دنیا کے حسنہ سے محروم نہیں کیا، اب تو آخرت کا حسنہ بھی میرے لیے مقدر کر دے۔

اِسی طرح آپ اِس حدیث قدسی کو پڑھیں: **أنا عند ظنّ عبدی بی، فلیظن بی خیر ماأحب (ذخیرة الحفاظ لابن القیسرانی، 5/2793)** یعنی میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں، تو بندے کو چاہیے کہ وہ مجھ سے اپنے محبوب خیر کا گمان کرے۔

اِس حدیث کو پڑھتے ہوئے آپ کو خدا کی وہ رحمتیں (blessings) یاد آئیں جو موجودہ دنیا میں خدا نے آپ کو دی ہیں۔ اِس یاد سے آپ تڑپ اٹھیں اور آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلیں کہ خدایا، تو نے دنیا میں میرے ساتھ ہر اعتبار سے خیر کا معاملہ فرمایا، اب تو آخرت میں بھی میرے ساتھ ہر اعتبار سے خیر کا معاملہ فرما—— یہی دعاءِ اعظم ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ افراد جن کو اِس طرح کی دعاءِ اعظم کی توفیق حاصل ہو۔

دعا کی دریافت

دعا ایک دریافت ہے۔ انسان جب اپنے عجز اور دعا کی قدرت کی دریافت کرتا ہے تو اس کے بعد وفورِ جذبات کے تحت جو الفاظ اس کی زبان پر جاری ہوجاتے ہیں، اسی کا نام دعا ہے۔ دعا یہ ہے کہ آدمی کے ربانی تجربات الفاظ میں ڈھل جائیں۔ اس کا داخلی احساس، خارجی اظہار کی صورت اختیار کرلے۔ دعا کی تاثیر کا تعلق اس کے الفاظ سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق خود دعا کرنے والے کے داخلی احساس سے ہے۔ مثال کے طور پر ایک انسان نے اپنے اوپر اللہ کے انعامات کو لے کر غور کیا۔ اس نے سوچا کہ اللہ نے مجھ کو وجود بخشا، میرے لیے ایک پورا لائف سپورٹ سسٹم پیدا کیا، میری ضرورت کی ہر چیز یک طرفہ طور پر مجھے عطا کردی۔

اِن باتوں کو سوچتے ہوئے اس کو موت کے بعد کا دورِ حیات یاد آیا۔ اس نے سوچا کہ آج جو نعمتیں مجھے ملی ہوئی ہیں، وہ سامانِ امتحان کے طور پر ہیں۔ موت کے بعد کے دورِ حیات میں کیا ہوگا، وہ سب کا سب اللہ کے اختیار میں ہے۔ ایک طرف اس نے اپنے عجز (helplessness) کو دریافت کیا، اور دوسری طرف اس نے اللہ کی قدرت کا ادراک کیا۔ اِن باتوں کو سوچتے ہوئے وہ بے قرار ہوگیا اور اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے — خدایا، تو اپنے فضل سے اپنی اِن نعمتوں کو میرے لیے دنیا سے آخرت تک ممتد (extend) کردے۔

ایک ہے دعا اور دوسری چیز ہے ماقبلِ دعا (pre-du‘a)۔ حقیقی دعا اُس وقت نکلتی ہے جب کہ اس کا ایک ماقبل موجود ہو۔ یہ ماقبل، دعا کرنے والے کا ایمانی تجربہ ہے۔ آدمی اپنے خالق اور مالک کے بارے میں سوچتا ہے۔ اِس سے اس کے دل و دماغ میں ایک روحانی حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اس کی نفسیات میں ایک تموج برپا ہوتا ہے، اس کو ربانی حقیقتوں کا تجربہ ہونے لگتا ہے۔ اس کو محسوس ہوتا ہے کہ داخلی سطح پر اس کا ربط ایک حقیقتِ اعلیٰ (higher reality) سے قائم ہوگیا ہے — یہ غیر ملفوظ کیفیت جب لفظوں کی صورت میں ظاہر ہو تو اسی کا نام دعا ہے۔

تجربہ اور دعا

30 جولائی 2010 کو میں آل انڈیا ریڈیو سن رہا تھا۔ اناؤنسر نے ایک واقعہ بیان کیا۔ اس نے بتایا کہ لندن کا ایک شخص جاب (job) کی تلاش میں تھا۔ اس نے کئی کمپنیوں اور اداروں میں کوشش کی، مگر اس کو جاب نہیں ملا۔ آخر کار اس نے ایک انوکھی تدبیر کی۔ اس نے ایک پلے کارڈ (play card) پر لکھا — برائے مہربانی، مجھے ایک جاب دیجیے:

Please give me a job.

اِس پلے کارڈ کو لے کر وہ لندن کی ایک سڑک پر کھڑا ہوگیا۔ بارش ہونے لگی تب بھی وہ وہاں اُسی طرح کھڑا رہا۔ شام کو لندن کا ایک ٹمبر مرچنٹ (timber merchant) وہاں سے گزرا۔ اس نے پلے کارڈ کے مضمون کو پڑھا۔ وہ اپنی سواری سے اتر کر اُس آدمی کے ساتھ آیا اور اس کو اپنا پتا دیتے ہوئے کہا — کل تم میرے آفس میں آجاؤ۔ میں تم کو جاب دوں گا، اور پھر اگلے دن اس کو جاب مل گیا۔

میں نے ریڈیو پر اس واقعے کو سنا تو دل میں ایک بے چینی پیدا ہوئی۔ مجھے موت اور آخرت اور جنت یاد آئی۔ میں نے اللہ سے دعا کرتے ہوئے کہا:

Please give me a seat in the Paradise.

یہ ایک سادہ مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی تجربے کو پوائنٹ آف ریفرنس بنا کر دعا کرنے کا مطلب کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے ہم بار بار مختلف قسم کے تجربات سے گزرتے ہیں، بار بار ہمارے سامنے مختلف قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ اگر آدمی کا ذہن بیدار ہو اور اس کو اللہ کی معرفت حاصل ہو چکی ہو تو یہ تجربات اور واقعات اس کے لیے پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) بن جائیں گے۔ اِن تجربات اور واقعات کے حوالے سے وہ بار بار اللہ کا ذکر کرے گا۔ کیفیت سے بھری ہوئی دعائیں اس کی زبان سے نکلتی رہیں گی۔ بظاہر وہ ایک مادی دنیا میں رہے گا، لیکن یہ مادی دنیا اس کے لیے رزقِ روحانی کا ایک عظیم دسترخوان بن جائے گی۔

زندہ دعا

ایک بیرونی سفر میں مجھے ایک رات کے لیے فرینکفرٹ (جرمنی) کے ائر پورٹ پر ٹھہرنا پڑا۔ ائر پورٹ کی ایک خاتون کارکن نے کہا کہ آپ کے پاس جرمنی کا ویزا نہیں ہے، ورنہ ہم آپ کو شہر کے اندر کسی ہوٹل میں ٹھہرا دیتے۔ اُس نے ائر پورٹ کے ایک حصے میں مجھے پہنچایا۔ یہاں میں لیٹ سکتا تھا۔ پھر اس نے ایک ٹرے میں شام کا کھانا لا کر مجھے دیا اور ایک کمبل (blanket) بھی دیا اور کہا کہ یہاں آپ رات کو آرام کریں۔ صبح کو میں آ کر اگلی فلائٹ تک آپ کو پہنچا دوں گی۔ میں کھانے سے فراغت کے بعد کمبل اوڑھ کر وہاں لیٹ گیا۔ صبح کو مذکورہ خاتون دوبارہ آئی تو میں نے وہ کمبل اس کو واپس دینا چاہا۔ اس نے کہا: اِس کو واپس کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ واقعہ جب مجھ کو یاد آتا ہے تو وہ میرے لیے دعا کا پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) بن جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ — خدایا، موت سے پہلے کی زندگی میں تو نے مجھے سب کچھ دے دیا، کیا موت کے بعد کی زندگی میں تو مجھ کو ہر چیز سے محروم کر دے گا۔ تیری رحمت جو موت سے پہلے کی زندگی میں مجھے حاصل تھی، اُس رحمت کو تو موت کے بعد کی زندگی میں بھی میرے لیے جاری رکھ۔ موت سے پہلے کی زندگی میں تو نے مجھے محرومی سے بچایا، موت کے بعد کی زندگی میں بھی تو مجھے محرومی سے بچا لے۔ ایک انسان دی ہوئی چیز کو واپس نہیں لیتا، پھر تو جو خالق انسان ہے، کیسے یہ کر سکتا ہے کہ تو دی ہوئی چیز کو مجھ سے واپس لے لے۔

آدمی کے اندر اگر زندہ فکر موجود ہو اور اس کا شعور بیدار ہو تو زندگی کا ہر واقعہ اس کے لیے ذکر اور دعا کا پوائنٹ آف ریفرنس بن جائے گا، وہ ہر واقعہ کے حوالے سے خدا کو یاد کرنے لگے گا، ہر واقعہ اس کے لیے ایک ایسا حوالہ بن جائے گا جس میں وہ دعا کے لیے نئے الفاظ پا لے گا۔ اِسی قسم کا ذکر اور دعا حقیقی معنوں میں ذکر اور دعا ہے۔ جو آدمی اِس طرح کے احساسات میں جینے لگے، وہ گویا ایک ایسے درخت کی مانند ہے جس کی سرسبزی کبھی ختم نہ ہو، جو ابدی طور پر پھول اور پھل کی فصل دیتا رہے۔

پوائنٹ آف ریفرنس

سب سے بڑی دعا وہ ہے جو پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) کے ساتھ کی جائے، یعنی آپ پر ایک تجربہ گزرا۔ وہ تجربہ آپ کے لئے اللہ کی یاد کا ایک حوالہ بن گیا۔ اس وقت آپ کے اندر ایک روحانی تموج (spiritual storm) پیدا ہوا۔

پھر اس واقعہ کے حوالہ سے آپ کے اندر کچھ دعائیہ الفاظ نکلے۔ یہ پوائنٹ آف ریفرنس کے ساتھ دعا کرنا ہے۔ ایسی دعا بہت زیادہ اہم ہوتی ہے۔ یہی وہ دعا ہے جس کو حدیث میں اسم اعظم کے ساتھ دعا کرنا بتایا گیا ہے۔

مثال کے طور پر گرمی کا مہینہ ہے۔ آپ ایک شخص سے ملنے کے لیے اس کے یہاں جاتے ہیں۔ جب آپ اس کے یہاں پہنچتے ہیں تو وہ آپ کو عزت کے ساتھ بٹھاتا ہے اور شیشہ کے گلاس میں ٹھنڈا پانی آپ کو پیش کرتا ہے۔ آپ پانی پیتے ہیں۔ اِس سے آپ کا سوکھا ہوا حلق تر ہو جاتا ہے۔ آپ کی پیاس بجھ جاتی ہے۔

اس تجربے کے بعد آپ کے اندر ایک روحانی بھونچال آتا ہے۔ آپ کہہ اٹھتے ہیں کہ خدایا — اِسی طرح ایک دن میں تیرے پاس آنے والا ہوں۔ میں تیرے پیدا کئے ہوئے ایک انسان سے ملا تو اس نے مجھے ٹھنڈا پانی پیش کیا۔ تو جو کہ خالق ہے، کیا تو ایسا کرے گا کہ جب میں تجھ سے ملوں تو تو اپنے فرشتوں کو یہ حکم دے دے کہ اس کو کھولتا ہوا پانی پلاؤ۔

حقیقی دعا یاد کئے ہوئے الفاظ کو دہرانے کا نام نہیں، حقیقی دعا میں الفاظ کی حیثیت صرف علامت کی ہوتی ہے۔ حقیقی دعا وہ ہے جو معرفت کی دعا ہو۔ حقیقی دعا وہ ہے جو خدائی دریافت کے بعد آپ کی زبان پر جاری ہو جائے۔ حقیقی دعا ایک اعلیٰ عبادت ہے۔

حقیقی دعا وہ ہے جو بندے کو اس کے خالق (Creator) سے قریب کر دے۔ حقیقی دعا وہ ہے جو کسی بندے کے پورے وجود کا ایک اظہار بن جائے۔

عجز کی دریافت

انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے کامل طور پر ایک عاجز مخلوق ہے۔ لیکن امتحان (test) کی مصلحت کے تحت اس کے اوپر بظاہر قدرت کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اِس پردے کو پھاڑے اور بظاہر عاجز نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے عجز کو دریافت کرے۔ یہ دریافت بلاشبہہ سب سے بڑی دریافت ہے۔ اِسی دریافت میں انسان کی تمام سعادتوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

عجز (helplessness) کی دریافت کسی انسان کے لیے اس کی عظیم ترین دریافت (greatest discovery) ہے۔ یہ دریافت اس کو ذکر و دعا کے اعلیٰ مواقع عطا کرتی ہے۔ یہ دریافت اس کو یہ موقع دیتی ہے کہ وہ یہ کہہ سکے کہ — خدایا، تو نے انسان کو عجز کے ساتھ پیدا کیا۔ ساری قدرت تیری طرف، اور سارا عجز انسان کی طرف۔ ایسی حالت میں، تو انسان کے معاملے میں غیر جانب دار (indifferent) نہیں ہوسکتا۔ یہ تیری شانِ خداوندی کے خلاف ہے کہ تیرے اور انسان کے درمیان، عجز اور غیر جانب داری (indifference) کا تعلق ہو۔ ضروری ہے کہ خدا اور بندے کے درمیان محروم (deprived) اور معطی (giver) کا تعلق ہو۔ یہی تعلق خدائے رحمان اور رحیم کی شان کے مطابق ہے۔

یہی وہ دعا ہے جس کو حدیث میں اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کرنا بتایا گیا ہے۔ جب کوئی بندہ حقیقی معنوں میں یہ کہے کہ — خدایا، تو نے مجھ کو ایک عاجز انسان کی حیثیت سے پیدا کیا تو اب تو میرے معاملے میں غیر جانب دار (indifferent) نہیں ہوسکتا۔

جب کوئی بندہ اِس طرح خدا کو پکارے تو خدا کی رحمت روشنی کی رفتار سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ سفر کرکے اس کی طرف آجاتی ہے۔ شاعر نے جو بات مظلوم کی نسبت سے کہی تھی، وہ عاجز کی نسبت سے زیادہ درست ہے، یعنی اجابت (قبولیت) کا خود دعا کا استقبال کرنے کے لیے آجانا:

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

عقیدے کی طاقت

خدا پر عقیدہ انسان کو اِس دنیا میں سب سے بڑا سہارا دیتا ہے۔ خدا پر عقیدہ، اعتماد (conviction) کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ایک فارسی شاعر نے بجا طور پر کہا ہے:

دشمن اگر قوی است، نگہباں قوی تر است۔

یعنی مسئلہ اگر بڑا ہے تو مسئلے کو حل کرنے والا اُس سے بھی زیادہ بڑا ہے:

If the problem is strong, the problem solver is stronger.

موجودہ دنیا مسائل کی دنیا ہے۔ یہاں ہر عورت اور مرد کو بار بار مسائل پیش آتے ہیں۔ بار بار ایسی صورتِ حال پیش آتی ہے جہاں آدمی اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگتا ہے۔

سفرِ حیات کے درمیان بار بار آدمی کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آگے کا راستہ بند ہے۔ بار بار انسان اِس منفی احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ اس کے وسائل وذرائع کی آخری حد آ گئی، خود اپنے بل پر اس کے لیے اب اپنے مسئلے کو حل کرنا ممکن نہیں رہا۔ یہی وہ نازک مرحلہ ہے جب آدمی خدا کو پکارتا ہے۔ اُس وقت خدا اس کی پکار کو سن کر اس کے عجز کی تلافی کا سامان فراہم کر دیتا ہے۔

جس آدمی کا خدا پر عقیدہ نہ ہو، وہ ایسے موقع پر مایوسی (despair) کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ دل برداشتہ ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اب اس کے اندر آگے بڑھنے کی ہمت نہیں۔ ایسی حالت میں پہنچ کر آدمی ٹنشن (tension) میں جینے لگتا ہے، اور ٹنشن اپنے آپ میں ساری بیماریوں کی جڑ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ٹنشن سے زیادہ بڑا کوئی مسئلہ انسان کے لیے نہیں۔

لیکن جس آدمی کو خدا کے اوپر سچا یقین (conviction) ہو، وہ کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہوتا۔ اُس کو ہر صورتِ حال میں یہ یقین رہتا ہے کہ اس کا خدا ضرور اس کی مدد کرے گا۔ ایسا آدمی کامل یقین (conviction) کے ساتھ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا خدا ضرور اس کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچا لے گا، اس کا خدا اُس وقت بھی ضرور اس کا ساتھ دے گا جب کہ دوسرے لوگ اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہوں۔

دعا ایک عبادت

میں نے 1982 میں حج کیا۔ اس سفر میں ایک عرب پروفیسر بھی میرے ساتھ تھے۔ ہم دونوں جدہ ائرپورٹ پر اترے اور پھر وہاں سے روانہ ہو کر مکہ پہنچے۔ مکہ پہنچ کر میرے عرب ساتھی کو اچانک معلوم ہوا کہ وہ اپنا ہینڈ بیگ جدہ میں ائرپورٹ پر چھوڑ آئے ہیں جس میں اُن کے بیس ہزار ریال تھے۔ اس کے بعد وہ مجھ کو مکہ میں چھوڑ کر دوبارہ جدہ کے لیے روانہ ہو گئے تاکہ وہاں اپنا کھویا ہوا ہینڈ بیگ تلاش کریں۔ ان کے جانے کے بعد میں نے دو رکعت نماز پڑھی۔ میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا تو میری زبان سے یہ الفاظ نکلے — خدایا، تو اس کو ہمارے لیے سبق بنا دے، تو اس کو ہمارے لیے نقصان نہ بنا۔

آدمی کو پوری کوشش کرنا چاہیے کہ وہ غلطی یا نقصان سے بچے، لیکن جب نقصان ہو جائے تو دوسری چیز جس سے آدمی کو بچنا چاہیے، وہ ہونے والے واقعہ پر غم اور افسوس ہے۔ جب ایک غلطی ہو جائے تو وہ گویا کمان سے نکلا ہوا ایک تیر ہے جو واپس نہیں آتا۔ ایسی غلطی کے لیے افسوس نہیں کرنا ہے، بلکہ اللہ سے دعا کرنا ہے کہ وہ اس کے بُرے انجام سے آدمی کو بچائے۔

غلطی نہ کرنا اچھا ہے، مگر غلطی کرنا بھی اس وقت اچھا بن جاتا ہے جب کہ غلطی کا احساس آدمی کو اللہ کی طرف متوجہ کر دے۔ وہ اپنے رب سے دعائیں کرنے لگے۔ ایسی غلطی آدمی کے لیے عبادت کا سبب بن جاتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ دعا ایک عبادت ہے: **(الدعاء هو العبادة)**۔

نقصان کے بعد اس پر غم کرنا گویا کھوئے ہوئے میں جینا ہے۔ اور نقصان کے بعد اللہ کی طرف رجوع ہو جانا گویا نقصان کے بعد اس کی بہتر تلافی کا طالب بننا ہے۔ اور بلا شبہہ اللہ یہ اختیار رکھتا ہے کہ وہ آدمی کے نقصان کو دوبارہ عظیم تر فائدے میں تبدیل کر دے۔

ہر نقصان کے دو پہلو ہیں۔ ایک، نقصان اور دوسرے، سبق۔ اگر کوئی نقصان ہو جائے، تو آدمی کو چاہیے کہ وہ اُس سے سبق لے۔ اِس طرح نقصان، فائدے میں تبدیل ہو جائے گا۔

کائناتی شکر

اکثر لوگوں کو آپ یہ کہتے ہوئے سنیں گے کہ — اللہ کا شکر ہے کہ شہر میں میرا ذاتی مکان ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے مجھے اولاد دی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرا اپنا بزنس ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے پاس دو گاڑیاں ہیں، وغیرہ۔ اِس قسم کا شکر چھوٹا شکر ہے۔ اِس قسم کے شکر سے آپ کے اندر اللہ کے لیے شکر کا دریا جاری نہیں ہوسکتا، جب کہ خداوندِ برتر کے لیے وہ شکر مطلوب ہے جو دریاؤں اور سمندروں کی طرح آپ کے سینے میں موج زن ہوجائے۔

اللہ کے لیے بڑا شکر کب پیدا ہوتا ہے۔ یہ اُس وقت پیدا ہوتا ہے، جب کہ آپ کے اندر توسیعی شکر (extended shukr) کا ذہن پیدا ہوجائے۔ اِس معاملے میں آپ کی نظر صرف اپنی ذات پر نہ ہو، بلکہ آپ اپنے آپ کو انسان کے ساتھ اسوسی ایٹ (associate) کرکے دیکھ سکیں۔ جب آپ کے اندر اِس قسم کی نفسیات پیدا ہوجائے، اُس وقت آپ کے اندر وہ اعلیٰ شکر پیدا ہوگا جس کو آفاقی شکر یا کائناتی شکر (universal shukr) کہا جاسکتا ہے۔

ایک باپ کا بیٹا زیادہ ترقی کرجائے تو وہ اُس کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے، کیوں کہ وہ بیٹے کی ترقی کو خود اپنی ترقی سمجھتا ہے، حتی کہ بیٹا اگر امریکا میں ترقی کررہا ہے اور وہ خود انڈیا میں ہے، تب بھی وہ دور ہونے کے باوجود اپنے بیٹے کی ترقی کی خبر سن کر خوش ہوتا ہے۔

اسی طرح اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے دل میں اللہ کے لیے بڑا شکر پیدا ہو، تو آپ اپنی ذات کو پوری انسانیت کے ساتھ اسوسی ایٹ کیجیے۔ ایسی حالت میں یہ ہوگا کہ دوسرے انسانوں کی ترقی آپ کو خود اپنی ترقی نظر آنے لگے گی۔ ذاتی نعمت پر اگر آپ کے اندر ایک درجے کا شکر پیدا ہوا تھا، تو پوری انسانیت کے ساتھ اپنے آپ کو اسوسی ایٹ کرنے کی شکل میں یہ ہوگا کہ بلین ٹریلین (billion, trillion) درجے میں آپ کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہوجائے گا۔ پہلے اگر آپ کے سینے میں شکر کا ایک قطرہ تھا، تو اب آپ محسوس کریں گے کہ آپ کے سینے میں شکر کا سمندر موج زن ہوگیا ہے۔

خدائی نعمتوں کی دریافت

خدا کی طرف سے انسان کو بے شمار نعمتیں دی گئی ہیں۔ انسان کی سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ وہ اِن نعمتوں کا اعتراف کرے۔ نعمتوں کے اِسی اعتراف (acknowledgement) کا نام شکر ہے۔ شکر بلاشبہہ سب سے بڑا دینی عمل ہے، اور شکر نہ کرنا سب سے بڑی بے دینی۔

خدا کی یہ نعمتیں اعلان کے ساتھ نہیں آتیں۔ مثال کے طور پر خدا کی طرف سے آکسیجن کی عالمی سپلائی ہر لمحہ جاری رہتی ہے، مگر اعلان کی زبان میں کبھی انسان کو اُس سے باخبر نہیں کیا گیا۔ اِس طرح کی بے شمار خدائی نعمتیں ہیں جو ہر لمحہ انسان کو پہنچ رہی ہیں، مگر یہ سارا عمل اعلان کے بغیر ہورہا ہے۔

ایسی حالت میں کس طرح ایسا ہو کہ انسان حقیقی شکر یا حقیقی اعتراف کی عبادت انجام دے۔ اس کا طریقہ صرف ایک ہے — اور وہ یہ کہ انسان مسلسل غور وفکر (contemplation) کے ذریعے خدا کی نعمتوں (blessings) کو دریافت کرتا رہے۔

شکر سے پہلے نعمتوں کی دریافت (discovery of blessings) ہے، جو آدمی دریافت سے محروم ہو، وہ یقینی طور پر شکر سے بھی محروم رہے گا۔

اِسی لیے روایات میں، تدبر اور تفکر کی بہت زیادہ اہمیت بیان کی گئی ہے۔ ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں: **لا عبادةَ کتفکر** (القرطبي 3/314) یعنی تفکر جیسی کوئی عبادت نہیں۔

تفکر کا مطلب ہے سوچنا۔ سوچنے کا عمل دماغ میں ہوتا ہے۔ انسان کے تمام اعمال کا سرچشمہ دماغ ہے۔ کوئی آدمی جتنا زیادہ سوچے گا، اتنا ہی زیادہ وہ گہرے معانی کو دریافت کرے گا۔ یہی معاملہ شکر کا ہے۔ کوئی شخص سوچ ہی کے ذریعے خدا کی بے پایاں نعمتوں کو دریافت کرتا ہے۔

اِسی دریافت کے بعد آدمی کے اندر شکر کا سرچشمہ جاری ہوتا ہے۔ اِس اعتبار سے، یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جتنی بڑی دریافت اتنا بڑا شکر — تفکر (contemplation) سے آدمی دریافت (discovery) تک پہنچتا ہے اور دریافت سے شکر عظیم تک۔

لامحدود عطیات

ایک پروفیسر صاحب نے خوش خبری کے انداز میں بتایا کہ میری ملازمت کی مدت پوری ہوگئی تھی اور اب میں ریٹائر ہونے والا تھا، لیکن یونی ورسٹی نے مجھے دو سال کا ایکسٹنشن (extension) دے دیا۔ اب میری سروس مزید دو سال جاری رہے گی۔

میں نے جب توسیع (extension) کی یہ خبر سنی تو وہ میرے لیے دعا کا ایک پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) بن گئی۔

میں نے کہا کہ — خدایا، تو نے مجھے پیدا کیا اور یک طرفہ عطیہ کے طور پر زندگی کے تمام سامان مجھے دے دئے۔ موت اِن عطیات کی مدت کو ختم کردے گی، لیکن اگر تو چاہے تو اپنی رحمت سے اِس اِعطاء (grant) میں مزید توسیع کردے۔

انسان صرف محدود توسیع کر سکتا تھا، اس نے محدود توسیع کر دی، لیکن تو رب العالمین ہے، تو اگر چاہے تو لامحدود توسیع (unlimited extension) کر دے، تو اپنے اعطاء کو میرے لیے ابد تک جاری رکھے۔

آدمی واقعات اور تجربات کے درمیان زندگی گزارتا ہے۔ اگر وہ غور کرے اور اپنے ذہن کو بیدار رکھے تو ہر واقعہ اور ہر تجربہ اس کے لیے روحانی غذا (spiritual bood) کا ذریعہ بن جائے گا۔ وہ ہر واقعہ اور ہر تجربے میں ایسے پوائنٹ آف ریفرنس پالے گا جس کے حوالے سے وہ اعلیٰ ذکر کر سکے اور اس کی زبان پر اعلیٰ دعا کے الفاظ جاری ہو جائیں۔

جس طرح کتاب کا مطالعہ آدمی کے لیے روحانی غذا کا ذریعہ ہے، اسی طرح واقعات اور تجربات میں بھی اس کے لیے روحانی غذا کا سامان موجود ہوتا ہے۔

جو آدمی اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کرلے، اس کی زندگی کا سفر ایک ایسی روحانی ترقی (spiritual development) کا ذریعہ بن جائے گا جو موت سے پہلے کبھی ختم نہ ہو۔

سچا عمل، سچی دعا

ہر انسان جو اِس دنیا میں پیدا ہوتا ہے، وہ بہر حال ایک مختصر مدت کے بعد مرنے والا ہے۔ اِس کے بعد ہر عورت اور ہر مرد کو خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ اِس کے بعد خدا ہر ایک کے ابدی مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرے گا۔ یہ ابدی مستقبل، یا تو جنت کی صورت میں ہوگا، یا جہنم کی صورت میں۔ اِس معاملے کو نجات (salvation) کہا جاتا ہے۔

یہ نجات اُن لوگوں کو ملے گی جو خدا کے یہاں اِس حال میں پہنچیں کہ اُن کے پاس دو میں سے کوئی ایک چیز اپنی اعلیٰ صورت میں موجود ہو۔ وہ دو چیزیں یہ ہیں — سچا عمل، یا سچی دعا۔ سچا عمل وہ ہے جو خالص رضاء الٰہی کے لیے کیا جائے۔ اور سچی دعا وہ ہے جو کامل عجز کی سطح پر کی گئی ہو:

The criterion of true ‘amal’ is that it is performed purely for the sake of God. And the criterion of true ‘dua’ is that it is performed with a sense of total helplessness.

سچے عمل کی توفیق اس کو ملتی ہے جو اپنے آپ کو منافقت سے کامل طور پر پاک کرے، جس کے قول اور جس کے عمل میں کوئی فرق باقی نہ رہے، جو اپنے آپ کو کم زور شخصیت (weak personality) بننے سے بچائے، جس کے لیے اس کا عمل اس کی پوری شخصیت کا اظہار بن جائے۔

اِسی طرح، سچی دعا کی توفیق اُس انسان کو ملتی ہے جو اپنے شعور کو اتنا زیادہ ترقی دے کہ وہ خدا کی قدرتِ کاملہ کے مقابلے میں، اپنے عجزِ کامل کو دریافت کرے۔ شعور کی اِسی سطح پر پہنچ کر کسی کو وہ دعا حاصل ہوتی ہے جس کو سچی دعا کہا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سچی دعا اور سچا عمل دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ سچی دعا میں سچا عمل شامل ہے، اور سچا عمل ہمیشہ سچی دعا کی زمین پر پیدا ہوتا ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے، سچے عمل اور سچی دعا کو ایک دوسرے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ سچا عمل دراصل، حقیقی عمل کا دوسرا نام ہے۔ اور سچی دعا حقیقی دعا کا دوسرا نام۔

شکر یا سرکشی

ایک اچھی چیز آپ کو ملتی ہے۔ اس کو اگر آپ اپنی محنت اور قابلیت کا نتیجہ سمجھیں تو آپ کے اندر سرکشی کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اور اگر آپ اس کو خدا کی طرف سے ملی ہوئی چیز سمجھیں تو آپ کے اندر شکر کا جذبہ جاگ اٹھے گا۔ پہلی کیفیت کا نام گمراہی ہے اور دوسری کیفیت کا نام ہدایت یابی۔

موجودہ دنیا کو امتحان کی مصلحت کے تحت بنایا گیا ہے۔ تمام واقعات بلاشبہہ اللہ کی مرضی سے اور اس کے اذن سے ہورہے ہیں۔ مگر تمام واقعات پر اسباب کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ اسباب کے ظاہری پردہ کو ہٹا کر اصل واقعہ کو دیکھے اور اس پر ایمان لائے۔

آپ کے اندر ایک چیز کی طلب پیدا ہوتی ہے۔ آپ اس کے لیے کوشش شروع کرتے ہیں۔ آپ کی کوشش مختلف مراحل سے گزرتی ہے۔ کہیں آپ اپنا ذہن استعمال کرتے ہیں، کہیں اپنی عملی طاقت لگاتے ہیں اور کہیں اپنا اثاثہ خرچ کرتے ہیں۔

اِس طرح بظاہر اسباب وعلل کے راستے سے گزرتے ہوئے آپ اپنے انجام تک پہنچتے ہیں، آپ اپنے مقصود کو پالیتے ہیں۔

اب اگر آپ کو صرف ظاہر بیں نگاہ حاصل ہے تو آپ اپنی کامیابی کو اپنی کوشش کا نتیجہ سمجھیں گے۔ لیکن اگر آپ کو وہ نگاہ حاصل ہو جو باتوں کو اس کی گہرائی کے ساتھ دیکھ سکے تو آپ جان لیں گے کہ جو ہوا، وہ خدا کے کرنے سے ہوا، یہ میرا کوئی ذاتی کارنامہ نہیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا امتحان ہورہا ہے۔ آدمی پر لازم ہے کہ وہ ظاہری پردہ کو پھاڑ کر اندرونی حقیقت کو دیکھے۔ بظاہر اپنے ہاتھ سے ہونے والے کام کے بارے میں وہ یہ دریافت کرے کہ وہ حقیقۃً خدا کے ہاتھ سے انجام پارہا ہے۔

جو لوگ اِس بصیرت کا ثبوت دے سکیں، وہی معرفت والے لوگ ہیں، اور جو لوگ اِس بصیرت کا ثبوت نہ دے سکیں، وہی وہ لوگ ہیں جو معرفت سے محروم رہے۔

شکرِ خداوندی

لوگوں سے بات کیجئے تو ہر آدمی شکایت (complaint) کی بولی بولے گا۔ ہر آدمی منفی باتیں کرے گا۔ یہ شکایت یا منفی باتیں کس کے خلاف ہیں، یہ سب کی سب انسان کے خلاف ہیں۔ ہر ایک کی شکایت کا نشانہ کوئی انسان یا کوئی قوم یا کوئی انسانی گروہ ہوگا۔ یہی ہر جگہ کے لوگوں کی عام حالت ہے— یہی وہ چیز ہے جس نے لوگوں کو شکرِ خداوندی کے احساس سے ناآشنا بنا دیا ہے۔

جن واقعات کو لے کر لوگ شکایتیں کرتے ہیں، وہ انسان ساز (man-made) واقعات ہیں۔ مگر یہ واقعات پوری انسانی زندگی کا ایک فی صد سے بھی کم حصہ ہوتے ہیں۔ دوسرے واقعات وہ ہیں جن کو خدا ساز (God-made) واقعات کہا جا سکتا ہے۔ یہ خدائی واقعات اپنی مقدار میں بہت زیادہ ہیں، حتی کہ ننانوے فی صد سے بھی زیادہ۔

اِس فرق کو سامنے رکھتے ہوئے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ جو انسانی واقعات ایک فی صد سے بھی کم ہیں، اُنھیں کے بارے میں لوگ سوچتے ہیں اور انھیں کا چرچا کرتے ہیں، وہ انھیں سے اپنی رائے بناتے ہیں۔ اِس کے برعکس، جو خدائی واقعات یا خدائی نعمتیں (divine bounties) انسان کو ملی ہوئی ہیں، جن کی مقدار ننانوے فی صد سے بھی زیادہ ہے، اُن کا کوئی چرچا نہیں۔ اُن کے بارے میں نہ کوئی سوچتا اور نہ ان کا اعتراف کرتا ہے۔

لوگوں کی شکایتی نفسیات کا اصل سبب یہی ہے۔ لوگ صرف انسانی واقعات کو جانتے ہیں، اس لیے وہ منفی بات کرتے رہتے ہیں۔ اِس کے برعکس، اگر وہ خدائی واقعات کو جانیں تو وہ اُن کو اتنا زیادہ نظر آئیں گے کہ اُن کے مقابلے میں انسانی واقعات ناقابلِ تذکرہ بن جائیں گے۔ اگر ایسا ہو تو یقینی طور پر یہ ہوگا کہ لوگ انسانی شکایتوں کو بھول جائیں گے۔ خدا کی نعمتوں کو سوچ کر وہ اتنا زیادہ سرشار رہیں گے کہ اُنھیں یاد ہی نہ رہے گا کہ اُن کے ساتھ کسی نے قابلِ شکایت بات کی ہے۔ یہی وہ سوچ ہے جو کسی آدمی کے اندر الحمد للہ کی سچی اسپرٹ پیدا کرتی ہے۔

سب سے بڑی عبادت سے محرومی

ہر آدمی جانتا ہے کہ اس کی زندگی کی تعمیر میں اس کے والدین کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اِس اعتبار سے، ہر آدمی اپنے والدین کی تعریف کرتا رہتا ہے۔ لیکن ایسے عورت اور مرد نہیں ملتے جو یہ جانتے ہوں کہ ان کی زندگی کی تعمیر میں پوری انسانیت کا حصہ ہے۔ اِس معاملے میں والدین کا حصہ اگر ایک فی صد ہے تو انسانیتِ عامہ کا حصہ ننانوے فی صد۔ لیکن کوئی شخص نہ اِس حقیقت کو جانتا ہے اور نہ وہ اس کا اعتراف کرتا ہے۔

مثلاً جب آپ ایک روٹی کھاتے ہیں تو اس کے حصول میں آپ کے والدین کا حصہ ایک فی صد سے بھی کم ہوتا ہے۔ اور انسانیتِ عامہ کا حصہ اس کے حصول میں ننانوے فی صد سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ ہزاروں سال کے لمبے تہذیبی عمل کے بعد یہ ممکن ہوا ہے کہ ایک انسان موجودہ صورتِ حال میں روٹی کو دریافت کرے اور اس کو اپنی غذا بنائے۔ یہی معاملہ دوسری تمام چیزوں کا ہے۔ مثلاً کپڑا اور مکان اور سواری اور مشین اور صنعت، وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ جو چیزیں انسان کو ملی ہوئی ہیں، اُن کا ایک حصہ وہ ہے جو براہِ راست عطیہ کی حیثیت رکھتا ہے، اور دوسرا حصہ وہ ہے جس کی حیثیت بالواسطہ عطیہ کی ہے۔ براہِ راست عطیہ آئس برگ کے ٹپ (tip) کے مانند ہے اور بالواسطہ عطیہ آئس برگ (iceberg) کے مانند۔ بالواسطہ عطیہ بظاہر دکھائی نہیں دیتا، لیکن وہ اپنی مقدار کے اعتبار سے، براہِ راست عطیہ سے بہت زیادہ ہے۔ لوگ صرف ظاہری عطیہ کو جانتے ہیں۔ اِس لیے وہ بہت کم شکر یا اعتراف کر پاتے ہیں۔ اگر وہ بالواسطہ عطیہ کو جان لیں تو ان کا شکر و اعتراف بہت زیادہ بڑھ جائے۔ وہ سارے انسانوں سے اُس سے بھی زیادہ محبت کرنے لگیں جو محبت وہ اپنے ماں باپ سے کرتے ہیں۔

کسی انسان کے لیے سب سے بڑی عبادت شکرِ کثیر اور اعترافِ کثیر ہے۔ لیکن جو انسان مذکورہ حقیقت سے بے خبر ہو، وہ شکرِ کثیر کی عبادت سے بھی محروم رہے گا اور اعترافِ کثیر کی عبادت سے بھی۔

سب سے بڑی محرومی

17 ستمبر 2008 کو جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) کے میر تقی میر ہال میں مسلم مسائل پر ایک سمینار تھا۔ اِس میں مسلمانوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اِن میں باریش مسلمان بھی تھے اور بے ریش مسلمان بھی۔ اِس کا پورا پروگرام انگریزی زبان میں ہوا۔ میں بھی اِس پروگرام میں شریک تھا۔ تمام مقررین نے بلا استثنا، ہندستانی مسلمانوں کو ایک مظلوم کمیونٹی بتایا۔ ایک صاحب نے کہا کہ انڈیا کے مسلمان محاصرہ (siege) کی حالت میں ہیں۔ ہر ایک نے مختلف الفاظ میں، مسلمانوں کی نسبت سے اِسی قسم کی منفی باتیں کیں۔

میں غم کے احساس میں ڈوبا ہوا لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں پہلی بار 1943 میں دہلی آیا تھا۔ اُس وقت میں نے پہلی بار جامعہ ملیہ اسلامیہ کو دیکھا۔ اُس وقت کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین (وفات: 1969) سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ اُس وقت جامعہ ایک معمولی کالج کی طرح تھا۔ نامنظور ادارہ ہونے کی بنا پر اس کی ڈگری کی بھی جاب مارکیٹ میں کوئی ویلو نہیں تھی۔ آج 65 سال بعد یہاں جامعہ ملیہ کے نام سے ایک عالی شان یونی ورسٹی بنی ہوئی ہے۔ پہلے کے مقابلے میں آج جامعہ ملیہ اسلامیہ نے تقریباً سو گنا ترقی کی ہے۔ اس کی یہ تمام ترقیاں آزادی کے بعد نئے انڈیا میں ہوئی ہیں۔

مذکورہ سمینار جامعہ کے ایک شان دار ہال میں ہوا۔ اِس ماحول میں لوگوں کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ جامعہ ملیہ علامتی طور پر یہ بتا رہا ہے کہ اس ملک میں مسلمان مسلسل ترقی کر رہے ہیں، یہ صورتِ حال شکر کا تقاضا کرتی ہے، پھر کیوں ایسا ہوا کہ ایک ترقی یافتہ مسلم ادارے میں بیٹھ کر لوگ اس طرح ناشکری کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ لوگوں کے اندر خدا کا خوف نہیں، ورنہ حدیثِ رسول کے مطابق، اُنھیں ڈرنا چاہیے کہ اگر اُن کے اندر شکرِ انسانی نہ ہو تو وہ شکرِ خداوندی کے جذبے سے محروم ہو جائیں گے۔ اور بلاشبہہ شکر خداوندی کے جذبے سے محرومی سب سے بڑی محرومی ہے۔ اِس حقیقت کو ایک حدیثِ رسول میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **مَن لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ** (مسند احمد، جلد 4، صفحہ 278) یعنی جو آدمی انسان کا شکر گزار نہ ہو، وہ خدا کا بھی شکر گزار نہیں ہو سکتا۔

فخر اور شکر

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے پُر اعتماد لہجے میں کہا کہ — میں پورے فخر اور شکر کے ساتھ کہتا ہوں کہ اللہ تعالی نے مجھے فلاں دینی ماحول میں پیدا کیا، اور اس نے مجھے فلاں ادارے میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا موقع عطا فرمایا، وغیرہ۔

یہ کسی ایک شخص کی بات نہیں۔ اِس قسم کی بات بہت سے لوگ اپنے اپنے انداز میں کہتے ہیں۔ یہ الفاظ بظاہر خوب صورت معلوم ہوتے ہیں، لیکن وہ انتہائی بے معنیٰ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فخر اور شکر دونوں دو مختلف جذبات ہیں۔ جہاں فخر ہوگا، وہاں شکر نہیں ہوگا اور جہاں شکر ہوگا، وہاں فخر نہیں ہوگا۔ جو لوگ ایسے الفاظ بولیں، ان کے اندر فخر تو ہوسکتا ہے، لیکن حقیقی شکر کا جذبہ ان کے اندر ہرگز موجود نہیں ہوسکتا۔

شکر کیا ہے۔ شکر دراصل، خداوندِ ذوالجلال کی نعمتوں کا اعتراف ہے۔ خداوندِ ذوالجلال کی نعمت کا احساس فوراً ہی آدمی کے اندر اپنی بے مائگی کا احساس پیدا کر دیتا ہے اور اپنی بے مائگی کے احساس کے بعد کوئی شخص کبھی فخر کا تحمل نہیں کرسکتا۔ اِس قسم کے احساس کے بعد آدمی اپنے آپ کو ''بے کچھ'' کے مقام پر پاتا ہے اور خداوند ذوالجلال کو ''سب کچھ'' کے مقام پر۔ جو آدمی اس قسم کی نفسیات کا حامل ہو، اس کے لیے فخر ایک مضحکہ خیز لفظ بن جائے گا۔ ایسا آدمی سب کچھ بھول کر شکرِ خداوندی کے اُس جذبے سے سرشار ہو جائے گا، جس کے اندر ذاتی فخر جیسی چیز کے لیے کوئی جگہ نہ ہو۔ شکر کی توفیق ہمیشہ عجز کامل کی سطح پر ہوتی ہے۔ جس آدمی کے اندر عجز کامل کی اعلیٰ ربانی صفت نہ ہو، وہ شکر کا تجربہ بھی نہیں کرسکتا۔

فخر کے ساتھ شکر کا لفظ بولنا، بتاتا ہے کہ ایسا آدمی، امتحان کی اصطلاح میں، مائنس مارکنگ (minus marking) کا مستحق ہے۔ ایسا کہنے والا شخص اِس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ وہ فخر اور شکر دونوں کی اصل حقیقت سے بے خبر ہے۔ وہ نہ فخر کی نفسیات کو جانتا ہے اور نہ شکر کی نفسیات کو۔ اگر وہ دونوں کی حقیقت سے باخبر ہوتا تو وہ اِس طرح، فخر اور شکر کے متضاد الفاظ کو ایک ساتھ نہ بولتا۔ حقیقت یہ ہے کہ شکر ہمیشہ نفیِ فخر کی زمین پر پیدا ہوتا ہے، نہ کہ اثباتِ فخر کی زمین پر۔

عظمتِ خداوندی کا اعتراف

دورِاول میں خلافتِ اسلامی کوغیر معمولی پھیلاؤ ہوا، اس کے باوجود بنواُمیہ کے عہد تک خلافت کا ایک ہی مرکز (دمشق) تھا۔عباسی انقلاب کے بعد اندلس میں علاحدہ سلطنت قائم ہوئی، اِس طرح حکومتِ اسلامی کے دومرکز ہوگیے۔جلد ہی بعد مراکش میں تیسرا آزاد سیاسی مرکز قائم ہوا، پھر مصر میں خودمختار حکومت قائم ہوگئی۔ اِس طرح ایک کے بعد ایک، آزاد مسلم سلطنتیں قائم ہوتی چلی گئیں۔ایک عظیم مسلم سلطنت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی۔اِنھیں آزاد سلطنتوں میں سے ایک سلطنت وہ تھی جس کو دولتِ سامانیہ کہا جاتا ہے۔سامانی سلطنت، ایران میں ابھری اور تقریباً ڈیڑھ سو سال تک قائم رہ کر ختم ہوگئی۔

سامانی سلطنت کا ایک حاکم نصر بن احمد بن سامان (وفات: 892ء) تھا۔کہا جاتا ہے کہ جب اس نے نیشاپور کو اپنی سلطنت میں شامل کیا تو وہاں اس نے ایک جشن منعقد کیا۔جب وہ اپنے شاہی تخت پر بیٹھا تو اس کی فرمائش کے مطابق، تخت نشینی کی افتتاحی رسم قرآن کی تلاوت سے شروع ہوئی۔مجلس میں ایک عالم موجود تھے۔ انھوں نے قرآن کی تلاوت کی۔انھوں نے سورہ المومن کا ایک حصہ پڑھا، جس میں یہ آیت بھی تھی: **یوم هُم بارزون لا یخفیٰ علی الله منهم شیٔ. لِمَن الملك الیوم، لله الواحد القهار** (40:16)۔یعنی جس دن کہ وہ ظاہر ہوں گے، اللہ سے ان کی کوئی چیز چھپی نہ ہوگی۔آج بادشاہی کس کے لیے ہے، اللہ واحد وقہار کے لیے۔ مذکورہ عالم تلاوت کرتے ہوئے جب اِس آیت پر پہنچے تو سلطان نصر بن احمد پر لرزہ طاری ہوگیا۔ وہ ہیبت زدہ ہوکر تخت سے اُتر پڑا۔تاج کو اپنے سر سے اتارا اور سجدے میں گر گیا۔اس نے کہا: اے میرے رب، بلاشبہہ بادشاہی تیری ہے، نہ کہ میری۔

اعلیٰ دعا اور اعلیٰ ذکرِ خداوندی کا تعلق الفاظ سے نہیں ہے، بلکہ انسان کی اپنی نفسیات سے ہے۔حدیث میں آتا ہے کہ: **مَن تَواضع لله رفعه الله (مشکاة المصابیح، رقم الحدیث: 5119)**۔اِس حدیث کا ایک مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے سامنے جھکا دے، وہی وہ شخص ہے جس کو خدا اِس طرح عزت دیتا ہے کہ اُس کو اسمِ اعظم کے ساتھ ذکر اور دعا کی توفیق ملتی ہے، اور جس شخص کو اسمِ اعظم کے ساتھ ذکر اور دعا کی توفیق ملے، اس کو بلاشبہہ دنیا ہی میں خدا کی جنت حاصل ہوگئی۔

دعا عبادت ہے

دعا کے معنی ہیں پکارنا۔ یہ لفظ جب شرعی اصطلاح کے طور پر بولا جائے تو اُس کا مطلب ہوگا اللہ کو پکارنا، اللہ سے التجا کرنا۔ یہ دعا ایک عظیم عبادت ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ **'الدعاء هو العبادة'** **(الترمذي، ابن ماجه)** یعنی دعا ہی عبادت ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **الدعاء مخ العبادة** (سنن الترمذي) یعنی دعا عبادت کا مغز ہے۔

دعا کا عبادت ہونا بتاتا ہے کہ دعا ایک ذاتی نوعیت کا عمل ہے۔ ہر آدمی کو اپنی دعا آپ کرنا ہے، جس طرح ہر آدمی اپنی عبادت آپ کرتا ہے۔ کوئی شخص ایسا نہیں کرسکتا کہ وہ کسی دوسرے آدمی سے کہے کہ تُم میری طرف سے نماز پڑھ دو، اسی طرح یہ بھی درست نہیں کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے کہے کہ تُم میرے لیے دعا کردو۔

قرآن کی سورہ السجدہ میں اہلِ ایمان کی ایک صفت اِن الفاظ میں بتائی گئی ہے: **يدعون ربهم خوفاً وطمعا** (32:16) یعنی وہ لوگ اپنے رب کو پکارتے ہیں خوف کے ساتھ اور امید کے ساتھ۔ کسی آدمی کا اپنے رب کو خوف اور امید کے ساتھ پکارنا ایک انتہائی قسم کا ذاتی عمل ہے۔ یہ دعا ئیہ واقعہ کسی آدمی کے دل کی انتہائی گہرائیوں کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ اس قسم کی دعا ایک آدمی کو خود کرنا ہے۔ وہ ایسا نہیں کرسکتا کہ کسی دوسرے شخص سے کہے کہ تم میری طرف سے خوف کرلینا یا میری طرف امید کرلینا۔ اس قسم کی دعا کسی انسان کے لیے اس کی عبدیت کا معیار ہے۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھنے کا مدعی ہو اُس کی زندگی میں ایسے لمحات آنے چاہئیں جب کہ اُس کی روح اللہ کی یاد سے تڑپ اٹھے۔ اُس کے دل ودماغ میں اللہ کے تصور سے زلزلہ پیدا ہوجائے۔ اُس کے سینے میں تعلق باللہ کا سیلاب اُمنڈ پڑے اور پھر اس زلزلہ خیز کیفیت کے ساتھ وہ سراپا التجا بن کر اللہ سے دعا کرنے لگے۔

جس آدمی کے اندر یہ کیفیت پیدا نہ ہو، اُس کا ایمان ہی اللہ کے نزدیک غیر معتبر ہوجائے گا۔

چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ: **من لم يسأل الله يغضب عليه (الترمذي، كتاب الدعوات)** یعنی جو شخص اللہ سے سوال نہیں کرتا اللہ اُس پر غضب ناک ہوتا ہے۔

دعا ایک ایسا لطیف عمل ہے جو براہِ راست خدا اور بندے کے درمیان پیش آتا ہے۔ اس عمل کے دوران کوئی تیسرا شخص موجود نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ بہترین دعا وہ ہے جو تنہائیوں میں کسی بندۂ خدا کے سینے سے ابلتی ہے۔ ایک روایت میں جنتی انسان کی ایک صفت یہ بتائی گئی ہے: **ذكر الله خاليا ففاضت عيناه** (**صحيح البخاري، رقم الحديث**: 660) یعنی وہ شخص جس نے اللہ کو تنہائی میں یاد کیا اور پھر اُس کی دونوں آنکھیں بہہ پڑیں۔

ان نصوص کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دعا انتہائی ذاتی نوعیت کا ایک لطیف عمل ہے۔ وہ ہر مدعیٔ ایمان کے لیے اُس کی ربانیت کا اظہار ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ دعا ایسی چیز نہیں کہ آپ کسی مفروضہ بزرگ سے مل کر کہیں کہ آپ میرے لیے دعا کر دیجیے۔ اس قسم کی درخواست بلاشبہہ دعا کی تصغیر ہے۔ یہ گویا اللہ کی طرف دوڑنے کے بجائے انسان کی طرف دوڑنا ہے۔

اسی طرح لاؤڈاسپیکر پر دعا کرنا بھی ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ اس قسم کا مکبّرانہ فعل ایک تقریر ہے نہ کہ دعا۔ حتی کہ یہ بھی حقیقی دعا نہیں کہ آپ کچھ الفاظ کو رٹ لیں اور ہر بار ان رٹے ہوئے الفاظ کو زبان سے دہرادیں۔ دعا، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، قلبی تڑپ کا ایک عمل ہے، وہ رسمی الفاظ کے کسی مجموعے کا نام نہیں۔

صحیح البخاری میں کتاب الایمان کے تحت ایک باب کا ترجمۂ باب ان الفاظ میں قائم کیا گیا ہے: **دعاؤكم إيمانكم** (تمھاری دعا تمھارا ایمان ہے)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسا ایمان ویسی دعا۔ دعا ایمان کو ناپنے کا پیمانہ ہے۔ اگر آدمی کو گہرا ایمان حاصل ہوا ہے تو اس کی دعا بھی دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی ایک ربانی آواز ہوگی۔ وہ جب دعا کرے گا تو اس کا پورا وجود اس کی دعاؤں میں شامل ہوجائے گا۔ دعا اس کے لیے اپنے رب سے ملاقات کا لمحہ بن جائے گی۔ اس کی دعا اپنے رب سے سرگوشی (whisper) کے ہم معنی ہوگی، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: **يناجي ربّه** (**صحيح مسلم، رقم الحديث**: 1258)۔ اس کے برعکس، جس کا ایمان قلب میں اترا ہوا نہ ہو بلکہ صرف لفظی اقرار کے ہم معنی ہو، اس کی دعا بھی صرف لفظی اور رسمی دعا ہوگی۔ وہ کچھ رٹے ہوئے الفاظ کو زبان سے دہرائے گا مگر ان الفاظ کا اس کی قلبی کیفیات سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اس کی دعا صرف تلفظِ لسانی کے ہم معنی ہوگی نہ کہ روحانی کیفیت کے اظہار کے ہم معنی۔

حدیث میں آیا ہے: رُبّ أشعث مدفوع بالأبواب، لو أقسم على الله لأبرّه (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 6848) یعنی بہت سے لوگ ہیں جن کے بال بکھرے ہوئے ہیں، جن کے کپڑے گرد آلود ہیں، جن کے اوپر لوگوں کے دروازے بند ہیں، اگر وہ اللہ پر قسم کھائیں تو اللہ اُن کی قسم کو پورا کرے گا۔

اس حدیث میں اُس انسان کی تصویر بتائی گئی ہے جو اللہ کے کام میں اتنا زیادہ مشغول ہوا کہ اُس کو بال اور کپڑے کا اہتمام کرنے کی بھی فرصت نہ رہی۔ جو لوگ اپنے آپ کو اللہ کے کام میں اس طرح وقف کردیں اُن کا معاملہ اللہ کا معاملہ بن جاتا ہے۔ وہ جب کسی چیز کے لیے دعا کرتے ہیں تو وہ ایک ایسی چیز کو مانگنا ہوتا ہے جس کی قبولیت کا فیصلہ پیشگی طور پر کیا جاچکا ہے۔

یہ دعا کوئی سادہ چیز نہیں ہے، یہ مومن کے لیے ایک عجیب سرمایہ ہے۔ دعا کے سرمایہ ہونے کے بہت سے پہلو ہیں۔ مثلاً کسی شخص کے خلاف آپ سے کوئی ایسی غلطی ہوگئی جس کی تلافی کی کوئی اور صورت نہ ہو تو آپ اُس کے لیے اللہ سے دعا کرتے ہوئے کہیں کہ اے اللہ، تو میری طرف سے اُس کے حق میں دعائے خیر لکھ دے۔ آپ کے اوپر کسی کا احسان ہے اور آپ اُس کے احسان کا بدلہ نہ دے سکتے ہوں تو آپ اُس کے حق میں بہترین دعائیں کریں۔ آپ کسی معذوری کی بنا پر کوئی دینی کام نہ کرسکیں تو آپ اُن لوگوں کے لیے اللہ کی مدد کی دعا کریں جو اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔ آپ کے دل میں کسی کے خلاف شکایت آجائے تو آپ اللہ سے یہ درخواست کریں کہ وہ آپ کے دل سے شکایت کو نکال دے اور اُس کی جگہ خیر خواہی کے جذبات رکھ دے۔

امام ابن تیمیہ کے بارے میں آتا ہے کہ جب قرآن کی کسی آیت کو سمجھنے میں اُنھیں مشکل پیش آتی تو وہ وضو کر کے کسی ویرانے میں چلے جاتے اور دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ سے یہ کہتے کہ اے ابراہیم کو علم دینے والے، مجھے بھی علم دے دے (یا معلم إبراهيم علّمنی)

حقیقت یہ ہے کہ دعا ہر مشکل کے وقت مومن کا سہارا ہے۔ وہ ہر مشکل مسئلے کا حل ہے۔ دعا بلاشبہہ ایک طاقت ہے، سب سے بڑی طاقت۔ دعا اللہ سے ملاقات کا لمحہ ہے۔ مگر یہ لمحہ غافل لوگوں کے حصے میں نہیں آتا۔ یہ قیمتی لمحہ صرف اسی انسان کے لیے مقدر ہے جو اپنے دل کے اندر اعلیٰ ربانی کیفیت کو بیدار کرچکا ہو۔

اسماءِ حسنیٰ اور اسمِ اعظم

اسماءِ حسنیٰ اور اسمِ اعظم

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ: وللّٰہ الأسماء الحُسنیٰ (7: 180) یعنی اللہ ہی کے لیے ہیں اچھے نام (best names) ۔ یہ بات قرآن میں چار مقامات پر کہی گئی ہے (7: 180; 17: 110; 20: 8; 59: 24) یہاں نام سے مراد نام نہیں ہیں، بلکہ صفات (attributes) ہیں، یعنی تمام اچھی صفتیں خدا ہی کے لیے ہیں۔

اسماءِ حسنیٰ کی تعداد کیا ہے، ایک حدیث میں بتایا گیا ہے کہ اسماءِ حسنیٰ کی تعداد ننّانوے ہے۔ بعض علما نے اسماءِ حسنیٰ کی تعداد میں اضافہ کیا ہے، چناں چہ وہ کہتے ہیں کہ اسماءِ حسنیٰ کی تعداد ایک ہزار تک ہے (تفسیر ابن کثیر، جلد 2، صفحہ 269)۔ مگر اِس معاملے میں تعداد کی حیثیت اضافی ہے۔ یہ تعداد دراصل، انسانی فرہنگ یا مجموعۂ الفاظ (vocabulary) کے اعتبار سے ہے۔ انسانی زبان کے الفاظ محدود ہوتے ہیں، لیکن خدا ایک لامحدود ہستی ہے، اِس لیے خدا کی صفات بھی اپنی حقیقت کے اعتبار سے لامحدود ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ کی ننانوے تعداد گویا کہ خدا کی نمائندہ صفات ہیں۔ اس اعتبار سے خدا کی بقیہ صفات بھی براہِ راست یا بالواسطہ طور پر انھیں بنیادی صفات میں شامل ہیں۔

خدا کے ننانوے نام

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ صحیح البخاری کے الفاظ یہ ہیں: **عن أبی هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إنّ لِلّٰهِ تسعة وتسعين اسماً، مأة إلّا واحداً. مَن أحصاها دخل الجنة (صحيح البخاري، رقم الحديث: 2736)** یعنی حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا— اللہ کے ننانوے نام ہیں، سَو میں ایک کم۔ جس شخص نے اُن کا اِحصا کیا، وہ جنت میں داخل ہوگا۔

اِس حدیثِ رسول میں 'اِحصاء' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اِحصا کا مطلب مجرد شمار کرنا نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد اسماءِ حسنیٰ کا عارفانہ ادراک ہے۔ عربی کے مشہور لغت '**المعجم الوسيط**' میں اِس کو

اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **أحصى الشيئ: أي عرف قَدرَہ**۔ ایسی حالت میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہاں 'احصاء' سے مراد اِحصاءِ شعوری ہے، نہ کہ احصاءِ لسانی، یعنی اسماءِ حسنیٰ کی معرفت۔

اللہ کے یہ نام دراصل اللہ کی صفات کے مختلف پہلو ہیں۔ آدمی خدا پر اور اس کی تخلیقات پر غور کرتا ہے تو خدا کی خدائی کے مختلف پہلو اس کے سامنے آتے ہیں۔ اِنھیں پہلوؤں کا شعوری ادراک ہونا، اُن کا احصا کرنا ہے۔ اور جو لوگ اِس اعتبار سے خدا کی معرفت حاصل کریں، وہ بلاشبہہ جنت میں جائیں گے، کیوں کہ جنت دراصل معرفتِ خداوندی کی قیمت ہے۔

حدیث میں ننانوے کا لفظ محض اعتباری ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے بے شمار نام ہیں۔ امام رازی نے اپنی تفسیر میں بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ: **إنّ لِلّٰــه خمسة الاف اسم** ۔ یعنی اللہ کے پانچ ہزار نام ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد 1، صفحہ 19)، مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بے شمار نام ہیں۔

حدیث میں اسماءِ حسنیٰ کی تعداد ننانوے بتائی گئی ہے۔ قرآن کا مطالعہ کرکے علما نے یہ تمام اسماءِ حسنیٰ نام بہ نام دریافت کیے ہیں، لیکن یہ نام خدا کے لامتناہی کمالات کی مطلق گنتی کو نہیں بتاتے۔ یہ تمام نام دراصل انسان کی نسبت سے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ انسان کے اندر جب عبدیت جاگتی ہے اور شعورِ خداوندی اُس کے اندر بیدار ہوتا ہے تو فطری طور پر اُس کے اندر مختلف قسم کی ربّانی کیفیات پیدا ہونے لگتی ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ دراصل، انھیں ربّانی کیفیات کے لیے موزوں الفاظ (appropriate words) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مثلاً انسان اپنے وجود پر غور کرتا ہے، جو کہ احسنِ تقویم کا نمونہ ہے (95:4)۔ وہ نیچر پر غور کرتا ہے، جس میں ہر چیز حیرت انگیز طور پر اپنے آخری ماڈل پر ہے۔ وہ زمین اور آسمان پر غور کرتا ہے، جس میں کہیں کوئی خلل یا نقص موجود نہیں (67:3)۔ یہ سوچ اور یہ مشاہدہ آدمی کے اندر ایک پُرتموّج تجربہ (thrilling experience) پیدا کرتا ہے۔ اُس وقت آدمی بے اختیارانہ طور پر یہ چاہنے لگتا ہے کہ اُس کے پاس ایسے موزوں الفاظ ہوں، جن کے ذریعے وہ اِن لطیف احساسات کا اظہار (express) کر سکے۔ اُس وقت، قرآن اُس کی عین طلب کے مطابق، اُس کو یہ الفاظ فراہم کر دیتا ہے: **فتبارك الله أحسن الخالقين** (23:14)۔

خدا کے نام میں الحاد

خدائی صفات کی یہ تعداد دراصل 'الحاد' کے مقابلے میں بتائی گئی ہے، جیسا کہ خود قرآن میں آیا ہے (7:180)۔الحاد کے معنیٰ انحراف (deviation) کے ہیں۔ یہ الحاد یا انحراف سب سے زیادہ فلسفے میں کیا گیا ہے۔فلسفے میں خدا کا تصور ایک بے صفاتی شخصیت (attributeless being) کے طور پر کیا گیا ہے۔اِسی فلسفیانہ تصور کے زیر اثر، ہندوازم میں 'نرا کار خدا' (formless god) کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ مشہور جرمن فلسفی فریڈرِک ہیگل (Friedrich Hegel) نے اِس کو رُوحِ عالَم (world spirit) کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ایک اور فلسفی نے اس کو 'مجرد تصور' (abstract idea) قرار دیا ہے۔

یہ فلسفیانہ تصور، بعض بڑے مذاہب کی اعتقادیات میں بھی داخل ہوگیا۔اِس تصور کے مطابق، خدا کی کوئی مستقل اور علاحدہ شخصیت نہیں۔ وہ ایک بے شخصیت اور بے صفات ہستی ہے، یعنی زمین کی قوتِ کشش (gravity) یا کاسمک ریز (cosmicrays) کی طرح۔قرآن میں اسماءِ حسنیٰ کا بیان دراصل اِسی فلسفیانہ گُم راہی کی تردید کے طور پر آیا ہے، نہ کہ اسماءِ الٰہی کی متعین تعداد کو بتانے کے لیے۔

فلسفے میں یا اُس سے متاثر مذاہب میں خدا کا تصور خالق کے طور پر نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اِس تصور کے مطابق، تخلیق کے تمام مظاہر خود خدا کا اپنا ظہور ہیں۔ یہ بلا شبہہ ایک مجرد فلسفیانہ قیاس ہے۔ یہ ایک کھُلی ہوئی بات ہے کہ کائنات میں متنوّع مظاہر پائے جاتے ہیں۔ایسی حالت میں یہ صرف ایک بے بنیاد قیاس ہے کہ ایک ایسا مفروضہ خدا، جو ہر قسم کی صفات سے کُلّی طور پر خالی ہو، وہ متنوّع تخلیقات کی صورت میں ظاہر ہو جائے۔ اِس قسم کے تضادات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا کا مذکورہ تصور محض ایک فلسفیانہ قیاس ہے، اُس کے حق میں کوئی علمی بنیاد موجود نہیں۔

سائنسی مطالعہ

موجودہ زمانے میں فطرت کے سائنسی مطالعے کے بعد خدا کے متعلق یہ فلسفیانہ تصور عملاً بے اصل ثابت ہو چکا ہے۔موجودہ زمانے میں سائنسی مطالعے سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ کائنات کے اندر کمال درجے میں معنویت (meaning) پائی جاتی ہے۔ اِس قسم کی معنویت اِس کے بغیر ممکن نہیں کہ

اُس کا خالق ایک ذہن (mind) ہو۔ چناں چہ سائنس میں خدا کا نام نہ لیتے ہوئے یہ مان لیا گیا ہے کہ کائنات کو وجود میں لانے والا ایک ذہین نقّاش (intelligent designer) ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ماہ نامہ الرسالہ، ستمبر 2007، سائنس اور الٰہیات)۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں ایک ایسے خدا کا تصور پیدائشی طور پر موجود ہے، جو متنوع صفات کا حامل ہو۔ اِس طرح سائنسی مطالعے میں کائنات اگر چہ آخری طور پر ایک ہی یونٹ (atom) کا مختلف ظہور ہے، لیکن یہ ایٹم حیرت انگیز طور پر مختلف اور متضاد قسم کی بامعنٰی چیزوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ انسانی فطرت اور خارجی کائنات، دونوں اِس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ کائنات میں ایک طرف بہت زیادہ اختلاف اور تنوع ہے اور دوسری طرف کائنات کے مختلف اجزا میں غیر معمولی ہم آہنگی (harmony) پائی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں انسان کا ذہن یہ چاہتا ہے کہ وہ خدا کی متنوع حیثیتوں کا تصور کر سکے۔ قرآن میں مذکور اسماءِ حسنٰی اِسی سوال کا جواب ہیں۔

خدا کا فزیکل ماڈل

خدا کا عقیدہ انسان کے اندر ہمیشہ سے پایا گیا ہے۔ اینتھراپالوجی (anthropology) کے تحت جو مطالعہ کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسانی سماج کسی نہ کسی اعتبار سے خدا کو مانتا رہا ہے۔ خدا کا عقیدہ فلسفیوں کے یہاں بھی پایا گیا ہے اور اہلِ مذاہب کے یہاں بھی۔ لیکن فلسفہ اور مذہب دونوں میں خدا کا عقیدہ ایک بے صفات خدا (attributeless God) کی حیثیت سے پایا جاتا رہا ہے، یعنی کاسمک ریز (cosmic rays) یا زمین کی قوتِ کشش (gravity) کی مانند۔

لیکن مجرد خدا (abstract God) انسان کی ذہنی گرفت میں نہیں آتا۔ انسان خدا کا ایک ایسا ماڈل بنانا چاہتا ہے، جس میں وہ خدا کو صفات کی اصطلاحوں (in term of attributes) میں قابلِ فہم بنا سکے۔ انسان کی یہی ضرورت ہے جس کے غیر فطری اظہار کے نتیجے میں بت وجود میں آئے۔ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ الفاظ یا ناموں کے ذریعے کسی حقیقت کو اپنے ذہن کی گرفت میں لاتا ہے۔ اس طرح مختلف بُت، انسان کو مختلف الفاظ یا نام دے دیتے ہیں جن کے ذریعے وہ بزعمِ خود ایک ماڈل

کے روپ میں خدا کا ادراک کرتا ہے۔ انسان نے اپنی اِسی فطری ضرورت کو پورا کرنے کے لیے غلط طور پر بت بنائے اور ان کی پرستش شروع کر دی۔

لیکن بتوں کی شکل میں خدا کا ماڈل بنانا، ایک بے بنیاد قیاس ہے، کیوں کہ خدا کو بتوں کا روپ دینا ایک لامحدود ہستی کو محدود کا روپ دینا ہے، یہ خدا کا ایک بگڑا ہوا فارم ہے۔ یہ خدا کے نام پر خدا کی نفی کے ہم معنی ہے۔

بت چوں کہ مٹی یا پتھر کے ہوتے ہیں اور انسان خود ان بتوں کو بناتا ہے۔ خدا کو بتوں کی شکل دینے کے باوجود ہر انسان یہ سمجھتا ہے کہ یہ صرف مٹی اور پتھر ہیں، اُن کے اندر کوئی ذاتی طاقت نہیں۔ اس لیے بتوں کی سطح پر خدا پرستی عملاً صرف ایک بے روح رسم بن جاتی ہے۔ انسان کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ بتوں سے قلبی ربط قائم کر سکے۔ اس لیے فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کچھ رسمی اعمال، خدا پرستی کی جگہ لے لیتے ہیں۔ آدمی خدا پرستی کے نام پر کچھ بے روح رسموں، مثلاً پھول چڑھانے یا نذر و نیاز دینے کو خدا پرستی کے لیے کافی سمجھ لیتا ہے۔

مزید یہ کہ آدمی خدا کے نام پر بتوں سے قریب ہوتا ہے، لیکن بتوں کی طرف سے جوابی طور پر اس کو کوئی انسپریشن (inspiration) نہیں ملتا، انسان داخلی طور پر اپنے لیے کوئی روحانی غذا نہیں پاتا، اِس لیے بتوں کا کلچر محض ایک بے روح تعلق بن کر رہ جاتا ہے۔ بتوں سے قربت کے باوجود انسان کو اتنی بھی روحانی کیفیت نہیں ملتی جتنا کہ ایک باپ یا ماں کو اپنے بچے سے مل کر حاصل ہوتی ہے۔

انسان ایک باروح شخصیت ہے۔ اپنی اِس فطرت کے اعتبار سے اس کو ایک باروح خدا درکار ہے۔ پتھر کی مورتی سے اس قسم کا روحانی تعلق قائم ہونا ممکن نہیں۔ روحانی تعلق دوطرفہ تعلق کا نام ہے۔ ہمارے اندر کیفیات ہوں، لیکن دوسری طرف سے اس کا جواب نہ ملے تو اِس قسم کا یک طرفہ تعلق صرف اوپری یا غیر فطری تعلق ہوگا، وہ انسان کی زندگی میں کوئی حقیقی درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔

یہ واقعہ ایک اور شدید تر خرابی پیدا کرتا ہے، وہ یہ کہ بت کلچر آخر میں جھوٹ کلچر یا ظاہر داری کلچر بن کر رہ جاتا ہے۔ بتوں کے اندر خدائی اوصاف ثابت کرنے کے لیے فرضی کہانیاں بنائی جاتی ہیں اور

ان کوخوب شہرت دی جاتی ہے، تاکہ بتوں کا جو فائدہ حقیقی طور پر نہیں ملا، اُن کے بارے میں لوگوں کو یہ فرضی تاثر دیا جائے کہ وہ حاصل ہوئے، یا وہ حاصل ہو سکتے ہیں۔

بت پرستی کا یہی ظاہرہ (phenomenon) قبر پرستی کی دنیا میں بھی نظر آتا ہے۔ قبر پرست لوگ صاحبِ قبر کے نام پر انتہائی بے بنیاد قسم کی فرضی کہانیاں وضع کرتے ہیں۔ وہ جھوٹے خوابوں کا طلسم بناتے ہیں اور پھر ان فرضی کہانیوں اور فرضی خوابوں کو اس طرح پھیلاتے ہیں جیسے کہ وہ سچ مچ واقعہ ہوں۔ اس طرح اَصنام کلچر اور درگاہ کلچر انسان کو دیوالیہ پن کی حد تک اعلیٰ اخلاق سے دور کر دیتا ہے۔

انسان عین اپنی فطری ساخت کے اعتبار سے ایک جذباتی وجود ہے۔ جذبات کا تفرق (diversification) ممکن نہیں۔ انسان فطری طور پر اپنے جذبات کا کوئی ایک مرکز چاہتا ہے۔ جذبات کا کئی مرکز ہونا ایک غیر فطری بات ہے جو عملاً ممکن نہیں۔ بت پرستی اِس معاملے میں بھی انسانی نفسیات سے ٹکرا جاتی ہے۔ فطری طور پر انسان کسی ایک ہی چیز سے جذباتی تعلق قائم کر سکتا ہے۔ بت پرستی کے مذہب میں چوں کہ یہ مراکز متعدد ہو جاتے ہیں، اِس لیے اس کا عملی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حقیقی خدا پرستی سرے سے ختم ہو جاتی ہے۔ خدا پرستی کے نام پر کچھ بے روح مظاہر باقی رہتے ہیں، اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

ایک مثال

کسی ماں کا بچہ اپنی ماں سے دور ہو تو اُس کی ماں ایسا نہیں کرے گی کہ وہ مٹی یا پتھر کے ذریعے اپنے بچے کی مورتی بنائے اور اُس پر صبح وشام پھول چڑھائے، یا وہ اپنے بچے کے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے اُس کی کئی مورتیاں بنائے اور اِن مورتیوں کے آگے وہ مختلف رسمیں ادا کرے۔ اگر کوئی ماں ایسا کرے تو اِس طرح اُس کو اُس کے جذبات کی تسکین نہیں ملے گی۔ اپنے بچے کے ساتھ اس کا کوئی تعلق قائم نہیں ہوگا۔ اگر کوئی ماں ایسا کرے تو اُس کے لیے اپنے بچے سے تعلق محض ایک ظاہرداری کی رسم بن جائے گی۔ اِس طرح کی ظاہردارانہ رسوم کسی بھی درجے میں ماں اور بچے کے درمیان لطیف تعلق کا بدل نہیں بن سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کسی ماں نے ایسا نہیں کیا۔ ماں اپنے دور کے بیٹے سے

ہمیشہ تصوراتی تعلق قائم کرتی ہے، وہ اس کی مورتی بنا کر اس کے ذریعے اپنے بچے سے تعلق قائم کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔

اِس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ خدا کے نام پر خدا کے بُت بنانا کتنا زیادہ بے اصل بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ خدا کے نام پر بتوں کی پوجا کرتے ہیں، یا جو لوگ خدا کے نام پر قبروں اور درگاہوں کے آگے جھکتے ہیں اور پھول اور چادر چڑھاتے ہیں، وہ خدا کے ساتھ حقیقی تعلق سے بالکل محروم ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ کچھ ظاہری رسوم میں جیتے رہتے ہیں، خدا کے ساتھ تعلق کی لطیف حقیقت سے وہ کبھی آشنا نہیں ہوتے۔ خدا اُن کے لیے محض ایک بے روح لفظ ہوتا ہے، اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

اسماءِ حسنیٰ: خدا کا تصوراتی ماڈل

اسماءِ حسنیٰ کا معاملہ اِس سے بالکل مختلف ہے۔ اسماءِ حسنی کے ذریعے آدمی اِس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں خدا کا تصور اپنے ذہن میں لائے، وہ حقیقی طور پر خدا سے مربوط ہوسکے۔

بت پرستی کے مذہب میں انسان، خدا کے فزیکل ماڈل (physical model) بناتا ہے۔ اِس قسم کے ماڈل بنانا ایک سنگین انحراف ہے، وہ خدا پرستانہ کلچر کو ایک بے روح رسم بنا کر رکھ دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اَصنام کلچر یا درگاہ کلچر خدا کی خدائی کا کم تر اندازہ (underestimation) ہے۔ بت پرستی کے کلچر میں یا قبر پرستی کے کلچر میں اعلیٰ خدائی اخلاقیات کبھی پرورش نہیں پاسکتے۔

اسماءِ حسنیٰ گویا کہ اِسی غلطی کی تصحیح ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ کے ذریعے انسان کو خدا کا تصوراتی ماڈل (conceptual model) مل جاتا ہے۔ اور بلاشبہہ خدا کا تصوراتی ماڈل ہی صحیح ماڈل ہے۔ اسماءِ حسنیٰ کی شکل میں آدمی اُن صحیح الفاظ کو پالیتا ہے جن کے ذریعے وہ خدا سے تصوراتی ربط قائم کرسکے۔ اسماءِ حسنیٰ کے ذریعے خدا سے جو تعلق قائم ہوتا ہے، وہ ایک زندہ اور معلوم تعلق ہوتا ہے۔

مثلاً انسان فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ خدا ایک ہو اور وہ زندہ اور قائم خدا ہو۔ اب جب وہ کہتا ہے کہ: اللّٰہ لا إلٰہ إلاّ ھو الحیُّ القیّوم (2 :3) تو وہ عین اپنی فطری مانگ کے مطابق، فوراً خدا کا ایک حقیقی ماڈل پالیتا ہے۔ اِس کے بعد فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ انسان اور خدا کے درمیان

ایک زندہ تعلق قائم ہوجاتا ہے۔ اِس اعتبار سے اسماءِ حسنیٰ، خدا اور انسان کے درمیان تصوراتی ربط (contact at conceptual level) کا زندہ اور حقیقی ذریعہ ہیں۔ وہ انسان کی فطری تلاش کا ایک بھرپور جواب (complete response) ہیں۔

اسماءِ حسنیٰ، انسان کے لیے خدا کا مستند تعارف ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ کے ذریعے انسان، خدا کی صفاتی شخصیت کا یقینی تصور اپنے ذہن میں لاسکتا ہے۔ اسماءِ حسنیٰ خدا کا وہ تصوراتی ماڈل ہیں جو کسی انسانی قیاس پر قائم نہیں ہیں، بلکہ وہ خود خدا کے الہامی علم پر قائم ہیں۔ وہ اعتقادی بے یقینی میں بھٹکے ہوئے انسان کو یقین کا سرچشمہ عطا کرتا ہے۔ اسماءِ حسنیٰ کے ذریعے انسان اُس صحیح فریم ورک کو پالیتا ہے جس کی روشنی میں وہ خدا کو اپنے لیے پوری طرح قابلِ فہم (understandable) بنا سکے۔

اسماءِ حسنیٰ اور دیگر مذاہب

اسماءِ حسنیٰ کا مطالعہ تاریخی نقطۂ نظر سے کیا جائے تو ایک انوکھی چیز دریافت ہوگی، وہ یہ کہ اسماءِ حسنیٰ کا تصور (concept) اسلام کے سوا کسی اور موجودہ مذہب یا کسی اور موجودہ اعتقادی نظام میں نہیں پایا جاتا۔ یہ اسلام کی استثنائی صفت ہے کہ اُس کے اندر خدا کے بارے میں اسماءِ حسنیٰ کا تصور پایا جاتا ہے۔ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اگر آپ اسلام اور دوسرے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ بے حد سنگین بات ہے۔ چناں چہ اِسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اسلام کے سوا، دوسرے مذاہب میں انسان اور خدا کے درمیان گہرا تعلق سرے سے نہیں پایا جاتا۔ ہر دوسرے مذہب میں خدا کی حیثیت صرف ایک علامتی ہستی (symbolic god) کی ہے، نہ کہ ایک حقیقی اور زندہ خدا کی۔

مثال کے طور پر یہودی مذہب کو لیجیے۔ یہودی اعتقادیات کا ماخذ بائبل (عہد نامہ قدیم) ہے۔ آپ اِس کتاب کا مطالعہ کریں تو اُس میں اسماءِ حسنیٰ کی نوعیت کا خداوندی تعارف موجود نہیں۔ ایک جگہ خدا کو بتاتے ہوئے، اُس کے بارے میں **''میں جو ہوں، سو میں ہوں''** کے الفاظ آئے ہیں۔ اِس سلسلے میں بائبل کے اصل الفاظ اس طرح ہیں:

تب موسیٰ نے خدا سے کہا: جب میں بنی اسرائیل کے پاس جا کر اُن کو کہوں کہ تمھارے باپ دادا

کے خدا نے مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے اور وہ مجھے کہیں کہ اُس کا نام کیا ہے، تو میں اُن کو کیا بتاؤں۔ خدا نے موسیٰ سے کہا: میں جو ہوں، سو میں ہوں۔ سوتو، بنی اسرائیل سے یوں کہنا کہ **میں جو ہوں** نے مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے (خروج 14 ,13 :3)

اِسی طرح مسیحیت کا مذہبی ماخذ وہ کتاب ہے جس کو نیا عہد نامہ (بائبل) کہا جاتا ہے۔ اِس نیے عہد نامے میں بتایا گیا ہے کہ حضرت مسیح جب صلیب پر چڑھائے گیے تو اُن کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: اِلوہی، اِلوہی، لما شبقتنی، یعنی اے میرے خدا، اے میرے خدا، تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا:

My God, my God, why have You forsaken me. (Mark, 15:34)

مسیحی چرچ کے عقیدے کے مطابق، حضرت مسیح کا سُولی پر چڑھ کر مصلوب ہونا کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا، وہ مسیحی چرچ کے عقیدے کے مطابق، ایک خدائی منصوبے کے تحت پیش آیا۔ کفّارۂ مسیح کے عقیدہ (atonement) کے مطابق، خدا نے حضرت مسیح کو اِسی خاص مقصد کے لیے دنیا میں بھیجا تھا کہ وہ انسانی گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے سُولی پر چڑھ جائیں، اور انھوں نے بخوشی ایسا کیا۔

مسیحی چرچ کے مبیّنہ عقیدے کے مطابق، خدا، تثلیث کا ایک حصہ ہے۔ مسیحی عقیدے کو ٹری نٹی (trinity) کے لفظ میں بیان کیا جاتا ہے، یعنی تین میں ایک اور ایک میں تین۔ اِس عقیدے کے مطابق، حضرت مسیح عام انسان نہیں تھے، بلکہ وہ خدا کا ایک حصہ تھے۔

ایسی حالت میں حضرت مسیح کا مذکورہ واقعہ، انسان کے لیے خدا کے معاملے میں یقین کا سرچشمہ نہیں بن سکتا۔ اِس واقعے میں خدا خود بے بس ہو کر فریاد کر رہا ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو ایک متروک وجود سمجھتا ہے۔ اُس کے اندر یہ طاقت نہیں کہ وہ اپنے آپ کو وقت کے حکم رانوں سے محفوظ رکھ سکے۔ ایسا خدا، دوسرے انسانوں کے لیے کس طرح اعتماد کا سرچشمہ بن سکتا ہے۔ انسان کو ایک ایسا خدا چاہیے جو اُس کے لیے اعتماد کا ذریعہ بن سکے، مگر مسیحیت، انسان کو ایک ایسے خدا کا تصور دیتی ہے جس میں خدا خود ہی بے بس دکھائی دے رہا ہے۔

اِس کے بعد اُن مذاہب کو لیجیے جن کو آرین مذاہب کہا جاتا ہے، یعنی ہندوازم، وغیرہ۔ اِن

مذاہب میں پرسنل گاڈ (personal God) کا تصور موجود نہیں۔ اِن مذاہب میں اگر چہ خدا کا لفظ استعمال ہوتا ہے، مگر وہ صرف ایک علامتی لفظ ہوتا ہے، کیوں کہ اِن مذاہب میں عقیدۂ خدا کے تشخّص کے لیے کسی مستقل وجود کا کوئی تصور نہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، آرین مذاہب میں خدا کو نِراکار (formless God) مانا جاتا ہے۔ اُن کے عقیدے کے مطابق، خدا 'نِرگُن' ہے، یعنی اُس کی کوئی صفت نہیں۔ ایسی حالت میں انسان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ خدا کو ایک متعین ہستی کے طور پر اپنے ذہن میں لائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مذہب میں خدا کی کوئی عبادت گاہ نہیں ہوتی۔ اُن کے یہاں یا بُتوں کی پرستش ہوتی ہے یا گُرووں کی۔ کیوں کہ بت یا گُرو کا تشخص اُن کو ممکن دکھائی دیتا ہے، لیکن خدا کا تشخص اُن کے لیے قابلِ تصور نہیں ہوتا۔

عقیدۂ خدا اور اسماءِ حسنیٰ

خدا کا عقیدہ انسان کے لاشعور میں پیوست ہے۔ انسان اپنے فطری تقاضے کے تحت، اِس لاشعور کو شعور میں لانا چاہتا ہے۔ اسماءِ حسنیٰ کا تصور انسان کی اِسی فطری ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اسماءِ حسنیٰ کی حیثیت ایک فکری ماڈل کی ہے۔ یہ انسان کے اپنے فریم ورک کے مطابق، خدا کی ہستی کو اُس کے لیے قابل فہم بناتا ہے۔

مختلف مذاہب میں خدا کی ہستی کے مختلف ماڈل بتائے گیے ہیں۔ اِن میں سے دو ماڈل زیادہ معروف ہیں— آکار ماڈل اور نِراکار ماڈل، مگر یہ دونوں انسانی فریم ورک کے اعتبار سے انسان کے لیے قابلِ فہم ماڈل نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں ماڈل صرف کاغذ میں یا لفظوں میں پائے جاتے ہیں، وہ حقیقی معنوں میں انسانی شعور کا حصہ نہ بن سکے۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ دونوں ماڈل انسان کی نسبت سے ناقص ماڈل ہیں۔ آکار ماڈل، دوسرے لفظوں میں بُت کا ماڈل، ایک ایسے خدا کا تصور دیتا ہے جس کا بظاہر ایک فارم تو ہے، مگر وہ مکمل طور پر بے صفاتی (powerless) ہے۔ دوسری طرف، نراکار ماڈل بظاہر ایک طاقت ہے، مگر یہ طاقت، کششِ ارض (gravity) کی طرح بے صفاتی (attributeless) ہے۔ اِس طرح یہ دونوں ہی

ماڈل، انسان کے معلوم فریم ورک کی نسبت سے مبہم ماڈل ہیں، وہ انسانی فطرت کا جواب فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ دراصل اِسی خلا کو پُر کرتے ہیں۔

اسماءِ حسنیٰ: تلاشِ فطرت کا جواب

اسماءِ حسنیٰ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے یہ تمام نام انسان کی نسبت سے خدا کا تعارف ہیں۔ انسان فطری طور پر اپنے سے ایک برتر ہستی کو چاہتا ہے۔ نفسیاتی مطالعے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ انسان پیدائشی طور پر ایک متلاشی حیوان (seeking animal) ہے۔ انسان اپنے پورے وجود کے اعتبار سے ایک ذاتِ اعلیٰ کا متلاشی ہے، ایک ایسی اعلیٰ اور برتر ذات جو اُس کی کمیوں کی تلافی کرے، جو اُس کے جذبات اور احساسات کا مرکز ومحور بن سکے۔

اسماءِ حسنیٰ دراصل اِسی سوال کا جواب ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ کا مطلب ہے، صفاتِ حسنیٰ۔ خدا کی یہ صفات جو اسماءِ حسنیٰ کے ذریعے بتائی گئی ہیں، وہ علی الاطلاق حیثیت سے خدائے برتر کا تعارف نہیں ہیں، بلکہ وہ انسان کی نسبت سے اُس کے مطلوب خدا کا تعارف ہیں۔ چناں چہ جب کوئی انسان اِن اسماءِ حسنیٰ کو اُن کی پوری معنویت کے ساتھ جان لیتا ہے تو اچانک اُس کو دریافت ہوتا ہے کہ وہ جس خدائے برتر کی تلاش میں تھا، اُس کا تعارف اُس کو اسماءِ حسنیٰ کی صورت میں مل گیا۔

مثال کے طور پر اسماءِ حسنیٰ میں سے ایک نام 'الغنیّ' ہے۔ غنی کے لفظی معنیٰ بے نیاز کے ہیں، یعنی وہ ہستی جس کو دوسروں سے کچھ لینے کی ضرورت نہ ہو، لیکن اس کو یہ طاقت ہو کہ وہ دوسروں کی تمام حاجتوں کو پورا کر سکے۔ یہ احساس ہر انسان کے اندر، شعوری یا غیر شعوری طور پر، چھپا ہوا ہے۔ اِس کے بعد جب انسان اسماءِ حسنیٰ کے ذریعے یہ جانتا ہے کہ خدا کی ایک صفت اُس کا غنی ہونا ہے، تو فوراً ہی وہ جان لیتا ہے کہ وہ جس خدا کی تلاش میں تھا، اُس کو اُس نے یہاں دریافت کرلیا۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن کی اِس آیت میں بتائی گئی ہے: **یٰایّھا النّاس أنتم الفقراء إلی الله، والله ھو الغنیُّ الحمید۔** یعنی اے لوگو، تم اللہ کے محتاج ہو، اور اللہ تو بے نیاز ہے، تعریف والا ہے (35:15)۔

اِسی طرح ایک اور جذبہ، جو سارے انسانوں کے اندر شعوری یا غیر شعوری طور پر پایا جاتا ہے،

وہ یہ کہ ہر انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی مخلوق ہے جو رزق کی محتاج ہے۔ رزق سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں، جن پر انسانی زندگی کا انحصار ہے۔ انسان ہر لمحہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بہت سی چیزوں کا ضرورت مند ہے — پانی غذا، ہوا، آکسیجن اور روشنی، وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں نہایت متناسب انداز میں اورنہایت وافر طور پر دنیا میں موجود ہیں۔

انسان فطری طور پر یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کون ہے جو اِن تمام ضروری چیزوں کو اُس کے لیے مہیّا کرر ہا ہے، بغیر اِس کے کہ وہ انسان سے اُس کی کوئی قیمت طلب کرر ہا ہو۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ اپنے اِس محسنِ اعلیٰ کے احسانات کا اعتراف کرے، وہ کامل اعتراف اور شکر کے جذبے سے اپنے آپ کو اُس کے آگے بچھا دے۔ یہاں اسماءِ حسنیٰ میں اُس کو رہ نمائی ملتی ہے۔

خدا کے اِن ناموں میں سے ایک نام 'الــرّزّاق' ہے۔ انسان جب خدا کو رزّاق کی حیثیت سے دریافت کرتا ہے تو اچانک اُس کو محسوس ہوتا ہے کہ اُس نے اپنی طلب کا جواب پالیا۔ یہی وہ حقیقت ہے، جس کو قرآن کی اِس آیت میں بیان کیا گیا ہے: **إنّ اللهَ هو الرّزّاق ذو القوّةِ المتين**۔ یعنی بے شک، اللہ ہی رزق دینے والا، زور آور، زبردست ہے (51:58)۔

اِسی طرح ہر انسان کی ایک اور ضرورت ہے۔ موجودہ دنیا جس میں انسان کو زندگی گزارنا ہے، وہ اِس انداز سے بنی ہے کہ کوئی انسان اُس کے اندر معیاری انداز میں نہیں رہ سکتا۔ اِسی طرح انسان کے اندر بہت سی خواہشیں اور تمنائیں ہیں۔ اِن خواہشوں اور تمناؤں کے زیر اثر ہر آدمی بار بار غلطیاں کر بیٹھتا ہے۔ اِن حالات میں ہر انسان یہ سوچتا ہے کہ کیسے وہ اپنی غلطیوں کے احساس سے اپنے آپ کو بچائے۔ کس طرح ایسا ہو کہ وہ اپنے آپ کو ایک پاکیزہ روح کا درجہ دے سکے۔ یہاں اسماءِ حسنیٰ میں وہ اپنے لیے تسکین کا سامان پالیتا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، خدا کا ایک نام 'الــغــفــور' ہے۔ غفور کے تصور میں انسان پوری طرح اپنے لیے ذہنی تسکین کا سامان پالیتا ہے۔ قرآن کی یہ آیت اِس معاملے میں انسان کی رہ نما ہے: **قُل يا عِبادِيَ الّذين أسرفوا علىٰ أنفسهم لا تقنطوا من رّحمة الله، إن الله يغفر الذّنوب جميعاً، إنّه هو الغفور الرّحيم**

(39:53)۔یعنی کہو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بے شک، اللہ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ وہ بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔

پوائنٹ آف ریفرنس

قرآن میں خدا کے جو اسماءِ حسنٰی بتائے گیے ہیں، اُن میں سے ہر نام ہم کو غور وفکر کے لیے ایک پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) دیتا ہے۔ اِن ناموں کے ذریعے ہم کو ایک متعین رہ نمائی مل جاتی ہے، جس کو لے کر ہم خدا کی ہستی کا تصور کر سکیں اور اُس کی مختلف صفات (attributes) کا تصور کرتے ہوئے خدا کی ہستی سے متعین نوعیت کا ذہنی رشتہ قائم کر سکیں۔ خدا سے اِسی تعلق کا نام معرفت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا کے لیے تمام اچھے نام ہیں، اُس کے بعد فوراً یہ ارشاد ہوا ہے — پس تم اِنھیں اچھے ناموں سے خدا کو پکارو، اور اُن لوگوں کو چھوڑ دو، جو خدا کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں (7: 180)، یعنی اُنھیں ناموں کے ذریعے خدائے کامل الصفات کا تصور قائم کرو، نہ کہ اُن ناموں کے ذریعے جو دوسروں نے خود ساختہ طور پر بنا لیے ہیں۔

خدا کیا ہے۔ خدا ایک اعتبار سے ہمارے عجز (helplessness) کی تلافی ہے۔ انسان اپنی تخلیق کے لحاظ سے عاجزِ مطلق ہے، اور خدا خالق و مالک ہونے کی بنا پر قادرِ مطلق۔ اِس لیے یہ فطری ہے کہ انسان ہر موقعے پر خدا کو پکارے۔ خدا کے اسماءِ حسنٰی اِس کام میں انسان کے لیے مددگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خدا کے یہ تمام نام دراصل انسان کی نسبت سے ہیں۔ انسان اپنی نفسیات کے اعتبار سے جن خدائی حوالوں کا محتاج ہے، وہ تمام خدائی حوالے اِن ناموں کے اندر موجود ہیں۔ آدمی کے اندر جب بھی اپنے عجز، اپنی عبدیت، اور اپنی حیثیتِ انسانی کے اعتبار سے کوئی جذبہ جاگتا ہے تو یہ خدائی نام اُس کو فوراً ایک رہ نما لفظ دے دیتے ہیں۔ اِن رہ نما الفاظ کے ذریعے سے وہ اُسی طرح خدائے رب العالمین سے مربوط ہو جاتا ہے، جس طرح ٹیلی فون پر ایک نمبر ڈائل کر کے وہ اپنی مطلوب شخصیت سے فی الفور ربط قائم کر لیتا ہے۔

چند مثالیں

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان پیدائشی طور پر ایک متلاشی حیوان(truth-seeking animal) ہے۔ اِس چھپی ہوئی فطرت کے زیر اثر آدمی کے اندر یہ جذبہ جاگتا ہے کہ کوئی برتر ہستی ہو جو اُس کو ہدایت کی روشنی عطا فرمائے۔ اُس وقت وہ پکار اٹھتا ہے کہ اے خدائے ہادی، تو مجھ کو اپنی رحمتِ خاص سے ہدایت عطا فرما۔

موجود دنیا میں انسان بار بار ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے، جہاں وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ اُس وقت اُس کی فطرت میں چھپا ہوا جذبہ چاہتا ہے کہ وہ ایک بالاتر ہستی کو پکارے۔ یہاں وہ اسماءِ حسنیٰ میں اِس بالاتر ہستی کا ایک متعلق خدائی نام پالیتا ہے اور اُس کے حوالے سے وہ یہ کہہ اٹھتا ہے کہ اے خدا، تو ہی میرا ناصر ہے، تو ہر اعتبار سے میری مدد فرما۔

انسان مجرد طور پر نہیں سوچ سکتا۔ اپنی ذہنی ساخت کے اعتبار سے انسان کو ہمیشہ الفاظ درکار ہوتے ہیں، جن کے ذریعے وہ کسی تصور کو اپنے ذہن میں لا سکے۔ خدا کے اسماءِ حسنیٰ کی نوعیت یہی ہے۔ یہ اسماءِ حسنیٰ یہ بتانے کے لیے نہیں ہیں کہ مطلق طور پر خدا کے نام کیا کیا ہیں، وہ صرف اُن اسماء کو بتاتے ہیں جو انسان کی نسبت سے ہم کو درکار ہیں۔ گویا کہ یہ اسماءِ حسنیٰ ضرورتِ انسانی کے اعتبار سے بتائے گیے ہیں، نہ کہ خود ذاتِ خداوندی کی حقیقتِ اعلیٰ کے اعتبار سے۔

اسماءِ حسنیٰ سے مراد صفاتِ حسنیٰ ہیں، مگر اسماءِ حسنیٰ خود خدا کی مطلق نسبت سے خدا کا تعارف نہیں ہیں، وہ انسان کی نسبت سے خدا کا تعارف ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ دراصل، ذکر اور دعا کے لیے انسان کو پوائنٹ آف ریفرنس دیتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کو رزق درکار ہے تو وہ خدا سے کہہ سکے کہ — اے رزّاق، تو مجھے رزق دے دے۔ ایک شخص اپنے کو عاجز محسوس کرتا ہے تو وہ کہہ سکے کہ — اے قادرِ حقیقی، تو میرے عجز کی تلافی فرما۔

پُراسرار نہیں

اسماءِ حسنیٰ کے بارے میں عام تصور یہ ہے کہ وہ حروفِ مقطّعات کی مانند کچھ پُراسرار الفاظ

ہیں۔ اِن الفاظ کے اندر کوئی معجزاتی تاثیر چھپی ہوئی ہے، جیسے کہ جادوگروں کے منتر میں ہوتی ہے۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم اُن کو یاد کر کے اُن کا وِرد کرتے رہیں۔ اور پھر پُر اسرار طور پر ہمیں ان کے انوکھے فوائد ملتے رہیں گے۔ اکثر لوگوں کے دماغ میں اِسی قسم کا تصور بسا ہوا ہے۔

مگر اسماءِ حسنٰی کے بارے میں اِس قسم کا تصور سرتاسر بے بنیاد ہے۔ اسماءِ حسنٰی کسی بھی درجے میں پُراسرار الفاظ نہیں، وہ پورے معنوں میں ایک معلوم اور بامعنیٰ حقیقت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اسماءِ حسنٰی کا معاملہ بلاشبہہ انسان کے لیے ایک عظیم رحمت کا معاملہ ہے۔ مگر یہ رحمت کوئی پُراسرار رحمت نہیں، بلکہ وہ ایک ایسی رحمت ہے جو پوری طرح ہمارے معلوم دائرے کی چیز ہے اور علمی طور پر اس کی تشریح کی جاسکتی ہے۔

اسماءِ حسنٰی دراصل، خدا کی رحمتوں کے معلوم دروازے ہیں۔ قرآن میں ان دروازوں کو اس لیے کھولا گیا ہے کہ آدمی ان کی دریافت کرے اور ان کے راستے سے گزر کر وہ خدا کی رحمتوں کی دنیا میں پہنچ جائے۔ اسماءِ حسنی گویا کہ رحمتِ خداوندی کے ابوابِ حسنٰی ہیں۔ اسماءِ حسنٰی ہم کو خدا سے مربوط کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اسماءِ حسنٰی خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی وہ کلیدِ معرفت ہے جو ہمارے دل و دماغ کو بیدار کرتی ہے اور ہم کو تاریکی سے روشنی کی طرف لے جانے کا ذریعہ ہے۔

اسماءِ حسنٰی اور انسان

اگر ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں کمیونکیشن کی تاریخ بتائی گئی ہو۔ اِس کتاب میں نامہ برکبوتر، ٹیلی گراف، ٹیلی فون اور موبائل جیسے نام ہوں۔ اس کتاب کو ایک شخص پڑھے، خواہ وہ کتاب کی زبان سے بخوبی واقف ہو، لیکن اگر نامہ بر کبوتر، ٹیلی گراف، ٹیلی فون اور موبائل جیسی چیزوں کو اُس نے دیکھا نہ ہو تو وہ اِن چیزوں کی حقیقت کے بارے میں کچھ نہ جان سکے گا۔ اِس قسم کی کوئی کتاب ایک واقف کار انسان کے لیے ایک معلوماتی کتاب ہے، لیکن ایک ناواقف انسان کے لیے وہ صرف ایک معمّا بن کر رہ جائے گی۔

ایسا ہی کچھ معاملہ اسماءِ حسنٰی کا ہے۔ خدا کے اسماءِ حسنٰی، قرآن اور حدیث میں نام بہ نام بتادیے گیے ہیں، لیکن اِن ناموں کو قرآن اور حدیث میں پڑھ لینا کافی نہیں۔ قرآن اور حدیث میں بیان

ہونے کے باوجود یہ تمام نام کسی انسان کے لیے ایک نامعلوم چیز کی دریافت (discovery) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کوئی آدمی اِن ناموں کی حقیقت کو صرف اُس وقت جان سکتا ہے، جب کہ اِس سے پہلے وہ ذاتی دریافت کی سطح پر اُن کا علم حاصل کر چکا ہو۔ ذاتی دریافت کے بغیر یہ نام کسی آدمی کے لیے صرف رسمی نام ہوں گے، نہ کہ معرفتِ خداوندی کا خزانہ۔

اسمِ اعظم

اسماءِ حسنیٰ کے ذیل میں ایک بحث یہ ہے کہ کیا خدا کا کوئی اسمِ اعظم ہے، اور اگر ہے تو وہ کیا ہے۔ اسمِ اعظم کے متعلق مختلف روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ اس سلسلے میں مسند امام احمد ابن حنبل کی دو روایتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں:

1- عن أنس بن مالك أنّ النبی صلی الله علیه وسلم سمع رجلاً یقول: اللهم إنی أسئلك أنّ لك الحمد، لاإلٰه إلا أنتَ وحدك، لا شريك لك، المنّان، بديع السّموات والأرض، ذاالجلال والإكرام. فقال النبی صلی الله علیه وسلم: لقد سألتَ الله بإسم الله الأعظم، الذی إذا دُعی به أجاب، وإذا سُئل به أعطیٰ (جلد3، صفحہ 120)۔

2- عن عبد الله بن بُريدة عن أبيه قال: سمع النبی صلی الله علیه وسلم رجلاً یقول اللهم إنّی أسئلك بأنّی أشهد أنك أنت الله، الذی لا إلٰه إلا أنت، الأحد الصمد، الذی لم يلد و لم يُولد، ولم يكن له كفواً أحد، فقال: قد سألتَ الله بإسم الله الأعظم، الذی إذا سُئل به أعطیٰ، وإذا دُعی به أجابَ (جلد5، صفحہ 350)۔

ترجمہ: انس بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ: اے اللہ، میں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ تیرے ہی لیے حمد ہے۔ تو ہی الٰہ ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔ تو بڑا احسان کرنے والا ہے۔ زمین اور آسمان کو کسی نمونے کے بغیر پیدا کرنے والا ہے۔ تو عزت اور کبریائی والا ہے۔ یہ سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو نے اللہ کو اُس کے اُس اسمِ اعظم کے ساتھ پکارا، جس کے ساتھ اُس کو پکارا جائے تو وہ ضرور پکار کا جواب دیتا ہے، اور جب

اُس کے ساتھ سوال کیا جائے تو وہ عطا کرتا ہے۔

عبداللہ بن بُریدہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ: اے اللہ، میں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو ہی اللہ ہے، تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ تو اکیلا ہے، تو بے نیاز ہے۔ تو نے نہ کسی کو جَنا اور نہ تجھے کسی نے جنا۔ اور تیرے برابر کوئی نہیں۔ یہ سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو نے اللہ سے اُس کے اُس اسمِ اعظم کے ساتھ سوال کیا ہے، جس کے ساتھ اُس سے مانگا جائے تو وہ ضرور عطا کرتا ہے۔ اور جب اُس کے ساتھ دعا کی جائے تو وہ ضرور اُس کو قبول کرتا ہے۔

دونوں روایتوں میں اللہ کے ساتھ اُس کے اور کئی صفاتی نام آئے ہیں۔ اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسمِ اعظم سے مراد کوئی ایک نام نہیں ہوسکتا۔ اگر اسمِ اعظم کوئی ایک نام ہوتا تو صحابی کی مذکورہ دعا میں بھی صرف وہی ایک نام ہوتا، جب کہ اِس دعا میں واضح طور پر خدا کے کئی نام ہیں۔ اِس واضح اشارے کے باوجود اسمِ اعظم کو خدا کا کوئی ایک نام سمجھنا اور اُسی ایک نام کی تلاش میں لگے رہنا، بلاشبہہ ایک غلطی ہوگی۔ اسمِ اعظم کسی لفظِ اعظم کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ معنیٔ اعظم کا نام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسمِ اعظم سے مراد خدا کا کوئی ایک نام نہیں ہے، بلکہ وہ خصوصی کیفیت کے ساتھ خدا کو پکارنے کا نام ہے۔ اسمِ اعظم سے مراد، اسمِ اعظم نہیں ہے بلکہ کیفیتِ اعظم ہے۔ مذکورہ دعا میں صحابی نے کسی رٹے ہوئے دعائیہ لفظ کو استعمال نہیں کیا، بلکہ جذبات کے وفور میں ان کی زبان سے کچھ خاص الفاظ نکل گیے، اِسی کا نام اسمِ اعظم کے ساتھ خدا کو پکارنا ہے۔ اسمِ اعظم کا تعلق دراصل ربانی کیفیت سے ہے۔ کیفیت سے بھرے ہوئے الفاظ میں خدا کو پکارنے کا نام اسمِ اعظم ہے۔

ایک وضاحت

مذکورہ حدیث میں ایک صحابی کی دعا کا ذکر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ دعا کے متعلق فرمایا کہ یہ دعا اسمِ اعظم کی دعا تھی۔ چوں کہ یہ دعا صحابی نے عربی زبان میں کی تھی، اِس لیے لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اسمِ اعظم والی دعا وہی ہے جو عربی زبان میں کی گئی ہو،

غیرعربی زبان کی دعا اسمِ اعظم کی دعا نہیں۔

مگر یہ سوچ درست نہیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، صحابی نے جو دعا کی، وہ ان کی اپنی مادری زبان میں تھی، نہ کہ سادہ طور پر عربی زبان میں۔ دعا کو عربی زبان کے ساتھ مخصوص کرنا، ایک غیرفطری نظریہ ہے۔ دعا دل کے جذبات کا نام ہے، نہ کہ کسی زبان کے الفاظ کا نام۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ہر پیغمبر اپنی قوم کی زبان میں بھیجا گیا (14: 1)، یہی معاملہ دعا کا بھی ہے۔ جس طرح دعوت مخاطب قوم کی زبان میں ہوتی ہے، اِسی طرح دعا، دعا کرنے والے کی اپنی مادری زبان میں ہوتی ہے۔

ایسا ماننا بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ اگر دعا کو عربی زبان کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے، یا عربی زبان کی دعا کو افضل دعا بتایا جائے تو یہ دعا کی اصل روح کو ختم کرنے کے ہم معنیٰ ہوگا۔ دعا کسی قسم کی تکرارِ الفاظ کا نام نہیں، دعا تڑپتے ہوئے دل کی پکار کا نام ہے، اور ایسی دعا ہمیشہ آدمی کی اپنی مادری زبان ہی میں ظہور میں آتی ہے۔

دعا کیا ہے

دعا کسی ٹکنکل واقعے کا نام نہیں، دعا ایک داخلی طوفان کا خارجی اظہار ہے۔ جب ایک انسان خدا کو اُس کی عظمت و کبریائی کے ساتھ دریافت کرتا ہے، جب ایسا ہوتا ہے کہ خدا کے بارے میں سوچتے ہوئے اُس کو خدا کی موجودگی کا اتنا شدید احساس ہوتا ہے کہ گویا وہ خدا کے پڑوس میں پہنچ گیا ہے۔ جب اُس پر وہ طوفانی تجربہ گزرتا ہے، جس کو حدیث میں: **ذَکَر اللہ خالیاً، ففاضت عیناہ (البخاری، کتاب الرّقاق)** کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی آدمی نے اپنی تنہائی میں خدا کو یاد کیا اور شدتِ تاثر سے اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے۔ اُس نے دنیائے امتحان کے بارے میں سوچا، اُس نے موت اور روزِ حساب کا گہرا ادراک کیا، وہ اُن ربّانی کیفیات سے گزرا، جب کہ انسان کو جہنم کے شعلے بھڑکتے ہوئے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف اُس کو جنت کے ابدی مناظر دکھائی دینے لگتے ہیں۔ جب اُس پر یادِ خداوندی کا وہ گہرا تجربہ گزرتا ہے، جب کہ سب کچھ اس کی نظروں سے محو ہو جاتا ہے، خدا کے سوا ہر چیز اُس کی نظر میں بے حقیقت بن جاتی ہے۔

ایسے طوفان خیز لمحات میں یہ ہوتا ہے کہ اُس کے دل و دماغ میں ایک بھونچال آجاتا ہے۔ اُس کی آنکھوں سے خوفِ خدا کا سمندر اُمڈ پڑتا ہے۔ جب سوچنے کی صلاحیت بظاہر ختم ہوجاتی ہے اور صرف محسوس کرنے کی صلاحیت باقی رہتی۔ اُس وقت ایسا ہوتا ہے کہ انسان بے تابانہ طور پر اپنے رب کو پکارنے لگتا ہے۔ اُس کے اندر چھپی ہوئی ربّانی فطرت الفاظ کی صورت میں بہہ پڑتی ہے۔ ایسے طوفانی لمحات میں آدمی کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے، اُسی کا نام دعا ہے۔ یہی وہ دعا ہوتی ہے جو اسمِ اعظم کی زبان میں نکلتی ہے اور ایسی دعا ہمیشہ اپنی پہلی زبان میں ہوتی ہے، نہ کہ اپنی دوسری زبان میں۔

ایک واقعہ

میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں دس سال سے ایک سوال کا جواب تلاش کررہا ہوں، لیکن اب تک مجھے اُس کا جواب نہیں ملا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا وہ کیا سوال ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اسمِ اعظم کیا ہے۔ اِس سلسلے میں، میں نے بہت سی کتابیں پڑھیں، بہت سے علما اور بزرگوں سے ملاقاتیں کیں، مگر اب تک کسی نے اِس کا تشفی بخش جواب نہیں دیا۔ اب میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ اگر ممکن ہو تو آپ مجھے اس کا جواب دے کر میری پریشانی کو دور فرمائیں۔

میں نے کہا آپ کی پریشانی ایک خود ساختہ پریشانی ہے۔ آپ نے یہ فرض کرلیا ہے کہ اسمِ اعظم جادو کے منتر کی طرح کوئی منتر ہے۔ اب آپ چاہتے ہیں کہ منتر کا وہ لفظ آپ کو معلوم ہوجائے، مگر ایسا ہونا کبھی ممکن نہیں۔

میں نے کہا کہ اسمِ اعظم کسی لفظ کا نام نہیں ہے، بلکہ کیفیت کا نام ہے۔ کیفیتِ اعظم کے ساتھ جو دعا کی جائے، وہی اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کرنا ہے۔ یہ دراصل آپ کی اپنی قلبی کیفیت ہے جو کسی دعا کو اسمِ اعظم کی دعا بناتی ہے۔ کسی انسانی لفظ میں یہ طاقت نہیں کہ وہ خدا کا اسمِ اعظم بن جائے، وہ خدا کی لامحدود ہستی کا احاطہ کرلے۔

میں نے کہا کہ آپ ہی کی طرح کا ایک شخص تھا۔ اُس کو ایک خزانے کی تلاش تھی۔ اُس کو معلوم ہوا کہ یہ خزانہ فلاں پہاڑ کی چوٹی پر ایک محل کے اندر رکھا ہوا ہے۔ اِس محل کے گیٹ پر ایک تالا لگا ہوا ہے۔

یہ تالا کسی کنجی سے نہیں کھلتا، بلکہ وہ ایک منتر سے کھلتا ہے۔ اب اُس کو اُس منتر کی تلاش ہوئی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ ایک جگہ پہنچا۔ یہاں اُس کی ملاقات ایک سادھو سے ہوئی۔ جو اُس منتر کو جانتا تھا۔

اس نے سادھو سے درخواست کی کہ وہ اُس کو یہ منتر بتا دے۔ سادھو نے اُس کو وہ منتر بتا دیا۔ سادھو نے کہا کہ وہ منتر ''سِم سِم'' ہے۔ تم فلاں پہاڑ کی چوٹی پر جاؤ۔ وہاں تم کو ایک محل ملے گا۔ اِس محل کے گیٹ پر ایک تالا لٹکا ہوگا۔ تم اُس کے سامنے کھڑے ہوکر کہنا: کُھل اے سِم سِم، کھل اے سِم سِم، پھر وہ تالا کھل جائے گا۔ وہ آدمی روانہ ہوا۔ لمبے سفر کے بعد وہ محل کے گیٹ پر پہنچا، مگر اُس وقت وہ منتر کو بھول چکا تھا۔ وہ گیٹ کے سامنے کھڑا ہوکر دوسرے دوسرے الفاظ بولتا رہا۔ مثلاً کُھل اے ٹُم ٹُم، کھل اے دَم دَم، کھل اے بم بم، مگر دروازہ نہیں کھلا۔ اب وہ وہاں سے واپس ہوکر دوبارہ سادھو کے پاس گیا۔ سادھو نے کہا کہ تم غلط منتر بول رہے تھے، اس لیے تالا نہیں کھلا۔ دوبارہ جاؤ اور سم سم کہو۔ آدمی نے منتر کو خوب اچھی طرح یاد کرلیا اور سفر کرکے دوبارہ وہاں پہنچا۔ اُس نے محل کے گیٹ کے سامنے کھڑے ہوکر کہا: کھل اے سِم سِم اور پھر فوراً دروازہ کھل گیا۔

اکثر لوگ اسم اعظم کو اِسی قسم کا ایک طلسماتی لفظ سمجھتے ہیں، مگر اس قسم کی سوچ بالکل غلط ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسمِ اعظم ڈکشنری کے کسی لفظ کا نام نہیں، وہ انسان کی اپنی داخلی کیفیت کا نام ہے۔ جب بھی کوئی سچا بندہ، اعلیٰ قلبی کیفیات کے ساتھ دعا کرتا ہے تو اُس کو فرشتوں کی مدد حاصل ہوجاتی ہے۔ اُس وقت اُس کے اندر سے مخصوص قسم کے ربّانی الفاظ نکلنے لگتے ہیں، اِسی کا نام اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کرنا ہے۔ اِس قسم کی دعا، خدائی الہام کے تحت ہوتی ہے اور جو دعا خدائی الہام کے تحت انسان کے دل سے نکلے، اُس کا معاملہ وہی ہوتا ہے جس کو ایک فارسی شاعر نے اِن الفاظ میں نظم کیا ہے:

اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

مقبول دعا

حقیقی دعا آدمی کی پوری ہستی سے نکلتی ہے، نہ کہ محض زبانی الفاظ سے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا سے مانگنے والا کبھی محروم نہیں ہوتا۔ مگر مانگنا صرف کچھ لفظوں کو دہرانے کا نام نہیں۔ مانگنا وہی مانگنا

ہے جس میں آدمی کی پوری ہستی شامل ہوگئی ہو۔ ایک شخص زبان سے کہہ رہا ہو: خدایا! مجھے اپنا بنالے، مگر عملاً وہ اپنی ذات کا بنا رہے، تو یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے مانگا ہی نہیں، اس کو جو چیز ملی ہوئی ہے، وہی دراصل اس نے خدا سے مانگی تھی، خواہ زبان سے اس نے جو لفظ بھی ادا کیے ہوں۔

ایک بچہ اپنی ماں سے روٹی مانگے تو یہ ممکن نہیں کہ ماں اس کے ہاتھ میں انگارہ رکھ دے۔ خدا اپنے بندوں پر تمام مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ خدا سے خشیت مانگیں اور وہ آپ کو قساوت دے دے، آپ خدا کی یاد مانگیں اور وہ آپ کو خدا فراموشی میں مبتلا کردے، آپ آخرت کی تڑپ مانگیں اور خدا آپ کو دنیا کی محبت میں ڈال دے، آپ کیفیت سے بھری ہوئی دین داری مانگیں اور خدا آپ کو بے روح دین داری میں پڑا رہنے دے۔ آپ حق پرستی مانگیں اور خدا آپ کو گم راہی کے اندھیروں میں بھٹکتا چھوڑ دے۔

آپ کی زندگی میں آپ کی مطلوب چیز کا نہ ہونا، اِس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے ابھی تک اس کو مانگا ہی نہیں۔ اگر آپ کو دودھ خریدنا ہو اور آپ چھلنی لے کر بازار جائیں تو پیسے خرچ کرنے کے بعد بھی آپ خالی ہاتھ واپس آئیں گے۔ اسی طرح اگر آپ زبان سے دعا کے کلمات دہرا رہے ہوں، مگر آپ کی اصل ہستی کسی دوسری چیز کی طرف متوجہ ہو تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ نہ آپ نے مانگا تھا اور نہ آپ کو ملا، جو مانگے وہ کبھی پائے بغیر نہیں رہتا۔ یہ مالک کائنات کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی بندے کو اِس حال میں رہنے دے کہ قیامت میں جب خدا سے اس کا سامنا ہو تو وہ اپنے رب کو حسرت کی نظر سے دیکھے۔ وہ کہے کہ خدایا، میں نے تجھ سے ایک چیز مانگی تھی مگر تو نے مجھے وہ چیز نہ دی۔ بخدا، یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے۔ کائنات کا مالک تو ہر صبح وشام اپنے تمام خزانوں کے ساتھ آپ کے قریب آکر آواز دیتا ہے — ''کون ہے جو مجھ سے مانگے، تاکہ میں اسے دوں'' مگر جنھیں لینا ہے وہ اس سے غافل بنے ہوئے ہوں تو اس میں دینے والے کا کیا قصور۔

دعا کی طاقت

حدیث میں آیا ہے کہ: لا يردّ القضاء إلا الدعاء (التّرمذي، رقم الحديث: 2139)

یعنی قضا اور قدر کے فیصلے کو صرف دعا بدل سکتی ہے۔ خدا نے اِس دنیا کا نظام اسباب وعلل کی بنیاد پر قائم کیا ہے، اور پھر انسان کو مکمل آزادی دے دی ہے۔ اب انسان اپنی آزادی کے مطابق عمل کرتا ہے اور خدا کے قائم کردہ نظام اسباب وعلل سے مطابقت یا مخالفت کی بنیاد پر اس کا اچھا یا بُرا نتیجہ اس کے سامنے آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ نظام بالکل حتمی ہے۔ کوئی آدمی خواہ مخلص ہو یا غیر مخلص، اُس کو بہر حال اِس نظام کو بھگتنا ہے۔ کسی بھی شخص کے لیے اِس نظام کو منسوخ نہیں کیا جاسکتا۔

اِس معاملے میں صرف ایک استثنا ہے اور وہ دعا کا ہے۔ کوئی آدمی جب سچی دعا کرتا ہے اور اُس وقت اگر خدا اس کی دعا قبول کر لیتا ہے تو وہ اسباب کے نظام میں مداخلت کر کے اس کا راستہ ہموار کر دیتا ہے۔ یہی مطلب ہے اس بات کا کہ دعا، قضا اور قدر کو بدل دیتی ہے۔

لیکن دعا الفاظ کی تکرار کا نام نہیں ہے، حتی کہ قرآنی دعائیں یا ماثور دعائیں بھی اگر صرف رَٹے ہوئے الفاظ کی تکرار ہوں تو وہ بھی مؤثر نہیں ہوسکتیں۔ نظامِ قضا کو بدلنے کے لیے وہ دعا درکار ہے جو دل کو پھاڑ کر کی جاتی ہے، جو دل کی پھٹن کی آواز ہوتی ہے، جس میں آدمی کا پورا وجود شامل ہو جاتا ہے، جو انسانی شخصیت میں ایک بھونچال کے بعد ظہور میں آتی ہے۔

اِس قسم کی دعا کی قبولیت کی ایک اور شرط یہ ہے کہ دعا کرنے والے کا ذہنی تزکیہ اتنا زیادہ ہو چکا ہو کہ اس کی سوچ خدا کی سوچ بن جائے۔ ایسا آدمی وہی دعا کرے گا جو خدا کے نزدیک قابلِ قبول ہوتی ہے۔ اس کی زبان سے ایسی دعا نہیں نکلے گی جو خدا کی سنّت کے مطابق، قابلِ قبول ہی نہیں۔

پیغمبر کی دعا کی مثال

خدا کے تمام پیغمبروں نے اسمِ اعظم کے ساتھ دعائیں کی ہیں۔ مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر کے موقع پر میدان جنگ کی طرف نگاہ ڈالی تو آپ کو نظر آیا کہ طاقت ور مشرک فوج کے مقابلے میں، مؤحدین کی ایک کم زور فوج کھڑی ہوئی ہے، جو تعداد میں بھی کم ہے اور سامانِ حرب میں بھی کم۔ اِس نابرابری کو دیکھ کر آپ کے جذبات میں ایک ہیجان پیدا ہوا۔ آپ کمالِ عجز کے ساتھ خدا کے سامنے زمین پر سجدے میں گر پڑے۔ اُس وقت آپ کی زبان سے دعا کرتے ہوئے یہ الفاظ نکلے: **اللھم،**

إن تهلك هٰذه العصابة من أهل الإسلام، لا تعبد في الأرض أبدا (مسند احمد، جلد1، صفحہ30)۔ یعنی اے اللہ، اگر تو اہلِ اسلام کے اِس گروہ کو آج ہلاک کر دے تو اس کے بعد زمین پر کبھی تیری عبادت نہ ہوگی۔ یہ دعا بھی اپنے ربّانی جذبات کے اعتبار سے اسمِ اعظم کے ساتھ کی جانے والی دعا تھی، جو کامل طور پر قبول ہوئی۔ کم زور گروہ نے خدا کی مدد سے طاقت ور گروہ کو مکمل شکست دے دی۔

اسمِ اعظم کے ساتھ دعا، صرف پیغمبروں کے ساتھ خاص نہیں، اِس دعا کی توفیق ہر بندۂ خدا کو ملتی ہے۔ جو شخص بھی ایمان اور اخلاص کے اعلیٰ ربّانی جذبات کے ساتھ خدا کی طرف رجوع ہو، وہ خدا کی مدد سے اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کرنے کی توفیق پاتا ہے۔ اِس کی پہچان یہ ہے کہ ایسی دعا کے موقع پر آدمی کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُس کا پورا وجود خدا کی تجلّی میں نہا اٹھا ہے۔ اُس وقت وہ ایسے الفاظ بولنے لگتا ہے جو اُس نے اِس سے پہلے کبھی سوچے نہیں تھے۔ تاریخ میں بہت سے خدا کے بندے ہیں، جن کو اِس قسم کی دعاءِ اعظم کی توفیق ملی ہے۔

دعا کے ذریعے شرکت

قرآن کی سورہ التوبہ میں کچھ اہلِ ایمان کا ذکر ہے۔ غزوۂ تبوک (8 ہجری) کے موقع پر چوں کہ نفیرِ عام تھی، اس لیے وہ اُس میں جانا چاہتے تھے۔ مگر اُن کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ اِس طویل سفر کے لیے ضروری سامان کی تیاری کرسکیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدد کے لیے آئے، مگر آپ نے معذرت فرمائی۔ اِس واقعے کا اشارہ قرآن کی ایک آیت میں اِس طرح کیا گیا ہے: اور نہ اُن لوگوں پر کوئی الزام ہے کہ جب وہ تمھارے پاس آئے کہ تم اُن کو سواری دو، تم نے کہا کہ میرے پاس کوئی چیز نہیں کہ میں تم کو اُس پر سوار کروں، تو وہ اِس حال میں واپس ہوئے کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اِس غم میں کہ اُنھیں کچھ میسر نہیں جو وہ خرچ کریں (9: 92)۔

یہ افراد غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہوسکے، مگر ایک حدیثِ رسول کے مطابق، خدا کے نزدیک وہ اُس میں شریک مانے گیے۔ غزوۂ تبوک سے واپس ہوتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے متعلق اپنے اصحاب سے فرمایا: إنّ بالمدينة أقواماً، ماسِرتُم مسيراً، ولا أنفقتُم من نفقةٍ،

ولا قطعتم من وادٍ، إلّا وھُم معکم فیه۔یعنی مدینہ میں کچھ ایسے افراد ہیں کہ تم جب کسی راستے پر چلے، یا جب بھی تم نے کچھ مال خرچ کیا، یا تم کسی وادی سے گزرے تو وہ اُس میں تمھارے ساتھ تھے (القرطبی، جلد8، 292، مسند احمد، جلد3، صفحہ 103)۔

یہ بڑا عجیب انعام تھا جو مدینہ کے اُن افراد کو ملا، یعنی عمل کے بغیر عمل کے انعام میں شرکت۔ میں غور کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ انوکھا انعام اُن کو اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کی بنا پر ملا۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے کہ وہ اپنی تنہائیوں میں رو رو کر یہ دعا کر رہے ہوں کہ — خدایا، تو نے دوسروں کو جو انعام عادل ہونے کی حیثیت سے دیا، وہ انعام مجھ کو رحیم ہونے کی حیثیت سے دے دے۔ تو نے دوسروں کے لیے جو چیز اُن کے عمل کی بنا پر مقدر کی، وہ چیز میرے لیے میری دعا کے نتیجے میں مقدر کر دے۔ تو نے جو کچھ دوسروں کو استحقاق کی بنا پر عطا فرمایا، وہ چیز مجھ کو سوال کرنے والے کی حیثیت سے دے دے۔ دوسروں کو جو چیز تو نے استطاعت کی بنا پر دی، وہ مجھ کو عجز کی بنا پر دے دے۔ تو نے دوسروں کو جو چیز مومنِ قوی ہونے کی حیثیت سے دی، وہ مجھ کو مومنِ ضعیف ہونے کی حیثیت سے دے دے، کیوں کہ تیرے رسول نے ہم کو یہ خبر دی ہے کہ: ضعیف مومن کے لیے بھی خیر ہے: **وفي کلٍّ خیر (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4823)**۔

اسمِ اعظم کا علم خدا کو

اسمِ اعظم، اسماءِ حسنیٰ سے الگ کوئی نام نہیں، وہ اُنھیں ناموں میں شامل ہے۔ اسماءِ حسنیٰ میں سے کوئی اسم، اُس وقت اسم اعظم بن جاتا ہے، جب کہ دعا کرنے والا اُس کو ایک غیر معمولی جذبے کے تحت استعمال کرے۔ پکارنے والے کا جذبۂ اعظم، اسماءِ حسنیٰ میں سے کسی اسم کو اسمِ اعظم بنا دیتا ہے۔

اسمِ اعظم کوئی پُر اسرار منتر نہیں، وہ مکمل طور پر ایک معلوم حقیقت ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ پکارنے والا یہ جانے کہ اُس نے اسمِ اعظم کے ذریعے خدا کو پکارا ہے۔ یہ دراصل خدا کی قبولیت ہے جو کسی اسم کو اسمِ اعظم کا درجہ دے دیتی ہے۔ اسم بظاہر ایک معلوم لفظ کا نام ہے، لیکن کسی چیز کا اسمِ اعظم ہونا، تمام تر داخلی اسپرٹ کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ چوں کہ داخلی اسپرٹ کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے،

اِس لیے یہ صرف اللہ ہے جو جانتا ہے کہ کب اُس کے کسی بندے نے اُس کو اسمِ اعظم کے ساتھ پکارا۔ یہ حقیقت صرف آخرت میں کھلے گی کہ وہ کون خوش قسمت انسان تھا جس کو اسمِ اعظم کے ساتھ خدا کو پکارنے کی توفیق حاصل ہوئی۔ اس معاملے میں اگر ہم کچھ کہتے ہیں تو وہ صرف بَر بناءِ قیاس ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص ایسا نہیں جو حقیقی علم کی بنیاد پر اِس بارے میں کوئی رائے دے سکے۔

خدااور بندے کے درمیان

خدا نے انسان کے لیے اپنے جن اسماءِ حسنیٰ کا تعارف کرایا ہے، وہ انسان کے اوپر ایک دروازۂ رحمت کھولنے کے ہم معنیٰ ہے۔ اسماءِ حسنیٰ یہ بتاتے ہیں کہ بندے اور خدا کے درمیان مواقعِ اتصال (meeting points) کیا کیا ہیں۔ اِن مواقعِ اتصال کے ذریعے بندہ، خدا سے قربت حاصل کرسکتا ہے۔ پھر اگر بندے کی اسپرٹ بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہو تو وہ اِس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے ذکر اور اپنی دعا میں اسمِ اعظم کا استعمال کرسکے، یعنی اُس اسم یا نام کا استعمال جس کے استعمال کے بعد ربّانی اتصال اچانک اسی طرح ممکن ہوجاتا ہے، جس طرح بجلی کا سوئچ دبانے کے بعد اچانک بجلی کے بلب کا فوراً روشن ہوجانا۔

یہ معاملہ کوئی پُراسرار معاملہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ فطرت کا ایک قانون ہے، جس کو خود انسانوں کے درمیان محسوس تعلقات کا مطالعہ کرکے سمجھا جاسکتا ہے۔

دعا اور سپر دعا

دعا، یا خدا کو پکارنے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے سادہ طور پر کچھ متعین الفاظ بول کر خدا سے مانگنا۔ دوسری دعا وہ ہے جس کو سپر دعا کہا جاسکتا ہے۔ یہ دعا کی وہ قسم ہے جس کو پکارنے والا ایسے الفاظ اور ایسے انداز میں پکارتا ہے کہ وہ خود خدا کے لیے، بلاتشبیہہ، اُسی طرح ایک ذاتی مسئلہ بن جاتا ہے، جس طرح وہ دعا کرنے والے کے لیے ایک ذاتی مسئلہ تھا۔ پہلی دعا اگر روایتی دعا (traditional dua) ہے تو دوسری دعا تخلیقی دعا (creative dua) ہے۔ انگریزی میں پہلی قسم کی دعا کو رِکویسٹ (request) کرنا کہا جاتا ہے اور دوسری قسم کی دعا کو اِنووک (invoke) کرنا، جیسے کہ کہا جائے:

The Almighty God was invoked by his call.

دعااوراسم اعظم کی دعامیں یہی فرق ہے۔ دعا عام قسم کی ایک دعا ہے، اوراسمِ اعظم کی دعا گویا کہ ایک سپر دعا۔ اس معاملے کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ہم ایک واقعہ پیش کرتے ہیں۔

ایک واقعہ

رام پور (یوپی) کا واقعہ ہے۔ ایک بچے نے اپنے باپ سے کہا کہ— میرے لیے ایک بائیسکل خرید دیجئے۔ باپ کی آمدنی کم تھی، وہ بائیسکل خریدنے کی پوزیشن میں نہ تھا، اس نے ٹال دیا۔ لڑکا بار بار کہتا رہا اور باپ بار بار منع کرتا رہا۔ بالآخر ایک روز باپ نے ڈانٹ کر کہا: میں نے کہہ دیا کہ میں بائیسکل نہیں خرید سکتا۔ اب آئندہ مجھ سے اس قسم کی بات مت کرنا، ورنہ میں تم کو ماروں گا۔

یہ سن کر لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کچھ دیر چپ رہا۔ اس کے بعد وہ روتے ہوئے بولا— آپ ہی تو ہمارے باپ ہیں، آپ سے نہ کہیں تو اور کس سے کہیں۔ اس جملے نے باپ کو تڑپا دیا۔ اچانک اس کا انداز بدل گیا۔ اس نے کہا: اچھا بیٹے اطمینان رکھو، میں تمھارے لیے بائیسکل خریدوں گا، اور کل ہی خریدوں گا۔ یہ کہتے ہوئے باپ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اگلے دن اس نے پیسے کا انتظام کرکے بیٹے کے لیے ایک نئی بائیسکل خرید دی۔

لڑکے نے بظاہر ایک لفظ کہا تھا، مگر یہ ایک ایسا لفظ تھا جس کی قیمت اس کی اپنی زندگی تھی، جس میں اس کی پوری ہستی شامل ہوگئی تھی۔ اس لفظ کا مطلب یہ تھا کہ اس نے اپنے آپ کو اپنے سرپرست کے آگے بالکل خالی کر دیا ہے۔ یہ لفظ بول کر اس نے اپنے آپ کو ایک ایسے نقطے پر کھڑا کر دیا جہاں اس کی درخواست اس کے سرپرست کے لیے بھی اتنا ہی بڑا مسئلہ بن گئی جتنا کہ وہ خود اس کے لیے تھی۔ بیٹے کے الفاظ نے باپ کو اِس سنگین سوال سے دوچار کر دیا کہ اگر وہ اپنے بیٹے کو بائیسکل نہ دے تو اُس کی پِدریت (fatherhood) ہی مشتبہ ہو جائے گی۔

اس واقعے سے سمجھا جاسکتا ہے کہ دعا کی وہ کون سی قسم ہے جس کے بعد خدا کی رحمتیں بندے کے اوپر اُمڈ آتی ہیں۔ یہ رٹے ہوئے الفاظ کی تکرار نہیں ہے، نہ اس کا کوئی ''رسمی نصاب'' ہے۔ یہ دعا کی وہ قسم ہے جس میں بندہ اپنی پوری ہستی کو انڈیل دیتا ہے۔ جب بندے کی آنکھ سے عجز کا وہ قطرہ ٹپک

پڑتا ہے جس کا تحمل زمین اور آسمان بھی نہ کر سکیں۔ جب بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے ساتھ اتنا زیادہ شامل کر دیتا ہے کہ ''مانگنے والا'' اور ''دینے والا'' دونوں ایک ترازو پر آجاتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہے جب کہ دعا محض لغت کا ایک لفظ نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک شخصیت کے پھٹنے کی آواز ہوتی ہے۔ اُس وقت خدا کی رحمتیں اپنے بندے پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ بندگی اور خدائی دونوں ایک دوسرے سے راضی ہوجاتے ہیں۔ قادرِ مطلق، عاجزِ مطلق کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔

اِس واقعے پر غور کیجیے تو اس میں دونوں قسم کی دعا کی مثال نظر آئے گی۔ مذکورہ بچے نے جب پہلی بار اپنے باپ سے یہ کہا کہ مجھے ایک بائیسکل خرید دیجیے تو اُس نے گویا کہ صرف دعا کی، لیکن دوسری بار جب اُس نے رو کر یہ کہا کہ آپ ہی تو ہمارے باپ ہیں، آپ سے بائیسکل کے لیے نہ کہیں تو اور کس سے کہیں۔ جب بچے کی زبان سے یہ دوسرے الفاظ نکلے تو وہ گویا کہ ایک سپر دعا تھی۔ پہلے قسم کے الفاظ سے باپ پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا، لیکن دوسرے قسم کے الفاظ نے باپ کو پگھلا دیا۔ اب وہ اتنا متاثر ہوا کہ وہ فوراً بائیسکل خریدنے کے لیے تیار ہوگیا۔

اِس مثال سے عام قسم کی دعا اور اسمِ اعظم کی دعا کا فرق سمجھا جا سکتا ہے۔ عام قسم کی دعا، محض دعائیہ الفاظ کو زبان سے دہرا دینے کا نام ہے، لیکن اسمِ اعظم کے ساتھ کی گئی دعا گویا کہ سپر دعا ہے۔ ایسی دعا خود خدا کو ہلا دیتی ہے، جیسا کہ مظلوم کی دعا کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ: **دعوة المظلوم تحمل على الغمام، وتفتح لها أبواب السماء، يقول الرّب عزّ وجلّ: وعزّتي، لأنصرنّك ولو بعد حين** (مسند احمد، جلد2، صفحہ 305)۔

دعا اور سپر دعا کا فرق، الفاظ میں فرق کا نام نہیں، بلکہ دعا کرنے والے کی داخلی اسپرٹ میں فرق کا نام ہے۔ یہ دراصل دعا کرنے والے کی اپنی حالتِ داخلی پر منحصر ہے کہ اُس کی زبان سے نکلنے والی دعا، سپر دعا بنے گی یا وہ صرف عام دعا بن کر رہ جائے گی۔

دو مثالیں

اس معاملے کو سمجھنے کے لیے دونوں قسم کی دعاؤں کی مثال یہاں نقل کی جاتی ہے۔

ایک شخص نے قرآنی دعاؤں کی ایک کتاب بازار سے خریدی۔ اُس میں کچھ دعائیں چھپی ہوئی تھیں۔ اُس نے اِن دعاؤں کو یاد کرلیا اور نمازوں میں اُن کو دہرانے لگا۔ مثلاً: **ربّنا اٰتنا فی الدنیا حسنة، و فی الأخرة حسنة، وقنا عذاب النار** ۔ یعنی اے ہمارے رب، تو ہم کو دنیا میں 'حسنہ' دے اور تو ہم کو آخرت میں 'حسنہ' دے، اور تو ہم کو آگ کے عذاب سے بچا (2: 201)۔ دعا کا یہ طریقہ روایتی دعا کی ایک مثال ہے۔

اب سپر دعا کی ایک مثال لیجیے۔ اب سے ساڑھے تین ہزار سال پہلے مصر میں ایک مشرک بادشاہ کی حکومت تھی، جس کا لقب فرعون تھا۔ اِس زمانے میں حضرت موسیٰ کا ظہور ہوا، جنھوں نے مصر میں دعوتِ توحید دی۔ فرعون خود تو حضرت موسیٰ کا مخالف بن گیا، لیکن اس کی بیوی آسیہ بنتِ مُزاحم، حضرت موسیٰ کی دعوتِ توحید سے متاثر ہوئی اور وہ حضرت موسیٰ پر ایمان لے آئی۔

قدیم زمانے کے اعتبار سے یہ کوئی سادہ بات نہ تھی۔ قدیم زمانہ **'النّاسُ علیٰ دینِ مُلوکھم'** کا زمانہ تھا۔ اُس زمانے میں اسٹیٹ ریلیجن کو ماننا، سیاسی وفاداری کی علامت تھا۔ اسٹیٹ ریلیجن کے خلاف کسی اور ریلیجن کو ماننے والا، اسٹیٹ کا باغی سمجھا جاتا تھا اور اُس کو وہ سزا دی جاتی تھی جو ریاست سے بغاوت کے لیے مقرر ہے۔ آج ہم مذہبی آزادی کے ماحول میں جیتے ہیں، لیکن قدیم زمانے میں ہزاروں سال تک دنیا میں مذہبی جبر (religious persecution) کا نظام رائج تھا۔

یہی وہ پس منظر تھا جس میں فرعون نے آسیہ کے لیے قتل کا حکم دے دیا۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اُس وقت آسیہ کی زبان سے یہ دعا نکلی: **ربِّ ابْنِ لي عندك بیتاً فی الجنة** (66: 11) یعنی اے میرے رب، اپنے پاس میرے لیے جنت میں ایک گھر بنادے۔

آسیہ کی اِس دعا کو اُس کے پس منظر کی روشنی میں دیکھئے تو گویا کہ آسیہ نے یہ کہا — اے میرے رب، میں نے تیرے لیے دنیا میں بادشاہ کے محل کو چھوڑ دیا، اب تو آخرت کی ابدی دنیا میں میرے لیے اپنے پڑوس میں ایک محل بنادے:

I sacrifice my seat in the palace of worldly king, O Lord, give me a better seat in your neighbourhood in the world hereafter.

آسیہ بنت مزاحم کی اِس دعا کے لیے بعض علمانے درست طور پر کہا کہ: **ما أحسن هٰذا الكلام**، یعنی کتنی اچھی ہے یہ دعا (**صفوةُ التّفاسير**، جلد3، صفحہ 412)۔

یہ دعا بلا شبہہ، ایک تخلیقی دعا تھی۔ آسیہ بنت مزاحم کے سامنے دو چیزوں کے درمیان انتخاب تھا— محل کی زندگی کی خاطر فرعون کے مشرکانہ مذہب پر قائم رہنا، یا خدا کے مُوحِدانہ مذہب کی خاطر سفّاکانہ قتل کا سامنا کرنا۔ آسیہ کی معرفت اُس وقت اتنی زیادہ گہری ہوچکی تھی کہ اُس کو یہ فیصلہ کرتے ہوئے ایک لمحے کی دیر نہیں لگی کہ مجھے حق کی خاطر، دنیا کے وقتی محل کو چھوڑ دینا چاہیے اور خدا کی ابدی جنت کو اپنے لیے منتخب کرلینا چاہیے، خواہ اِس انتخاب کی قیمت میں مجھے قتل کردیا جائے یا سُولی پر چڑھا دیا جائے۔

اِس پورے پس منظر کی روشنی میں دیکھیے تو آسیہ بنت مزاحم کی دعا بلاشبہہ ایک سپر دعا تھی اور وہ فوراً ہی قبول ہوگئی۔ روایات میں آیا ہے کہ موت سے پہلے فرشتوں نے آسیہ کو جنت میں اُس کے محل کا مشاہدہ کرایا۔ چناں چہ آسیہ نے اِس حال میں جان دی کہ اُس کے چہرے پر اطمینان کی خوشی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

آسیہ بنت مزاحم کی یہ دعا جو قرآن میں نقل کی گئی، وہ محض ایک فرد کی دعا نہیں ہے بلکہ وہ ایک نمائندہ دعا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر عورت اور مرد کو یہی دعا کرنا ہے۔ ہر عورت اور مرد کو اِسی مرحلے سے گزرنا ہے۔ ہر عورت اور مرد کو قربانی کی سطح پر جا کر یہ کہنا ہے کہ — خدایا، میں نے تیرے دین کی خاطر دنیا کی چیزوں کو چھوڑا، تاکہ تو اگلے مرحلۂ حیات میں اپنا زیادہ بہتر انعام مجھے عطا فرمائے۔ یہی وہ عورت اور مرد ہیں جن کی بابت یومُ الحساب (Day of Judgement) کے موقع پر یہ اعلان کیا جائے گا کہ انھوں نے خدا کی خاطر دنیا کی عارضی جنت کو چھوڑ دیا تھا، اب اُن کو آخرت کی زیادہ اعلیٰ جنت میں داخل کردو، تاکہ یہاں وہ ابدی طور پر خوشیوں اور راحتوں کی زندگی گزاریں اور کبھی اُکتاہٹ کے احساس کا شکار نہ ہوں۔

اسم اعظم ایک زندہ تجربہ

اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کرنا، خدا کی توفیق سے ہوتا ہے۔ یہ توفیق صرف اُس انسان کو ملتی ہے جو اسمِ اعظم

کی دعا سے پہلے اسمِ اعظم کی کیفیات میں جی رہا ہو۔ اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کا معاملہ کوئی پُراسرار معاملہ نہیں۔ وہ دراصل 'الإناء یترشّح بما فیه' کا معاملہ ہے، یعنی ایک انسان جو حق کا متلاشی تھا، پھر اُس کو خدا کی صورت میں حق مل گیا اور اُس کا وہ حال ہوا جس کی تصویر قرآن میں اِس طرح بیان کی گئی ہے: **أوَ مَن کان میتًا فأحییناه، وجعلنا له نوراً یمشی به فی النّاس** (6:123)۔ یعنی وہ شخص جو مُردہ تھا، پھر ہم نے اُس کو زندگی دی اور ہم نے اُس کو ایک روشنی دی کہ اُس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے۔

ایسے انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ ذکرِ کثیر (الأحزاب: 41) میں جینے لگتا ہے، یعنی ہر وقت خدا کو یاد کرنا، ہر وقت خدا کے بارے میں سوچنا، ہر لمحہ خدا کی تجلّیات کا تجربہ کرنا۔ ایسا انسان گویا کہ اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کرنے کے لیے ایک تیار ذہن (prepared mind) ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی خاص موقع اُس کی زندگی میں پیش آتا ہے تو اُس کے اندر چھپے ہوئے ربّانی جذبات ایک طوفان بن کر اُبل پڑتے ہیں۔ اُس وقت وہ مخصوص قسم کے الہامی الفاظ میں خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ ایک تیار ذہن سے نکلنے والی اِسی قسم کی الہامی دعا کا نام اسمِ اعظم کے ساتھ خدا کو پکارنا ہے۔

ایک صالح خاتون کا واقعہ

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، فرعون کی بیوی آسیہ بنتِ مُزاحم خفیہ طور پر حضرت موسیٰ کے دین پر ایمان لائی تھی۔ جب فرعون کو اِس کا علم ہوا تو وہ بہت غصہ ہوا اور اُس کے قتل کا فیصلہ صادر کردیا۔ اُس وقت آسیہ کی زبان سے ایک دعا نکلی جو قرآن میں اِن الفاظ میں آئی ہے: **ربِّ ابْنِ لي عندك بیتاً فی الجنّة، ونجِّنی من فرعون وعمله، ونجّنی من القوم الظّالمین** (66:11)۔ یعنی اے میرے رب، میرے لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنادے اور مجھ کو فرعون اور اُس کے عمل سے بچالے اور مجھ کو ظالم قوم سے نجات دے۔

یہ دعا ایک ایسی دعا ہے جس کے اندر اسمِ اعظم کی روح پوری طرح موجود ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ آسیہ نے جب یہ دعا کی تو اُس وقت موت سے پہلے اُس کو یہ تجربہ ہوا کہ فرشتوں نے اُس کو آخرت کی دنیا میں ملنے والا جنّتی مکان اُس کو دکھا دیا (القرطبی، جلد 18، صفحہ 203)۔

یہ بات یقینی ہے کہ آسیہ کی زبان سے یہ دعا اچانک یا اتفاقاً نہیں نکلی، بلکہ وہ اُس کی پچھلی زندگی کے دوران پیش آنے والے تجربات کا نتیجہ تھی۔ اِس دعا سے پہلے وہ ایک تیار شخصیت بن چکی تھی۔ وہ پہلے ہی سے ذکر اور دعا کے مخصوص لمحات میں جی رہی تھی۔ اِسی کا یہ نتیجہ تھا کہ جب فرعون کی سفّاکی کا معاملہ پیش آیا تو اُس کی زبان سے فطری طور پر مذکورہ قسم کے ربّانی الفاظ نکل پڑے۔

ایک تاریخی مثال

سلطان عبدالرحمٰن الناصر (وفات: 961ء) اسپین (اندلس) کا ایک مسلم حکمراں تھا۔ اُس نے پچیس سال کی محنت سے قرطبہ کے پاس ایک شان دار محل بنایا۔ یہ محل چار میل لمبی اور تین میل چوڑی زمین میں واقع تھا۔ اس محل کا نام اس نے الزّہرا رکھا۔ مگر غیر معمولی طور پر بڑا ہونے کی وجہ سے اس کو قصر الزہرا کے بجائے مدینۃ الزہرا کہا جانے لگا۔

سلطان عبدالرحمٰن الناصر کو عمارتوں کا بہت شوق تھا۔ اس نے الزّہرا کے نام سے یہ شاہی بستی بسائی اور اس میں شان دار محل تعمیر کیے۔ اِن تعمیرات کے آخری دنوں میں سلطان اتنا مشغول رہا کہ مسلسل تین جمعہ میں وہ مسجد نہ پہنچ سکا۔ چوتھے جمعہ کو جب سلطان جامع مسجد پہنچا تو اس کی موجودگی میں قاضی منذر (وفات: 966ء) نے جو خطبہ دیا، اُس میں نام لیے بغیر سلطان پر سخت تنقید کی گئی تھی۔

قاضی منذر نے ایسی آیتیں پڑھیں جن میں دنیا میں عمارتیں کھڑی کرنے اور آخرت سے غافل ہو جانے پر وعیدیں تھیں۔ مثلاً— کیا تم ہر بلندی پر عبث یادگاریں تعمیر کرتے ہو اور شان دار محل بناتے ہو گویا کہ تم کو ہمیشہ اِسی دنیا میں رہنا ہے۔ اور جب تم کسی پر حملہ کرتے ہو تو جبّارانہ حملہ کرتے ہو۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو (26:128-131)۔ تمھارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو، یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی اور وہ عمارت اُس کو لے کر جہنم کی آگ میں جا گری۔ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ہے، ہمیشہ اُن کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی، یہاں تک کہ اُن کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ اور اللہ علیم اور حکیم ہے (9:109-110)۔

اِسی طرح قاضی منذر نے اِس مضمون کی بہت سی حدیثیں سنائیں اور ان کی تشریح کی۔ اپنے خطبے میں اگر چہ انھوں نے سلطان کا نام نہیں لیا، مگر مسجد کا ہر نمازی سمجھ رہا تھا کہ اِن سخت تنقیدوں کا مخاطب کون ہے اور وہ کس کے اوپر پڑ رہی ہیں۔

تنقید، یوں بھی آدمی کے اوپر بہت سخت ہوتی ہے اور جب مجمعِ عام میں کسی پر تنقید کی جائے تو وہ اور بھی زیادہ ناگواری کا باعث ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ یہ تنقید ایک ماتحت کی زبان سے اپنے حاکم کے اوپر تھی۔ اور جب کوئی حاکم اپنے ماتحت کو تنقید کرتے ہوئے سنتا ہے تو اس پر کبر کا سخت دَورہ پڑتا ہے۔ بڑے بڑے شریف اور دین دار لوگ بھی اُس وقت قابو سے باہر ہو جاتے ہیں، مگر سلطان نے حد درجہ ضبط سے کام لیا۔ اگر چہ سلطان پر اس تنقید کا بہت زیادہ اثر تھا، مگر وہ مسجد میں کچھ نہ بولا اور نماز کے بعد خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔

گھر پہنچ کر سلطان نے اپنے لڑکے الحکم سے کہا کہ آج قاضی منذر نے مجھ کو بہت سخت تکلیف دی۔ اب میں نے طے کر لیا ہے کہ میں اُن کے پیچھے کبھی جمعہ کی نماز نہیں پڑھوں گا۔ الحکم نے کہا: قاضی منذر کا امام ہونا یا نہ ہونا آپ کے اختیار میں ہے، آپ اُن کو معزول کر دیجیے اور اُن کی جگہ دوسرا کوئی امام مقرر کر دیجیے، جو ایسی گستاخی نہ کرے۔ یہ سن کر سلطان غصے میں آ گیا۔ اُس نے اپنے لڑکے کو ڈانٹ کر کہا: تمھارا بُرا ہو، ایک شخص جو ہدایت سے دور ہے اور راستے سے بھٹکا ہوا ہے، کیا اُس کی خوشی کی خاطر قاضی منذر جیسے خوبیوں والے آدمی کو معزول کر دیا جائے گا۔ یہ بات کبھی نہیں ہو سکتی (**هذا ما لا يكون**)۔

مجھے اُن کی باتوں سے چوٹ لگی، اِس لیے میں نے اُن کے پیچھے جمعہ نہ پڑھنے کی قسم کھا لی۔ میری خواہش ہے کہ اِس قسم کے کفّارے کی کوئی صورت نکل آئے۔ تاہم قاضی منذر ہماری زندگی میں اور اپنی زندگی میں لوگوں کو نماز پڑھاتے رہیں گے: **بل يصلّي بالناس حياتنا وحياته إن شاء الله تعالىٰ** (**تاريخ قُضاة الأندلس**، صفحہ 70)، چناں چہ قاضی منذر بدستور جمعہ کی نماز پڑھاتے رہے۔ عبدالرحمٰن الناصر کے انتقال کے بعد اُس کے لڑکے نے بھی اُن کے مقام کو اُسی طرح باقی رکھا۔

اوپر جس واقعے کا ذکر ہوا، اُس میں بہت بڑا سبق ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی انسان

کی وہ مطلوب صفات کیا ہیں، جو اگر کسی کے اندر ہوں تو اُس کو یہ خوش قسمتی حاصل ہوتی ہے کہ وہ خدا سے ایسی دعا کر سکے جس کو اسمِ اعظم کے ساتھ کی جانے والی دعا کہا جاتا ہے۔

اسمِ اعظم کے ساتھ دعا میں اگر پچاس فی صد اسمِ اعظم کا حصہ ہے تو پچاس فی صد خود دعا کرنے والے کی ربّانی استعداد کا حصہ ہے۔ یہ ربّانی استعداد قاضی منذر اور سلطان عبدالرحمٰن دونوں کے اندر کم وبیش موجود تھی، اِس لیے اُن کے ساتھ ایک عظیم دعا کی تاریخ شامل ہوگئی۔ حسب ذیل واقعہ اِس معاملے میں ایک چشم کُشا مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔

بارش شروع ہوگئی

سلطان عبدالرحمٰن الناصر کے زمانے میں ایک بار اسپین میں قحط پڑا۔ بہت سخت حالات پیدا ہوگئے۔ سلطان نے اپنا ایک خاص آدمی قاضی منذر کے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ آپ استسقاء کی نماز پڑھائیں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بارش برسائے۔ قاضی منذر نے سلطان کے قاصد سے پوچھا کہ سلطان نے میرے پاس دعا کا پیغام بھیجا ہے مگر وہ خود کیا کر رہے ہیں۔

قاصد نے کہا: آج سے زیادہ ہم نے کبھی ان کو اللہ سے ڈرنے والا نہیں پایا۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ حیران و پریشان ہیں۔ تنہائی میں پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ مٹی کے فرش پر سجدے میں گرے ہوئے تھے۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہے تھے اور اللہ سے کہہ رہے تھے: خدایا، میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے۔ کیا تو میرے گناہوں کی وجہ سے لوگوں کو عذاب دے گا، حالاں کہ تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے (هذه ناصيتي بيدك، أترا ك تعذِّب بيَ الرّعيّة، وأنت أرحم الراحمين)

یہ سن کر قاضی منذر کے چہرے پر اطمینان ظاہر ہوگیا۔ انھوں نے قاصد سے کہا: اپنے ساتھ بارش لے کر واپس جاؤ، اب ضرور بارش ہوگی۔ کیوں کہ زمین کا حاکم جب تضرع کرتا ہے تو آسمان کا حاکم ضرور رحم فرماتا ہے (إذا خشع جبّار الأرض، رحم جبّار السماء) چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ قاصد واپس ہو کر گھر پہنچا تھا کہ بارش شروع ہوگئی (الکامل فی التاریخ، جلد 8، صفحہ 675)۔

زمین پر خشک سالی اِس لیے آتی ہے، تا کہ آنکھوں کی خشک سالی ختم ہو۔ آسمان پر بادل اِس لیے گرجتے ہیں، تا کہ لوگوں کے دل خدا کے خوف سے دہلیں۔ گرمی کی شدت اِس لیے ہوتی ہے، تا کہ لوگ جہنم کی آگ کو یاد کر کے تڑپ اٹھیں۔

اِس طرح کے واقعات کا نہایت گہرا تعلق، اسماءِ حسنیٰ اور اسمِ اعظم کے معاملے سے ہے۔ یہی وہ واقعات ہیں جو انسان کے اندر ربّانی کیفیات کی پرورش کرتے ہیں، اور جس سینے کے اندر ربّانی کیفیات کا یہ چشمہ جاری ہو جائے، وہی وہ انسان ہے جس کو اسماءِ حسنیٰ کی معرفت ہوتی ہے اور اُسی کو یہ توفیق ملتی ہے کہ وہ اسمِ اعظم کے ساتھ خداوندِ عالم کو پکارے اور اُس کی پکار ضرور سنی جائے۔

ذاتی تجربات

خدا کے فضل سے مجھ کو اِس قسم کے تجربے بار بار پیش آئے ہیں۔ 30 دسمبر 2006 کو میں اپنی ٹیم (سی پی ایس) کے کچھ افراد کے ساتھ نئی دہلی کے لودھی گارڈن میں گیا۔ یہ گویا کہ ہماری اسپریچول آؤٹنگ (spiritual outing) تھی۔ اِس موقع پر میرے دل سے ایک دعا نکلی، جو میری فہم کے مطابق، اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کی ایک مثال ہے۔

جب ہم لوگ لودھی گارڈن کے اندر پہنچ گیے تو میں نے اپنی ٹیم کے افراد سے پوچھا کہ آپ لوگ جب یہاں پہنچے تو آپ کا پہلا احساس کیا تھا۔ لوگوں نے مختلف انداز سے اپنے اپنے تجربے بتائے۔ پھر میں نے کہا کہ جب میں اِس خوب صورت گارڈن کے اندر داخل ہوا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ میں جنت کو دور سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ خوب صورت گارڈن میرے لیے جنت کا ایک بعید تعارف بن گیا۔

میں نے اشک بار آنسوؤں کے ساتھ کہا کہ خدایا، تو نے مجھے ناقص جنت میں پہنچا دیا، اب تو اپنی رحمت سے مجھے کامل جنت میں بھی داخل کر دے۔ میں نے کہا کہ خدایا، میں اور میرے ساتھی، پوری انسانی تاریخ میں، جنت کے لیے سب سے زیادہ غیر مستحق لوگ (least deseving candidates) ہیں۔ اگر تو ہمارے کامل عدمِ استحقاق کے باوجود ہم کو اپنی جنت میں داخل کر دے تو یہ واقعہ تیری شانِ رحمت کے ایک نیے اظہار کے ہم معنیٰ ہوگا۔ سارے زمین اور آسمان اور تمام فرشتے یہ دیکھ کر

حیران ہوجائیں گے کہ خدا کی رحمتوں کا سمندر اتنا وسیع تھا کہ ہمارے جیسے آخری حدتک غیر مستحق افراد بھی تیری رحمتِ بے پایاں کے فیض سے محروم نہ رہے، تیری رحمتِ بے پایاں کتنی وسیع تھی کہ وہ تاریخ کے اِن نااہل ترین افرادتک کا احاطہ کررہی تھی۔

لقد أُوتيتَ سُؤلك يا موسیٰ

غالباً 1962 کی بات ہے۔ مجھے اعظم گڑھ کے ایک قصبہ (اَن جان شہید) کے ایک اجتماع میں شرکت کا موقع ملا۔ اِس اجتماع میں مسلم حضرات شریک تھے۔ مجھے پیشگی طور پر معلوم نہ تھا کہ مجھ کو اِس اجتماع میں خطاب کرنا ہے۔ کچھ لوگوں نے اچانک مجھے اسٹیج پر لے جاکر کھڑا کردیا۔ میرے لیے یہ ایک مجبورانہ خطاب کا معاملہ تھا۔ یہ غالباً پہلا موقع تھا جب کہ مجھے خطاب کے معاملے میں کامل عجز کا تجربہ ہوا۔ اس سے پہلے میں نے بار بار اجتماعات میں خطاب کیا تھا، مگر یہ تمام خطابات تحریری مقالے کی صورت میں تھے۔ مجھے پیشگی طور پر پروگرام کا علم ہوتا تھا اور میں مقالہ لکھ کر اس کو وہاں پڑھ دیتا تھا۔

مگر اِس بار ایسی صورت پیش آئی کہ مجھے لازمی طور پر بولنا بھی تھا اور کسی پیشگی تیاری کے بغیر زبانی طور پر خطاب کرنا تھا۔ اُس وقت اچانک میرے اندر وہ ذہنی بھونچال کی کیفیت پیدا ہوئی جس کو نفسیاتی اصطلاح میں برین اسٹارمنگ (brain storming) کہا جاتا ہے۔ اُس وقت میرے لیے کسی آزادانہ انتخاب کا موقع نہ تھا۔

میں نے خدا کو یاد کیا اور دیوانگی کے عالم میں اچانک بولنا شروع کردیا۔ حاضرین کے سامنے مائک پر بولتے ہوئے میں نے کہا کہ — قرآن میں پیغمبروں کے قصے بتائے گئے ہیں، لیکن یہ تاریخی کہانی کے طور پر نہیں، بلکہ وہ ہمارے حال کے لیے ایک زندہ سبق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِسی میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ وہ مصر کے جابر بادشاہ کے دربار میں جائیں اور وہاں اُس کے سامنے توحید کی دعوت پیش کریں۔

حضرت موسیٰ نے کہا کہ: **يضيق صدري ولاينطلق لساني** (26:13)۔ یعنی خدایا، میرا سینہ تنگ ہورہا ہے اور میری زبان چلتی نہیں۔ پھر انھوں نے قادرِ مطلق خدا کی توفیق سے یہ دعا کی کہ:

ربّ اشرح لی صدری، ویسّر لی أمری، واحلُل عُقدةً من لسانی، یفقھوا قولي (20: 25-28) یعنی اے میرے رب، میرے لیے میرا سینہ کھول دے اور میرے لیے میرے معاملے کو آسان کر دے۔ اور تو میرے زبان کی گرہ کو کھول دے تا کہ لوگ میری بات کو سمجھیں۔

میں نے کہا کہ حضرت موسیٰ نے جب اس طرح خدائے سمیع وبصیر کو پکارا تو ان کی دعا سیدھے عرشِ الٰہی تک پہنچ گئی اور وہاں سے آواز آئی: **لقد أوتیت سؤلك یا موسیٰ** (20:36)۔ یعنی اے موسیٰ، تم نے جو سوال کیا، وہ تم کو دے دیا گیا۔

اس کے بعد میں نے دیوانگی کے عالم میں کہا کہ یہ واقعہ کوئی ماضی کی سرگزشت نہیں، یہ واقعہ آج بھی اسی طرح زندہ ہے، جس طرح خدائے حی وقیوم زندہ موجود ہے۔ آج بھی اگر کوئی خدا کا بندہ خدا کو پکارے اور کہے کہ خدایا، میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے اور میری زبان چلتی نہیں تو آج بھی اُس کی یہ آواز خدائے سمیع وبصیر تک پہنچے گی اور وہاں سے آواز آئے گی کہ اے میرے بندے، تم نے جو سوال کیا وہ تم کو دے دیا گیا۔ میں یہ کہہ رہا تھا اور میری آنکھ سے آنسو نہ تھمنے والے مینھ کی طرح برس رہے تھے۔ اس کے بعد میں نے بے اختیارانہ انداز میں بولنا شروع کیا اور مسلسل بولتا رہا۔

یہ واقعہ میرے لیے اِس معاملے میں ایک بریک تھرو (breakthorugh) کی مانند تھا۔ اس کے بعد میں نے تقریری مقالہ لکھنا چھوڑ دیا اور برجستہ انداز میں بولنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد میں نے انڈیا کے اندر اور انڈیا کے باہر سیکڑوں اجتماعات میں شرکت کی اور لمبی لمبی تقریریں کیں۔ یہ بلاشبہہ اَن جان شہید کے اجتماع والی دعا کا کرشمہ تھا۔

میری سمجھ کے مطابق، یہ دعا اسم اعظم کے ساتھ کی ہوئی دعا تھی۔ اس سے پہلے میں گویا ایک بے زبان انسان تھا۔ میرے مرحوم عزیز مولانا اقبال احمد سہیل (وفات: 1955) مجھ کو بچپن میں ''مرزا پھویا'' کہا کرتے تھے۔ مذکورہ واقعے کے بعد میں جس طرح اجتماعات میں بولنے لگا، اُس کی کوئی بھی توجیہہ دعا کے سوا نہیں کی جا سکتی۔

تو میرے لیے پلے بیک اسپیکر بن جا

ایک بار میں ایک مغربی ملک کے سفر پر تھا۔ اِس دوران مجھے ایک اجتماع میں خطاب کے لیے بلایا گیا۔ بلانے والے نے مجھ سے یہ نہیں بتایا تھا کہ مجمع کی نوعیت کیا ہوگی، اس نے صرف یہ بتایا تھا کہ یہ پڑھے لکھے لوگوں کا مجمع ہوگا۔ کسی غلط فہمی کی بنا پر میرے ذہن میں یہ آگیا کہ وہاں ہندستان اور پاکستان کے لوگ ہوں گے اور مجھے وہاں اردو میں خطاب کرنا ہوگا۔

یہ رات کا وقت تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک صاف ستھرے ہال میں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ دریافت کرنے پر مجھے بتایا گیا کہ یہ سب انگریزی داں لوگ ہیں۔ ان کو مجھے انگریزی میں خطاب کرنا ہے، کیوں کہ وہ لوگ اردو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ خبر میرے لیے ایسی تھی جیسے کسی کے اوپر اچانک بجلی گر جائے۔ اس سے پہلے میں نے انگریزی زبان میں پیشگی طور پر تیار کیے ہوئے مقالے پڑھے تھے، لیکن برجستہ طور پر انگریزی میں میں نے کبھی خطاب نہیں کیا تھا۔

ہال کے ساتھ وہاں ایک سائڈ روم تھا۔ میں سراسیمگی کے عالم میں اس سائڈ روم میں گیا۔ میں نے اندر سے دروازے کو بند کرلیا۔ اور وضو کرکے دو رکعت صلوٰۃ الحاجت پڑھی۔ اس کے بعد میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو میری آنکھوں سے آنسو اِس طرح بہہ رہے تھے جیسے کہ پانی کا نل کھل گیا ہو۔

میں نے روتے ہوئے کہا کہ خدایا، یہاں ایک عاجزِ مطلق کو قادرِ مطلق کی ترجمانی کرنی ہے۔ آپ اگر چاہیں تو پتھروں کو حکم دیں اور وہ چلا کر آپ کی بات کا اعلان کریں۔ آپ اگر حکم دیں تو درخت اپنی خاموشی کو توڑ کر انسانوں سے خطاب کریں۔ اگر آپ حکم دیں تو زمین اور آسمان، وہ سب کچھ بولیں جو انسان کو بولنا تھا، مگر وہ نہ بول سکا۔ لیکن خدایا، آپ خود اپنے قانونِ امتحان کی بنا پر ایسا نہیں کر سکتے۔ اِس لیے آپ کے سامنے اس کے سوا کوئی اور انتخاب نہیں کہ آپ میرے جیسے عاجز انسان کی وہ مدد کریں جو اس سے پہلے آپ نے کسی اور کی نہیں کی۔

خدایا، میں آپ کے تمام اسماءِ حسنیٰ کا واسطہ دے کر آپ سے دعا کرتا ہوں کہ آپ میرے لیے پلے بیک اسپیکر (playback speaker) بن جائیں۔ آپ بولتے جائیں اور میں اس کو دہراتا جاؤں۔ آپ خاموشی کی زبان میں مجھ کو بتائیں اور میں نُطق کی زبان میں اس کو دوسروں کے سامنے

پیش کروں۔ خدایا، اگر میں اِس موقع پر نہ بولوں تو یہ میرے لیے 'فرار من الزَّحف' کے ہم معنیٰ ہوگا۔ اور اگر آپ میری مدد نہ کریں تو اُس بات کا اعلان نہ ہو سکے گا جس کا اعلان آپ کی سب سے زیادہ مطلوب چیز ہے۔ خدایا، یہ وہ لمحہ ہے جب کہ نہ میرے لیے کوئی دوسرا انتخاب ہے اور نہ آپ کے لیے کوئی دوسرا انتخاب۔ خدایا، یہ وہ لمحہ ہے جب کہ بندے کا عجز اور خالق کی قدرت دونوں ایک سطح پر آگیے ہیں۔ ایسی صورت میں نہ میرے لیے واپسی کا موقع ہے اور نہ آپ کے لیے مجھ کو نظر انداز کرنے کا موقع۔

یہ دعا کرکے میں باہر آیا اور ہال کے اندر مقرر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پورا ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں صرف مجھ کو تقریر کرنا تھا۔ میں نے دیوانگی کے عالم میں بولنا شروع کیا۔ اور تقریباً ایک گھنٹے تک انگریزی میں بولتا رہا۔ میں نے پوری تقریر برجستہ طور پر اور روانی کے ساتھ کی۔ تقریر کے خاتمے پر اعلان کیا گیا کہ کوئی صاحب سوال کرنا چاہیں تو سوال کر سکتے ہیں، لیکن مجمع کی طرف سے کوئی سوال نہ آیا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ تمام لوگ آپ کی انگریزی تقریر سے اِس قدر مسحور تھے کہ وہ اپنے اندر سوال کرنے کی جرأت نہ پا سکے۔

اِس تجربے کے بعد میری زندگی میں غیر متوقع طور پر ایک نیا دَور آیا، جب کہ میں برجستہ طور پر انگریزی زبان میں بولنے لگا۔ انگریزی میں گفتگو، انگریزی میں انٹرویو، انگریزی میں تقریر۔ یہ سب جو اِس سے پہلے میری زندگی میں موجود نہ تھا، اب وہ عمومی طور پر میری زندگی میں شامل ہوگیا اور بفضلہٖ تعالیٰ تا دمِ تحریر (30 اگست 2007) جاری ہے۔

آزادئ ہند (1947) کے بعد جب میں نے خصوصی طور پر انگریزی سیکھنا شروع کیا تو ہر ایک میری حوصلہ شکنی کرتا تھا۔ میرے بڑے بھائی عبد العزیز خاں (وفات: 1988) نے میرے انگریزی شوق کو دیکھ کر کہا تھا: بڈھا طوطا کیا پڑھے گا۔ عام تجربے کے لحاظ سے، اُن کا ایسا کہنا بالکل درست تھا۔ لیکن خدا کی نصرت سے وہ سب کچھ ہو سکتا ہے جو انسان سے نہیں ہو سکتا۔ میرے گمان کے مطابق، مذکورہ دعا بلاشبہہ، اسمِ اعظم کے ساتھ کی جانے والی دعا تھی اور اِسی دعا کا یہ کرشمہ تھا کہ ایک نہ ہونے

والی بات واقعہ بن کر لوگوں کے سامنے آ گئی۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

پروفیسر محمد مجیب (وفات: 1985) جامعہ ملّیہ اسلامیہ (نئی دہلی) کے تین بڑے ستونوں میں سے ایک تھے۔ بقیہ دو یہ تھے: ڈاکٹر ذاکر حسین (وفات: 1969)، ڈاکٹر عابد حسین (وفات: 1978)۔ پروفیسر مجیب نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ اُن کو انگریزی زبان پر غیر معمولی قدرت تھی۔ انھوں نے مستشرقین (orientalists) کا لٹریچر تفصیل کے ساتھ پڑھا تھا۔

غالباً 1970 کی بات ہے۔ میں جامعہ ملیہ کے کیمپس میں پروفیسر مجیب سے ملا۔ اُس وقت پروفیسر انوار علی خاں سوز (وفات: 1987) بھی میرے ساتھ تھے۔ گفتگو کے دوران پروفیسر مجیب نے خاص انداز میں مجھ سے کہا: مولوی صاحب، آپ جانتے ہیں کہ اِس زمانے میں اسلام کی نمائندگی یہودی اسکالر کر رہے ہیں۔

اُن کا مطلب یہ تھا کہ موجودہ زمانے میں ایک نیا اسلوبِ تحریر پیدا ہوا ہے۔ اِس اسلوبِ تحریر میں، مسلم علما اسلامی لٹریچر تیار نہ کر سکے۔ البتہ تعلیم یافتہ یہودیوں نے یہ کام کیا۔ انھوں نے وقت کے جدید اسلوب میں اسلام کے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ ان کتابوں میں اگر چہ اسلام کی تعلیمات کو بگڑی ہوئی صورت میں پیش کیا گیا ہے، لیکن اسلوبِ تحریر کے اعتبار سے وہ وقت کے اسلوب میں ہیں۔ اس لیے آج جو تعلیم یافتہ لوگ انگریزی زبان میں اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، وہ اکثر اِنھیں یہودی علما کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

میں پروفیسر مجیب کی باتوں کو سنتا رہا۔ میں نے ان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا، لیکن اُن کی بات کو سن کر میرے دماغ میں ایک بھونچال آ گیا۔ میں خاموشی کے ساتھ واپس آ گیا اور پھر رات دن یہ دعا کرنے لگا کہ خدایا، مجھے توفیق دیجیے کہ میں آپ کے دین کو آج کے اسلوب میں دنیا کے سامنے پیش کر سکوں، میں عصری اسلوب میں اسلام کا لٹریچر تیار کر سکوں۔

میں اکثر کسی واقعے کا حوالہ دے کر دعا کرتا ہوں۔ اِس معاملے میں بھی میں نے ایسا ہی کیا۔

اصل یہ ہے کہ آزادی کے بعد یو پی میں خاتمۂ زمین داری کا قانون (zamindari abolition act) نافذ ہوا۔ نیشنل گورنمنٹ کے تحت، یہ قانون اِس اصول پر مبنی تھا کہ — جو جوتے، اُس کا کھیت۔

میرا خاندان یو پی کے اعظم گڑھ سے تعلق رکھتا تھا۔ ہمارا خاندان وہاں کے بڑے زمین داروں میں سے ایک تھا۔ ہماری زمینیں زیادہ تر کسانوں کو دی ہوئی تھیں، جو اُن کو جوتتے تھے اور لگان ادا کرتے تھے۔ خاتمۂ زمیں داری کے قانون کے مطابق، زمین دار کو اُس کی زمین واپس ملنے کی صرف ایک ہی صورت تھی، وہ یہ کہ زمین کو جوتنے والا کسان تحریری طور پر زمین سے استعفا دے دے۔

ہماری بیش تر زمینیں کسانوں کے پاس تھیں۔ یہ کسان سب کے سب ہندو لوگ تھے۔ ہماری زمیں داری کے مینیجر بھی ایک ہندو تھے، جن کا نام بھاؤ رام تھا۔ بھاؤ رام ہمارے خاندان کے نہایت وفادار ملازم تھے۔ انھوں نے ایک طوفانی مہم چلادی کہ تمام کسان جو ہماری زمینوں کو جوتے ہوئے تھے، وہ تحریری استعفا دے دیں۔ بھاؤ رام نے اپنی رات دن کی کوشش سے ایک ایک کسان سے استعفا لکھوالیا۔ ہمارے ساتھ استثنائی طور پر ایسا ہوا کہ ہمارا کوئی بھی کھیت ایسا نہ بچا جس کا تحریری استعفا حاصل نہ کرلیا گیا ہو۔

اُس زمانے میں بھاؤ رام پر ایک دیوانگی طاری تھی۔ وہ ہم لوگوں سے کہتے تھے کہ: بابو، جم داری میں داگ نہ لگنے پائے (بابو، زمیں داری میں داغ نہ لگنے پائے) میں اِس واقعے کے حوالے سے خدا سے دعا کرنے لگا۔ میں روتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ خدایا، تیرے دین میں ایک داغ لگ رہا ہے۔ تیرا دین اُس اسلوب میں پیش نہیں ہورہا ہے جو آج کے جدید ذہن کو ایڈریس کرسکے۔ تو مجھے توفیق دے کہ میں تیرے دین کے اِس داغ کو ہٹاؤں، میں وقت کے اسلوب میں اسلام کو پیش کرسکوں۔ میں بے قرار دل اور اشک بار آنکھوں کے ساتھ یہ دعا کرتا تھا اور رات دن اپنی تیاری میں مشغول رہتا تھا۔

اُس زمانے میں میری بے قراری کا عالم یہ تھا کہ ایک بار میں دلّی پبلک لائبریری میں گیا۔ وہاں کے ریفرنس سیکشن میں جا کر ریفرنس کی کتابوں کو پڑھنے لگا۔ اُس وقت میری محویت کا یہ عالم تھا کہ میں قریب کی کرسی پر نہ بیٹھ سکا۔ میں الماری کے سامنے کھڑا تھا اور کتابیں نکال نکال کر پڑھ رہا تھا۔ یہ سخت سردی کا زمانہ تھا۔ چناں چہ مجھے سردی لگ گئی اور میں بیمار ہوکر تقریباً دو مہینے تک بستر پر پڑا رہا۔

آج جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے خدا کی توفیق سے تقریباً ہر اسلامی موضوع پر اتنی کتابیں لکھی ہیں، جو ایک تعلیم یافتہ انسان کے لیے وقت کے اسلوب میں اسلام کا مؤثر تعارف پیش کرتی ہیں۔ مشرق اور مغرب دونوں جگہ کے اہلِ علم نے اِس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

لوگوں کا یہ تاثر یہاں تک پہنچا ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں بہت سے تعلیم یافتہ لوگوں نے میرے لٹریچر کو پھیلانے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردی ہیں۔ امریکا میں مقیم کچھ تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اپنے ذاتی جذبے کے تحت، میری تمام کتابوں اور ماہ نامہ الرسالہ کو انٹرنیٹ کے ویب سائٹ پر ڈال دیا ہے۔ اب دنیا کے کسی بھی حصے میں کوئی آدمی میری تحریروں کو اردو اور انگریزی میں انٹرنیٹ کی مدد سے پڑھ سکتا ہے۔

اِسی طرح مصر کے کچھ عرب حضرات میری کتابوں کو انٹرنیٹ پر ڈال رہے ہیں۔ ان شاء اللہ، اب ہر جگہ میری عربی کتابیں بھی انٹرنیٹ کی مدد سے پڑھی جاسکیں گی۔ اِس کے علاوہ، انڈیا میں ایک پوری ٹیم نے اپنے آپ کو اِس مشن کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اِس طرح یہ کام اب ہر دن عالمی سطح پر پھیل رہا ہے۔ اسی طرح کچھ تعلیم یافتہ لوگوں نے اِس لٹریچر کو اتنی زیادہ اہمیت دی کہ انھوں نے محض ذاتی جذبے کے تحت، میری اردو اور انگریزی تقریروں کو ٹی وی کے پروگرام میں شامل کر دیا۔ **فجزاهم الله خيرا الجزاء۔**

''عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر'' کا وجود میں آنا بلاشبہہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ میرے جیسے عاجز اور بے حقیقت آدمی کے ذریعے یہ واقعہ پیش آیا۔ اِس واقعے کی اِس کے سوا کوئی اور توجیہہ ممکن نہیں کہ اسمِ اعظم کے ساتھ مانگی جانے والی دعا جو میرے بے قرار دل سے نکلی، اُس کو خدا نے قبول فرمایا اور اِس طرح اسلام کے جدید تعارف کا وہ واقعہ پیش آیا جو میرے جیسے انسان کے لیے ناقابلِ تصور تھا۔

ایک واقعہ

24 اکتوبر 2006 کا واقعہ ہے۔ یہ عید کا دن تھا۔ میں اپنے گھر والوں کے ساتھ نئی دہلی کی ایک مسجد میں عید کی نماز ادا کرنے گیا۔ وہاں میں مسجد کے ایک گوشے میں تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ میں مسلسل رو رہا تھا اور

بے قراری کے عالَم میں دل کی زبان سے دعا کررہا تھا۔ میری اِس حالت کو مولانا محمد ذکوان ندوی نے دیکھا۔ بعد کو انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا کیا معاملہ تھا۔ اُن کے پوچھنے پر میں نے بتایا کہ مجھے وہ حدیث یاد آئی، جس میں عیدالفطر کے دن نماز کے لیے نکلنے والے اہلِ ایمان کا ذِکر ہے۔ وہ حدیث اِس طرح ہے:

''...... فإذا كان يومُ عيدِهم، يعني يومَ فِطرهم، باهىٰ بهم ملائكتَه، فقال: ملائكتي، ماجزاءُ أجيرٍ وفّىٰ عملَه۔ قالوا: ربّنا، جزائُه أن يُوفّىٰ أجره۔ قال: ملائكتي، عبيدى وإمائى قضوا فريضتى عليهم، ثمّ خرجوا يعُجُّون إلى الدّعاء، وعزّتي وجَلالِي وكَرمي وعُلوّى وارتفاعِ مكاني لأجيبنّهُم۔ فيقول: ارجعوا فقد غفرتُ لكم، وبدّلتُ سيّئاتكم حسنات۔ قال: فيرجعون مغفوراً لهم۔ (رواه البيهقي في شعب الإيمان، رقم الحديث: 3444)۔

ترجمہ: جب اُن کی عید کا دن آتا ہے، یعنی عیدفطر کا دن، تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے اُن پر فخر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: اے میرے فرشتو، اُس عامل کا اجر کیا ہے جس نے اپنے عمل کو پورا کردیا۔ فرشتے کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب، اُس کی جزا یہ ہے کہ اُس کو اُس کے عمل کا پورا بدلہ دے دیا جائے۔ خدا کہتا ہے کہ اے میرے فرشتو، میرے بندوں اور میری بندیوں نے میرے اُس فرض کو ادا کردیا جو اُن پر تھا، پھر وہ نکلے ہیں دعا کے ساتھ مجھ کو پکارتے ہوئے۔ میری عزت اور میرے جلال کی قسم، میرے کرم، میرے عُلوِ شان اور میرے بلند مقام کی قسم، میں ضرور اُن کی پکار کو سنوں گا۔ پھر خدا کہتا ہے کہ: تم لوگ واپس جاؤ، میں نے تم کو بخش دیا اور میں نے تمھارے سیّاٰت کو حسنات میں بدل دیا۔ پس وہ لوگ اِس طرح لوٹتے ہیں کہ اُن کی مغفرت ہوچکی ہوتی ہے۔

آج کے دن کی نسبت سے یہ حدیث مجھے یاد آئی۔ یہ سوچ کر میرا دل بے قرار ہوگیا کہ آج کے دن خدا لوگوں کو بڑے بڑے انعام دے رہا ہے، لیکن یہ انعام عمل کرنے والوں کے لیے ہے اور میرے پاس کوئی عمل نہیں۔

پھر مجھ کو سرسید احمد خاں (وفات: 1898) کا ایک واقعہ یاد آیا۔ وہ اپنے محمڈن کالج (موجودہ علی گڑھ

یونیورسٹی) کے چندے کے لیے ایک مسلم نواب کے یہاں گیے۔نواب صاحب سرسید کے بعض خیالات پر ان سے بہت غصہ تھے۔انھوں نے سرسید سے ملنے سے انکار کر دیا،مگر سرسید مایوس نہیں ہوئے۔ان کو معلوم تھا کہ شام کو نواب صاحب اپنی گھوڑا گاڑی پر سیر کے لیے نکلتے ہیں۔اُس وقت ان کی کوٹھی کے سامنے بھکاری لوگ بیٹھ جاتے ہیں۔نواب صاحب ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دیتے ہوئے آگے چلے جاتے ہیں۔

سرسید شام کے وقت وہاں پہنچے اور بھکاریوں کی صف میں اِس طرح بیٹھ گیے کہ اپنی ٹوپی کو کاسۂ گدائی کی طرح اپنے سامنے رکھ لیا۔نواب صاحب حسب معمول اپنی گھوڑا گاڑی پر نکلے۔ انھوں نے دیکھا کہ سرسید بھکاریوں کی صف میں بیٹھے ہوئے ہیں۔یہ دیکھ کر نواب صاحب کو تعجب ہوا۔انھوں نے کہا کہ سید تم یہاں کہاں۔سرسید نے جواب دیا کہ — نواب صاحب، اگر آپ مجھے چندہ نہیں دے سکتے تو بھیک تو دے سکتے ہیں۔اس بات کا نواب صاحب پر بہت اثر پڑا۔وہ اپنی گاڑی سے اتر پڑے اور سرسید کو لے کر اپنی کوٹھی کے اندر گیے۔ان کو عزت کے ساتھ بٹھایا اور ان کو کالج کے لیے کافی چندہ دیا۔

میں نے اس واقعے کو لے کر کہا کہ خدایا، اگر میں عمل کی بنیاد پر کچھ پانے کا مستحق نہیں تو بھیک کے طور پر تو مجھے اپنا انعام عطا کر دے، کیوں کہ تو نے قرآن میں جس طرح عامل کو عطیہ کا مستحق قرار دیا ہے، اِسی طرح تو نے سائل کو بھی عطیہ کا مستحق بتایا ہے۔اگر تو انسان سے یہ چاہتا ہے کہ وہ عامل کو دینے کے ساتھ سائل کو بھی دے تو یقیناً میں امید کر سکتا ہوں کہ تو خود بھی میرے ساتھ اِسی طرح کا معاملہ فرمائے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کی ایک مثال ہے، جس کی توفیق مجھے خدا کی خصوصی رحمت کے تحت حاصل ہوئی۔جہاں تک میرا تجربہ ہے، اسمِ اعظم کے ساتھ دعا نہ تو کسی یاد کیے ہوئے الفاظ کو دہرانے کا نام ہے اور نہ خود انسان پیشگی طور پر سوچ کر اِس قسم کی دعا کر سکتا ہے۔اِس قسم کی دعا براہِ راست خدا کی توفیق سے ہوتی ہے اور وہ اچانک ہی انسان کے سینے سے اُبل پڑتی ہے، جیسے کوئی جوالہ مُکھی پہاڑ اچانک پھٹ پڑے، حالاں کہ موسمیات کے ماہرین نے اس کی پیشین گوئی نہ کی ہو۔

99 اسماءِ حسنیٰ

1 - اللّٰہ	2 -الرّحمٰن	3 - الرّحيم	4 -الملِك	5 -القدّوس
6 -السّلام	7 -المؤمن	8 -المُهَيمن	9 -العزيز	10 -الجبّار
11 -المتكبّر	12 -الخالق	13 -البارئ	14 -المصوّر	15 -الغفّار
16 -القهّار	17 -الوهّاب	18 -الرزّاق	19 -الفتّاح	20 -العليم
21 -القابض	22 -الباسط	23 -الخافض	24 -الرّافع	25 -المُعِزّ
26 -المُذِلّ	27 -السّميع	28 -البصير	29 -الحَكَم	30 -العدْل
31 -اللطيف	32 -الخبير	33 -الحليم	34 -العظيم	35 -الغفور
36 -الشكور	37 -العلي	38 -الكبير	39 -الحفيظ	40 -المُقيت
41 -الحسيب	42 -الجليل	43 -الكريم	44 -الرّقيب	45 -المجيب
46 -الواسع	47 -الحكيم	48 -الودود	49 -المجيد	50 -الباعث
51 -الشهيد	52 -الحق	53 -الوكيل	54 -القوىّ	55 -المتين
56 -الوليّ	57 -الحميد	58 -المُحصي	59 -المُبدئ	60 -المعيد
61 -المحيى	62 -المُميت	63 -الحيّ	64 -القيّوم	65 -الواجد
66 -الماجد	67 -الواحد	68 -الصّمد	69 -القادر	70 -المقتدر
71 -المقدّم	72 -المؤخّر	73 -الأوّل	74 -الاٰخِر	75 -الظاهر
76 -الباطن	77 -الوالي	78 -المتعالي	79 -البَرّ	80 -التّواب
81 -المُنتقِم	82 -العفُوّ	83 -الرّءُوف	84 -مالك المُلك	
85 -ذُوالجلال والإكرام		86 -المُقسِط	87 -الجامع	88 -الغنيّ
89 -المُغني	90 -المانع	91 -الضّارّ	92 -النّافع	93 -النّور
94 -الهادي	95 -البديع	96 -الباقي	97 -الوارث	98 -الرّشيد

99 -الصّبور (فتح الباري بشرح صحيح البخاري، جلد11، صفحہ 220)۔

محبتِ الٰہی

محبتِ الٰہی

قرآن میں اہلِ ایمان کی ایک بنیادی صفت اِن الفاظ میں بتائی گئی ہے: والذین اٰمنوا أشدّ حبًّا للّٰہ (2:165) یعنی جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں، وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں۔ قرآن کی اِس آیت میں اہلِ ایمان سے مراد اہلِ معرفت ہیں۔ جو شخص دریافت کے درجے میں خدا کو پائے، وہ ایک صاحبِ معرفت انسان بن جاتا ہے، اور جو انسان صاحب معرفت ہو، اس کے جذبات تمام تر خدا کے ساتھ وابستہ ہو جائیں گے۔ خدا اس کے قلب و دماغ کا واحد مرکز بن جائے گا۔

انسان اپنی محدودیت کی بنا پر موجودہ دنیا میں خدا کو نہیں دیکھتا، لیکن وہ خدا کی رحمتوں کا ہر آن تجربہ کرتا ہے، اور یہی تجربہ محبتِ الٰہی کا اصل سرچشمہ ہے۔ آدمی کو اِس دنیا میں جو کچھ ملا ہوا، وہ سب کا سب خدا کی رحمت ہے۔ آدمی جتنا زیادہ اِن ملی ہوئی چیزوں پر غور کرے گا، اتنا ہی زیادہ خدا کے ساتھ اس کی محبت بڑھتی چلی جائے گی۔ خدا سے محبت کا سرچشمہ انعام کی دریافت ہے، نہ کہ منعم کا مشاہدہ۔

انسان کو کس نے پیدا کیا، خدا نے۔ انسان کو مختلف قسم کی اعلیٰ صلاحیتیں کس نے دیں، خدا نے۔ انسان کے لیے زمین جیسا ایک استثنائی سیارہ کس نے بنایا، خدا نے۔ انسان کے لیے یہاں لائف سپورٹ سسٹم کس نے قائم کیا، خدا نے۔ انسان کی تمام حاجتوں کی تکمیل کا انتظام کس نے کیا، خدا نے۔ انسان کو وہ دماغ کس نے دیا جو زمین پر رہتے ہوئے ساری کائنات کا احاطہ کرسکتا ہے، خدا نے۔

اِنھیں تمام انعام کے منعم کی دریافت کا نام معرفت ہے۔ کسی انسان کو جب یہ معرفت حقیقی معنوں میں حاصل ہو جائے تو اس کے اندر خدا سے محبت کا سرچشمہ ابل پڑتا ہے۔ اس کے دل کی گہرائیاں خدا کی محبت سے روشن ہو جاتی ہیں۔ خدا کی اطاعت بلاشبہہ ایمان کا تقاضا ہے، لیکن یہ خدا سے محبت کی تصغیر ہے کہ اُس کو صرف اطاعت کے معنی میں لیا جائے۔ اطاعت، خدا سے تعلق کا صرف ایک قانونی اظہار ہے، جب کہ محبت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا پورا وجود خدا کی یاد میں ڈھل گیا، انسان اپنی پوری ہستی کے ساتھ خدا کا اعترافِ کامل کرنے والا بن گیا۔

الحبُّ للہ

انسان کے اندر سب سے زیادہ طاقت ور جذبہ محبت کا جذبہ ہے۔ انسان جب کسی چیز کو اپنا سب سے بڑا کنسرن (supreme concern) بنائے تو اس کے بعد فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے محبت کے جذبات اس چیز سے وابستہ ہوجاتے ہیں۔ مذہبی اصطلاح میں اِسی کو ''معبود بنانا'' کہا جاتا ہے۔ جس چیز سے آدمی سب سے زیادہ محبت کرے، وہی اس کا معبود ہے، خواہ وہ اس کے لیے محبت کا لفظ بولے یا نہ بولے۔

ایمان باللہ یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اِس طرح دریافت کرے کہ اللہ ہی سے اس کو سب سے زیادہ محبت ہوجائے۔ اِسی کو قرآن میں: الذین آمنوا أشد حباً لله (2: 165) کہا گیا ہے۔ جو آدمی اللہ سے سب سے زیادہ محبت کرنے لگے، وہی وہ شخص ہے جس نے اللہ کو اپنا معبود بنایا۔

جس آدمی کے اندر اللہ کے لیے حقیقی محبت پیدا ہوجائے، اُس کے اندر سے یہ محبت مختلف شکلوں میں ظاہر ہونے لگے گی۔ ظہور کی اِنھیں مختلف شکلوں کو قرآن میں حمد اور شکر اور ذکر جیسے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ محبت ہی دراصل تعلق باللہ کی اصل ہے۔ اِس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ الحمد للہ کا مطلب ہے: الحب للہ۔ الشکر للہ کا مطلب ہے: الحب للہ۔ اِسی طرح اللہ کے لیے ذکر کثیر کا مطلب ہے: اللہ کے لیے محبتِ کثیر۔ قرآن میں آیا ہے کہ — اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے (13: 28)۔ اِس کا مطلب بھی یہی ہے کہ صرف اللہ کی محبت ہی وہ چیز ہے جس کے ذریعے انسان کو حقیقی معنوں میں اطمینانِ قلب عطا ہوتا ہے:

Love of God alone gives the peace of mind.

اللہ پر ایمان، اللہ کی دریافت (discovery) سے شروع ہوتا ہے۔ اِسی دریافت کو قرآن میں معرفت کہا گیا ہے۔ حقیقی معرفت وہ ہے جو آدمی کے پورے وجود میں شامل ہوجائے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو اِسی سے وہ تمام اعلیٰ مظاہر پیدا ہوتے ہیں جن کو محبت اور شکر اور ذکر جیسے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

محبتِ الٰہی، اطاعتِ الٰہی

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ — اللہ سے محبت کا مطلب اللہ کی اطاعت ہے۔ اِس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ اللہ کی ذات ایک غیر مرئی ذات (invisible being) ہے، اور ایک غیر مرئی ذات سے محبت جیسا جذباتی تعلق (emotional attachment) پیدا نہیں ہوسکتا، اُس کی صرف اطاعت ہی کی جاسکتی ہے۔ یہ اطاعت بواسطۂ احکام ہوگی جو ہم کو قرآن اور حدیث کے ذریعے معلوم ہوئے ہیں۔

یہ بات صحیح نہیں۔ کیوں کہ جو بات اللہ سے محبت کے بارے میں کہی جاتی ہے، وہی بات اللہ پر ایمان سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ اللہ پر ایمان اگر **یؤمنون بالغیب** کی صورت میں ہوسکتا ہے، تو اللہ سے محبت بھی **یحبون بالغیب** کی صورت میں یقینی طور پر ممکن ہے۔

اصل یہ ہے کہ ایمان کا معاملہ ہو یا محبت کا معاملہ، دونوں اللہ کی نسبت سے مطلوب ہیں، نہ کہ کسی عام نسبت سے۔ ایمان کا مطلب عقیدہ ہے۔ عقیدہ کا لفظ ایک مرئی چیز (visible entity) کے لیے بھی بولا جاسکتا ہے۔ اُس وقت عقیدہ اپنے عام لغوی مفہوم میں ہوگا۔ لیکن جب عقیدہ کا لفظ اللہ کے لیے بولا جائے تو وہ نسبت کے بدلنے کی وجہ سے مافوق عقیدہ (high belief) کے معنی میں ہوگا۔ اِسی طرح، محبت کا لفظ جب اللہ کی نسبت سے استعمال کیا جائے تو وہ مافوق محبت (high love) کے ہم معنی ہوجائے گا۔

انسانی نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ کسی سے انسان کا جذباتی تعلق حقیقتاً دیکھ کر قائم نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ فکر کے ذریعے تصوراتی سطح (conceptual level) پر قائم ہوتا ہے۔ خواہ بظاہر وہ کوئی مرئی چیز ہو یا غیر مرئی چیز، اُس سے انسان کا تعلق ہمیشہ تصوراتی سوچ کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔

انسان کی نفسیات کے اعتبار سے، عقیدہ تصوراتی عقیدہ (conceptual belief) کا نام ہے۔ تصوراتی سطح پر ہی کسی انسان کو اللہ کی معرفت (realization of God) حاصل ہوتی ہے، تصوراتی سطح پر ہی کوئی انسان اللہ سے محبت کرنے والا بنتا ہے، نہ کہ مشاہداتی سطح پر۔

محبتِ الٰہی، عشقِ الٰہی

قرآن اور حدیث میں اللہ کے لیے محبت کا ذکر ہے، لیکن قرآن اور حدیث میں اللہ کے لیے عشق کا ذکر نہیں۔ عشقِ الٰہی کا تصور بعد کو عباسی دور میں، صوفیا کے یہاں پیدا ہوا۔ یہ دراصل غلو (extremism) کا ظاہرہ (phenomenon) ہے۔ صوفیا نے بر بناءِ غلو یہ نظریہ قائم کیا کہ خدا کے لیے عبادت سرتاسر بے غرض ہونا چاہیے، جنت کی حرص یا جہنم کے خوف سے نہیں۔ اِسی سے صوفیانہ نظریے کی بنا پر عشق کا تصور پیدا ہوا۔ عشق دراصل محبت برائے محبت (love for the sake of love) کا نام ہے۔ عشق کے اِس تصور کا ماخذ خود صوفیا کا اپنا تصورِ عبادت تھا، نہ کہ اسلام کا تصورِ عبادت۔

اللہ سے محبت اسلام میں اعلیٰ ترین مطلوب چیز ہے۔ یہ محبت ذاتِ خداوندی سے عاشقانہ تعلق کی بنا پر نہیں ہوتی۔ اسلام کا تصورِ محبت تمام تر انعاماتِ الٰہی (divine blessings) کی بنیاد پر قائم ہے۔ انسان موجودہ دنیا میں خدا کے بے شمار انعامات کا تجربہ کرتا ہے۔ یہ انعامات آدمی کے اندر منعم (giver) کے لیے گہرا قلبی تعلق پیدا کر دیتے ہیں۔ اِسی گہرے قلبی تعلق کا نام محبتِ الٰہی ہے۔

عشق گویا کہ فزیکل لَو (physical love) کا نام ہے، اور اِس کے مقابلے میں، محبت گویا کہ اسپریچول لو (spiritual love) کا نام۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان، خدا کو اس کے انعامات کے واسطے سے دریافت کرتا ہے۔ انعام کی یہ دریافت (discovery) فطری طور پر آدمی کے اندر منعم کے لیے اعتراف (acknowledgement) کا ذہن پیدا کرتی ہے۔

عبادتِ الٰہی کی اصل یہی اعتراف (acknowledgement) ہے۔ حمد اور شکر اور ذکر جیسے الفاظ اصلاً اپنی حقیقت کے اعتبار سے، اِسی اعتراف کے مختلف نام ہیں۔ اِس اعتراف میں جب والہانہ قلبی جذبات شامل ہو جائیں تو اِسی کا نام محبت ہے۔

محبت فطری محبت کا نام ہے، اور عشق غلو آمیز محبت کا نام، اور قرآن اور حدیث کے واضح نصوص کے مطابق، غلو اسلام میں نہیں (لا غلوَّ في الإسلام)۔

محبتِ الٰہی، اعترافِ الٰہی

اللہ سے محبت ایمان کا جز ہے۔ اللہ سے محبت تمام الہامی مذاہب کی تعلیمات کا حصہ رہا ہے۔ مثلاً موجودہ بائبل، عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید، دونوں میں آیا ہے کہ — خداوند اپنے خدا سے، اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ:

You shall love the Lord your God with all your heart, with all your soul and with all your mind. (Matthew 22: 37, Deuteronomy 6: 5)

محبتِ الٰہی کسی پُر اسرار چیز کا نام نہیں۔ محبتِ الٰہی دراصل اعترافِ الٰہی کا اعلیٰ درجہ ہے۔ ایک شخص جب اللہ کی دریافت کرتا ہے، جب وہ اللہ کی نعمتوں سے شعوری طور پر واقف ہوتا ہے، جب وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا وجود اور اس کی پوری زندگی اللہ کے انعامات (blessings) سے بھری ہوئی ہے، اُس وقت فطری طور پر اُس کے اندر اللہ کے لیے شدید محبت (strong affection) کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اِسی حبِّ شدید کا نام محبتِ الٰہی ہے۔

محبتِ الٰہی، رب السماوات والارض سے محبت کا نام ہے۔ ایسی محبت کسی آدمی کے لیے صرف جذباتی تعلق کا نام نہیں ہوتا، اِس کے ذریعے آدمی کی شخصیت میں ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ محبتِ الٰہی آدمی کے اندر تمام اعلیٰ صفات پیدا کرتی ہے۔ مثلاً مثبت سوچ (positive thinking)، انسانوں کے لیے شفقت، توکل علی اللہ اور اعتماد اور حوصلہ، وغیرہ۔

محبت اللہ کی نسبت سے، معرفت کا اعلیٰ درجہ ہے۔ انسان کی نسبت سے معرفت آدمی کے اندر انسان دوست کردار (human-friendly behaviour) پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ دعوت الی اللہ بھی محبت الٰہی کا ایک اظہار ہے۔ جب کسی انسان کو اللہ سے محبت کا تعلق قائم ہوتا ہے تو فطری طور پر وہ چاہنے لگتا ہے کہ وہ اللہ کے بندوں تک اللہ کا پیغام پہنچائے، یہاں تک کہ اللہ کا کوئی بندہ اپنے رب کی ابدی رحمتوں سے محروم نہ رہے۔

محبتِ الٰہی سے محرومی کیوں

قرآن کے مطابق، خدا کی اعلیٰ معرفت صرف اُس شخص کو ملتی ہے جس کو اللہ سے اعلیٰ تعلق قائم ہو جائے۔ اللہ سے اعلیٰ تعلق کی پہچان یہ ہے کہ انسان کو اللہ سے حبّ شدید (2: 165) اور اللہ سے خوفِ شدید (9: 18) پیدا ہو جائے۔

جب کسی انسان کو اللہ کے ساتھ اِس قسم کا گہرا تعلق پیدا ہو جائے تو اس کے اندر ذکرِ کثیر (33: 41) کی صفت پیدا ہو جاتی ہے، یعنی اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنا، اللہ کے لیے بہت زیادہ سوچنا۔ اللہ کے ساتھ تعلق میں اگر ایک فی صد بھی کمی آجائے تو ایسے انسان کو اللہ کی اعلیٰ معرفت حاصل نہیں ہوگی۔

یہود کا حال بعد کے زمانے میں یہ ہوا کہ ان کا گہرا تعلق اللہ سے نہ رہا، بلکہ اپنے اَحبار اور رُہبان سے ہو گیا۔ اِس کے نتیجے میں وہ اللہ کی اعلیٰ معرفت سے محروم ہو گئے۔ یہی موجودہ زمانے میں مسلمانوں کا حال ہے۔ مسلمانوں کے ہر گروہ کے کچھ بڑے (bigs) ہیں اور ان کا گہرا تعلق اپنے اِنھیں بڑوں سے ہے، نہ کہ خداوند ذو الجلال سے۔

اپنے اِن بڑوں کو انھوں نے مقدس نام دے رکھے ہیں۔ مثلاً اکابر، اسلاف، مشائخ، بزرگانِ دین، وغیرہ۔ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے اِنھیں مفروضہ بڑوں سے گہرا قلبی تعلق رکھتے ہیں۔ اِس گہرے قلبی تعلق کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے اِن بڑوں کے خلاف علمی تنقید کو بالکل پسند نہیں کرتے۔

یہ غیر خدا کے ساتھ حب شدید کا تعلق قائم کرنا ہے اور جو لوگ کسی غیر خدا کے ساتھ حب شدید کی نفسیات میں مبتلا ہوں، وہ کبھی اللہ کی محبت کی توفیق نہیں پاتے۔ ایسے لوگوں کے حصے میں صرف رسمی عقیدہ آتا ہے، نہ کہ اعلیٰ ایمان باللہ جو آدمی کو اعلیٰ معرفت تک پہنچانے والا ہو— محبت الٰہی کی ایک قیمت ہے، اور یہ قیمت ادا کیے بغیر کسی کو اللہ کی محبت حاصل نہیں ہو سکتی۔

معرفت کے دو پہلو

خدا کی معرفت کے دو پہلو ہیں — محبت، اور خشیت۔ خدا ایک طرف رحیم ہے، اور دوسری طرف وہ عادل ہے۔ انسان جب خدا کی بے پایاں رحمت کو سوچتا ہے تو اس کے اندر وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کو قرآن میں: أشد حبّا لله (2: 165) کہا گیا ہے، یعنی اللہ سے بہت زیادہ محبت کرنے والے۔ اِسی طرح جب ایک انسان خدا کے عادل ہونے کو سوچتا ہے تو اس کے اندر وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کو قرآن میں: ولم یخش إلا الله (9: 18) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

مومن کی شخصیت اِنھیں دو کیفیات کے ذریعے بنتی ہے۔ ایک طرف، وہ اپنے رب سے بہت زیادہ محبت کرنے والا ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف، وہ اپنے رب سے بہت زیادہ ڈرنے والا ہوتا ہے۔ خدا کی محبت ایک ایسی محبت ہے جو سراپا درد سے بھری ہوتی ہے۔ اِسی طرح خدا سے خوف ایک ایسا خوف ہے جو محبت کے جذبات سے معمور ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا تعلق ہے جس میں آدمی جس ہستی سے پانے کی امید رکھتا ہے، اُسی ہستی کے بارے میں اس کو یہ اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ وہ کہیں اپنی رحمتوں سے اس کو محروم نہ کردے۔ یہ محبت اور خوف کا ایک ایسا امتزاج ہے جس کو محسوس کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

یہی اعلیٰ معرفت کی پہچان ہے۔ اعلیٰ معرفت سکون بھی ہے اور تڑپ بھی۔ اعلیٰ معرفت امید بھی ہے اور خوف بھی۔ اعلیٰ معرفت یقین بھی ہے اور بے یقینی بھی۔ اعلیٰ معرفت قربت بھی ہے اور دوری بھی۔ اعلیٰ معرفت ایک ایسا مقام ہے جہاں بندے کو کبھی یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ منزل پر پہنچ گیا اور کبھی اس کو یہ شبہہ ہوتا ہے کہ وہ ابھی راستے میں سرگرداں ہے۔ کبھی وہ اِس احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ وہ فل اسٹاپ (full stop) تک پہنچ گیا، اور کبھی وہ اِس شک میں مبتلا رہتا ہے کہ ابھی وہ کاما (comma) کے مرحلے سے گزر رہا ہے — محبت اور خشیت کی اِنھیں کیفیات کا نام معرفت ہے۔

الحمدللہ

قرآن کی پہلی آیت یہ ہے: **الحمد للہ ربّ العالمین** (1:1)۔ ان الفاظ کو اگر صرف زبان سے ادا کرنا ہو تو آدمی ایک لمحے میں اُس کو زبان سے دہرا سکتا ہے۔ لیکن حقیقی معرفت کی بنیاد پر اِن الفاظ کا زبان سے نکلنا اتنا عظیم ہے کہ اُس سے زیادہ عظیم اور کوئی چیز نہیں۔ اِس لیے حدیث میں آیا ہے کہ: **الحمد لله تملأ الميزان** (صحيح مسلم، رقم الحديث: 556) یعنی الحمدللہ آدمی کی میزانِ عمل کو بھر دیتا ہے۔

ایک انسان جب سوچتا ہے کہ پندرہ بلین سال پہلے موجودہ کائنات شروع ہوئی۔ اُس وقت سے اب تک وہ توسیع پذیر ہے۔ یہ سوچ آدمی کے اندر دہشت انگیز عظمت کا احساس طاری کر دیتی ہے۔ پھر جب انسان اپنی تخلیق پر سوچتا ہے تو وہ پاتا ہے کہ میرا وجود ایک ایسا معجزاتی وجود ہے جس کے ایک انتہائی قلیل جز کو بھی میں پیدا نہیں کر سکتا۔

پھر وہ انسان سوچتا ہے کہ خلا (space) سے خدا اس کے لیے سورج کی روشنی اور حرارت بھیج رہا ہے۔ ہواؤں کے ذریعے آکسیجن کی فراہمی کا ایک مسلسل نظام قائم ہے۔ زمین سے طرح طرح کی غذائیں پیدا ہو رہی ہیں۔ زمین میں انتہائی متناسب قوتِ کشش اُس کو مسلسل طور پر سنبھالے ہوئے ہے۔ اس کے اِردگرد ایک مکمل قسم کا لائف سپورٹ سسٹم قائم ہے، وغیرہ۔

اِس قسم کی باتوں کو سوچتے ہوئے آدمی کو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ شکرِ خداوندی کے سمندر میں داخل ہو گیا ہے۔ اس کی روح ایک عظیم ربانی طوفان (divine storm) سے دوچار ہو رہی ہے۔ اس کے دماغ میں اہتزاز (thrill) کا چشمہ جاری ہو گیا ہے۔ یہ ناقابلِ بیان ربانی احساسات جب ایک انسان کی زبان سے کائناتی اعتراف کی صورت میں بے تابانہ طور پر نکل پڑیں تو اِسی کا نام حمدِ خداوندی ہے۔ حمدِ خداوندی کے یہی وہ احساسات ہیں جو قرآن میں اس طرح بیان کئے گئے ہیں: **الحمد لله رب العالمين** (ساری حمد اللہ رب العالمین کے لیے ہے)

محبتِ الٰہی کا سرچشمہ

قرآن کی سورہ النحل میں ارشاد ہوا ہے: **واشكروا نعمة الله إن كنتم إياّه تعبدون** (16: 114) یعنی تم اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو، اگر تم اللہ ہی کی عبادت کرنے والے ہو۔ اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرنا کوئی سادہ بات نہیں، اِس میں اللہ سے محبت اپنے آپ شامل ہے۔ نعمتوں کا احساس، آدمی کے اندر اس کے دینے والے کے لیے محبت پیدا کرتا ہے۔ اس کے بعد آدمی کی زبان سے شکر، یعنی اعتراف (acknowledgement) کا کلمہ نکلتا ہے۔ گویا کہ انعام سے، منعم کے لیے محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور محبت، اعتراف کے کلمات میں ڈھل جاتی ہے۔ اِسی کو شکر کہا گیا ہے۔

اِسی حقیقت کو ایک حدیث رسول میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے: **أحبوا الله لما يغذواكم به من نِعَمه** (**المستدرك للحاكم، رقم الحديث:** 4716) یعنی تم اللہ سے محبت کرو اُس کی اُن نعمتوں کی بنا پر جن نعمتوں کا رزق اللہ نے تم کو عطا فرمایا ہے۔

اِس روایت میں 'غذا' کا لفظ علامتی معنوں میں ہے۔ یہاں غذا سے مراد ہر قسم کے عطیات ہیں جو اللہ کی طرف سے انسان کو ملے ہیں۔ اِس میں مادّی عطیات (material blessings) بھی شامل ہیں، اور معنوی عطیات (spiritual blessings) بھی۔

قرآن کی مذکورہ آیت اور مذکورہ حدیث رسول پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ احساسِ محبت کا سرچشمہ احساسِ نعمت ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان کو جو بھی چھوٹی یا بڑی چیز ملی ہے، وہ سب کی سب، اللہ کی طرف سے یک طرفہ انعام کے طور پر ملی ہے۔ انسان اپنے بارے میں اور خارجی دنیا کے بارے میں جتنا زیادہ سوچے گا، اتنا ہی زیادہ وہ اللہ کی نعمتوں کو دریافت کرے گا۔

انسان جب شعوری طور پر اِن خدائی نعمتوں کو دریافت کرتا ہے تو اُس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر دینے والے کے لیے محبت کے گہرے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں، پھر یہی محبت ذکر اور شکر اور عبادت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

محبتِ الٰہی کی قیمت

قرآن کی سورہ الاحزاب میں فطرت (nature) کے ایک قانون کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: ما جعل اللّٰہ لرجل من قلبین في جوفه (33: 4) یعنی اللہ نے کسی آدمی کے سینے میں دو دل نہیں رکھے:

God has not placed two hearts in any man's body.

اِس قانونِ فطرت کا یہ نتیجہ ہے کہ انسان کے دل میں نفرت اور محبت دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ اگر انسان کے اندر نفرت کا جذبہ پیدا ہو جائے تو محبت کا جذبہ اس کے اندر سے نکل جائے گا۔ اِسی طرح جو انسان محبت کرنے والا بن جائے، اُس کے اندر سے دوسروں کے خلاف نفرت کا جذبہ ختم ہو جائے گا۔ یہ ایک سنگین مسئلہ ہے، اور اس معاملے میں ہر ایک کو بے حد محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔

انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اللہ سے شدید محبت کرنے والا بنے (2: 165)۔ اِس محبت کے بغیر کوئی شخص خدا کے اعلیٰ عنایات کا مستحق نہیں بن سکتا۔ مگر اِس محبت الٰہی کی ایک لازمی قیمت ہے، وہ قیمت یہ ہے کہ انسان کسی بھی حال میں اپنے اندر نفرت کے جذبات آنے نہ دے۔ وہ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی ہر شکایت کو بھلائے، وہ ہر غلطی کو معاف کرے، وہ ہر ظلم پر صبر کرے، وہ ہر ناپسندیدہ بات کو نظر انداز کرے، غرض وہ ہر قیمت کو ادا کر کے اپنے آپ کو نفرت سے دور رکھے۔ یہی محبت الٰہی کی قیمت ہے۔ جو آدمی یہ قیمت ادا نہ کرے، وہ محبتِ الٰہی کی سعادت سے محروم رہے گا۔

عام طور پر لوگ یہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی نفرت کے لیے ایک عذر (excuse) تلاش کر لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میری نفرت فلاں سبب سے ہے، اور جہاں یہ سبب پایا جاتا ہو، وہاں کوئی شخص نفرت سے بچ نہیں سکتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ محبتِ الٰہی کے معاملے میں ہر عذر ایک جھوٹا عذر ہے۔ اِس معاملے میں کوئی بھی عذر قابلِ سماعت نہیں۔ اِس معاملے میں کسی عذر کو اپنے لیے عذر بنانا، صرف اِس قیمت پر ہوگا کہ ایسا شخص خدا کی محبت سے محروم ہو کر رہ جائے۔

اللہ سے محبت

قرآن کی سورہ البقرہ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ پر ایمان لانے والے، اللہ سے شدید محبت رکھتے ہیں (2: 165)۔ اِس آیت میں محبتِ الٰہی سے کیا مراد ہے۔ صوفیا اس کو عشقِ الٰہی کے معنی میں لیتے ہیں۔ علماء کا عام طور پر ماننا یہ ہے کہ محبتِ الٰہی سے مراد اطاعتِ الٰہی ہے۔ مگر اِن دونوں تفسیروں میں محبت کا اصل مفہوم نہیں آتا۔ محبت دراصل کسی کے ساتھ نہایت گہرے قلبی میلان کا نام ہے، یعنی:

Strong affection, deep emotional attachment.

اللہ کے ساتھ یہ گہرا قلبی میلان اُس انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے جو اللہ کے اعلیٰ انعامات کو شعوری طور پر دریافت کرے۔ اللہ نے انسان کو پیدا کیا جب کہ اس کا کوئی وجود نہ تھا (19:9)۔ اللہ نے انسان کو بہترین صورت عطا فرمائی (40: 64)، اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا (**خلق اللہ آدم علی صورتہ**)۔ انسان کو اللہ نے رہنے کے لیے زمین دی، جہاں استثنائی طور پر اس کی ضرورت کی تمام چیزیں موجود تھیں، انسان کے لیے اللہ نے جنت کی صورت میں ایک معیاری دنیا (perfect world) بنائی، انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک معیاری جنت بنائی، جہاں اس کو پورا فل فلمینٹ حاصل ہو۔ اللہ نے انسان کو عقل دی جو حدیث کے مطابق، تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ اکرم واشرف چیز ہے (**ما خلق اللہ خلقاً أکرم علیہ من العقل**)، اللہ نے انسانوں کے اندر استثنائی طور پر مودّت پیدا کی جس کی وجہ سے خاندان اور سماج جیسی چیز وجود میں آتی ہے (30: 21)۔ اِن سب پر مزید یہ کہ اللہ نے انسان کو استثنائی طور پر شعور دیا جس سے وہ انعاماتِ الٰہی کو جانے۔ اللہ نے استثنائی طور پر انسان کو احساسِ لذت (sense of pleasure) دیا، جس سے وہ انعامات سے پوری طرح محظوظ ہو سکے۔

اِس طرح کے بے شمار انعامات ہیں جو اللہ نے انسان کو عطا کیے ہیں۔ جب آدمی اِن بے شمار انعاماتِ الٰہی کو سوچتا ہے تو اس کے اندر وہی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کو قرآن میں حبِّ شدید (2: 165) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

حقیقی محبت، اضافی محبت

قرآن کی سورہ البقرہ میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ ایمان کو سب سے زیادہ محبت اللہ سے ہوتی ہے (2: 165) خدا سے محبت کا مطلب کیا ہے۔ علما عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ خدا سے محبت کا مطلب خدا کی اطاعت ہے۔ اِس کے مقابلے میں، صوفیا کا یہ کہنا ہے کہ خدا سے محبت کا مطلب خدا سے عشق ہے۔ مگر یہ دونوں باتیں قرآن کی آیت کی صحیح تشریح نہیں۔

محبت دراصل قلبی تعلق کا نام ہے۔ گہری قلبی کیفیت کے ساتھ جب آپ کو کسی سے غیر معمولی تعلق قائم ہو جائے تو اسی کا نام محبت ہے۔ اِس پہلو سے، صرف خدائے واحد اِس کا مستحق ہے کہ ایک بندہ اُس سے شدید محبت کرے۔ خدا کی نسبت سے محبت، خدا کی نعمتوں کے اعلیٰ اعتراف کا دوسرا نام ہے۔ اِس قسم کی محبت کا حق بلاشبہہ صرف خدا کو ہے، اُس کے سوا کسی اور کو نہیں۔

محبت کی دو قسمیں ہیں — حقیقی محبت (real love)، اور اِضافی محبت (relative love)۔ دنیا کی زندگی میں مختلف اسباب سے ایک انسان کو دوسرے انسان سے محبت کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، حتی کہ ایک گھر اور ایک حیوان سے بھی۔ لیکن اِس قسم کی محبتیں انسان کے مرتے ہی فوراً ختم ہو جاتی ہیں۔ اِس لیے اِس قسم کی تمام محبتیں اضافی محبتیں ہیں۔ وہ وقتی اسباب سے پیدا ہوتی ہیں اور اسباب کے ختم ہوتے ہی وہ اچانک ختم ہو جاتی ہیں۔ اِس کے مقابلے میں، خدا کی محبت حقیقی محبت ہے۔ وہ حقیقی اسباب سے پیدا ہوتی ہے اور جب وہ کسی انسان کے اندر پیدا ہو جائے تو وہ ابدی طور پر باقی رہتی ہے، موت اُس کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔ خدا نے انسان کو وجود بخشا، خدا نے انسان کو اِس دنیا میں رہنے کے لیے ایک بے حد موافق زمین دی، خدا نے انسان کے لیے اعلیٰ درجے کا لائف سپورٹ سسٹم قائم کیا، اِس طرح کی ان گنت چیزیں جو اِس دنیا میں انسان کو ملی ہوئی ہیں، ان کو دینے والا صرف خدا ہے، کوئی بھی دوسرا شخص اِن عطیات میں خدا کا شریک نہیں۔ یہ احساس جب کامل اعتراف میں ڈھل جائے تو اِسی کا نام محبتِ خداوندی ہے۔

جنتِ قریب، جنت بعید

قرآن کی سورہ القمر میں اہلِ جنت کے بارے میں ارشاد ہوا ہے: **إنّ المتقین فی جنات ونهر، فی مقعد صدقٍ عند ملیكٍ مقتدر** (55-54) یعنی بے شک اللہ سے ڈرنے والے لوگ باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے، بیٹھے ہوئے سچائی کی سیٹ پر، قدرت والے بادشاہ کے پاس۔

قرآن کی اِس آیت اور دوسری آیتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے دو درجے ہیں — ایک، جنت قریب، اور دوسری، جنت بعید۔ جنت قریب، خدا کے پڑوس میں ہوگی۔ یہاں وہ لوگ بسائے جائیں گے جو اعلیٰ معرفت والے لوگ ہوں گے۔ جنت بعید سے مراد خدا کے پڑوس سے دور کی جنت ہے۔ اِس جنت میں عام اہلِ ایمان کو جگہ ملے گی۔ عام اہلِ ایمان بھی جنت میں جگہ پائیں گے، لیکن ان کو جنتِ بعید میں جگہ ملے گی، نہ کہ جنت قریب میں۔

اعلیٰ معرفت والے لوگ وہ ہیں جن کے بارے میں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: **والذین اٰمنوا أشدّ حبّا لله** (البقرة: 165) یعنی جو ایمان والے ہیں، وہ سب سے زیادہ محبت اللہ سے رکھنے والے ہیں۔ یہ وہ اصحابِ معرفت ہیں جنھوں نے اللہ کو ایسی برتر ہستی کے طور پر دریافت کیا جو کامل طور پر ان کے دل ودماغ پر چھا گیا۔ ان کی ساری محبتیں ایک اللہ کے لیے وقف ہوگئیں۔ اللہ وحدہ لاشریک ہی اُن کا سب سے بڑا کنسرن (supreme concern) بن گیا۔ اُن کی سوچ تمام تر اللہ والی سوچ (God-oriented thinking) بن گئی۔

جن لوگوں کو اللہ سے محبت کے درجے کا تعلق ہوجائے، وہ اللہ کے حضور (presence) میں جینے لگتے ہیں۔ اُن کو دنیا ہی میں اللہ کی قربت حاصل ہوجاتی ہے۔

ایسے لوگوں کو دنیا میں یہ قربت (closeness) نفسیات کی سطح پر ملتی ہے، آخرت میں اُن کو قربت کا یہ تجربہ عملی سطح پر ہونے لگے گا۔ وہ دنیا ہی کی زندگی میں خدا کی قربت کا تجربہ کررہے تھے، آخرت میں اُنھیں قربتِ الٰہی کے مزید اعلیٰ درجات حاصل ہوجائیں گے۔

اللہ کی محبت

قرآن کی سورہ البقرہ میں ارشاد ہوا ہے: والذین آمنوا أشد حبّا للہ (2:165)۔ اِس آیت کے مطابق، اللہ کا مومن بننے کی پہچان یہ ہے کہ آدمی کے اندر اللہ کے لیے حبّ شدید پیدا ہوجائے۔ مذکورہ قرآنی آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ اہلِ ایمان اللہ سے حب شدید کرتے ہیں، بلکہ یہ فرمایا کہ اہلِ ایمان کے اندر اللہ سے حب شدید ہوتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ محبت جواب (response) کے طور پر کسی انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ جب ایک انسان اللہ کو اپنے سب سے بڑے محسن اور منعم کی حیثیت سے دریافت کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں ایسا ہوتا ہے کہ اس کے سینے میں اللہ کے لیے محبت کا سمندر موج زن ہوجاتا ہے۔

اِسی کا نام حبّ شدید ہے۔ محبت اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک دریافت (discovery) کا نتیجہ ہے، وہ محض ایک حکم کی تعمیل نہیں۔

انسان جب اپنے آپ کو احسنِ تقویم (95:4) کی حیثیت سے دریافت کرتا ہے، جب وہ دریافت کرتا ہے کہ اللہ نے اس کے ساتھ تکریم (17:70) کا معاملہ کیا ہے، جب وہ دریافت کرتا ہے کہ اللہ نے اس کے لیے زمین اور آسمان کو مسخر کردیا ہے، جب وہ ان بے شمار نعمتوں کو دریافت کرتا ہے جن کو لائف سپورٹ سسٹم کہا جاتا ہے، جب وہ اللہ کے اِس احسان کو دریافت کرتا ہے کہ اُس نے پیغمبر کے ذریعے اس کی ہدایت کا انتظام فرمایا، جب کہ وہ اس سے پوری طرح بے خبر تھا، جب وہ کائناتی پیمانے پر اللہ کی تخلیق اور اس کی ربوبیت کو دریافت کرتا ہے تو اس کے دل میں شکر کا بے پناہ جذبہ امنڈ پڑتا ہے۔ یہی شکرِ الٰہی محبتِ الٰہی کا منبع ہے۔ اِسی سے انسان کے اندر وہ گہرا جذبہ پیدا ہوتا ہے جس کو قرآن میں حب شدید کہا گیا ہے۔

اصل بات یہ نہیں ہے کہ محبت کرو، اصل بات یہ ہے کہ اللہ کو اتنے بڑے منعم کی حیثیت سے دریافت کرو کہ تمھارے اندر اللہ کے لیے حب شدید پیدا ہوجائے۔

مومنِ قوی، مومنِ ضعیف

انسانوں میں قوی انسان بھی ہوتے ہیں اور ضعیف انسان بھی، ذہنی اعتبار سے بھی اور جسمانی اعتبار سے بھی۔ تخلیق کا یہی فرق اہلِ ایمان میں بھی پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ مومن قوی ہوتے ہیں اور کچھ لوگ مومن ضعیف۔ اِس فرق کے بارے میں ایک حدیثِ رسول اِن الفاظ میں آئی ہے: المؤمن القويّ خير وأحبّ إلى الله من المؤمن الضعيف، وفي كلٍّ خير (صحيح مسلم، 4823) یعنی اللہ کے نزدیک، ضعیف مومن کے مقابلے میں، قوی مومن زیادہ بہتر اور زیادہ محبوب ہے، اور دونوں میں سے ہر ایک کے لیے خیر ہے۔ خیر کے معنی بھلائی کے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ سوال ہے کہ دونوں ہی قسم کے مومن میں خیر کے پائے جانے کا مطلب کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ دونوں کا خیر دو مختلف معنی میں ہے۔ مومن قوی کا خیر یہ ہے کہ اُس کو اللہ تعالیٰ نے زیادہ صلاحیت دے کر پیدا کیا، اور مومن ضعیف کا خیر یہ ہے کہ کم تر صلاحیت کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس کی تلافی کے لیے زیادہ نصرت مقدر کردی۔ ظاہر ہے کہ انسانی صلاحیت کے مقابلے میں، خدائی نصرت زیادہ بڑی ہے۔ اِس لیے مومن ضعیف اگر حقیقی طور پر ایمان کے راستے پر چلے تو وہ خدا کی خصوصی نصرت کی بنا پر مومن قوی سے بھی زیادہ بڑا کام کرسکتا ہے۔ یہ مومن ضعیف کے لیے بلاشبہہ ایک عظیم خوش خبری ہے۔

ضعف کسی آدمی کے لیے اپنے عجز (helplessness) کی دریافت کا سبب بنتا ہے، عجز ہی وہ مقام ہے جہاں کوئی شخص اپنے آپ کو کھڑا کرسکتا ہے۔ خدا کامل معنوں میں، قادرِ مطلق (all-powerful) ہے۔ خدا کی قدرت اِس کائنات کا آخری حد تک احاطہ کئے ہوئے ہے۔ کوئی بھی مقام خدا کی قدرت سے باہر نہیں۔ ایسی حالت میں انسان کے لیے اِس دنیا میں کھڑے ہونے کی جگہ صرف ایک ہے، اور وہ عجز ہے۔ خدا کے ساتھ انسان کی نسبت صرف عجز کی سطح پر قائم ہوتی ہے۔ عجز ہی خدا اور انسان کے درمیان نقطۂ ملاقات (meeting point) ہے۔ ضعیف انسان اپنے اِس عجز کو دریافت کرتا ہے، اِس لیے صرف ضعیف انسان اِس قابل بنتا ہے کہ خدا اپنی نصرت اُس پر انڈیل دے۔

معرفت کے دو درجے

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — میرے رب نے مجھے پیش کش کی کہ وہ مکہ کی وادی کو میرے لیے سونا بنادے۔ میں نے کہا کہ اے میرے رب، نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں ایک دن سیر ہو کر کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں۔ پھر جب مجھے بھوک لگے تو میں تجھ سے تضرع کروں اور تجھ کو یاد کروں، اور جب میں شکم سیر ہوں تو تیری حمد کروں اور تیرا شکر کروں: **فإذا جعتُ تضرعتُ إليك وذكرتُك، وإذا شبعتُ حمدتك وشكرتك** (سنن الترمذي، رقم الحديث: 2347)

اِس حدیث سے پیغمبر کی معرفت کا درجہ معلوم ہوتا ہے۔ پیغمبر کی معرفت شعور کی سطح پر ہوتی ہے۔ پیغمبر کسی دباؤ کے بغیر ذاتی ارادے کے تحت وہ فیصلہ کرتا ہے جس کی ایک مثال مذکورہ روایت میں نظر آتی ہے۔ معرفت کے اِس درجے کو ایک لفظ میں اختیاری عجز کہا جاسکتا ہے۔

معرفت کا دوسرا درجہ وہ ہے، جب کہ اللہ اپنے کسی بندے کے ساتھ یہ رحمت فرمائے کہ اُس کو مجبورانہ حالات میں ڈال دے اور اِس طرح اضطراری طور پر اس کو حمد وشکر کا تجربہ کرائے۔

غالباً یہی وہ بات ہے جس کو ایک حدیث میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے: **إن الله إذا أحبّ قوما ابتلاهم** (سنن الترمذي، رقم الحديث: 23623) یعنی جب اللہ کسی سے محبت کرتا ہے تو وہ اس کو آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ گویا کہ پیغمبر کی معرفت اختیارانہ سطح پر ہوتی ہے، اور غیر پیغمبر کی معرفت مجبورانہ سطح پر۔

فانی بدایونی (وفات: 1940) ایک عارف شاعر تھے۔ اُن کا کلام دوسرے شاعروں سے بہت مختلف ہے۔ فانی بدایونی کا حسب ذیل شعر غالباً معرفت کی اسی دوسری قسم کو بتاتا ہے:

میری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول ۔۔۔ تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دُکھا ہوا

قابلِ رشک افراد

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ سنن البیہقی کے الفاظ یہ ہیں: **ألا أخبركم عن أقوام ليسوا بأنبياءَ ولا شهداءَ يغبطهم يوم القيامة الأنبياءُ والشهداء بمنازلهم من الله عزّوجلّ على منابر من نور يكونون عليها۔ قالوا: من هم۔ قال: الذين يحبِّبُون عباد الله إلى الله، ويحبِّبُون الله إلى عباده، وهم يمشون على الأرض نُصحاء (شعب الإيمان، رقم الحديث: 405)** یعنی کیا میں تم کو بتاؤں ایسے لوگوں کے بارے میں جو نہ پیغمبر ہوں گے اور نہ شہید، لیکن قیامت کے دن پیغمبر اور شہید ان پر رشک کریں گے، اُن کے اُس درجے کی وجہ سے جو اللہ کے یہاں ان کو حاصل ہوگا۔ وہ وہاں نور کے ممبروں پر ہوں گے۔ پوچھا گیا کہ وہ کون لوگ ہوں گے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو اللہ کے بندوں کو اللہ سے محبت کرنے والا بنائیں، اور اُن کو اِس قابل بنائیں کہ اللہ اُن سے محبت کرے اور وہ زمین پر چلیں لوگوں کا ناصح (well-wisher) بن کر۔

انبیاء کے لیے قابلِ رشک بننے والے یہ کون لوگ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کو اِس طرح دریافت کریں کہ اللہ اُن کا محبوب بن جائے۔ وہ اللہ کی محبت میں جینے لگیں۔ اللہ سے بڑی کوئی ذات نہیں، اِس لیے اللہ کی محبت سے بڑا کوئی عمل نہیں ہوسکتا۔ جب کسی انسان کا یہ حال ہوگا تو وہ دوسروں کو بھی وہی اعلیٰ ترین چیز دینے کی کوشش کرے گا جو اُس نے خود اپنے لیے پائی ہے۔ وہ اپنی ساری توانائی کو استعمال کرکے یہ کوشش کرے گا کہ دوسرے لوگ بھی خدا کو اُس کی اُس اعلیٰ حیثیت میں دریافت کریں جب کہ خدا کی معرفت اُن کے دلوں میں اتر جائے، جب کہ خدا اُن کے لیے وہ ہستی بن جائے جس سے وہ سب سے زیادہ محبت کرتے ہوں، جب کہ خدا کی ذات اُن کے لیے وہ اعلیٰ ہستی بن جائے جو اُن کے تمام قلبی جذبات کا مرکز ہو۔ جو لوگ اِس طرح اللہ کو اپنا محبوب بنالیں تو ایسے لوگ خود بھی اللہ کے محبوب بندے بن جاتے ہیں—— یہی ایمان کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔

ایک حدیثِ قدسی

ایک حدیثِ قدسی اِن الفاظ میں آئی ہے: قال اللہ عزو جل: إذا أحبّ عبدي لقائي، أحببتُ لقاءَ ہ (فتح الباري بشرح صحیح البخاري، 11/366) یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب میرے کسی بندے کا یہ حال ہوتا ہے کہ مجھ سے ملاقات اُس کے لیے محبوب چیز بن جاتی ہے، تو میرے لیے بھی اُس بندے سے ملاقات کرنا محبوب ہوجاتا ہے۔

یہ کوئی پراسرار معاملہ نہیں ہے۔ یہ ایک معلوم حقیقت کا اظہار ہے۔ یہ بندے کی طرف سے دریافت کا واقعہ ہے، اور اللہ کی طرف سے دریافت کی قدردانی کا واقعہ۔

اصل یہ ہے کہ ایک بندہ جب غوروفکر کرتا ہے۔ پھر اس کے نتیجے میں جب اس کو اپنے رب کی دریافت ہوتی ہے۔ جب وہ اپنے بارے میں اللہ کی بے پایاں نعمتوں کو یاد کرتا ہے تو اِس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ سے بے پناہ محبت کرنے لگتا ہے۔ ایسے بندے کے لیے مقدر ہے کہ وہ اللہ کا پسندیدہ بندہ بن جائے۔ دنیا سے لے کر آخرت تک اُس کو اللہ کی خصوصی رحمت ملتی رہے۔

کسی بندے کے دل میں اللہ سے محبت اُس وقت پیدا ہوتی ہے، جب کہ وہ اللہ کو اپنے منعمِ حقیقی کی حیثیت سے دریافت کرے، جب کہ وہ نعمتوں کے ساتھ اس کے منعم کی بھی معرفت حاصل کرلے۔ یہی وہ بندہ ہے جو اللہ کا مطلوب بندہ ہے۔ یہی وہ بندہ ہے جس کو آخرت میں خدا سے ملاقات کی خوش نصیبی حاصل ہوگی۔ اور یہی وہ بندہ ہے جس کو خدا کے پڑوس میں ابدی طور پر بسایا جائے۔ اِسی ابدی پڑوس کا دوسرا نام جنت ہے۔

اللہ سے محبت کا سرچشمہ اللہ کی نعمتوں کی دریافت ہے۔ اِسی دریافت سے انسان کے اوپر آخرت کی اعلیٰ نعمتوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ اِسی دریافت سے آدمی کے اندر خدا کے لیے اعلیٰ شکر اوراعترافِ کامل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اِسی اعترافِ کامل کے جذبے کا نام محبتِ الٰہی ہے — انسان کی طرف سے محبت، دریافت کا نتیجہ ہے، اور اللہ کی طرف سے محبت قدردانی کا نتیجہ۔

خدا اور بندہ

علی بن ربیعہ کہتے ہیں کہ میں نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو دیکھا۔ ان کے پاس سواری کے لیے ایک جانور لایا گیا۔ جب انھوں نے اپنا پاؤں اس کے رکاب میں رکھا تو کہا: **بسم اللہ**۔ پھر جب وہ اس کی پیٹھ پر بیٹھ گئے تو کہا: **الحمد لله، سبحان الذي سخر لنا هذا وما كنا له مقرنين وإنّا إلىٰ ربنا لمنقلبون**۔ اس کے بعد انھوں نے تین بار اللہ کی حمد کی اور تین بار اللہ کی تکبیر کی۔ پھر کہا: **سُبحانك لا إلٰه إلا أنت قد ظلمت نفسي فاغفرلي**۔ راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت علی ہنس پڑے۔ میں نے پوچھا کہ اے امیر المومنین، آپ کس بات پر ہنسے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ نے سوار ہوتے ہوئے وہی کہا جو میں نے کہا۔ پھر آپ ہنس پڑے۔ میں نے پوچھا کہ اے خدا کے رسول، آپ کیوں ہنسے۔ آپ نے فرمایا: **يعجب الربُّ تبارك وتعالىٰ من عبده إذا قال ربّ اغفرلي۔ ويقول علم عبدي أنه لا يغفر الذنوب غيري۔ (مسند احمد، رقم الحديث 753)** بندہ جب کہتا ہے کہ اے میرے رب، مجھے بخش دے تو اللہ تعالیٰ اس پر تعجب کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے اس کو جانا کہ میرے سوا کوئی بھی گناہوں کو بخشنے والا نہیں۔

رَبِّ اغْفِرلي (میرے رب، مجھے بخش دے) کہنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ایک عظیم ترین دریافت کے نتیجے میں ظاہر ہونے والا کلمہ ہے، جو ایک مومن کی زبان سے نکل پڑتا ہے۔ یہ کلمہ کسی کی زبان سے اُس وقت نکلتا ہے جب کہ وہ غیب کے پردے کو پھاڑ کر خدا کی موجودگی (presence of God) کو دریافت کرے۔ یہ آزادی کے باوجود اس بات کا اقرار ہے کہ میں اپنی آزادی کو بے قید استعمال کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ یہ حشر کو دیکھے بغیر حشر کے واقعہ پر یقین لانا ہے۔ یہ اعمال کے اخروی نتائج کی حقیقت کا اُس وقت اقرار کرنا ہے جب کہ ابھی وہ ظاہر نہیں ہوئے۔ یہ خدا کے ظہور سے پہلے خدا کے جلال و جبروت کے آگے جھک جانا ہے۔ یہ کلمہ، معرفت کا کلمہ ہے، اور معرفت بلاشبہہ اِس دنیا کا سب سے بڑا عمل ہے۔

محبت، اتباع

قرآن کی سورہ البقرہ میں اہلِ ایمان کی صفت اِن الفاظ میں بتائی گئی ہے: والذین اٰمنوا أشدُّ حبًّا لله (2:165) یعنی جو ایمان والے ہیں، وہ اللہ سے بہت زیادہ محبت رکھنے والے ہیں۔

محبت کے لفظی معنی ہیں— شدید میلان (strong affection)۔ مومن وہ ہے جس کے اندر اپنے رب سے اِس قسم کا گہرا قلبی تعلق پیدا ہو جائے۔

کچھ لوگ اِس آیت میں محبت کو اتباع کے معنی میں لیتے ہیں۔ اِس تفسیر کے لیے وہ اِس قرآنی آیت کا حوالہ دیتے ہیں: قل إن کنتم تحبّون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (3:31) یعنی اے پیغمبر، کہو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو تم میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

محبت کو اتباع کے معنی میں لینے کے لیے یہ حوالہ درست نہیں۔ قرآن کی یہ آیت محبتِ الٰہی کی تعریف (definition) کے طور پر نہیں، وہ صرف محبتِ الٰہی کے ایک تقاضے کو بتا رہی ہے، یعنی اگر تم کو اللہ سے محبت ہے تو اِس کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ تم اللہ کے رسول کے متبع (follower) بن جاؤ۔

محبتِ الٰہی ایک اعلیٰ ترین کیفیت ہے۔ محبت الٰہی کا سرچشمہ اللہ کے انعامات کا ادراک ہے۔ جب ایک شخص اللہ کو اپنے مُنعمِ کامل کی حیثیت سے دریافت کرتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی محبت میں غرق ہو جاتا ہے۔ اللہ کی محبت اُس کے قلب وروح کا سب سے بڑا سرمایہ بن جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ سب کچھ جو ہمیں اِس دنیا میں ملا ہوا ہے، اپنے وجود سے لے کر خارجی اشیا تک، سب کا سب اللہ کا عطیہ ہے، حتی کہ لذت اور مسرت کے جذبات بھی اللہ کا عطیہ ہیں۔ ایسی حالت میں یہ بالکل فطری ہے کہ انسان کو تمام چیزوں سے زیادہ اللہ سے محبت ہو، اللہ سے اُس کو والہانہ تعلق پیدا ہو جائے، اللہ اس کے تمام جذبات اور کیفیات کا مرکز بن جائے— محبت ایک اعلیٰ ترین نفسیاتی کیفیت کا نام ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کو کسی ایک لفظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ اور اس کے رسول کا اتباع اِس محبت کا ایک لازمی تقاضا ہے، اتباع کو ہرگز محبت کی تعریف قرار نہیں دیا جاسکتا۔

محبت ایک دوطرفہ معاملہ

ایک طویل روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ اِس روایت کا ایک حصہ یہ ہے:
قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: والله لا يُلقي اللهُ حبيبَه في النار (السلسلة الصحيحة للألباني، 5/531) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا کی قسم، اللہ اُس شخص کو آگ میں نہیں ڈالے گا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔

یہ حدیث کسی پُر اسرار معنی میں نہیں ہے۔ اِس حدیث میں جس محبت کا ذکر ہے، وہ دوطرفہ ہے، نہ کہ یک طرفہ۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جو انسان غور وفکر کے ذریعے اپنے خالق کو پہچانے، جو اللہ کو اپنے منعم کی حیثیت سے دریافت کرے، ایسے انسان کا حال یہ ہوگا کہ اللہ اس کا محبوب بن جائے گا، اُس کے تمام قلبی جذبات اللہ سے وابستہ ہو جائیں گے۔

جب کسی انسان کا یہ حال ہو کہ اس کے شعوری ادراک کے نتیجے میں اللہ اس کا محبوب بن جائے تو اس کے بعد ایسا انسان خود بھی اللہ کا محبوب بن جاتا ہے۔ اور جب اِس اعتبار سے کوئی شخص اللہ کا محبوب بن جائے تو یہ محبوبیت اُس آدمی کے لیے اِس بات کی ضمانت ہوگی کہ اللہ اُس کو قیامت کے دن ہرگز آگ میں نہیں ڈالے گا۔

کسی انسان کا محبوبِ خدا بن جانا کوئی پُر اسرار چیز نہیں، یہ فطری اسباب کے تحت پیش آنے والا ایک واقعہ ہے۔ جب کوئی شخص اپنے آپ کو اللہ سے اتنا زیادہ وابستہ کرے کہ اللہ سے اُس کو محبت کے درجے میں تعلق پیدا ہو جائے، تو ایسا انسان، اللہ کی نظر میں اِس کا مستحق بن جاتا ہے کہ اللہ اس کے ساتھ رحم کا معاملہ کرے اور اس کو آخرت کے عذاب سے بچالے۔

اللہ کا کسی انسان سے محبت کرنا بر بناء رحمت ہوتا ہے، اور انسان کا اللہ سے محبت کرنا بر بناء انعام ہوتا ہے۔ اللہ کی محبت کسی بندے کے لیے ایک عطیۂ الٰہی ہے، اور بندے کی محبت اللہ کے لیے شکر واعتراف کا ایک معاملہ ہے۔ یہی شکر واعتراف بلاشبہہ جنت کی قیمت ہے۔

خدا سے محبت

ایک صاحب نے کہا آپ اپنی تحریروں میں خدا سے محبت پر زور دیتے ہیں۔ مجھے بتائیے کہ خدا سے محبت کیسے کی جائے، اُس کا طریقہ کیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ کا کوئی بیٹا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ میں نے کہا کہ کیا آپ کو اپنے بیٹے سے محبت ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ پھر میں نے پوچھا کہ جب آپ کے یہاں بیٹا پیدا ہوا تو کیا آپ نے ایسا کیا کہ دوسرے لوگوں سے پوچھا کہ بیٹے سے محبت کیسے کی جائے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ اپنے بیٹے سے محبت تو آپ پوچھے بغیر کرتے ہیں اور خدا سے محبت کے لیے آپ ہم سے سوال کر رہے ہیں۔

پھر میں نے کہا کہ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اِس کا تعلق آپ کے شعور سے ہے۔ ہر باپ اپنے بیٹے سے محبت کرتا ہے، کیوں کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنی توسیع (extention) سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر باپ خود بخود اپنے بیٹے سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اس معاملے میں کسی باپ کو کسی اور سے پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ خدا کا درجہ ہر آدمی کے لیے اِس سے بہت زیادہ بڑا ہے۔ خدا آپ کا خالق ہے اور آپ اس کی مخلوق ہیں، مگر آپ نے خدا کو اپنے خالق (creator) کی حیثیت سے دریافت نہیں کیا۔ یہی بے شعوری ہے جس کی بنا پر آپ کو خدا سے محبت نہیں۔ اگر آپ نے خدا کو اپنے خالق اور اپنے مُنعم اور معطی (giver) کی حیثیت سے دریافت کیا ہوتا تو یقیناً ایسا ہوتا کہ اِس معاملے میں آپ کسی اور سے سوال نہ کرتے۔ آپ کو خود بخود اپنے خالق سے مطلوب قسم کی آفاقی محبت پیدا ہو جاتی۔ خدا آپ کی زندگی میں اوّلین چیز بن جاتا، اور دوسری تمام چیزیں اپنے آپ ثانوی درجے میں چلی جاتیں۔

خدا سے محبت کوئی مصنوعی چیز نہیں، وہ انسانی فطرت کی پکار ہے۔ یہ دراصل ماحول کی کنڈیشننگ ہے جو آدمی کو خدا سے دور کر دیتی ہے۔ اگر آپ اپنی سوچ کو متحرک کر کے اپنی ڈی کنڈیشننگ کر سکیں تو خود بخود آپ خدا سے جڑ جائیں گے، آپ اُسی طرح خود اپنی فطرت کی آواز کے تحت خدا سے محبت کرنے لگیں گے، جس طرح آپ اپنے بیٹے سے محبت کرتے ہیں۔

تعلق باللہ

خدا کو ایک خارجی حقیقت کے طور پر دریافت کرنا کافی نہیں ہے۔ خدا کے ساتھ گہرا تعلق صرف اُس وقت قائم ہوتا ہے، جب کہ آدمی خدا کی رحمتوں کو اپنی ذات کی سطح پر دریافت کرے۔ اِس معاملے کو ایک لفظ میں پرسنلائزیشن آف بلسنگس آف گاڈ (personalization of divine blessings) کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً ہر آدمی کو اپنے ماں باپ سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ کیوں کہ آدمی یہ سوچتا رہتا ہے کہ میرے ماں باپ نے میرے ساتھ یہ کیا اور میرے ماں باپ نے میرے ساتھ وہ کیا۔ اِس قسم کی سوچ جب خدا کے بارے میں پیدا ہوجائے تو اِسی کا نام تعلق باللہ ہے۔

موجودہ دنیا اپنے تمام اجزا کے ساتھ خدا کے انعامات کا ظہور ہے۔ سوچنے والے انسان کے لیے اُس کا ہر تجربہ اور ہر مشاہدہ خدا کے آفاقی انعامات کی یاد دلاتا ہے۔ یہ دریافت بھی کافی ہے کہ انسان خدا کو اپنا منعم سمجھے۔ وہ خدا کا شکر کرنے والا بندہ بن جائے لیکن یہ احساس اُس وقت بہت زیادہ شدید ہوجاتا ہے جب کہ انسان اِن نعمتوں کو اپنی ذات کی سطح پر دریافت کرے۔ پہلی دریافت آدمی کو یہ الفاظ دیتی ہے کہ — خدایا، تو نے انسان کے اوپر کتنا زیادہ انعام فرمایا ہے۔ لیکن جب آدمی دوسری نوعیت کی دریافت کا تجربہ کرے تو وہ بے اختیار ہوکر پکار اٹھے گا کہ خدایا، تو میرے اوپر کتنا زیادہ مہربان ہے۔ تو نے مجھ کو وہ نعمتیں بھی دیں جن کو میں جانتا تھا، اس کے علاوہ تو نے مجھ کو مزید وہ بے شمار نعمتیں عطا کردیں جن کو میں نہ جانتا تھا اور نہ میں اُن کا طلب گار بن سکتا تھا۔

انسان سے سب سے زیادہ جو چیز مطلوب ہے، وہ اللہ سے گہرا تعلق ہے۔ یہ گہرا تعلق صرف گہری سوچ (deep thinking) کے ذریعے پیدا ہوسکتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ خدا کی نعمتوں کو اپنی ذات کی سطح پر دریافت کرے۔ اِس قسم کی ذاتی دریافت ہی کسی آدمی کے اندر گہرا تعلق باللہ پیدا کرسکتی ہے۔ خدا سے اِسی گہرے تعلق کو قرآن میں حبِّ شدید کہا گیا ہے: والذین آمنوا أشد حُبًّا للّٰه (2: 165)۔

خدا کی قربت

پلاسٹک سرجری (plastic surgery) کی ایک اصطلاح ہے۔ اس کو آٹو گریفٹنگ (auto grafting) کہا جاتا ہے۔ کسی آدمی کے جسم کے کسی حصے میں اگر گریفٹنگ کرنا ہوتو اس کے اپنے جسم ہی کے کسی حصے کی کوئی کھال (skin) نکال کر اُس مقام پر لگائی جاتی ہے۔ کسی دوسرے آدمی کے جسم کی کھال اِس کام کے لیے کار آمد نہیں۔ اِس کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر ولیم بائڈ (William Boyd) نے لکھا ہے کہ — خودی غیر خودی کو قبول نہیں کرتی:

Self will not accept not-self

آخرت میں سب سے زیادہ خوش نصیب وہ لوگ ہوں گے جن کو وہاں خدا کی ہم نشینی ملے، جو خدا کے پڑوس (neighbourhood) میں آباد کئے جائیں۔ یہ خوش قسمت انسان کون ہوگا، یہ وہ انسان ہوگا جو دنیا میں خدائی طرزِ زندگی اختیار کرے، جو خدا کی پسند کو اپنی پسند بنائے، جو خدا کے اخلاقی معیار پر پورا اترے۔ یہ اعلیٰ صفات صرف اُس انسان کے اندر پیدا ہوسکتی ہیں جو اپنے شعور کو اتنا زیادہ ترقی دے کہ وہ خدا کی معرفت کا اعلیٰ ادراک کرسکے۔ موت سے پہلے کی زندگی تیاری کے دور (preparatory period) کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ خدا کی پسند کو دریافت کرے اور پھر اپنی پوری شخصیت کی تعمیر اِس خدائی پسند کے مطابق کرے۔ اس کا سوچنا، اس کا بولنا، اس کے سلوک اور آداب، اس کا پورا لائف اسٹائل (life style)، خدا کے رنگ میں رنگ جائے۔ اِس معاملے میں انسان اتنا زیادہ حساس ہو کہ وہ کسی بھی ملاوٹ کو قبول نہ کرے۔ یہی ربانی شخصیت ہے، اور جن لوگوں نے اپنے اندر اِس قسم کی ربانی شخصیت کی تشکیل کی، وہی وہ خوش قسمت لوگ ہیں جو آخرت کی ابدی زندگی میں خداوند ذوالجلال کے پڑوس میں جگہ پائیں گے — خودی غیر خودی کو قبول نہیں کرتی، اِسی طرح خدا غیر خدائی انسان کو قبول نہیں کرے گا۔ آخرت کی ابدی دنیا میں صرف خدائی انسان ہوں گے جو خدا کے پڑوس میں جگہ پانے کی سعادت حاصل کریں گے۔

تجسیم کا نظریہ

بعض مذہبوں میں تجسیم (incarnation) کا نظریہ پایا جاتا ہے۔ اِس کو حلول یا وحدتِ وجود بھی کہتے ہیں۔ حلول یا تجسیم کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **تجسُّد الإلٰہ فی شکل بشری (العلمانیة: نشأتھا وتطورھا وآثارھا فی الحیاۃ الإسلامیة المعاصرۃ، لسفر بن عبد الرحمن الحوالی)** یعنی خدا کا انسانی صورت میں مجسم ہونا۔

حلول یا تجسیم کا یہ تصور اصلاً ایک فلسفیانہ تصور ہے۔ قدیم فلاسفہ مانتے تھے کہ اِس کائنات کا ایک خدا ہے، لیکن وہ خدا ایک قسم کی اسپرٹ ہے، اس کی کوئی شکل وصورت نہیں۔ یہ خدا جب ظاہر ہونا چاہتا ہے تو وہ کسی انسان کی صورت میں مجسم ہوجاتا ہے۔ ہندو مذہب میں اِسی کو 'اوتارواد' کہا جاتا ہے۔ اِس تصور کے مطابق، خدا اصلاً ایک غیر شخصی خدا (impersonal god) ہے، پھر وہ مختلف زمانوں میں کسی انسان کی صورت میں متشکل ہوتا ہے۔ اِسی کو ہندو مذہب میں 'اوتار' کہا جاتا ہے۔

اسلام میں حلول یا تجسیم کا یہ نظریہ سرتاسر باطل ہے۔ کچھ صوفیا نے اس باطل تصور کو وحدتِ وجود (monism) کے نام پر اسلام میں داخل کیا، لیکن یہ یقینی طور پر ایک بے بنیاد نظریہ ہے، اسلام میں ایسے کسی نظریے کی کوئی گنجائش نہیں۔

قرآن میں کہا گیا ہے کہ: **واسجد واقترب** (96:19) یعنی سجدہ کرو اور قریب ہوجاؤ۔ اِس سے معلوم ہوا کہ خدا اور بندے کے درمیان قربت کا واقعہ پیش آتا ہے، یعنی بندہ اور خدا دونوں ایک نہیں ہوجاتے، بلکہ عملاً یہ ہوتا ہے کہ ایک بندہ جب حقیقی معنوں میں ساجد بن جاتا ہے تو وہ نفسیات کی سطح پر خدا کے قرب کا تجربہ کرتا ہے۔ خدا کے ساتھ اس کی سرگوشیاں ہونے لگتی ہیں۔ اس کو خدا کی موجودگی (presence of God) کا شدید تجربہ ہوتا ہے۔ حدیث کے الفاظ میں، وہ اس طرح عبادت کرنے لگتا ہے جیسے کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے — خدا اور بندے کے درمیان وحدت کا تصور نہیں، البتہ اسلام میں، خدا اور بندے کے درمیان قربت کا تصور اپنے کامل ترین معنوں میں پایا جاتا ہے۔

حمدِ خداوندی

انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح کرے، یعنی اُس کو اللہ کی معرفت اور اللہ کا ادراک اتنی گہرائی کے ساتھ ہو جائے کہ اس کی زبان سے بار بار خدا کے اعلیٰ اعتراف کا کلمہ نکلنے لگے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی بات آسمانوں اور زمینوں سے بھی مطلوب ہے۔ قرآن کے مطابق، ساری کائنات عملاً اللہ کی حمد و تسبیح کر رہی ہے (64: 1)۔

اِس کا مطلب کیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ مخلوقات سے اللہ تعالیٰ کو سب سے بڑی جو چیز مطلوب ہے، وہ حمد ہے، یعنی اعلیٰ اعتراف۔ انسان کے سوا، اِس کائنات کی دوسری تمام چیزیں ہر وقت غیر ملفوظ زبان (unspoken language) میں اللہ کی حمد میں مشغول ہیں۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے استثنائی طور پر زبان دی ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ ملفوظ زبان (spoken language) میں اللہ کی حمد کرنے لگے۔ وہ بقیہ کائنات کی غیر ملفوظ حمد کو، ملفوظ زبان میں دہرائے۔ کائنات کی معنویت کو دیکھ کر انسان کی زبان سے گہرے اعتراف کا جو کلمہ نکلتا ہے، اُسی کا نام حمد ہے۔

جب انسان اپنے بارے میں غور کرتا ہے تو وہ پاتا ہے کہ اللہ نے مجھے احسنِ تقویم (95: 4) پر پیدا کیا ہے۔ اِسی طرح جب انسان مصنوعاتِ خداوندی پر غور کرتا ہے تو وہ پاتا ہے کہ ہر چیز کمال کے آخری درجے پر ہے (27: 88)۔ یہ چیزیں آدمی کے اندر حمد کے چشمے جاری کر دیتی ہیں۔ آدمی اپنے پورے دل اور اپنے پورے دماغ کے ساتھ اللہ کا اعتراف کرنے لگتا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ: وآتاکم من کلّ ما سألتموہ (14:34) یعنی اللہ نے انسان کو وہ سب کچھ دے دیا جس کا اُس نے سوال کیا تھا۔ غور کیجئے تو اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ سوال کے بغیر ہی اُس نے انسان کو اس کی ضرورت کی تمام چیزیں دے دیں۔ اللہ کے اِن ناقابلِ شمار انعامات کے بارے میں جب انسان سوچتا ہے تو اس کے بعد اس کی زبان سے اعتراف کے جو اعلیٰ کلمات نکلتے ہیں، اُنھیں کا نام حمد ہے۔ یہی حمد وہ چیز ہے جو انسان کے لیے جنت میں داخلے کا ذریعہ بنے گی۔

استثنائی رحمت کا معاملہ

انسان کا وجود خدا کی رحمت کا ظہور ہے۔ دنیا میں انسان کو تمام چیزیں بقدرِ ضرورت دی گئی ہیں (14:34)۔ جنت میں مزید اضافے کے ساتھ انسان کو یہ رحمت حاصل ہوگی۔ قرآن کے مطابق، جنت میں انسان کو تمام چیزیں بقدرِ اشتہا (41:31) دی جائیں گی۔

انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ تمام عطیات کو خدا کی رحمت کی نسبت سے دریافت کرے۔ موجودہ دنیا میں انسان کو اس کی ضرورت کی تمام چیزوں کا ملنا بھی خدا کی رحمت کا ظہور ہے، اور جنت میں تمام چیزوں کا بقدرِ اشتہا ملنا بھی خدا کی رحمت کا ظہور— موجودہ دنیا ضرورت کی سطح پر خدا کی رحمت کا تجربہ کرنے کی جگہ ہے۔ جنت وہ مقام ہے جہاں انسان انجوائے مینٹ (enjoyment) کی سطح پر خدا کی رحمت کا تجربہ کرے گا۔

انبساط (pleasure) انسان کی ایک استثنائی صفت ہے۔ ساری کائنات میں یہ صرف انسان ہے جس کو خصوصی طور پر یہ صلاحیت دی گئی ہے کہ وہ چیزوں سے انجوائے (enjoy) کر سکے۔ انجوائے مینٹ کی اِس صفت کا تجربہ موجودہ دنیا میں انسان کو ابتدائی طور پر ہوتا ہے، اور جنت میں اِس کا تجربہ انسان کو انتہائی طور پر ہوگا۔

انسان کے ساتھ خدا کی یہ رحمتِ خاص انسان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اِسی رحمتِ خاص کی دریافت سے انسان کے اندر اپنے رب کے لیے حبّ شدید (2:165) کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ معرفت کا سب سے اعلیٰ درجہ یہی ہے کہ انسان کو اپنے رب کے ساتھ محبت (strong affection) کی سطح پر تعلق پیدا ہو جائے۔ خدا سے اِس حبِ شدید کے لیے ایک حقیقی بنیاد درکار ہے۔ یہ حقیقی بنیاد یہی ہے کہ انسان اپنے بارے میں خدا کی استثنائی رحمت کو دریافت کرے۔ یہی وہ دریافت ہے جس کے بعد کسی انسان کے اندر خدا کے لیے حبّ شدید کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اِس دریافت کے سوا کوئی بھی دوسرا طریقہ اِس کیفیت کے حصول کے لیے کارآمد نہیں ہوسکتا۔

اللہ ہمارے دلوں میں

مولانا عبدالباسط عمری قطر میں رہتے ہیں۔ وہ ہمارے دعوتی مشن سے وابستہ ہیں۔ وہ سی پی ایس (نئی دہلی) میں ہونے والے ہفتے وار لیکچر کو بذریعہ انٹرنیٹ پابندی کے ساتھ سنتے ہیں۔ انھوں نے ہمارے ساتھی مولانا محمد ذکوان ندوی کو ٹیلی فون پر اپنا ایک تاثر بتایا۔ یہ تاثر اُنھیں کے الفاظ میں یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''عرب امارات کے حاکم وبانی شیخ زائد بن سلطان آلِ نہیان کا 2004 میں انتقال ہوا۔ اُس وقت عربی ریڈیو میں شیخ زائد کے اوپر ایک پروگرام آتا تھا۔ اِس پروگرام کا عنوان تھا: زائد في قلوبنا (شیخ زائد ہمارے دلوں میں)۔ اِس پروگرام میں لوگ شیخ زائد کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو بیان کرتے تھے۔ بعض لوگ اپنے تاثرات بیان کرتے وقت رونے لگتے تھے۔ اِس واقعے کو لے کر اب میں سوچتا ہوں کہ اِس دنیا میں ایسا کوئی شخص نظر نہیں آتا جو یہ کہے کہ — اللہ ہمارے دلوں میں ہے۔ کوئی پروگرام ایسا دکھائی نہیں دیتا جس کا عنوان ہو: الله في قلوبنا (اللہ ہمارے دلوں میں)۔ لوگ اِس پروگرام میں خدا کی نعمتوں کا اور اللہ کی عظمتوں کا چرچا کریں اور اللہ سے اپنی محبت کا اظہار کریں''۔

مومن وہ ہے جو اللہ رب العالمین کو اُس کی عظمتوں کے ساتھ دریافت کرے۔ جو شخص اللہ رب العالمین کو اِس طرح اس کی عظمت اور قدرت کے ساتھ دریافت کرے گا، اس کا دل اللہ کی بڑائی سے بھر جائے گا۔ وہ اللہ کی بڑائی میں جینے لگے گا۔ اللہ اس کے دل کا سب سے بڑا سرمایہ بن جائے گا۔ کائنات کی ہر چیز اُس کو اللہ کی یاد دلانے والی بن جائے گی۔ وہ سورج اور چاند میں اللہ کا جلوہ دیکھے گا۔ وہ پہاڑوں اور سمندروں میں آلاء اللہ (wonders of God) کا مشاہدہ کرے گا۔ انسان کی زندگی اور انسان کی موت بھی اس کو اللہ کی یاد دلانے والی بن جائے گی۔

جو اہلِ ایمان اِس طرح اللہ کی عظمتوں میں جینے والے بن جائیں، اُن کا حال یہ ہوگا کہ اُن کی زندگی اللہ کے رنگ میں رنگ جائے گی۔ وہ بولیں گے تو اُن کے بول اللہ کی عظمت والے بول ہوں گے۔ وہ لکھیں گے تو اُن کی تحریر اللہ کی عظمت کے تعارف کے ہم معنیٰ ہوگی۔

خدا کی یاد

خدا کو یاد کرنا بلاشبہہ سب سے بڑی عبادت ہے۔ مگر خدا کی یاد کا مطلب تسبیح کے دانوں پر اللہ اللہ پڑھنا نہیں ہے۔ خدا کو یاد کرنا یہ ہے کہ آدمی کا ذہن اتنا زیادہ جاگ اٹھے کہ ہر مخلوق کو وہ خالق سے ریلیٹ (relate) کر سکے، ہر چیز میں اس کو خدا کی یاد آنے لگے۔

ایک صاحب کا واقعہ ہے۔ وہ اپنے ساتھی کے ہم راہ شہر کی ایک سڑک سے گزرے۔ راستے میں کھلونے کی ایک دکان تھی۔ کھلونے کی اِس دکان پر پہنچ کر وہ ایک لمحے کے لیے وہاں رکے۔ انھوں نے دکان کی طرف دیکھا تو اچانک ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان کے ساتھی نے اِس کا سبب پوچھا تو وہ اس کو ٹالنے لگے۔ آخر اصرار کے بعد انھوں نے بتایا کہ دو برس پہلے میں اپنے آٹھ سال کے بچے کے ساتھ یہاں آیا تھا، بچے نے اِس دکان سے ایک کھلونا خریدنے کے لیے کہا۔ اگلی صبح کو بچہ فیملی کے ساتھ ایک اور شہر میں جانے والا تھا۔ میں نے کہا کہ ابھی تو تم سفر پر جا رہے ہو، جب تم واپس آؤ گے تو یہ کھلونا میں تمھارے لیے خرید دوں گا۔ مگر واپسی میں کار کا ایکسی ڈنٹ ہوا اور میرا آٹھ سال کا بچہ سڑک پر ہی مر گیا۔ اِس دکان پر کھلونے کو دیکھ کر مجھے اپنے بچے کی بات یاد آئی۔ میرا دل تڑپ اٹھا اور میں رونے لگا۔

مذکورہ شخص کے لیے وہ کھلونا اپنے بیٹے کی یاد کے لیے ایک پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) بن گیا، وہ اپنے بچے کو یاد کر کے رونے لگا۔ اِسی طرح انسان کا اپنا وجود اور اس کے آس پاس کی ساری دنیا خدا کی یاد کے لیے ایک پوائنٹ آف ریفرنس ہے۔

تخلیق کا ہر واقعہ اپنے خالق کی یاد دلا رہا ہے۔ اگر لوگ خدا کے معاملے میں اُسی طرح سنجیدہ ہوں، جیسا کہ وہ اپنی اولاد کے لیے ہوتے ہیں، تو دنیا کی ہر چیز ان کے لیے خدا کی یاد دہانی بن جائے۔ ہر چیز ان کی ربانی سوچ کو جگائے۔ وہ ہر چیز میں خدا کی جھلک دیکھیں اور ہر چیز میں یادِ الٰہی کی غذا لینے لگیں۔

جینے کے دو طریقے

اِس دنیا میں آدمی کے لیے جینے کے دو طریقے ہیں — ایک ہے خدا میں جینا، اور دوسرا ہے، غیرِ خدا میں جینا۔ سچے اہلِ ایمان خدا میں جینے والے ہوتے ہیں۔ غیر خدا میں جینے والوں کو اہلِ دنیا کہا جاسکتا ہے۔ پہلے بھی جینے کے یہی دو طریقے تھے، اور آج بھی جینے کے یہی دو طریقے ہیں۔ اُن کے درمیان ظاہر کے اعتبار سے فرق ہوسکتا ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

خدا میں جینے والا کون ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کے بارے میں سنجیدہ ہوں۔ وہ حق کے متلاشی (truth seeker) بنیں، پھر وہ خدا کو دریافت (discover) کریں۔ پھر وہ اِس دریافت کے مطابق، اپنی زندگی بنائیں۔ اُن کا سوچنا، ان کا بولنا، ان کی عادتیں، ان کے معاملات، دوسروں کے ساتھ اُن کا سلوک، سب خدا کے رنگ میں رنگ جائے۔

دوسری قسم اُن لوگوں کی ہے جو دنیا کی کسی چیز کو وہ درجہ دے دیں جو خدا کا درجہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی مادی ترقی کے بارے میں سوچیں۔ اِسی کے مطابق، وہ اپنے تعلقات قائم کریں۔

ان کے لیے سب سے زیادہ قابلِ لحاظ چیز ان کی فیملی ہو۔ سیاسی معاملات ان کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہوں۔ اپنی قوم کے مفادات کو وہ سب سے زیادہ اہم سمجھتے ہوں۔ وہ دنیا کی عزت کو عزت اور دنیا کی ترقی کو ترقی سمجھیں۔ وہ دنیا کو پانے سے خوش ہوں اور دنیا سے محرومی ان کو غمگین بنا دے۔ ان کے حوصلوں اور تمناؤں کا مرکز دنیا کی چیزیں بنی ہوئی ہوں۔ اِس قسم کے تمام لوگ غیرِ خدا میں جینے والے لوگ ہیں۔

خدا میں جینے والے لوگ خدا کے مطلوب بندے ہیں۔ آخرت میں وہ ابدی جنتوں میں داخل کئے جائیں گے۔ غیر خدا میں جینے والے لوگ خدا کے غیر مطلوب بندے ہیں۔ ایسے لوگ خدا کی رحمتوں سے محروم رہیں گے۔ پہلی قسم کے لوگ اہلِ جنت ہیں اور دوسری قسم کے لوگ اہلِ جہنم۔

عجز کی طاقت

لوگ مظلوم کی طاقت کو جانتے ہیں، لیکن لوگ عاجز کی طاقت کو نہیں جانتے، حالاں کہ عاجز کی طاقت مظلوم کی طاقت سے بھی زیادہ ہے۔ ایک فارسی شاعر نے کہا ہے کہ — مظلوم کی آہ سے بچو، کیوں کہ جب وہ دعا کرتا ہے تو اللہ کی طرف سے اجابت خود اُس کے استقبال کے لیے دوڑ پڑتی ہے:

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

مگر مظلومیت سے بھی زیادہ بڑی حقیقت عجز ہے۔ اگر کوئی شخص واقعی طور پر اپنے عجز کو دریافت کرے، وہ واقعی طور پر اس کا ادراک کرلے کہ خدائے قادرِ مطلق کے مقابلے میں وہ سرتا سر ایک عاجز انسان ہے، تو اس کی زبان سے دعا کا ایسا کلمہ نکلے گا جس کا تحمل زمین وآسمان بھی نہیں کرسکیں گے۔ وہ کلمہ یہ ہے — خدایا، تو نے مجھے عاجز انسان کی حیثیت سے پیدا کیا۔ اب تو ایسا نہیں کرسکتا کہ تو میرے بارے میں غیر جانب دار (indifferent) ہوجائے۔

عجز کیا ہے۔ عجز حقیقتِ انسانی کی دریافت ہے۔ عجز یہ ہے کہ آدمی خالق کی نسبت سے، اپنی حیثیتِ واقعی کو دریافت کرلے۔ عجز سادہ طور پر مسکینی کا نام نہیں، عجز انکشافِ حقیقت کا نام ہے۔ عجز اپنے آپ میں ایک طاقت ہے۔ عجز خدا کے سامنے سب سے بڑی سفارش ہے۔ عجز کا مطلب اپنے آپ کو عبدیت کے مقام پر کھڑا کرنا ہے، اور بلاشبہہ عبدیت سے بڑا کوئی مقام نہیں۔

قرآن کی سورہ العلق میں ارشاد ہوا ہے: **واسجد واقترب** (96:14)۔ سجدہ اظہارِ عجز کی آخری صورت ہے۔ عجز بلاشبہہ قربت خداوندی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ جہاں عجز کی آخری حد آجائے، وہاں سے اُس ربانی تجربے کا آغاز ہوجاتا ہے جس کو لقاءِ رب کہا گیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کبر (arrogance) آدمی کو خدا سے دور کردیتا ہے، اور اس کے مقابلے میں عجز (helplessness) آدمی کو خدا سے قریب کردینے والا ہے — کبر (arrogance) اللہ سے دوری کا ذریعہ ہے، اور عجز (helplessness) اللہ سے قربت کا ذریعہ۔

خدا کی یاد میں رونا

ایک ماں کا بیٹا اُس سے دور چلا گیا۔ دس سال تک دونوں کے درمیان کوئی تعلق نہ تھا۔ آخر میں بیٹے کا ایک دوست اس کی ماں کے پاس آیا۔ اس کے پاس بیٹے کا ایک فوٹو تھا۔ اُس نے یہ فوٹو ماں کو دکھایا۔ فوٹو دیکھتے ہی ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایسا کیوں ہوا، اس کا سبب یہ تھا کہ فوٹو کو دیکھ کر ماں کو اپنا بیٹا یاد آ گیا۔ فوٹو کو دیکھنے کے بعد ماں اور بیٹے کے درمیان یادوں کی سطح پر ایک ناقابلِ مشاہدہ اتصال (invisible contact) قائم ہو گیا۔

اِس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا کی یاد میں رونے کا معاملہ کیا ہے۔ یہ خدا اور بندے کے درمیان نفسیات کی سطح پر اتصال کا ایک نتیجہ ہے۔ ایک انسانی روح کو جب اپنے رب سے نفسیاتی اتصال کا تجربہ ہوتا ہے تو یہ تجربہ آنکھوں سے آنسو کی شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے۔

یہی حقیقت قرآن کی سورہ مریم کی ایک آیت میں اِن الفاظ میں بتائی گئی ہے: **إذا تُتلی علیهم اٰیات الرحمن خرّوا سُجّداً وبُکیًّا** (19:58)۔ دوسری جگہ قرآن کی سورہ العلق میں یہ آیت آئی ہے: **واسجد واقترب** (96:19)۔ ایک حقیقی سجدہ، خدا اور بندے کے درمیان قربت کا لمحہ ہوتا ہے۔ اُس وقت خدا اور بندے کے درمیان ایک غیر مرئی سطح پر روحانی اتصال قائم ہو جاتا ہے۔ اتصال کا یہ تجربہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ بندے کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔

دنیا کی زندگی میں کسی انسان کے لیے سب سے بڑا روحانی واقعہ یہ ہے کہ اس کو خدا سے قربت کا تجربہ ہو۔ قربت کا یہ واقعہ دو مساوی (equals) وجود کے درمیان نہیں ہوتا، بلکہ دو غیر مساوی (inequals) وجود کے درمیان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِس اتصال کے وقت انسان کا وہی حال ہوتا ہے جو حضرت موسیٰ کے زمانے میں اِسی قسم کے غیر مساوی اتصال کے وقت پہاڑ کا ہوا تھا (7:143)۔ کسی بندے کے لیے یہ تجربہ دو انتہائی کیفیات کی یکجائی کے ہم معنی ہوتا ہے — ایک اعتبار سے شدید اضطراب، اور دوسرے اعتبار سے شدید اطمینان۔

روحِ دین

ایک سفر کے دوران مجھے ایک ایسے ملک میں جانا پڑا جہاں پہلے بادشاہی نظام تھا۔ اب وہاں بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا۔ اب وہاں صدر راج قائم ہے۔ قدیم شاہی محل کی تمام شان و شوکت باقی ہے۔ البتہ اب اس کو شاہی محل کے بجائے صدارتی محل کہا جاتا ہے۔

میں اور کانفرنس کے دوسرے شرکا، صدر مملکت سے ملاقات کے لیے صدارتی محل میں لے جائے گئے۔ ہم لوگ جب اُس پر ہیبت عمارت میں داخل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ہر آدمی کا انداز اچانک بدل گیا ہے۔ لوگوں پر خاموشی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ ان کی رفتار سست پڑ گئی۔ چہرے پر سنجیدگی کے آثار ظاہر ہو گئے۔ محل کی ہر چیز کو وہ پُر رعب نظروں سے دیکھنے لگے۔

اس منظر کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں، وہ بھی خدا کا ایک عظیم محل ہے۔ اس میں ہر طرف خدا کی عظمت و قدرت کے جلوے نمایاں ہیں۔ اس خدائی محل کے اندر چلتے ہوئے مزید اضافے کے ساتھ آدمی پر وہ کیفیت طاری ہونا چاہیے جو کسی شاہی محل کے اندر چلتے ہوئے اس کے اندر طاری ہوتی ہے۔ مگر جب میں دنیا کے راستوں میں لوگوں کو چلتے ہوئے دیکھتا ہوں تو یہ محسوس کر کے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ یہاں لوگ اس طرح چل رہے ہیں گویا کہ انھیں اس عظیم حقیقت کی کوئی خبر ہی نہیں۔ لوگوں کے چہروں پر تواضع (modesty) کے آثار دکھائی نہیں دیتے جو از روئے واقعہ ان کے چہروں پر جھلکنا چاہیے۔

لوگوں کے چہروں پر مجھے احتیاط کے بجائے غفلت نظر آتی ہے۔ ان کی چال تواضع کے بجائے غیر متواضعانہ چال معلوم ہوتی ہے۔ ان کے انداز پر ذمہ داری کے بجائے بے حسی کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔ خدا کی دنیا میں چلتے ہوئے لوگ اتنا سنجیدہ بھی نظر نہیں آتے جتنا سنجیدہ کوئی شخص کسی ایوانِ صدارت یا کسی قصرِ شاہی میں چلتے ہوئے نظر آتا ہے۔ جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ انسانی محل میں چلتے ہوئے ان پر ہیبت طاری ہو، مگر خدائی محل میں چلتے ہوئے ان پر ہیبت طاری نہ ہو، وہ گویا خدا کی رحمت سے آج ہی دور ہو گئے۔

رضوانُ اللہ، رضوانُ العباد

قرآن اورحدیث میں بار بار مختلف انداز سے یہ بات کہی گئی ہے کہ آخرت کے اعتبار سے صرف اُس عمل کی قیمت ہے جس میں ابتغاء رضوان اللہ (57:27) کی روح پائی جاتی ہو۔ جو عمل اِس روح سے خالی ہو، وہ آخرت کی میزان میں کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔

اللہ تعالیٰ کسی انسان کے صرف ظاہری عمل کو دیکھ کر اُس کے بارے میں فیصلہ نہیں کرتا، وہ انسان کی اُس قلبی حالت کے اعتبار سے فیصلہ کرتا ہے جس کو شریعت میں نیت کہا گیا ہے۔ اِس پہلو سے تمام انسانی اعمال کی صرف دو قسمیں ہیں۔ ایک، وہ جو رضوان اللہ (اللہ کی خوشی) حاصل کرنے کے لیے کیا جائے۔ دوسرا، وہ جو رضوان العباد (بندوں کی خوشی) حاصل کرنے کے لیے کیا گیا ہو۔

جو شخص رضوان اللہ کا طالب ہو، اس کا رخ ہمیشہ اللہ کی طرف ہوتا ہے، وہ ہر معاملے میں اللہ کی پسند اور ناپسند کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنا رویہ ہمیشہ اصولِ حق کی بنیاد پر متعین کرتا ہے۔ وہ وہی بات بولتا ہے جو اللہ کی مرضی کے مطابق ہو اور اُسی سمت میں چلتا ہے جدھر اللہ نے چلنے کا حکم دیا ہے۔ وہ اپنی اِس روش پر قائم رہتا ہے، خواہ تمام انسان اس کے مخالف ہو جائیں۔

اِس کے برعکس معاملہ اُس شخص کا ہوتا ہے جو رضوان العباد کا طالب بنا ہوا ہو۔ اس کی توجہ کا مرکز اللہ کے بجائے انسان بن جاتے ہیں۔ وہ ہر معاملے میں اپنی قوم، اپنے حلقہ، اپنی پارٹی اور اپنے دنیوی سرپرستوں کی طرف دیکھتا ہے، وہ ایسے الفاظ بولتا ہے جو اِن انسانوں کو پسند ہوں، وہ ایسے عمل کرتا ہے جو اِن انسانوں کے درمیان اُس کو مقبول بنانے والے ہوں۔

جو شخص رضوان اللہ کا طالب ہو، وہ اللہ کے معاملے میں آخری حد تک حساس ہوتا ہے۔ وہ ہر دوسرے پہلو کو نظر انداز کرسکتا ہے، مگر اللہ والے پہلو کو نظر انداز کرنا اُس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اِس کے برعکس، جو لوگ رضوان العباد کے طالب ہوں، وہ انسانوں کے بارے میں سب سے زیادہ حسّاس بن جاتے ہیں۔ وہ انسانوں کا اِس طرح لحاظ کرنے لگتے ہیں، جس طرح خدا کا لحاظ کرنا چاہیے — پہلی قسم کے لوگوں کا مقام جنت ہے، اور دوسری قسم کے لوگوں کا مقام جہنم۔

تسبیحِ خداوندی

قرآن میں بار بار یہ تعلیم دی گئی ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ کی تسبیح کرے۔ اِس کے لیے دوسرے الفاظ بھی آئے ہیں۔ مثلاً تحمید، تمجید، تقدیس، وغیرہ۔ اِن سب کا خلاصہ ایک ہے، اور وہ ہے اعتراف (acknowledgement) انسان کی نسبت سے جس چیز کو اعتراف کہا جاتا ہے، اسی کو اللہ کی نسبت سے تسبیح وتحمید کہا گیا ہے۔ تسبیح وتحمید کے الفاظ دراصل اعتراف ہی کی منزّہ تعبیریں ہیں۔ پھر اِن سب کا خلاصہ صرف ایک ہے، اور وہ گلوری فکیشن (glorification) ہے، یعنی اللہ کی عظمت وکبریائی کا بندے کی زبان سے اظہار۔

خدا اور بندے کے درمیان جو نسبت ہے، وہ دینے والے اور پانے والے کی نسبت ہے۔ بندے کے پاس اللہ کو دینے کے لیے کچھ نہیں۔ واحد چیز جس کو ایک بندہ اپنے رب کے سامنے پیش کرسکتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اللہ رب العالمین کو اس کی حیثیتِ واقعی کے ساتھ دریافت کرے۔ اِسی دریافت کا نام معرفت (realization) ہے۔ جب کوئی بندہ جہاد فی اللہ کرتا ہے، یعنی اللہ کے معاملے میں انتہائی حد تک غور وفکر، اُس وقت اللہ کی توفیق سے اُس پر حقیقت خداوندی کا انکشاف ہوتا ہے۔ وہ کامل یقین کے درجے میں اللہ کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ اِس کے بعد اپنے آپ ایسا ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں ایک فکری بھونچال آجاتا ہے۔ وہ اندرونی طوفان کے ذریعے اللہ کا اعلیٰ اعتراف کرنے والے الفاظ بولنے لگتا ہے۔ یہ گویا معرفتِ داخلی کا خارجی الفاظ میں ڈھل جانا ہے۔ یہی وہ واقعہ ہے جس کو قرآن میں تسبیح وتحمید جیسے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ کسی انسان کا اِس طرح اللہ کو دریافت کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ یہ مخلوق کا اپنے خالق کو دریافت کرنا ہے، یہ طالب کا اپنے مطلوب کو دریافت کرلینا ہے، یہ عاجزِ مطلق کا قادرِ مطلق کو دریافت کرلینا ہے۔ اِس دریافت کو دوسرے لفظوں میں اِس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ وہ لمحہ ہے جب کہ ایک انسان اپنے رب کو اس کی حیثیتِ واقعی کے ساتھ دریافت کرلیتا ہے۔ وہ اِس پوزیشن میں ہوجاتا ہے کہ وہ دیکھے بغیر اللہ کو دیکھے، وہ دوری کے باوجود اللہ کی قربت کا تجربہ کرے۔

قادرِ مطلق، عاجزِ مطلق

خدااور انسان کے درمیان جونسبت ہے، وہ یہ نہیں ہے کہ خدا کُل ہے اور انسان اس کا جُز ہے۔ خدا سمندر ہے اور انسان اس کا ایک قطرہ ہے۔ اِس قسم کی تمام نسبتیں سرتاسر بے بنیاد ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ خدااور انسان کے درمیان ''ہے'' اور ''نہیں'' کی نسبت ہے۔ خدا سب کچھ ہے اور انسان اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ خدا، واجب الوجود (self-existing) ہے، اور انسان مکمل طور پر اور ہر اعتبار سے خدا کے حکم سے وجود میں آنے والی صرف ایک مخلوق۔

انسان کی صفت یہ ہے کہ وہ ایک صاحبِ شعور مخلوق ہے۔ انسان کے ذریعے اس کائنات میں شعوری عجز کا واقعہ وجود میں آتا ہے، اور بلا شبہہ اِس سے بڑا کوئی دوسرا واقعہ نہیں۔ یہی انسان کی اصل قیمت ہے۔ انسان وہ نادر مخلوق ہے، جو اِس کائنات میں شعورِ قدرت کے مقابلے میں شعورِ عجز کی دوسری انتہا (extent) بناتا ہے۔ وہ کائنات کے صفحے پر ''عدد'' کے مقابلے میں ''صفر'' کا ہندسہ تحریر کرتا ہے۔ وہ خداوندی انا کے مقابلے میں اپنے بے انا ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

یہی شعورِ عجز انسان کا سب سے بڑا سرمایہ (asset) ہے۔ یہی کسی انسان کے لیے اس کی سب سے بڑی دریافت (discovery) ہے۔ جب کوئی عورت یا مرد عجز کی زبان بولیں، تو انھوں نے اپنی زبان کا صحیح استعمال کیا۔ اِس کے مقابلے میں جو عورت یا مرد فخر اور سرکشی اور خودنمائی اور گھمنڈ اور اظہار برتری کی زبان بولیں، تو انھوں نے اپنی زبان کا غلط استعمال کیا۔ اِس دنیا میں صرف اُس انسان کو جینے کا حق ہے جو اِس کی قیمت ادا کرے، اور یہ قیمت عجز ہے۔ عجز کی قیمت ادا کیے بغیر اِس دنیا میں رہنا بلاشبہہ ایک جُرم کی حیثیت رکھتا ہے۔

عجز دراصل حقیقت شناسی کی اعلیٰ ترین صورت کا نام ہے۔ عجز کوئی مجبورانہ چیز نہیں، عجز دراصل وہ مثبت کیفیت ہے جو حقیقتِ اعلیٰ کے اختیارانہ اعتراف سے پیدا ہوتی ہے۔ عجز کوئی انفعالی کیفیت نہیں، وہ تمام فعّال کیفیات سے زیادہ بڑی فعّال کیفیت ہے۔

عجز کا تجربہ

ایک حدیثِ قدسی ان الفاظ میں آئی ہے: **أنا عند المنكسرة قلوبهم (حلية الأولياء، جلد2، صفحہ 364)** یعنی میں ٹوٹے دل والوں کے پاس ہوتا ہوں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مادّی قسم کی بربادی، انسان کو خدا سے قریب کرتی ہے، مگر انسان اپنے کو برباد نہیں ہونے دیتا، اِس لیے وہ خدا سے قربت کا تجربہ بھی نہیں کرتا۔

موجودہ دنیا کا نظام اِس طرح بنا ہے کہ انسان کے ساتھ بار بار ناکامی کے واقعات ہوں، وہ دل شکستگی کے تجربے سے دوچار ہو۔ لیکن انسان ہوشیاری کرتا ہے اور اپنے آپ کو اِس قسم کے تجربات سے بچانے کے لیے سب کچھ کرڈالتا ہے۔

اِس ہوشیاری کی عام طور پر دو قسمیں ہیں۔ ایک، یہ کہ صحیح طرز پر معاملہ کرنے میں جب اس کو کوئی نقصان ہوتا ہوا نظر آتا ہے تو وہ فوراً غلط طریقے اختیار کر کے اپنے آپ کو نقصان سے بچانے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ وہ انصاف اور دیانت داری کے طریقے کو چھوڑ کر، بے انصافی اور بددیانتی کا طریقہ اپنا لیتا ہے۔ اِس طرح وہ بظاہر اپنی ناکامی کو کامیابی میں تبدیل کر لیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو دل شکستگی کے تجربے سے دوچار نہیں ہونے دیتا۔ حالاں کہ دل شکستگی کسی انسان کے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آدمی بھُلاوہ کلچر کو اختیار کر لیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو دل شکستگی کے احساس سے بچانے کے لیے شراب پیتا ہے۔ نمائشی تفریحات کے ذریعے اپنا دل بہلاتا ہے۔ وہ مصنوعی سرگرمیوں میں مشغول ہو کر اپنے آپ کو افسردگی کے احساس سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی فطری زندگی گزارے۔ وہ ہمیشہ اعتدال کے ساتھ رہے، وہ کسی بھی حال میں، جھوٹ اور بے انصافی کا طریقہ اختیار نہ کرے۔ اس طرح وہ اُن لمحات سے محروم نہ ہوگا، جب کہ اس کے اوپر عجز کا احساس طاری ہو اور وہ قادرِ مطلق خدا کی قربت کا تجربہ کرے۔

ابتدائی حمد، انتہائی حمد

رابندر ناتھ ٹیگور (وفات: 1941) مشہور بنگالی مصنف ہیں۔ ان کو 1913 میں لٹریچر کا نوبل پرائز ملا۔ انھوں نے اپنی ایک نظم میں کہا ہے — ساری عمر بینا (ستار) کے تاروں کو سلجھانے میں بیت گئی۔ انتم (آخری) گیت جو میں گانا چاہتا تھا، وہ میں نہ گا سکا۔

ٹیگور نے یہ بات اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں کہی تھی۔ لیکن یہ بات حمدِ الٰہی کے بارے میں زیادہ درست طور پر صادق آتی ہے۔ ایک مومن جب خدا کو دریافت کرتا ہے تو وہ بے اختیارانہ طور پر یہ چاہنے لگتا ہے کہ وہ خدا کی حمد بیان کرے، وہ خدا کی عظمت کے نغمے گائے۔ لیکن اس کی عمر پوری ہو جاتی ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا کی عظمت کا بیان گویا ایک ان کہی عظمت (untold glory) ہو کر رہ گیا ہے۔

قرآن میں مومن کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے ہیں: **الحمد لله ربّ العالمين**۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ یہی حمد دوبارہ آخرت میں بیان کی جائے گی (**وقيل الحمد لله رب العالمين**) دونوں میں کیا فرق ہے۔ اصل یہ ہے کہ دنیا میں محدودیت (limitations) کی بنا پر ایک مومن صرف ابتدائی حمد بیان کرتا ہے۔ آخرت کی لامحدود دنیا میں مومن کے لیے یہ موقع ہوگا کہ وہ خدا کی انتہائی حمد بیان کر سکے۔ موجودہ زندگی میں شخصیتوں کا اور دنیوی موضوعات کا چرچا ہوتا ہے۔ آخرت میں صرف ایک اللہ کی حمد اور کبریائی کا چرچا ہوگا۔ یہ ایک ابدی چرچا ہوگا جو ہمیشہ نئے نئے پہلوؤں کے اعتبار سے جاری رہے گا، وہ کبھی ختم نہ ہو سکے گا۔ اُس وقت مومن کو محسوس ہوگا کہ نئے حالات نے اس کو یہ موقع دے دیا ہے کہ وہ اللہ کی ان کہی عظمت (untold glory) کو بیان کرے اور ابدی طور پر اس کو بیان کرتا رہے۔ موجودہ زندگی گویا کہ اِسی ربانی صلاحیت کو پیدا کرنے کی تربیت گاہ ہے۔ آخرت میں خدا کی بے پایاں حمد کو بیان کرنا، بلاشبہہ ایک عظیم ترین سعادت ہے۔ یہ سعادت صرف اُن لوگوں کو ملے گی جو موت سے پہلے کی زندگی میں اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر چکے ہوں۔

منطقی علم، فطری شعور

کسی عورت یا مرد کو سب سے زیادہ محبت اپنی ماں سے ہوتی ہے۔ یہ محبت کسی دلیل یا منطق (logic) کے زور پر نہیں ہوتی۔ وہ مکمل طور پر داخلی شعور کے تحت ہوتی ہے۔ اگر یہ داخلی شعور موجود نہ ہوتو کوئی بھی شخص اپنی ماں سے محبت کا تعلق قائم نہیں کرسکتا۔ یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانے پر خدا کا ہے، جو کہ ہمارا خالق اور مالک ہے۔

خدا کا وجود بلاشبہہ ایک حقیقت ہے، لیکن خدا ہم کو اپنی مادّی آنکھوں کے ذریعے دکھائی نہیں دیتا۔ اِسی طرح عقلی اور منطقی دلائل بھی خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے صرف جزئی حد تک کافی ہیں۔ خدا کے بارے میں کوئی بھی عقلی یا منطقی دلیل آدمی کو صرف امکان (probability) کی حد تک پہنچاتی ہے، نہ کہ یقین (conviction) کی حد تک۔ یہ خالق کی ایک عظیم رحمت ہے کہ اس نے اپنے شعور کو انسان کی فطرت میں ودیعت کردیا۔ خدا کو پہچاننا انسان کے لیے ویسا ہی ایک حتمی معاملہ بن گیا ہے، جیسا کہ اپنی ماں کو پہچاننا اور اس کے ساتھ خصوصی محبت کا تعلق قائم کرنا۔ یہ فطری شعور ہر ایک کے لیے ایک داخلی جبر (inner compulsion) کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ داخلی شعور انسان کے لیے بہت بڑی نعمت ہے، بلکہ سب سے بڑی نعمت۔ کیوں کہ انسان کی فطرت میں اگر یہ جبری شعور نہ ہوتا تو صرف عقلی یا منطقی استدلال اس کے لیے اطمینان کا سبب نہیں بن سکتا تھا۔ ایسی حالت میں اگر آدمی خدا کو مانتا بھی تو وہ کامل یقین کے درجے میں اس کو نہیں مان سکتا تھا۔ فطری شعور کی غیر موجودگی میں شاید کوئی بھی شخص خدا کا سچا مومن نہ بنتا۔ اِس معاملے میں صرف پیغمبروں کا استثناء ہوسکتا تھا جن کو خدا نے براہِ راست مشاہدے کے ذریعے ایمان کا تجربہ کرادیا ہے۔

انسان کی سب سے بڑی سعادت یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کی معرفت حاصل کرسکے۔ ایسی حالت میں اگر صرف منطقی طور پر خدا کو پہچاننا ہوتو وہ انسان کے لیے بہت بڑا رِسک (risk) ہوتا۔ یہ خالق کی بہت بڑی رحمت ہے کہ اس نے انسان کو اِس سنگین رسک سے بچالیا۔

شکر واعتراف

سب سے بڑی چیز جوانسان سے مطلوب ہے، وہ یہ کہ وہ اپنے خالق و مالک کا شاکر بنے۔ وہ اللہ کی نعمتوں پر اللہ کا اعتراف کرے۔ مگر دنیا میں سب سے کم جو چیز پائی جاتی ہے، وہ یہی شکر یا اعتراف ہے۔ انسان خدائی انعامات کے ہجوم میں زندگی گزارتا ہے، لیکن وہ ناشکرا بنا رہتا ہے۔

اِس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان ہر ملی ہوئی چیز کو خدا کے بجائے خود اپنے خانہ میں ڈال لیتا ہے — اس کو وجود کس طرح ملا، ماں باپ کے ذریعے۔ وہ دنیا میں زندہ کیسے ہے، اپنی تدبیروں کے ذریعہ۔ اس نے ترقی کس طرح کی، اپنی ہوشیاری کے ذریعہ۔ اس کے معاملات درست کیسے ہوئے، اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے ذریعے۔ اس نے عزت کا مقام کس طرح پایا، اپنے تعلقات کے ذریعہ، وغیرہ۔

اِس طرح یہ ہوتا ہے کہ جن ملی ہوئی چیزوں کو انسان نے خدا سے پایا ہے، اُن کو خدا سے منسوب (associate) کرنے کے بجائے، وہ اُن کو کسی اور سے منسوب کر دیتا ہے۔

منسوب کرنے کی اِسی غلطی کا یہ نتیجہ ہے کہ انسان کے اندر خدا کے لیے شکر واعتراف کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا۔ خدا کے لیے شکر واعتراف یہ نہیں ہے کہ آپ مختلف مواقع پر الحمد للہ اور سبحان اللہ کے الفاظ بول دیں۔

شکر ہمیشہ ایک دریافت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آدمی پہلے خدا کے محسن ہونے کی حقیقت کو دریافت کرتا ہے۔ یہ دریافت اس کے ذہن کو بیدار کرتی ہے۔ اِس کے بعد ذہن کے اندر ایک پراسس جاری ہوتا ہے۔ پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے سینے میں اللہ کے لیے شکر کا چشمہ جاری ہو جاتا ہے۔

آدمی کے اندر پیدا ہونے والی یہ داخلی کیفیت شکر واعتراف کے الفاظ میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ دریافت کی سطح پر جس نے شکر کو نہیں جانا، وہ اظہار کی سطح پر بھی شکر کی مطلوب عبادت نہیں کر سکتا۔

اعلیٰ ربانی تجربہ

بعض روایات میں ایک اثر نقل کیا گیا ہے۔اس کے الفاظ یہ ہیں: **إنّ العبد إذا دعا ربّه وهو يحبه قال: يا جبريل لا تعجل بقضاء حاجة عبدي، فإنّي أحبّ أن أسمع صوته** (**جامع العلوم والحكم لابن رجب الحنبلي**، صفحہ 342) یعنی بندہ جب اپنے رب کو پکارتا ہے اور وہ بندہ اللہ کو محبوب ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے — اے جبریل، میرے بندے کی حاجت پوری کرنے میں جلدی نہ کر، مجھے محبوب ہے کہ میں اس کی آواز کو سنوں۔

اِس سے مراد سچی معرفت کا کلمہ ہے۔ جب کوئی انسان کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو اُس وقت اس کے تمام داخلی احساسات متحرک ہوجاتے ہیں۔اس کی چھپی ہوئی فطرت جاگ اٹھتی ہے۔

یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جس کو جدید نفسیات کی اصطلاح میں ذہنی طوفان (brain storming) کہا جاسکتا ہے۔اُس وقت اس کی زبان سے وہ خصوصی کلمات نکلتے ہیں جو سچی حمد کو بیان کرنے والے ہوتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ انسان کے لاشعور(unconscious mind) میں خالق کی معرفت گہرائی کے ساتھ موجود ہے،مگر یہ معرفت ابتدائی طور پر خوابیدہ حالت(dormant state) میں ہوتی ہے۔

اِن چھپے ہوئے احساسات کو جگانے کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ انسان کے ساتھ کوئی صدماتی تجربہ (shocking experience) پیش آئے۔جب ایسا ہوتا ہے تو فطرت میں چھپے ہوئے ربانی احساسات جاگ اٹھتے ہیں۔اُس وقت آدمی کی زبان سے ذکر ودعا کے ایسے کلمات نکلتے ہیں جو تخلیقی نوعیت کے ہوتے ہیں۔یہ کلمات وہ ہوتے ہیں جن کو اِس سے پہلے اُس نے نہ سنا تھا اور نہ اپنی زبان سے کہا تھا اور نہ کہیں اُن کو پڑھا تھا۔

یہ ایک انتہائی خصوصی نوعیت کا ذکرِ خداوندی ہوتا ہے۔اِس کو دوسرے الفاظ میں تخلیقی ذکر کہہ سکتے ہیں۔یہ ایک خصوصی توفیق ہے جو اللہ اپنے منتخب بندوں کو عطا کرتا ہے۔

خالق کی بے پناہ عظمت

قرآن کی سورہ الرعد میں یہ آیت آئی ہے: **اللّٰہ الذی رفع السماوات بغیر عمدٍ ترونھا** (13:2) یعنی اللہ ہے جس نے آسمان کو بلند کیا بغیر ایسے ستون کے جو تمھیں نظر آئیں۔ اِس آیت میں ایک عظیم کائناتی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت اتنی زیادہ عظیم ہے کہ اس کو سوچ کر آدمی کا دل دہل اٹھے اور اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔

قدیم روایتی زمانے میں انسان یہ سمجھتا تھا کہ چیزیں کسی مادّی سہارے پر قائم ہیں۔ مثلاً ستارے کسی آسمانی چھت سے لٹکائے گئے ہیں، اور زمین کسی مادی سہارے پر قائم ہے۔ مگر موجودہ زمانے میں جب دوربین ایجاد ہوئی اور خلا (space) کا دوربینی مشاہدہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ساری کائنات ایک خلا میں ہے۔

کہکشائیں، شمسی نظام، ستارے اور سیارے، سب ایک اتھاہ خلا میں کسی سہارے کے بغیر گھوم رہے ہیں۔ یہ سارا معاملہ اتنے وسیع خلا میں ہو رہا ہے کہ انتہائی طاقت ور دوربینوں کے ذریعے بھی اُن کی حدوں کو دیکھا نہیں جا سکتا۔

کسی سہارے کے بغیر قائم یہ کائناتی نظام اتنا زیادہ بڑا ہے کہ اس کا صرف قیاس کیا جا سکتا ہے۔ وسیع کائنات کے بارے میں جو اندازے کئے گئے ہیں اور اس کے جو فوٹو حاصل کئے گئے ہیں، وہ اتنے زیادہ بڑے ہیں کہ اُن کے فاصلوں کو عام اَعداد کے ذریعے بیان نہیں کیا جا سکتا، چناں چہ اُن کو صرف سالِ نور (light years) کی اصطلاح میں بیان کیا جاتا ہے:

Light year: A unit of astronomical distance, equal to the distance that light travels in one year, approximately 6,000,000,000,000 miles.

لامحدود خلا (limetless space) میں انتہائی وسیع کائنات کا معلق ہونا، خالق کی عظمت کا ناقابلِ بیان ثبوت ہے۔

خوفِ خدا کی اہمیت

ایمان خدا کی دریافت ہے۔ یہ دریافت آدمی کے اندر جو صفات پیدا کرتی ہے، اُن میں سے ایک اہم صفت وہ ہے جس کو خشوع اور تقویٰ اور خوف، وغیرہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی خدا کی پکڑ سے ڈرنا، آخرت میں خدا کے سامنے جواب دہی کو سوچ کر ہمیشہ اپنا محاسبہ کرتے رہنا، یہی سچے ایمان کی علامت ہے۔ سچا مومن صرف وہ انسان ہے جس کا سب سے بڑا کنسرن (concern) خدا بن جائے، جس کی سوچ کا فوکس صرف ایک ہو، اور وہ ہے خوفِ خدا۔

موجودہ زمانے میں احیاءِ ملت کے نام سے بہت سی بڑی بڑی تحریکیں اٹھیں، لیکن عملی اعتبار سے سب کی سب بے نتیجہ رہیں۔ اِس ناکامی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اِن تمام مسلم تحریکوں کا فوکس بدلا ہوا تھا— کسی کا فوکس اَغیار سے تحفظ تھا، کسی کا فوکس سیاسی اقتدار تھا، کسی کا فوکس فضائلِ اعمال تھا، کسی کا فوکس ظاہری فارم تھا، کسی کا فوکس ملّی شناخت تھا، وغیرہ، یہ تمام کے تمام بدلے ہوئے فوکس تھے۔ اِس لیے موجودہ زمانے کی تمام مسلم تحریکیں، ظاہری دھوم کے باوجود، اپنے مطلوب نتیجے کے اعتبار سے سرتاسر ناکام رہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام میں اصل فوکس خوفِ خدا ہے۔ خوفِ خدا تمام مثبت صفات (positive qualities) کا سرچشمہ ہے۔ خوفِ خدا سے آدمی کے اندر سنجیدگی پیدا ہوتی ہے۔ خوفِ خدا آدمی کو متواضع (modest) بناتا ہے۔ خوفِ خدا آدمی کے اندر غلطی کے اعتراف کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ خوفِ خدا اصلاحِ خویش کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ خوفِ خدا انفرادی بڑائی کو ختم کرکے اتحاد پیدا کرتا ہے۔ خوفِ خدا آدمی کو حقیقت پسند بناتا ہے۔ خوفِ خدا آدمی کے اندر قرآنی سوچ پیدا کرتا ہے۔ خوفِ خدا آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی موت کو یاد کرتا رہے۔ خوفِ خدا آدمی کو کبر اور انانیت کی نفسیات سے بچاتا ہے۔ خوفِ خدا کی حیثیت، کیرم بورڈ کی اصطلاح کے مطابق، ماسٹر اسٹروک (master stroke) کی ہے جو آدمی کی پوری شخصیت کو مکمل طور پر بدل دیتی ہے۔

عظمتِ الٰہی

وسیع خلا میں تقریباً ایک سوبلین کہکشائیں (galaxies) ہیں۔ ہر کہکشاں کے اندر ایک سوملین سے زیادہ ستارے ہیں۔ اِس عظیم کائنات کا ایک بہت چھوٹا حصہ ہمارا شمسی نظام (solar system) ہے۔ اِسی شمسی نظام میں وہ استثنائی سیارہ واقع ہے جس کو زمین کہا جاتا ہے۔

یہ تمام ستارے اور سیارے ایک بے حد وسیع خلا کے اندر مسلسل نہایت منظّم انداز میں گردش کررہے ہیں۔ یہ وسیع کائنات تقریباً پندرہ بلین سال سے قائم ہے، لیکن اس کے مختلف اجسام (bodies) کے درمیان کبھی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔

یہ عظیم کائنات ایک عظیم تر خالق کے وجود کی گواہی دے رہی ہے، ایک ایسا خالق جو خالق بھی ہے اور اسی کے ساتھ حی وقیوم بھی۔ وہ قادرِ مطلق بھی ہے اور حکمت اور رحمت کا اتھاہ خزانہ بھی۔ یہ خالق اتنی اعلیٰ سطح پر اِس وسیع کائنات کا نظم کررہا ہے کہ اس کے اندر کوئی نقص (defect) پایا نہیں جاتا۔ پوری کائنات حیرت انگیز طور پر ایک بے نقص کائنات (zero-defect universe) ہے۔

ایمان باللہ کسی کلمہ کے لفظی تکرار کا نام نہیں۔ ایمان دراصل اِسی عظیم خالق کی دریافت (discovery) کا نام ہے۔ جب کوئی شخص غور وفکر سے کام لیتا ہے، وہ اپنے وجود سے لے کر بقیہ کائنات تک ایک عظیم تخلیقی کرشمہ کی دریافت کرتا ہے تو وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ بلاشبہہ اِس دنیا کا ایک خالق ہے۔ میں اُس کا اعتراف کرتا ہوں اور اس کے آگے کامل طور پر سرینڈر کرتا ہوں۔

اِسی شعوری دریافت کا نام ایمان باللہ ہے۔ یہ ایمان یا معرفت ایک ایسا فکری انقلاب ہے جو آدمی کی پوری شخصیت کو بدل دیتا ہے۔ اِس ایمان کے بعد آدمی کے اندر ایک نئی ربانی شخصیت ایمرج (emerge) کرتی ہے۔

یہی وہ انقلابی شخصیت ہے جس کو مومن اور مسلم کہا جاتا ہے۔ یہ شخصیت ہمیشہ شعوری معرفت سے بنتی ہے۔ شعوری معرفت نہیں تو مومنانہ شخصیت بھی نہیں۔

محاسبہ کے بغیر

بہت سے لوگ ہیں جو خدا کے وجود کو مانتے ہیں، لیکن وہ محاسبہ (accontability) پر یقین نہیں رکھتے۔ اِس قسم کا عقیدۂ خدا بلاشبہہ ایک غیر مطلوب عقیدہ ہے۔ خدا کے بارے میں درست عقیدہ صرف وہ ہے جس میں آدمی مواخذہ (accountability) کے تصور کو مانتا ہو، یعنی موت کے بعد خدا کے سامنے حاضری اور اپنے تمام اعمال کی جواب دہی۔ محاسبہ اور مواخذہ کے تصور کے بغیر خدا کو ماننا، خدا کا مطلوب عقیدہ نہیں۔

خدا کے وجود کے بارے میں غیر مسلم حضرات نے ایسی کتابیں چھاپی ہیں جو مسلم مصنفین سے بہت زیادہ بہتر ہیں، مگر اِن کتابوں میں محاسبۂ آخرت حذف ہے۔ البتہ خدا کے عقیدے کو پرزور طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً درج ذیل دو کتابیں:

1. *Evidence of God in an Expanding Universe,* Compiled by John Clover Monsma
2. *Man Does not Stand Alone* by Dr. Cressy Morrison

مؤخرالذکر کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں چھپا ہے جس کا ٹائٹل یہ ہے: **الله يتجلى في عصر العلم**۔

حقیقت یہ ہے کہ محاسبۂ آخرت کے تصور کے بغیر خدا کو ماننا یا اس پر لکھنا اور بولنا ایک قسم کی روحانی شاعری (spiritual song) ہے۔ اِس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ خدا پر درست عقیدہ وہ ہے جس میں آدمی خدا کو خالق اور رب ماننے کے ساتھ اس کو محاسب اور مجازی بھی مانتا ہو، یعنی ایسا خدا جو اس کا مواخذہ کرے اور جو سزا و جزا کا اختیار رکھتا ہو۔

خدا کا درست عقیدہ وہ ہے جس کے تصور سے آدمی کا دل دہل اٹھے (8:2) اور اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں (39:23)۔ خدا کا درست عقیدہ وہ ہے جو آدمی کے دماغ میں طوفان بن کر داخل ہو، جو آدمی کے دل کو مستقل تڑپ میں مبتلا کر دے۔ عشقِ الٰہی اور جلوۂ الٰہی کا تصور اِس قسم کی مطلوب کیفیت پیدا نہیں کرسکتا۔

خدا کی عظمت

خدا کی معرفت ایمان اور اسلام کی اساس (basis) ہے۔ جتنی اعلیٰ معرفت، اتنا ہی اعلیٰ ایمان۔ اِس معرفت کی تکمیل اُس وقت ہوتی ہے، جب کہ آپ خدا کو اس کے کمالِ عظمت کے ساتھ دریافت کریں۔ ایک بندہ جب خدا کو اس کی عظمتوں کے ساتھ دریافت کرتا ہے تو اس کا وہی حال ہوتا ہے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: الذین إذا ذکر اللہ وجلت قلوبهم (8:2) یعنی خدا کی یاد سے اُن کے دل دہل اٹھتے ہیں۔ جدید فلکیاتی سائنس (modern astronomy) کا اِس معاملے میں ایک مثبت کنٹری بیوشن (contribution) یہ ہے کہ اس نے خالق کی ناقابلِ قیاس عظمت کا ادراک کرنے کے لیے ایک فریم ورک (frame work) دے دیا ہے۔ اِس فریم ورک کی مدد سے انسان خداوند ذوالجلال کی ناقابلِ بیان عظمت کا ایک تصور اپنے ذہن میں لا سکتا ہے۔

جدید سائنس کئی سو سال سے فلکیات کا مطالعہ کر رہی ہے۔ 1508 میں دوربین (telescope) کی ایجاد ہوئی، اور 1609 میں پہلی بار اٹلی کے سائنس داں گلیلیو (Galileo) نے خلا کا دوربینی مشاہدہ کیا۔ یہ فلکیاتی مشاہدہ برابر بڑھتا رہا۔ پچھلے زمانے میں دوربینی رصدگاہ کسی پہاڑ پر نصب کی جاتی تھی۔ اب خلائی سائنس کا زمانہ آگیا ہے۔ اب انسان نے خلائی رصدگاہ (space observatory) بنالی ہے۔ اِس کے ذریعے کائنات کا مشاہدہ اتنی زیادہ دور تک کرنا ممکن ہو گیا ہے جس کی دوری کو صرف سالِ نور (light years) کی اصطلاح میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ اِس طرح خدا کی عظمت کو تصور میں لانے کے لیے ایک نیا وسیع تر دائرہ انسان کے علم میں آگیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک تازہ ترین فلکیاتی دریافت (discovery) سامنے آئی ہے۔ اِس میں بتایا گیا ہے کہ خلا میں نصب الکٹرانک دوربینوں کے ذریعے ایک بہت بڑا بلیک ہول دریافت ہوا ہے۔ یہ بلیک ہول پورے نظامِ شمسی (solar system) کو نگل سکتا ہے۔ نظام شمسی کا دائرہ کتنا زیادہ بڑا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے اِس نظام کا بعید ترین سیارہ پلوٹو (Pluto) ہے جو سورج کے گرد

بیضوی دائرے میں چکر لگا رہا ہے۔ یہ دائرہ ساڑھے سات بلین میل پر مشتمل ہے۔

مذکورہ بلیک ہول اب تک کے دریافت کردہ تمام بلیک ہول سے زیادہ بڑا ہے۔ اس کا حجم 6 بلین سورج سے بھی زیادہ ہے۔ اِس بلیک ہول کا نام M 87 رکھا گیا ہے۔ یہ بلیک ہول ہماری کہکشاں (Milky Way) سے 50 ملین سال نور کی دوری پر واقع ہے:

This black hole can eat solar system

Astronomers have discovered what they say is the biggest ever black hole which weighs the same as 6.8 billion suns and could swallow our entire solar system. According to the scientists, the black hole, identified as M87, is as large as the orbit of Neptune and by far the largest and most distant galaxy in the nearby universe. As a point of comparison, the black hole at the centre of the Milky Way is 1,000 times smaller than this one which has been observed some 50 million light years away. (*The Times of India,* New Delhi, Tuesday, January 18, 2011 Page 19)

یہ واقعہ اور اِس طرح کے دوسرے واقعات معرفتِ الٰہی کے لیے عظیم خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ واقعات خدا کی قدرت کو ناقابلِ قیاس حد تک عظیم بنا دیتے ہیں۔ جو آدمی اِن واقعات پر سوچے گا، اس کا دل خدا کی عظمت کے تصور سے دہل اٹھے گا، اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ یہ واقعات ایک انسان کو اپنے بارے میں انتہائی عجز اور خدا کے بارے میں انتہائی قدرت کی یاد دلاتے ہیں۔ اِن واقعات پر غور کرنا بلاشبہہ اعلیٰ معرفت کے حصول کا کائناتی خزانہ ہے۔

معرفت یہ ہے کہ آدمی ایک طرف اپنی محدودیت (limitation) کو جانے اور دوسری طرف وہ خدا کی لامحدودیت کو دریافت کرے۔ اِس دریافت کے نتیجے میں جو کیفیت آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے، اُسی کا نام معرفت ہے۔ یہ معرفت جس کو حاصل ہو جائے، اس کے لیے گویا دنیا اور آخرت کی تمام سعادتوں کے دروازے کھل گئے۔ یہی وہ خوش قسمت انسان ہے جس کے بارے میں آخرت میں کہا جائے گا کہ — تم جنت کے دروازوں میں سے جس دروازے سے چاہو، جنت میں داخل ہو جاؤ۔ آج کے بعد تمھارے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی حزن۔

جذباتِ پرستش

انسان اپنے پیدائشی مزاج کے اعتبار سے ایک پرستش پسند مخلوق ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ کوئی اس کا معبود ہو جس کی وہ پرستش کرے۔ کوئی ہو جس کو وہ اپنی توجہات کا مرکز بنا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام قومیں ہیرو پرست ہوتی ہیں۔ وہ اپنے ''اکابر'' کو اپنے خدا پرستارانہ جذبات کا مرکز بنالیتی ہیں۔ ہیروؤں سے غیر معمولی لگاؤ درحقیقت اس جذبۂ عبودیت کا غلط استعمال ہے جو اللہ نے ہر آدمی کے اندر پیدائشی طور پر رکھ دیا ہے۔ جس طرح ہر آدمی کو پیاس لگتی ہے اور وہ پانی پینے پر مجبور ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر آدمی خود اپنے اندرونی جذبے کے تحت مجبور ہے کہ وہ کسی کو معبود بنا کر اس کی پرستش کرے۔ کوئی بھی شخص اس احساس سے خالی نہیں ہو سکتا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ جو لوگ اپنے جذبات پرستش کا مرکز ایک خدا کو بنائیں وہ سچے پرستار ہیں، وہ امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ جو لوگ اپنے جذبات پرستش کا مرکز کسی غیر خدا کو بنالیں وہ جھوٹے پرستار ہیں، وہ امتحان میں ناکام ہو گیے۔

کچھ لوگ ہیں جو اپنی فطرت میں چھپے ہوئے جذبات پرستش کا مرکز بتوں کو یا مظاہر فطرت کو بناتے ہیں۔ کچھ اور لوگ ہیں جو اپنے قومی ہیروؤں کو اپنا معبود بنا لیتے ہیں اور اپنے جذبات پرستش ان کے لیے خاص کر دیتے ہیں۔ یہ سب شرک ہے۔ اور شرک کو خدا کبھی قبول نہیں کرے گا۔

اسی طرح ایک اور طبقہ ہے جو اپنے ''اکابر'' سے وہ محبت کرنے لگتا ہے جو خدا سے ہونی چاہیے۔ اپنے اکابر کی باتوں کو وہ اہمیت دینے لگتا ہے جو خدا کی باتوں کو دینا چاہیے۔ جو اپنے اکابر پر کسی بھی قسم کی تنقید سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اکابر کی تقدیس و تعظیم ہی اس کا سرمایۂ حیات ہوتی ہے۔ یہ بھی بلاشبہہ وہی چیز ہے جسے قرآن میں، غیر اللہ کو اپنا معبود بنانا کہا گیا ہے (9:31)۔

حقیقی موحد وہ ہے جس کے جذبات کا مرکز آخری حد تک صرف خدا بن جائے۔ جو انسانی شخصیتوں میں اٹکا ہوا نہ ہو۔ ایسا آدمی اکابر کے خلاف تنقید سن کر کبھی نہیں بھڑکے گا۔

خدا کا تجربہ

صحیح مسلم میں ایک حدیث نقل ہوئی ہے اس حدیث کا ایک حصہ یہ ہے:

ان اللہ عزو جلّ یقول یوم القیٰمۃ یابن آدم مرضت فلم تعدنی قال یا رب کیف اعودك وانت ربُّ العٰلمین قال ماعلمت انّ عبدی فلانا مرض فلم تعدہ اَما علمتَ انّك لو عدتہ لوجدتنی عندہ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 6721) اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہے گا اے ابن آدم، میں بیمار ہوا مگر تم نے میری عیادت نہ کی۔ بندہ کہے گا کہ اے میرے رب، میں کس طرح تیری عیادت کرتا جب کہ تو سارے عالم کا رب ہے۔ اللہ تعالیٰ کہے گا، کیا تم نے نہیں جانا کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا مگر تم نے اس کی عیادت نہ کی۔ کیا تم نے نہیں جانا کہ تم اگر اس کی عیادت کرتے تو یقیناً تم مجھ کو اس کے پاس پاتے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی آدمی خالص رضائے الٰہی کے لئے ایک کام کرتا ہے تو کام کے درمیان اس پر ایسی کیفیات گزرتی ہیں جب کہ وہ لقاءِ رب کا تجربہ کرتا ہے۔ اس وقت اس کا یہ حال ہوتا ہے گویا کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔

مریض کی ایک عیادت وہ ہے جس میں رضاءِ الٰہی کا جذبہ شامل نہ ہو۔ جس کو آدمی نمائش کے لئے یا کسی فائدہ کے لئے کرے۔ ایسی عیادت صرف دنیوی مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ وہ آدمی کے اندر ربّانی کیفیات پیدا نہیں کرتی۔ دوسری عیادت وہ ہے جب کہ خدا کا ایک بندہ کسی انسان کی بیماری کو سن کر تڑپ اٹھتا ہے۔ اس کو خدا کا یہ حکم یاد آتا ہے کہ تم دوسرے انسانوں پر رحم کرو میں قیامت کے دن تمہارے اوپر رحم کروں گا۔ وہ خالص رضاءِ الٰہی کے جذبہ کے تحت مریض کی طرف روانہ ہوتا ہے اور مریض کے حق میں دعائیں کرتا ہوا اس کے پاس پہنچتا ہے۔

بندۂ مومن خدا کا تجربہ دنیا میں بھی کرتا ہے اور آخرت میں بھی۔ فرق یہ ہے کہ دنیا میں یہ تجربہ بالواسطہ انداز میں ہوتا ہے اور آخرت میں وہ زیادہ مکمل صورت میں براہ راست انداز میں ہوگا۔

شعورِفطرت، وجودِخدا

قرآن کی سورہ الذاریات میں ارشاد ہوا ہے: **ومن کل شيءٍ خلقنا زوجین، لعلکم تذکرون** (51:49) یعنی خالق نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا ہے، تاکہ تم اس سے سبق لو۔ اِس آیت کے مختلف پہلو ہیں۔ اس کا ایک پہلو خود خالق کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس اصول کی رہنمائی میں غور کیا جائے تو وہ آدمی کے لیے خدا کے وجود پر ایمان کا ذریعہ بن جائے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر آدمی اپنے اندر ایک اعلیٰ حقیقت کو پانے کا بے پناہ جذبہ رکھتا ہے۔ ہر انسان اِس اعتبار سے ایک متلاشی (seeker) انسان ہے۔ جب انسان کی تلاش کامیاب ہوتی ہے اور وہ خدا کی دریافت کرتا ہے تو اچانک اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی فطری تلاش کا جواب پالیا۔ اِس اعتبار سے، فطرت کا شعور گویا کہ داخلی حصہ (part) ہے اور خدا کا وجود اس کا خارجی شَی (counter part)۔ یہی خدا کے وجود کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

خدا کے وجود پر بہت سے فلسفیانہ دلائل اور سائنسی دلائل موجود ہیں۔ یہ دلائل صرف پچاس فی صد کی حد تک کام کرتے ہیں۔ یہ دلائل خدا کے وجود پر صرف عقلی قرینہ (rational probability) فراہم کرتے ہیں۔ لیکن یقین والا ایمان کسی آدمی کو صرف اُس وقت حاصل ہوتا ہے، جب کہ وہ اپنے شعور کی سطح پر خدا کو پالے۔ عقلی دلائل آدمی کو امکان (probability) تک پہنچاتے ہیں اور آدمی کا داخلی شعور اس کو یقین (conviction) عطا کرتا ہے۔

فطری شعور کی سطح پر خدا کو پانا ایسا ہی ہے جیسے ایک چھوٹا بچہ جدائی کے بعد اپنی ماں کو پالے۔ اُس وقت بچے کو بلاشبہہ یہ یقین ہوتا ہے کہ یہی خاتون میری ماں ہے۔ لیکن اُس کے اِس یقین کی بنیاد کسی عقلی تجزیہ پر نہیں ہوتی، بلکہ داخلی شعور کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ جس شخص نے خدا کو اپنے داخلی شعور کی سطح پر پایا، وہی در اصل خود کو پانے والا ہے۔ حقیقی ایمان وہ ہے جو داخلی یقین سے حاصل ہو۔ صرف عقلی دلیل کے ذریعے حاصل ہونے والا ایمان مطلوب ایمان نہیں۔

تبارک اللہ

تبارک کالفظی مطلب ہے — بہت زیادہ برکت والا۔ یہ لفظ قرآن میں 9 بار آیا ہے۔ یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوتا ہے (وھی کلمة لم تستعمل إلاّ لله وحده)۔ تبارک کا لفظ 'برکۃ' سے مشتق ہے۔ یہ تفاعل کے وزن پر برکۃ کا مبالغہ ہے۔ برکۃ کے معنی حضرت عبداللہ بن عباس نے اِن الفاظ میں بیان کیے ہیں: الکثرة فی کلّ خیر (لسان العرب 10/396) یعنی ہر قسم کے خیر کی کثرت۔

تبارک کا مطلب ہے — ہر پہلو سے اور ہر چیز میں کمالِ خیر کا حامل ہونا۔ مثلاً قرآن میں ہے: فتبارك الله أحسن الخالقين (23:14) اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی تخلیق ہر پہلو سے کامل ہے، اللہ کی بنائی ہوئی دنیا میں ہر چیز اپنے فائنل ماڈل (final model) پر ہے۔ اِس دنیا کا تخلیقی منصوبہ اتنا زیادہ اعلیٰ ہے کہ اس میں کوئی تضاد نہیں، اِس میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں، کسی پہلو سے اس میں ادنیٰ درجے میں کوئی نقص (defect) موجود نہیں۔

انسان کو جو جسم دیا گیا ہے، وہ ہر اعتبار سے ایک بہترین جسم ہے۔ اِس دنیا میں جو لائف سپورٹ سسٹم پایا جاتا ہے، وہ انسان کی تمام ضرورتوں کو آخری حد تک پورا کرنے والا ہے۔ سولر سسٹم اور کہکشاؤں کا نظام اپنی ساری وسعتوں کے باوجود پوری طرح خالی از نقص (zero-defect) صفات کا حامل ہے۔ نباتات، جمادات اور حیوانات کی وسیع دنیا اپنے تمام تنوعات کے باوجود ہر پہلو سے کمالِ خیر کے نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اللہ اپنی ذات میں خیرِ کامل ہے۔ اُسی سے خیر وبرکت کا تمام فیضان لوگوں تک پہنچتا ہے۔ یہ سب انسان کے لیے ایک عظیم رحمت (blessing) ہے۔ وہ اِس لیے ہے کہ انسان ان کو دیکھ کر خدا کی بے پایاں عظمت وقدرت کا تعارف حاصل کرے۔ وہ خدا سے سب سے زیادہ محبت کرنے لگے، اور خدا کے بارے میں اس کے اندر خشیت کے اعلیٰ جذبات پیدا ہوں۔ یہی ایمان ہے، اور خدا کی پیدا کی ہوئی دنیا اِسی ایمان کی کائناتی تربیت گاہ۔

ابتغاء رضوان اللہ

اسلام کے مطابق، مقبول عمل وہ ہے جو خالص رضوان اللہ (57: 27) اور مرضات اللہ (2: 265) کے لیے انجام دیا جائے۔ جس عمل میں رضوان الٰہی یا مرضات الٰہی کی اسپرٹ شامل نہ ہو، وہ آخرت کے اعتبار سے مقبول عمل نہیں، خواہ بظاہر لوگوں کو وہ ایک شان دار کام دکھائی دیتا ہو۔

اللہ کی رضا (goodwill) کے لیے کام کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جب آپ کوئی کام کریں تو آپ اپنے منہ سے یہ الفاظ بول دیں کہ — میں اللہ کی رضا کے لیے یہ کام کر رہا ہوں۔ یہ رضاء الٰہی کی تصغیر ہے۔ رضاء الٰہی یا رضوانِ الٰہی ایک گہری اسپرٹ کا نام ہے۔ یہ اسپرٹ لمبے عمل کے نتیجے میں کسی کے اندر پیدا ہوتی ہے اور جو شخص اِس زندہ اسپرٹ کے تحت کام کرے، اُس کا عمل رضاء الٰہی کے مطابق کیا جانے والا عمل ہے۔ جو کام اِس اسپرٹ سے خالی ہو، وہ گویا کہ پلاسٹک کا پھول ہے۔ پلاسٹک کا پھول دیکھنے میں بظاہر پھول نظر آتا ہے، لیکن اس کو کبھی حقیقی پھول کا درجہ نہیں ملتا۔

اصل یہ ہے کہ جب ایک بندۂ خدا کے اندر تلاش کا جذبہ (seeking spirit) پیدا ہوتا ہے تو وہ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ سچائی کو جاننے کی کوشش کرتا ہے، وہ خدا کی کتاب کو پڑھتا ہے، حدیثِ رسول کا مطالعہ کرتا ہے، تخلیقاتِ خداوندی میں غور وفکر کرتا ہے، وہ ہر قسم کے تعصّبات سے خالی ہو کر یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ سچائی کیا ہے۔ آخر کار اس کے اوپر سچائی پوری طرح کھل جاتی ہے۔ یہی دریافت وہ مقام ہے جہاں سے رضائے الٰہی کا سفر شروع ہوتا ہے۔

اِس دریافت کے بعد یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی سوچ بدل جاتی ہے۔ وہ اپنے رات دن کے لمحات میں اِسی کے بارے میں سوچتا ہے۔ آخر کار، اس کی زندگی کا ایک فوکس (focus) بن جاتا ہے۔ یہ فوکس اللہ کی رضا ہوتی ہے۔ وہ دل وجان سے یہ چاہنے لگتا ہے کہ اس کا رب اس سے راضی ہو۔ وہ اپنے رب کی رحمتوں کا مستحق بنے۔ قیامت کے دن وہ عرشِ الٰہی کے سائے میں جگہ پائے۔ جو کام اِس اسپرٹ کے ساتھ انجام دیا جائے، وہی رضاء الٰہی کے مطابق، کیا جانے والا کام ہے۔

سجدۂ قربت

قرآن کی سورہ العلق میں ارشاد ہوا ہے: **واسجد واقترب** (96:19) یعنی سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **أقرب ما یکون العبد من ربّه وهو ساجد، فأكثروا الدعاء (صحيح مسلم، رقم الحديث: 1111)** یعنی بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب اُس وقت ہوتا ہے، جب کہ وہ سجدے میں ہوتا ہے، اِس لیے تم سجدے کی حالت میں زیادہ سے زیادہ دعا کرو۔ قربتِ خداوندی کا یہ معاملہ صرف شکلِ سجدہ پر نہیں ہے، بلکہ روحِ سجدہ پر ہے۔ ایک واقعہ اِس معاملے کی وضاحت کرتا ہے۔

بنگلور کا واقعہ ہے۔ ایک ہندو نوجوان کی بعض عادتوں سے اُس کا باپ سخت ناراض ہوگیا۔ اُس نے اپنے بیٹے کو گھر سے نکال دیا۔ ایک عرصے تک وہ اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ آخر کار، اس کی ملاقات ڈاکٹر احمد سلطان (وفات: 1999) سے ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمھارا باپ تم کو دوبارہ قبول کرلے تو اس کی صرف ایک صورت ہے۔ تم خاموشی سے اپنے گھر جاؤ، اور وہاں پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ جب دروازہ کھلے اور تمھارا باپ تمھارے سامنے آئے تو تم فوراً ہی باپ کے پیروں پر گر پڑو، اور کہو کہ باپ، مجھ سے غلطی ہوئی، مجھ کو معاف کردے۔ لڑکے نے ایسا ہی کیا۔ جب لڑکا روتے ہوئے اپنے باپ کہ پیروں پر گر پڑا تو باپ بھی رونے لگا۔ اس نے اپنے بیٹے کو اٹھا کر سینے سے لگالیا اور اس کو معاف کر کے دوبارہ اپنے گھر میں داخل کرلیا۔

سجدہ بلاتشبیہہ اِسی قسم کی ایک حالت ہے۔ سجدہ کوئی رسمی فعل نہیں۔ حقیقی سجدہ یہ ہے کہ ایک بندہ شدتِ احساس سے بے چین ہو جائے اور بے تابانہ طور پر وہ اپنا سر زمین پر رکھ دے۔ ایسا سجدہ گویا کہ اپنے رب کے قدموں میں سر رکھنے کے ہم معنیٰ ہوتا ہے۔ ایسا سجدہ تسلیم ورضا کی آخری صورت ہے۔ جب کوئی بندہ اِس طرح اپنے آپ کو آخری حد تک خدا کے آگے سرینڈر (surrender) کردے تو خدا کی رحمت کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ اس کو معاف فرما کر اُسے اپنی رحمتوں کے سایے میں لے لے۔

شرک کیا ہے

قرآن کی سورہ البقرہ کی ایک آیت یہ ہے: **ومن الناس مَن يتخذ مِن دون الله أنداداً يحبونهم كحبّ الله، والذين آمنوا أشد حباً لله، ولو يرى الذين ظلموا إذ يرون العذاب أن القوة لله جميعاً، وأن الله شديد العقاب** (2:165) یعنی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا برابر ٹھہراتے ہیں۔ وہ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنا چاہئے۔ اور جو اہلِ ایمان ہیں، وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھنے والے ہیں۔ اور اگر یہ ظالم اس وقت کو دیکھ لیں جب کہ وہ عذاب سے دوچار ہوں گے تو وہ سمجھ لیتے کہ زور سارا کا سارا اللہ کا ہے اور اللہ بڑا سخت عذاب دینے والا ہے۔

اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا کیا ہے، وہ یہ ہے کہ کسی کو اللہ کا نِدّ ٹھہرایا جائے۔ ند کے معنی مِثل (equal) کے ہیں۔ اللہ کے سوا، کسی اور کو اُس کا ند ٹھہرانا شرک ہے، خواہ وہ کلی معنی میں ہو یا جزئی معنی میں۔

اللہ کا ند ٹھہرانا کن پہلوؤں سے ہوتا ہے، مذکورہ آیت میں اِس کے دو پہلو بیان کئے گئے ہیں — محبت، اور قوت۔ قرآن کی ایک اور آیت کے مطابق، اِس کا تیسرا پہلو خشیت (9:18) ہے۔ بنیادی طور پر یہی تین چیزیں ہیں جو شرک کی پہچان ہیں۔ مذکورہ تینوں معاملے میں جس نے اللہ کے سوا کسی اور کو شریک کیا، اس نے شرک کا ارتکاب کیا۔ حتی کہ اگر کسی شخص نے خود اپنے آپ کو اِس قسم کا درجہ دیا تو اس کا کیس بھی شرک کا کیس بن جائے گا (45:23)۔

اِس بات کو دوسرے لفظوں میں اِس طرح کہا جاسکتا ہے کہ — توحید کا مطلب ہے ہر اعتبار سے، صرف ایک اللہ کو اپنا واحد کنسرن (sole concern) بنانا، اور شرک کا مطلب ہے — جزئی یا کلی طور پر کسی غیر اللہ کو اِس کنسرن میں شریک کرنا۔

جب کوئی شخص اللہ کو اِس حیثیت سے دریافت کرے کہ یہ اللہ ہے جس نے اس کو عدم سے

وجود بخشا، جس نے اس کو اعلیٰ درجے کی شخصیت عطا فرمائی، جس نے اس کو زمین جیسے نادر سیارے پر آباد کیا، جس نے اُس کے لیے لائف سپورٹ سسٹم کا انتظام کیا، وغیرہ۔ اِس طرح کا احساس آدمی کے اندر اللہ کے ساتھ بے پناہ تعلق پیدا کرتا ہے، وہ اللہ کو اپنا سب کچھ سمجھنے لگتا ہے۔ یہی اللہ کے ساتھ شدید محبت کی بنیاد ہے۔

پھر جب وہ اللہ کی اِس حیثیت کو دریافت کرتا ہے کہ یہ تمام چیزیں اس کا یک طرفہ عطیہ ہیں، کسی بھی وقت اللہ اس کو چھین سکتا ہے۔ پھر یہ کہ ہر عطیہ کے ساتھ جواب دہی (accountability) جڑی ہوئی ہے۔ یہ احساس اس کو مزید اِس اندیشے میں مبتلا کر دیتا ہے کہ اگر میں نے ان عطیاتِ الٰہی کا حق ادا نہ کیا تو اللہ کے یہاں میری سخت پکڑ ہوگی۔ یہ احساسات آدمی کے اندر وہ کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جس کو قرآن میں خوفِ شدید (9:18) کہا گیا ہے۔

اِسی کے ساتھ آدمی یہ دریافت کرتا ہے کہ اِس دنیا میں سارا اختیار صرف ایک اللہ کو حاصل ہے، اللہ کے سوا کسی اور کو جزئی درجے میں بھی کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اللہ ہی دینے والا اور اللہ ہی محروم کرنے والا ہے۔ یہ احساس اُس کو اپنے عجزِ کامل کی یاد دلاتا ہے۔ وہ اِس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں پاتا کہ وہ اللہ کے آگے اپنے آپ کو پوری طرح سرینڈر کر دے۔

اِسی دریافت کا نام معرفت (realization) ہے۔ اِس دریافت سے جس کے اندر وہ شخصیت بنے جب کہ ایک اللہ ہی اس کے لیے سب کچھ بن جائے، وہ اُسی کی یاد میں جئے اور یہی سوچ اس کی غالب سوچ بن جائے، ایسا انسان شریعت کی اصطلاح میں موحد ہے۔ اِس کے برعکس، اللہ جس کا واحد کنسرن نہ ہو، بلکہ اس کے ساتھ وہ دوسری چیزوں کو بھی اپنا کنسرن بنائے ہوئے ہو، ایسا انسان شریعت کی اصطلاح میں شرک میں مبتلا ہے۔ موحد کی شخصیت انٹگریٹیڈ پرسنالٹی (integrated personality) ہوتی ہے، اور مشرک کی شخصیت اسپلٹ پرسنالٹی (split personality)۔

شریعت کے مطابق، اللہ انسان کی اصل غایت ہے، اور دوسری چیزیں صرف اس کی ضرورت۔ توحید اور شرک دونوں کا تعلق حقیقت سے ہے، نہ کہ صرف مظاہر سے۔

اللہ کے ساتھ

عربی زبان میں بہت سے مضامین اور کتابیں چھپی ہیں جن کا ٹائٹل اِس قسم کا ہوتا ہے — ایک ساعت فلاں کے ساتھ (ساعةٌ مع فلان)۔ اِس طرح کا ٹائٹل بظاہر درست ہے، مگر عجیب بات یہ ہے کہ کوئی لکھنے والا اِس طرح کے ٹائٹل کے ساتھ کیوں نہیں لکھتا کہ — ایک ساعت اللہ کے ساتھ (ساعةٌ مع الله)۔ یہ واقعہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے لکھنے والوں کو انسان کی صحبت تو ملی، مگر اُن کو اللہ کی صحبت نہیں ملی۔

حدیث میں آیا ہے کہ مومن پر ایسا لمحہ گزرنا چاہیے، جب کہ وہ اپنے رب سے سرگوشی کر رہا ہو: **ساعةٌ يناجي فيها ربَّه**(**حلية الأولياء لأبي نُعيم** 1/221)۔ سرگوشی (whisper) ایک ایسے تجربے کا نام ہے جب کہ انسان اپنے آپ کو اپنے رب سے قریب پاتا ہے، اتنا زیادہ قریب کہ وہ سرگوشی کے انداز میں اپنے رب سے کلام کرنے لگتا ہے۔

قرآن سے ثابت ہے کہ خدا اپنے بندے سے بہت قریب ہے (2: 286)۔ اِسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ سجدہ کے وقت انسان، خدا سے قربت کا تجربہ کرتا ہے (96: 19)

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ جب ایک انسان اپنے رب کو دریافت کرتا ہے، وہ آفاق وانفُس میں گہرائی کے ساتھ غور کرتا ہے تو بار بار وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے رب کے انتہائی قریب پہنچ گیا ہے۔ اُس وقت اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے، اس کی آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہے، وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ربانی فیضان (divine inspiration) کی سطح پر خدا سے جڑ گیا ہے۔ اُس وقت آدمی کی زبان سے غیر متوقع طور پر اعلیٰ ربانی کلمات ادا ہونے لگتے ہیں، اس کا پورا وجود ایک روحانی تجربے میں غرق ہو جاتا ہے۔ وہ دیکھے بغیر خدا کو دیکھنے لگتا ہے، وہ ہم کلام ہوئے بغیر خدا سے بات کرنے لگتا ہے، بظاہر دوری کے باوجود وہ خدا سے آخری حد تک قریب ہو جاتا ہے — اِس دنیا میں خدا کی قربت یہ ہے کہ کوئی شخص روحانی سطح پر اِس طرح اپنے رب کو پالے۔

حبِّ الٰہی، محبتِ رسول

مومن سے یہ مطلوب ہے کہ اس کو خدا سے اور خدا کے رسول سے نہایت گہرا قلبی تعلق ہو۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کو خدا سے محبت کے درجے کا تعلق ہونا چاہیے (2: 165)۔ جہاں تک رسول کا تعلق ہے، قرآن میں رسول کے لیے محبت کا لفظ نہیں آیا ہے، بلکہ اتباع اور اطاعت کے الفاظ آئے ہیں (3: 31)۔ تاہم حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول سے بھی محبت کے درجے کا تعلق مطلوب ہے۔ البتہ اللہ سے محبت اور رسول سے محبت کے درمیان وہی فرق پایا جائے گا جو خود اللہ اور رسول کے درمیان پایا جاتا ہے۔

حبِّ الٰہی سے مراد عشقِ الٰہی نہیں ہے۔ اِسی طرح محبتِ رسول سے مراد عشقِ رسول نہیں ہے۔ اِس معاملے میں عشق کا لفظ قرآن اور حدیث میں اجنبی ہے۔ اِس معاملے میں عشق کا تصور بلاشبہہ ایک مُبتدعانہ تصور ہے، جو بعد کے زمانے میں پیدا ہوا۔ محبت کا تعلق شعوری معرفت سے ہے، جب کہ عشق صرف ایک والہانہ کیفیت کا نام ہے۔ حقیقی محبت اعلیٰ معرفت کے ذریعے پیدا ہوتی ہے، جب کہ عشق ایک ایسی مبہم کیفیت کا نام ہے جس کو صرف وجد (ecstasy) اور بے خودی جیسی پُراسرار حالت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

محبتِ الٰہی کا سرچشمہ یہ ہے کہ آدمی جب بے شمار خدائی انعامات کے بارے میں سوچتا ہے، تو فطری طور پر اس کے اندر اِن انعامات کے مُنعم کے بارے میں گہرا جذبۂ اعتراف پیدا ہوتا ہے۔ اِس کے مقابلے میں رسول سے محبت کا جذبہ اِس اعتبار سے پیدا ہوتا ہے کہ رسول کے ذریعے ہم کو خدا کی ہدایت ملی۔ اِس کے بغیر ہم خدا کی ہدایت سے محروم رہتے۔

دونوں کے درمیان فرق کو اِس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ خدا سے محبت فوق الطبیعی جذبے کے تحت پیدا ہوتی ہے، اور رسول سے محبت طبیعی جذبے کے تحت۔ خدا سے محبت، ربّ العالمین سے محبت ہے، اور رسول سے محبت، رب العالمین کے فرستادہ سے محبت۔

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لایؤمن أحدکم حتّٰی

أکون أحبَّ إلیه من والده وولده والنّاس أجمعین ۔ایک اورروایت میں اِن الفاظ کا اضافہ ہے:مِن أھلہ ومالہ (فتح الباری بشرح صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب حبّ الرّسول) یعنی تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اُس کا یہ حال نہ ہوجائے کہ میں اس کے لیے اس کے والد سے اور اس کی اولاد سے اور اس کے اہل سے اور اس کے مال اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔

محبتِ رسول کے بارے میں جو روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں، اُن میں یہ بات بہت زیادہ قابلِ غور ہے کہ اُن میں سے کسی روایت میں اِس قسم کے الفاظ نہیں آئے ہیں کہ تم رسول سے اُسی طرح محبت کرو، جس طرح تم خدا سے محبت کرتے ہو۔ اِس کے بجائے روایتوں میں اِس قسم کے الفاظ آئے ہیں کہ تمھارا ایمان باللہ اُس وقت مکمل ہوگا، جب کہ تم رسول سے اُس سے بھی زیادہ محبت کرو جتنا کہ تم اپنے والد سے، اپنے اہل سے اور اپنے مال اور اولاد سے محبت کرتے ہو، یعنی اِن روایتوں میں خدا کے برابر محبت کا ذکر نہیں ہے، بلکہ اپنی محبوباتِ دنیا سے زیادہ، رسول سے محبت کا ذکر ہے۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں محبتوں میں ایک نوعی فرق ہے۔ حبِّ الٰہی بہ معنیٰ تعظیم اور اِجلال مراد ہے، اور حبِّ رسول بہ معنی ترجیح اور تقابل مراد ہے۔ حبِّ الٰہی ایک مطلق نوعیت کی محبت ہے۔ اِس کے مقابلے میں حبِّ رسول کا معاملہ یہ ہے کہ وہ بہ مقابلہ محبوباتِ دنیا مراد ہے۔ جو لوگ محبوباتِ دنیا سے اوپر نہ اٹھیں، وہ رسول کے ربّانی مشن میں اپنے آپ کو پوری طرح وقف نہیں کرسکتے۔ جو آدمی خدا کے رسول کو خدا کے رسول کی حیثیت سے پہچانتا ہے، وہ فوراً ہی یہ چاہنے لگتا ہے کہ وہ اصحابِ رسول کی طرح رسول کے دعوتی مشن میں شامل ہوجائے۔ یہ شُمولیت اعلیٰ درجے میں اُسی وقت ہوسکتی ہے، جب آدمی کو رسول کے ساتھ محبت کے درجے کا تعلق پیدا ہوجائے۔

رسول سے محبت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رسول سے عاشقانہ اور والہانہ تعلق ہو، جیسا کہ کسی نعت خواں، یا قوّال میں بظاہر دکھائی دیتا ہے۔ بلکہ رسول سے محبت کا مطلب یہ ہے کہ رسول کے دعوتی مشن سے گہرا لگاؤ ہو۔ ہر دوسری چیز کو ثانوی (secondary) بنا کر آدمی رسول کے دعوتی مشن کو اپنا دعوتی مشن بنالے، جس طرح خود رسول نے اپنی زندگی میں کیا تھا۔

خدا کا پڑوس

خدا کا پڑوس

جنت کیا ہے، جنت دراصل خدا کے پڑوس میں رہنے کا نام ہے (66:11)۔ موت سے پہلے کی دنیا میں مومن احساس کے اعتبار سے، خدا کے پڑوس میں جیتا ہے۔ موت کے بعد کی دنیا میں مومن واقعہ کے طور پر خدا کے پڑوس میں زندگی گزارے گا۔

خدا بلاشبہہ تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ اِس لیے کسی انسان کو حقیقی سکون صرف خدا کے پڑوس میں مل سکتا ہے، اِس سے کم تر درجے کی کوئی چیز انسان کے لیے حقیقی سکون کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

موجودہ دنیا دراصل اسی قسم کے انسانوں کا انتخابی مقام (selection ground) ہے۔ یہاں اُن انسانوں کو چنا جارہا ہے جو اپنی صفات کے اعتبار سے، خدا کے پڑوس میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔ جن کی سوچ، جن کی سرگرمیاں، جن کے جذبات، جن کا سلوک، جن کے معاملات اُس اعلیٰ اخلاقی معیار پر پورے اتریں جو خدا کا پڑوسی بننے کے لیے مطلوب ہیں۔ یہی لوگ اِس عزت کے لیے منتخب کئے جائیں گے۔ یہ انتخاب فرشتوں کے ریکارڈ کی بنیاد پر کیا جائے گا۔

آخرت کی ابدی زندگی میں کسی کو خدا کے پڑوس میں رہنے کی یہ خوش قسمتی تمام تر ذاتی خصوصیت (merit) کی بنیاد پر حاصل ہوگی۔ خدا کا پڑوس گویا کہ ایک کائناتی باغ ہے۔ اِس کائناتی باغ میں صرف خدائی معیار پر پورا اترنے والے لوگ ہی جگہ پائیں گے۔ خدائی معیار سے کم تر کوئی چیز کسی آدمی کو اِس کائناتی باغ میں جگہ دینے والی نہیں۔

یہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے دنیا کی زندگی میں صرف خدا کو اپنا واحد کنسرن (supreme concern) بنایا ہو، جن کی سوچ اور جن کے جذبات تمام تر خدا کے لیے وقف ہو گئے ہوں جن کی صبح بھی خدا کی یاد سے معمور ہو اور جن کی شام بھی خدا کی یاد سے معمور۔ یہی وہ خوش قسمت لوگ ہیں جو خدا کے پڑوس میں رہنے کے لیے منتخب کئے جائیں گے۔

متشابہ دنیا

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ جنت کو جب جنت میں داخل کیا جائے گا اور ان کو وہاں کا رزق دیا جائے گا تو اُس کو پا کر وہ کہیں گے کہ — یہ تو وہی ہے جو ہم کو اِس سے پہلے دنیا میں دیا گیا تھا۔ اور اُن کو جنت میں متشابہ رزق دیا جائے گا (2:25)۔

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو دنیائیں ایک دوسرے کے مشابہ پیدا کیں۔ ایک موجودہ دنیا، اور دوسری جنت والی دنیا۔ موجودہ دنیا امتحان (test) کے لیے ہے اور اگلی دنیا انجام (reward) کے لیے۔ موجودہ دنیا ناقص ہے اور آخرت کی دنیا کامل۔ یہ غیر معیاری ہے اور وہ معیاری۔ یہ ناپائدار ہے اور وہ پائدار۔ قرآن کے الفاظ میں، یہاں خوف اور حزن ہے اور دوسری دنیا خوف اور حزن سے مکمل طور پر خالی ہے۔

موجودہ دنیا میں آدمی کو بار بار یہ تجربہ ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے وہ بظاہر یہاں موجود ہے، اِس کے باوجود وہ آدمی کے لیے قابلِ حصول نہیں۔ آدمی صحت چاہتا ہے، مگر بیماری، حادثہ اور بڑھاپا اُس کی تمناؤں کی نفی کر دیتے ہیں۔ آدمی لذت چاہتا ہے، مگر ہزار کوشش کے بعد جب وہ سامانِ لذت کو حاصل کر لیتا ہے تو اس پر کھُلتا ہے کہ وہ اُس سے انجوائے نہیں کر سکتا۔ آدمی خوشیوں سے بھری ہوئی زندگی چاہتا ہے، مگر خوشیوں کے باغ میں داخل ہو کر وہ دریافت کرتا ہے کہ یہاں خوشیوں کا باغ طرح طرح کے کانٹوں سے بھرا ہوا ہے۔

ایسا اس لیے ہے کہ آدمی کو یہاں جنت کا تعارف صرف دور سے دیا جاتا ہے۔ یہاں آدمی کو جنت کی ایک جھلک تو دکھائی جاتی ہے مگر اسی کے ساتھ اس کو یہ بتایا جاتا ہے کہ جنت تمھیں اس دنیا میں نہیں مل سکتی۔ تمھارے لیے مقدر ہے کہ یہاں تم جنت کے لیے کوشش کرو اور اگلے مرحلۂ حیات میں جنت کو عملاً حاصل کرو۔ موجودہ دنیا میں آدمی سے عمل مطلوب ہے۔ اسی کے ساتھ ابتدائی جھلک کی صورت میں اُس کو دکھا دیا جاتا ہے کہ اگر تم عمل میں پورے اترے تو وہ کون سی دنیا ہے جہاں تمھیں اس کے نتیجے میں داخلہ دیا جائے گا، موجودہ دنیا تعارفِ جنت کا مقام ہے اور اگلی دنیا حصولِ جنت کا مقام۔

جنت کا تعارف

قرآن کی سورہ السجدہ میں ارشاد ہوا ہے: **فلا تعلم نفس ما أخفی لهم من قرّة أعين جزاءً بما كانوا يعملون** (21:17) یعنی کسی کو خبر نہیں کہ اِن لوگوں کے لیے آنکھوں کی کیا ٹھنڈک چھپا رکھی گئی ہے۔

اس آیت کے مطابق، جنت اِس دنیا میں ایک لامعلوم چیز ہے۔ لیکن قرآن کی ایک اور آیت میں کہا گیا ہے: **يدخلهم الجنة عرّفها لهم** (47:6) یعنی خدا ان کو جنت میں داخل کرے گا جس کی اُنھیں پہچان کرادی ہے۔

قرآن کی اِس دوسری آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی پہچان اِسی دنیا میں ہوجاتی ہے۔ ایسی حالت میں دونوں آیتوں کے درمیان تطبیق کی صورت کیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ پہلی آیت میں جنت کی عملی یافت کو بتایا گیا ہے اور دوسری آیت میں جنت کی فکری دریافت کا بیان ہے۔ جنت بلاشبہہ اپنے پورے مفہوم کے اعتبار سے صرف آخرت میں معلوم ہوگی، لیکن موجودہ دنیا میں انسان جنت کو بالقوہ طور پر (in terms of potential) جان لیتا ہے، اور آخرت میں وہ جنت کو بالفعل طور پر (in terms of actual) حاصل کرلے گا۔

جو انسان جنت کے بارے میں حساس ہو، جو خدا کے تخلیقی نقشہ پر غور کرتا ہو، جو دنیا اور آخرت کی حکمتوں میں تدبر کرتا ہو، وہ اِسی دنیا میں جنت کی جھلک کو پالیتا ہے۔ وہ اِس حقیقت کو دریافت کرلیتا ہے کہ موجودہ دنیا اِس انداز میں بنائی گئی ہے کہ وہ جنت کا تعارف بن گئی ہے۔

آخرت کی جنت ایک کامل (perfect) جنت ہے اور موجودہ دنیا گویا کہ غیر کامل (imperfect) جنت۔ آخرت کی جنت میں آدمی جن آسائشوں کو اپنی آئیڈیل صورت میں پائے گا، اُن آسائشوں کا تجربہ اس کو اِسی دنیا میں آئڈیل سے کم تر درجے میں ہوجاتا ہے، اِس فرق کے ساتھ کہ آخرت کی جنت ابدی جنت ہے اور موجودہ دنیا اس کا صرف وقتی اور جزئی تعارف۔

جنت کا استحقاق

قرآن کی سورہ ابراہیم میں ارشاد ہوا ہے: لئـن شکرتم لأزیدنکم (14:7) یعنی اگر تم دنیا میں اللہ کے عطیات پر شکر کرو گے تو تم کو آخرت میں خدا کے عطیات دئے جائیں گے۔

حقیقی شکر سب سے بڑا عمل ہے۔ شکر تمام عبادات کا خلاصہ ہے۔ جو آدمی دنیا کی زندگی میں حقیقی معنوں میں شکر گزاری کا ثبوت دے، وہ آخرت میں دوبارہ خدا کی نعمتوں سے سرفراز کیا جائے گا۔ حقیقی شکر کسی آدمی کو جنت کا مستحق بناتا ہے۔ جنت میں صرف اعلیٰ روحیں داخل کی جائیں گی، اور اعلیٰ روح وہ ہے جو حمد اور شکر کی کیفیات سے بنی ہو۔ اِس اعلیٰ روح کو جنت کے ابدی باغوں میں بسایا جائے گا۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جنت والے جب جنت میں داخل کر دئے جائیں گے تو وہ کہیں گے: الحمد لله الذی أذهب عنا الحزَن (35: 34) یعنی اللہ کا شکر ہے جس نے حزن کو ہم سے دور کر دیا۔

دنیا کی زندگی میں ہر آدمی کا ایک لمحۂ حزن یا زمانۂ حزن ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ وقت آتا ہے جب کہ وہ اس حزن (sorrow) سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ جو آدمی اپنے اِس زمانہ حزن کو اور پھر زمانہ فرحت کو دریافت کرے اور پھر وہ یہ کہہ اٹھے کہ خدایا، تو نے دنیا میں میرے حزن کو دور کر دیا، اِسی طرح تو آخرت میں میرے حزن کو دور کر دے۔ جو آدمی سچے احساس کے ساتھ یہ بات کہے تو یہ بات اس کے لیے ان شاء اللہ جنت میں داخلے کا ٹکٹ بن جائے گی۔ دنیا کی نعمتوں کا اعتراف اس کو آخرت کی نعمتوں کا مستحق بنا دے گا۔

اِس قسم کا قول کوئی سادہ قول نہیں۔ اِس کے لیے گہری شعوری بیداری درکار ہے۔ جو آدمی اپنے اندر اِس قسم کی شعوری بیداری پیدا کرے، اُسی کے دل سے اِس قسم کے کلمات نکلتے ہیں جو اس کے لیے جنت میں داخلے کا استحقاق بن جائیں۔ گہری شعوری بیداری کے بغیر کسی شخص کو یہ توفیق ملنے والی نہیں۔

جنت یا جہانِ لذت

قرآن کی سورہ ابراہیم میں دنیا کے بارے میں یہ الفاظ آئے ہیں: وآتاکم من کلّ ما سألتموہ (14:34) اِس کے مقابلے میں، جنت کے بارے میں قرآن کی سورہ نمبر حٰم السجدہ میں یہ الفاظ آئے ہیں: ولکم فیھا ما تشتھي أنفسکم (41:31) اِن دونوں آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کو تمام چیزیں بقدرِ ضرورت دی گئی ہیں۔ اِس کے مقابلے میں جنت میں انسان کو تمام چیزیں بقدر خواہش دی جائیں گی۔

انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک لذت طلب حیوان (pleasure-seeking animal) ہے۔ لذت ایک انوکھی صفت ہے جو صرف انسان کے اندر پائی جاتی ہے۔ انسان کے اندر ہر قسم کی لذتوں کی بے پناہ طلب موجود ہے۔ لیکن موجودہ دنیا میں کسی بھی عورت یا مرد کی خواہشیں پوری نہیں ہوتیں۔ ہر ایک کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ وہ کامل فُل فِل مینٹ (fulfilment) کے حصول کے بغیر مر کر اِس دنیا سے چلا جاتا ہے، خواہ وہ امیر ہو یا غریب، خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، خواہ وہ عام انسان ہو یا کوئی بادشاہ۔

انسان کی لذتوں کی فہرست بہت لمبی ہے — لذتِ فکر، لذتِ بصارت، لذت سماعت، لذتِ ذائقہ، لذتِ لمس، لذتِ گفتگو، لذتِ رفاقت، لذتِ مطالعہ، لذتِ دریافت، لذتِ مسرت، وغیرہ۔ اِن تمام لذتوں کی طلب انسان کے اندر بے پناہ حد تک موجود ہے، لیکن موجودہ دنیا میں انسان اپنی اِن لذتوں کی تکمیل نہیں کر پاتا۔ وہ اِسی کی تلاش میں رہتا ہے، مگر بہت جلد اس کو موت آجاتی ہے۔ موجودہ دنیا میں اُس کو احساسِ لذت کا تجربہ تو ہوتا ہے، لیکن تکمیلِ لذت کا تجربہ اس کو حاصل نہیں ہوتا۔

ایک ملحد فلسفی نے جنت کو ''خوش خیالی'' قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ جنت انسانی تمناؤں کی خوب صورت تخئیل (beautiful idealization of human wishes) ہے۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ جنت انسان کی خوب صورت تمناؤں کا پوری طرح وقوع میں آنا (beautiful actualization of human wishes) ہے۔

جنت کی پہچان

قرآن کی سورہ محمد میں اہلِ جنت کے بارے میں آیا ہے کہ: **ویدخلهم الجنّة عرّفها لهم** (47:6)۔ اِس آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے: ''اور اللہ اُن کو جنت میں داخل کرے گا جس کی اُنھیں پہچان کرادی ہے''۔ اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جنت اُن اہلِ معرفت کے لیے ہے، جن کے لیے موجودہ دنیا جنت کی پہچان بن جائے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا اپنی حقیقت کے اعتبار سے مثلِ جنت ہے۔ جنت میں جو چیزیں اعلیٰ معیار پر پائی جاتی ہیں، وہی موجودہ دنیا میں غیر معیاری صورت میں موجود ہیں (2:25)۔ جس آدمی کو معرفت کے درجے میں ایمان ملا ہو، وہ اِس معاملے میں اتنا زیادہ حساس ہوجائے گا کہ دنیا کی ہر چیز میں اُس کو جنت کی جھلک دکھائی دے گی، دنیا کی ہر چیز اُس کے لیے جنت کی پہچان بن جائے گی:

Everything in this world serves as an introduction to Paradise.

قرآن میں آیا ہے کہ اہلِ جنت کو جب کوئی جنتی چیز دی جائے گی تو وہ کہیں گے کہ: **هذا الذی رزقنا من قبل** (2:25) یعنی یہ تو وہی ہے جیسا کہ اِس سے پہلے ہم کو دیا گیا تھا۔ اِسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ: **إنّ شدة الحرّ من فيح جهنم (صحيح البخاری، رقم الحديث: 536)** یعنی گرمی کی شدت جہنم کی پھونک کی وجہ سے ہے۔

اِس آیت اور اِس حدیث کو لے کر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا اِس طرح بنائی گئی ہے کہ وہ انسان کے لیے جنت اور جہنم کی یاد دہانی کا ذریعہ بن جائے۔ یہاں آدمی کو کوئی نعمت ملے تو اُس کے اندر اس کو جنت کی جھلک دکھائی دے۔ اِسی طرح یہاں کوئی مصیبت پیش آئے تو وہ اس کے تجربے سے جہنم کو یاد کرنے لگے۔ جو آدمی موجودہ دنیا میں اِس طرح رہے، اُس کے اندر بیک وقت دو صفات پیدا ہوں گی — جہنم کا ڈر، اور جنت کا اشتیاق۔

سچائی کی سیٹ پر

قرآن کی سورہ القمر میں اہلِ جنت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ —— وہ آخرت میں بادشاہِ کائنات کے پاس سچائی کی سیٹ پر ہوں گے (**في مقعد صدق عند مليكٍ مقتدر**) :

At the seat of truth with an all-powerful sovereign (54: 55)

قرآن کی اِس آیت کے مطالعے سے دنیا اور آخرت کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ دنیا میں اُن لوگوں کو عزت ملتی ہے جو مقعدِ کذب (جھوٹ کی سیٹ) پر کھڑے ہوں۔ آخرت میں اِس کے برعکس معاملہ ہوگا۔ آخرت میں عزت کا مقام صرف اُن لوگوں کو ملے گا جو دنیا کی زندگی میں مقعدِ صدق پر کھڑے ہوئے تھے۔ دنیا میں سچائی پر کھڑے ہونے والوں کو آخرت میں یہ انعام ملے گا کہ وہاں وہ سچائی کے مقام پر کھڑے ہونے کی عزت حاصل کریں۔

دنیا میں جھوٹ پر کھڑے ہونے والے کون ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو ظاہری چیزوں میں جیتے ہوں، جو خود غرضی کے طریقوں میں مہارت رکھتے ہوں، جو موقع پرست ہوں اور استحصال کرنے کا مزاج رکھتے ہوں، جو لوگوں کو خوش کر کے مادّی فائدے حاصل کرنے کے ماہر ہوں، جو لوگوں کو ان کی پسند کی خوراک دینا جانتے ہوں، جو کل کو نظر انداز کر کے آج کے مفادات میں جیتے ہوں —— یہ لوگ آج کی دنیا میں عزت کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں، مگر آخرت کی حقیقی دنیا میں وہ صرف جھوٹ کی سیٹ پر جگہ پائیں گے۔

اِس کے مقابلے میں، دوسرے لوگ وہ ہیں جو موجودہ دنیا میں اِس طرح رہیں کہ اُن کا سب سے بڑا کنسرن سچائی ہو، وہ دیانت داری (honesty) کو سب سے زیادہ اہمیت دینے والے ہوں، وہ مفاد پرستی کے بجائے حق پرستی میں جینے والے ہوں، جو وقتی مصلحت کے بجائے اعلیٰ مصلحت کو اہمیت دیتے ہوں، جن کا معیار اصول پسندی ہو، نہ کہ بے اصولی —— یہی وہ لوگ ہیں جو آخرت میں عزت کے اعلیٰ مقامات پر سرفراز کیے جائیں گے، خواہ دنیا میں بظاہر وہ بے عزت سمجھ لیے گئے ہوں۔

دنیا اور آخرت

قرآن میں یہ دعا بتائی گئی ہے کہ اے ہمارے رب، ہم کو دنیا میں حسنہ دے، اور ہم کو آخرت میں حسنہ دے: ربنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة (2:201)

اس کا مطلب کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو دونوں دنیاؤں کا فائدہ دے۔ یعنی دنیا میں مال دے اور آخرت میں جنت۔ ایک مسلم صحافی نے اس نظریہ کے تحت ایک ماہانہ پرچہ نکالا اور اس کا نام رکھ دیا: 'فلاح دین' و دنیا۔ مگر اس قرآنی دعا کا یہ مطلب نہیں۔ اس دعا میں حسنہ سے مراد وہ حسنہ ہے جو اللہ کے نزدیک حسنہ کی حیثیت رکھتی ہو، نہ کہ وہ چیز جس کو آدمی بطور خود حسنہ سمجھ لے۔ اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس دنیا میں جنتی اعمال کی توفیق اور آخرت میں جنت کے اندر داخلہ۔

ایک انسان کے لیے دنیا کا حسنہ یہ ہے کہ اس کو خدا کی معرفت حاصل ہو۔ وہ دین کو اس کے صحیح مفہوم کے ساتھ سمجھ سکے۔ اور رسول کو اپنا غیر مشروط رہنما بنا سکے۔ اور صحابہ کرام کی زندگی کی صورت میں جو معیاری دینی نمونہ قائم کیا گیا ہے اس کو رضا و رغبت کے ساتھ پوری طرح قبول کرے۔ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ خدا اس کو ہر قسم کی ذہنی برائیوں سے بچائے وہ دین کی غلط تعبیرات سے بچ کر دین کو اس کے صحیح مفہوم کے ساتھ اختیار کرے۔ اسی طرح وہ اس گمراہی سے محفوظ رہے کہ ذاتی مفاد، ذاتی خواہشیں یا کوئی اور ذاتی رجحان اس کو دین کی شاہراہ سے ہٹا دے۔ اس دنیا میں وہ نہ سرکش بنے اور نہ دین کے نام پر بے دینی کو اختیار کرنے والا بن جائے۔

ہم کو آخرت میں حسنہ دے—— اس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کے انعامات میں ہم کو حصہ دار بنا۔ آخرت میں جنت کی صورت میں ایک ایسی دنیا بننے والی ہے جو آخری حد تک معیاری دنیا ہوگی۔ وہاں آدمی خدا کی رحمت اور مہربانی کے سائے میں جئے گا اور ابدی طور پر ایک ایسی بامعنی زندگی حاصل کرے گا جو معنویت اور مسرت اور راحت سے بھرپور ہوگی۔ یہی جنتی زندگی انسان کی اعلیٰ ترین منزل ہے۔ اُس دعا کا مطلب یہ ہے کہ خدایا، تو مجھے دنیا میں اس مطلوب زندگی کی توفیق دے جو مجھ کو آخرت کی جنت کو پانے کا مستحق بنا دے۔

جنت کا تعارف

قرآن کی سورہ محمد میں اہلِ جنت کے بارے میں یہ آیت آئی ہے: **ویدخلھم الجنة عرفھا لھم**، یعنی اللہ اُن لوگوں کو جنت میں داخل کرے گا جس کی اُس نے انھیں پہچان کرادی ہے:

God will admit them into the Paradise, He
has already made known to them (47: 6)

جو اہلِ ایمان جنت کے حقیقی طالب بن گئے ہوں، اُن کو اِس دنیا میں جنت کی معرفت حاصل ہوجاتی ہے۔ وہ موجودہ دنیا کو غیر کامل جنت (imperfect paradise) کے روپ میں دیکھنے لگتے ہیں۔ ان کی یہ کیفیت ان کے لیے اِس بات کا ثبوت بن جاتی ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں جنت کے طالب بن چکے ہیں۔ ایسے اہلِ ایمان کو ان کی معرفت کے انعام کے طور پر اُنھیں آخرت کی جنت میں باعزت داخلہ دیا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا جنت کے جُزئی تعارف کا مقام ہے، اور آخرت کی دنیا جنت کو اس کے کامل معنوں میں پانے کا مقام۔ جو لوگ اپنی سوچ کو ربانی سوچ بنائیں، ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر چیز میں جنت کی جھلک دیکھنے لگتے ہیں۔ اِس طرح یہ ہوتا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ملی ہوئی نعمتیں اُن کے لیے آخرت کی جنت کا ابتدائی تعارف بن جاتی ہیں۔

موجودہ دنیا کی ہر چیز انسان کے لیے خدا کا ایک انعام ہے۔ جب آدمی اپنے آپ کو مزکّٰی شخصیت (purified personality) بناتا ہے تو اُس کے دیکھنے کا زاویہ (angle) بدل جاتا ہے۔ اس کا احساس عارفانہ احساس بن جاتا ہے۔ اِس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ ایسے لوگ چیزوں کو ان کی داخلی حیثیتوں کے اعتبار سے دیکھنے لگتے ہیں۔

یہی وہ مزکّٰی افراد ہیں جو جنت میں داخلے کے مستحق قرار پائیں گے — اِس قسم کی عارفانہ نظر صرف اُن لوگوں میں پیدا ہوتی ہے جو حقیقی معنوں میں اپنا تزکیہ کریں۔ تزکیہ کے بغیر کسی شخص کے اندر اِس قسم کی صلاحیت پیدا نہیں ہوسکتی۔

حکمتِ تخلیق

قرآن کی سورہ التین میں انسان کی تخلیق اور اس کے انجام کا ذکر آیا ہے۔اس سلسلے میں آیت کے اصل الفاظ یہ ہیں: **لقد خلقنا الإنسان فی أحسن تقویم، ثم رددناہ أسفل سافلین، إلا الذین آمنوا وعملو الصالحات فلهم أجر غیر ممنون** (98:4-6) یعنی بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر اس کو سب سے نیچے پھینک دیا، سوا اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے کام کیے تو اُن کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔

اِس آیت میں احسنِ تقویم سے مراد جنتی تقویم ہے۔ اسفل سافلین سے مراد غیر جنتی دنیا ہے۔ ایمان سے مراد یہ ہے کہ آدمی تخلیق کی اِس حقیقت کو دریافت کرے۔ عمل صالح سے مراد ہے اِس دریافت اور اس کے تقاضے کے مطابق عمل۔ اجرِ غیر ممنون سے مراد وہ معیاری جنت ہے جس کے لیے انسان کو بنایا گیا ہے۔

اِس تشریح کے مطابق، قرآن کی اِن آیتوں کا مطلب یہ ہوگا کہ — اللہ نے انسان کو جنتی اوصاف کے ساتھ بنایا۔ اس نے انسان کے اندر ہر اعتبار سے وہ اعلیٰ ذوق رکھا جس کی تکمیل (fulfilment) کا سامان صرف جنت کی دنیا میں ممکن ہے۔ پھر اُس کو موجودہ غیر جنتی دنیا میں آباد کردیا۔

اِس دنیا میں بظاہر سب کچھ موجود ہے، مگر وہ صرف بقدرِ ضرورت ہے، نہ کہ بقدرِ ذوق۔ اب انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ تخلیق کی اِس حکمت کو دریافت کرے۔

یہ دریافت اتنی شدید ہو کہ آدمی کی پوری زندگی اِسی کے مطابق ڈھل جائے۔ دنیا کی زندگی میں جو لوگ اِس کا ثبوت دیں، وہی وہ لوگ ہیں جن کو آخرت کی ابدی جنتوں میں بسایا جائے گا، جہاں وہ ہر اعتبار سے فل فل مینٹ (fulfilment) پائیں گے۔ وہ ابدی طور پر اِن جنتوں میں رہیں گے۔ جنت کی دنیا ہر اعتبار سے، ایک مکمل دنیا ہوگی۔ وہ خوف اور حزن سے پوری طرح خالی ہوگی — انسان کا یہی وہ ابدی مستقبل ہے جس کی خبر دینے کے لیے خدا کے تمام پیغمبر آتے رہے۔

جوڑے کا اصول

قرآن کی سورہ الذاریات میں ارشاد ہوا ہے: **ومن کلّ شیٔ خلقنا زوجین، لعلکم تذکرون** (51:49) یعنی اللہ نے ہر چیز کو جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے، تا کہ تم نصیحت حاصل کرو۔

جوڑا (pair) کا تعلق صرف مذکر اور مونث سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق ہر چیز سے ہے۔ مثال کے طور پر انسان کو خدا نے متلاشی لذت حیوان (desire-seeking animal) کے طور پر پیدا کیا ہے۔ انسان کے اندر لامحدود قسم کی خواہشیں چھپی ہوئی ہیں۔ لیکن موجودہ زمین پر اِن خواہشات کی تکمیل (fulfilment) کا سامان موجود نہیں، گویا یہاں طالب ہے، مگر اس کا مطلوب یہاں موجود نہیں۔ طالب کا جوڑا (pair) مطلوب ہے۔

جب ساری دنیا کو جوڑے جوڑے کی صورت میں پیدا کیا گیا ہے تو سوال یہ ہے کہ انسان کی فطری خواہشوں کا جوڑا کہاں ہے۔ جب ساری دنیا میں جوڑے کا اصول کارفرما ہے تو ضرور ایسا ہونا چاہیے کہ یہاں خواہش (desire) کا جوڑا بھی موجود ہو۔ یہ جوڑا بلاشبہہ موجود ہے اور اِسی جوڑے کا نام جنت (paradise) ہے۔

جنت میں تمام خواہشوں اور لذتوں کا جوڑا موجود ہے۔ جنت میں تمام فطری خواہشوں کی تکمیل (fulfilment) کا سامان اعلیٰ ترین صورت میں فراہم کیا گیا ہے۔

یہ واقعہ انسان کو دعا کے لیے ایک پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) دیتا ہے۔ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ خدایا، جب تو نے میری فطرت میں تمام خواہشیں رکھ دیں تو اب تو اُن کی تکمیل کا سامان بھی عطا فرما۔ فانی بدایونی (وفات: 1940) اگر اس حقیقت کو جانتے تو وہ اپنے شعر کو کسی قدر تبدیلی کے ساتھ اس طرح کہتے:

جب دیا ذوقِ طلب، پھر اُسے مطلوب بھی دے — اپنے دیوانے پہ اتمامِ کرم کر، یا رب

جنت کی قیمت

قرآن کی سورہ المائدۃ کی آیات 85-83 میں ایک گروہ کا ذکر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ایمان لایا۔ اُس کے بارے میں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: **یقولون ربنا آمنا فاکتبنا مع الشاھدین** ۔ پھر ان کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے انھیں اِس قول کے بدلے جنت دے دی (**فأثابھم اللہ بما قالوا جنات تجري من تحتھا الأنھار**)۔

اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان لوگوں کو جنت صرف ان کے قول پر دے دی گئی، کیوں کہ اگلی آیت میں ان کے بارے میں یہ الفاظ آئے ہیں: **ذلک جزاء المحسنین**۔

یہاں یہ نہیں فرمایا کہ: **ذلک جزاء القائلین**، بلکہ یہ فرمایا کہ: **ذلک جزاء المحسنین**۔ اس سے معلوم ہوا کہ جنت سادہ معنوں میں صرف قول پر نہیں ہے، بلکہ جنت اُس قول پر ہے جو حقیقی معنوں میں ایک محسن کی زبان سے نکلا ہو۔

قرآن اور حدیث میں جہاں بھی قول پر جنت کا ذکر ہے، اُس سے مراد تلفظ نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد وہ قول ہے جو داخلی حقیقت کے اظہار کے طور پر کسی انسان کی زبان سے نکلے۔ مجرد تلفظ ایک منافقانہ فعل ہے۔ اِس طرح کے تلفظ پر کسی کو کوئی انعام ملنے والا نہیں۔

لیکن جب ایسا ہو کہ ایک شخص حق کا متلاشی بنا، اس نے غور وفکر کیا، اس نے مطالعہ کیا، پھر اس پر سچائی منکشف ہوئی، اس نے سچائی کو اپنے پورے وجود کے ساتھ قبول کرلیا، پھر سچائی کے بارے میں اس کا یہ داخلی شعور الفاظ کی صورت میں اس کی زبان سے نکل پڑا تو ایسا قول بلاشبہہ صرف ایک قول نہیں ہے، بلکہ وہ سرتاپا عمل ہے۔ اور وہ اِس قابل ہے کہ اُس پر اس کے کہنے والے کے لیے جنت کا فیصلہ کیا جائے۔

جنت ایک حقیقی انعام ہے اور حقیقی انعام کسی کو ایک حقیقی عمل ہی کے ذریعے مل سکتا ہے، اِس سے کم تر درجے کی کوئی چیز جنت کی قیمت نہیں بن سکتی۔

طالبِ جنت بنئے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسنِ تقویم کی حیثیت سے پیدا کیا۔ اِس کا ایک پہلو یہ ہے کہ انسان استثنائی طور پر ایک ایسی مخلوق ہے جو احساسِ لذت (sense of pleasure) رکھتا ہے۔ وسیع کائنات میں بہت سی مخلوقات ہیں۔ مثلاً ستارہ، سیارہ، سورج، چاند، سمندر، درخت، حیوانات، وغیرہ۔ لیکن اِن میں سے کسی کو بھی احساسِ لذت کی نعمت حاصل نہیں۔

ایک طرف، اللہ نے انسان کو اعلیٰ درجے میں لذت کا احساس رکھنے والی مخلوق کے طور پر بنایا ہے۔ اور دوسری طرف، اس نے ایک انوکھی دنیا بنائی جس کا نام جنت ہے۔

جنت وہ مقام ہے جہاں وہ تمام سامانِ لذت کمال درجے میں موجود ہے جس کا احساس لے کر انسان پیدا ہوتا ہے، لیکن وہ اُس سامانِ لذت کو نہیں پاتا جو اُس کے لیے فُل فل مینٹ (fulfilment) کا ذریعہ بن سکے۔

یہی موجودہ دنیا میں انسان کا معاملہ ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان کو طالب جنت بن کر رہنا ہے۔ جو شخص موجودہ دنیا میں اِس طرح رہے کہ وہ حقیقی معنوں میں طالب جنت بن گیا ہو، وہی خدا کا مطلوب انسان ہے اور اسی کو ابدی جنت میں آباد کرنے کے لئے منتخب کیا جائے گا۔

جو لوگ اپنی موجودہ زندگی میں جنت کے طالب نہ بن سکیں، جن کا دل جنت کے سوا کسی اور چیز میں لگا ہوا ہو، وہ اللہ کے مطلوب انسان نہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ کی نعمتوں کی قدر نہیں کی۔ ان کا کیس ناقدری کا کیس ہے، نہ کہ قدردانی کا کیس۔

ایسے لوگ جنت کے باغوں میں بسنے کے لیے نااہل قرار پائیں گے۔ جنت کے ابدی دسترخوان پر بیٹھنے کی سعادت اُنھیں حاصل نہ ہوگی۔ انھوں نے موجودہ دنیا میں خدا کی جنت سے نگاہیں پھیر لی تھیں، آخرت میں خدا اُن سے اپنی نگاہیں پھیر لے گا۔ آخرت کی دنیا میں ان کو ابدی محرومی کے سوا کچھ اور ملنے والا نہیں۔

جنت کی پہچان

قرآن کی سورہ محمد میں سچے اہلِ ایمان کی بابت ارشاد ہوا ہے: **ویُدخلهم الجنة عرّفها لهم** (47:6)۔یعنی اللہ اُن کو جنت میں داخل کرے جس کی اُس نے اُنھیں پہچان کرا دی ہے۔ یہاں جنت کی پہچان سے کیا مراد ہے۔ اِس کا جواب قرآن کی دوسری آیت میں ملتا ہے۔قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ ایمان جب جنت میں داخل ہوں گے اور وہاں کے پھل اُن کو دیے جائیں گے، تو وہ کہیں گے: **هذا الذی رزقنا من قبل، وأتوا به متشابهاً** (2:25)یعنی یہ وہی ہے جو اِس سے پہلے ہم کو دیا گیا تھا، اور ملے گا اُن کو ایک دوسرے سے ملتا جلتا۔

اِس سے معلوم ہوا کہ جنت اُن لوگوں کے لیے ہے جو موجودہ دنیا کو جنت کی پہچان کے طور پر دریافت کریں۔ موجودہ دنیا میں مطلوب نعمتیں انسان کے لیے رکھی گئی ہیں، لیکن یہاں وہ غیر معیاری صورت میں ہیں۔ غیر معیاری نعمتوں کو دیکھ کر معیاری نعمتوں والی دنیا کو دریافت کرنا، یہی جنت کی پہچان ہے، اور یہی پہچان جنت کی قیمت ہے۔

جو لوگ موجودہ دنیا کو جنت کی پہچان کے طور پر دریافت نہ کریں، وہ عاجلہ کی محبت (75:20) میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کا نظریہ ''یہیں اور اسی وقت'' (right here, right now) کا نظریہ بن جاتا ہے۔ وہ کل (tomorrow) کو چھوڑ کر آج (today) کے اندر اپنی ساری توجہ لگا دیتے ہیں۔ اِس کے برعکس، جو لوگ موجودہ غیر معیاری دنیا میں معیاری جنت کو دریافت کر لیں، ان کی زندگی کا نشانہ یہ بن جاتا ہے کہ وہ ہر قیمت پر معیاری جنت کو حاصل کریں۔ موجودہ دنیا کے بجائے، اگلی دنیا ان کا اصل کنسرن بن جاتا ہے۔ ان کی پوری زندگی آخرت رُخی زندگی ہو جاتی ہے۔ یہی خدا کے سچے بندے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے حقیقت کو دریافت کیا اور اس کو عملاً اپنی زندگی میں اختیار کر لیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر موت آئے گی تو فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور کہیں گے: **سلامٌ عليكم طبتم، فادخلوها خالدين** (39:73)۔

جنت ایک معلوم دنیا

قرآن کی سورہ محمد میں جنت اور اہلِ جنت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: **ویُدخلهم الجنّة عرّفها لهم** (47:6) یعنی خدا، اہلِ ایمان کو ایسی جنت میں داخل کرے گا جس کی اس نے اُنھیں پہچان کرادی ہے۔ گویا کہ جنت ایک ایسی جگہ ہے جس کی معرفت ایک باشعور انسان پیشگی طور پر آج ہی کی دنیا میں حاصل کرسکتا ہے۔

موجودہ دنیا میں، جنت کی معرفت کی دو سطحیں ہیں۔ اس کی پہلی سطح یہ ہے کہ ہر آدمی پیدائشی طور اپنے اندر لامحدود خواہشیں (desires) رکھتا ہے۔ اِسی کے ساتھ وہ محسوس کرتا ہے کہ اِن خواہشوں کی تکمیل (fulfilment) موجودہ دنیا میں ممکن نہیں۔

عقلی اعتبار سے دیکھئے تو جب خواہشیں حقیقی طور پر موجود ہیں تو ان کی تکمیل بھی حقیقی طور پر قابلِ حصول ہونا چاہیے۔ اِس طرح، کسی آدمی کے لیے اپنی خواہشوں (desires) کا علم گویا کہ اُس کے لیے جنت کا آدھا علم ہے۔

نصف جنت کا یہ علم، انسان کو یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ بقیہ نصف جنت بھی فطرت کے نظام میں موجود ہونا چاہیے۔ تخلیقِ خواہش اگر ممکن ہے تو بلا شبہہ تکمیلِ خواہش بھی ممکن ہونا چاہیے۔

جنت کی معرفت کی دوسری قسم وہ ہے جو موجودہ سیارۂ زمین کی شکل میں آدمی کے علم میں آتی ہے۔ موجودہ سیارۂ زمین میں ہر قسم کے جنتی سامان موجود ہیں۔

زمین گویا کہ جنت کا ایک جزئی نمونہ ہے۔ کامل جنت کے مقابلے میں، موجودہ سیارۂ زمین ایک ناقص جنت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس طرح یہ زمین جزئی معنوں میں، جنت کی موجودگی کا ایک پیشگی تعارف ہے۔

اہلِ جنت کا کلمہ

قرآن کی سورہ فاطر میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ جنت جب جنت میں داخل کئے جائیں گے تو وہ کہیں گے: الحمد للہ الذي أذھب عنا الحزن (35: 34) یعنی شکر ہے اللہ کا جس نے ہم سے غم کو دور کردیا:

Praise be to God, who has taken away all sorrow from us.

قرآن کی یہ آیت دعا کے لیے ایک اہم پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) دیتی ہے۔ اِس دعا میں اہلِ ایمان اللہ کے ایک اسمِ اعظم کو دریافت کرتے ہیں، جس کے حوالے سے دعا کرکے وہ جنت کے مستحق بن سکیں۔ یہ اسمِ اعظم خدا کا مُذہِب حزن ہونا ہے، یعنی حَزن (sorrow) کو دور کرنے والا۔ ہر انسان کے ساتھ اِس دنیا میں حَزن کا کوئی واقعہ پیش آتا ہے، پھر فطرت کے نظام کے تحت وہ رفع ہوجاتا ہے۔ مثلاً بیماری کے بعد اچھا ہوجانا، حادثے کے بعد صحت مند ہوجانا، تکلیف کے بعد دوبارہ آرام مل جانا، ناخوش گوار تجربے کے بعد دوبارہ خوش گوار تجربہ پیش آنا، وغیرہ۔

اِس طرح کے تجربے کے وقت انسان گویا کہ اللہ کی ایک صفت کو دریافت کرتا ہے، یہ اللہ کا مُذہِب حزن ہونا ہے۔ جب بھی ایسا تجربہ کسی انسان کو پیش آتا ہے تو وہ اُس کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اس کے حوالے سے یہ دعا کرکہ — اے اللہ، موت سے پہلے دنیا کی زندگی میں جس طرح تو نے میرے ساتھ اِذہابِ حزن (حزن کو دور کرنے) کا معاملہ فرمایا، اِسی طرح تو موت کے بعد آخرت کی زندگی میں میرے ساتھ اذہابِ حزن کا معاملہ فرما۔ یہ دعا کی اعلیٰ قسم ہے۔

یہی وہ دعا ہے جس کو حدیث میں اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کرنا بتایا گیا ہے۔ اِس قسم کی دعا کا موقع اِس دنیا میں ہر انسان کو بار بار ملتا رہتا ہے۔ اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کرنا، بلاشبہہ سب سے بڑی دعا ہے، لیکن اسمِ اعظم کتاب میں چھپے ہوئے کسی اسم کا نام نہیں، اسمِ اعظم وہ ہے جس کو انسان خود دریافت کرتا ہے اور پھر اس کے حوالے سے وہ اِخبات اور انابت کے ساتھ اللہ سے دعا کرتا ہے۔

جنتِ دنیا، جنتِ آخرت

قرآن کے مطابق، موجودہ دنیا آخرت کی دنیا کے عین مشابہہ (2:25) ہے۔ جو چیزیں آخرت کی جنت میں موجود ہوں گی، وہ سب موجودہ ارضی جنت میں موجود ہیں، صرف اِس فرق کے ساتھ کہ آخرت کی جنت میں ہر چیز پرفکٹ (perfect) ہوگی، اور موجودہ دنیا میں ہر چیز امپرفکٹ (imperfect) حالت میں پائی جاتی ہے۔ اِس لیے قرآن میں آیا ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کو بقدرِ ضرورت (14:34) دیا گیا ہے، اور آخرت کی جنت میں تمام چیزیں انسان کو بقدرِ اشتہا (41:31) دی جائیں گی (ولكم فيها ما تشتهي أنفسكم)۔

آخرت دار الجزا ہے، اور موجودہ دنیا دار الامتحان۔ مصلحتِ امتحان کی بنا پر موجودہ دنیا میں کبد (90:4) رکھ دیا گیا ہے، یعنی مسائل۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ آخرت کی جنت ایک ایسا پھول ہے جو صرف پھول ہے۔ اِس کے مقابلے میں، دنیا کی جنت ایک ایسا پھول ہے جس کی شاخ میں کانٹا بھی لگا ہوا ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان کا امتحان یہ ہے کہ وہ پھول کو لے اور کانٹے کو نظر انداز کردے۔ کانٹے کی موجودگی کو نظر انداز کرنا ہی یہاں کا اصل امتحان ہے۔

جو آدمی پھول کو لے اور کانٹے کو بھلا دے، وہ امتحان میں پورا اترا۔ وہ شکر کے جذبات کے ساتھ اِس دنیا میں زندگی گزارے گا جو کہ خدا کا اصل مطلوب ہے۔ اِس کے برعکس، جو آدمی کانٹے کی موجودگی کو نظر انداز نہ کرسکے، وہ ہمیشہ شکایتوں میں جئے گا، وہ دنیا میں شکر کی عبادت سے محروم رہے گا اور آخرت میں جنت میں داخلے سے محروم۔

موجودہ دنیا کو جنت کے طور پر دریافت کرنا ہی اپنے آپ کو آخرت کی جنت کا مستحق بنانا ہے۔ لیکن انسان ''کانٹوں'' کی موجودگی کو لے کر نفرت وشکایت میں پڑا رہتا ہے۔ مگر یاد رکھئے، موجودہ دنیا کا کانٹا اعراض کے لیے ہے، نہ کہ احتجاج کے لیے۔ جو لوگ اِس راز کو نہ سمجھیں، اُن کے حصے میں آخرکار جو چیز آئے گی، وہ صرف محرومی ہے، نہ کہ کوئی کامیابی۔

مقصدِ تخلیق

قرآن کی سورہ الذاریات میں انسان کے مقصدِ تخلیق کو اِن الفاظ میں بتایا گیا ہے: **وما خلقت الجن والإنس إلا لیعبدون** (51:56)۔ اِس آیت میں عبادت سے مراد معرفت ہے، یعنی انسان کو اِس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ اپنے خالق کی معرفت حاصل کرے۔ یہ معرفت انسان کو کیسے حاصل ہوگی، اِس کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام کیا کہ انسان کو ایسا دماغ دیا جو لامحدود طور پر سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دوسری طرف، اس کو ایک ایسی کائنات میں پیدا کیا گیا جو خدا کی صفات کا مظہر ہے۔ اِس کائنات کی ہر چیز میں اللہ کی معرفت کی غذا موجود ہے۔ انسان، پیغمبر کی رہنمائی کے تحت غور کرکے تخلیقاتِ الٰہی میں اللہ کی معرفت حاصل کرسکتا ہے۔

لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ یہ مقصدِ تخلیق عملاً پورا نہ ہوسکا۔ انسان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے دماغ کا بہت کم حصہ استعمال کرکے مرجاتا ہے۔ گویا کہ ہر انسان پیدا ہوکر اِس طرح اِس دنیا سے چلا جاتا ہے کہ اُس کا دماغ غیر استعمال شدہ (unutilized) رہ جاتا ہے۔ دوسری طرف، قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے کلمات اتنے زیادہ ہیں کہ اگر دنیا کے تمام درختوں سے قلم بنایا جائے اور دنیا کے تمام سمندر اور اتنے ہی اور سمندر سیاہی بنا دئے جائیں اور کلماتِ الٰہی کو لکھنا شروع کیا جائے تو اُن کا بیان مکمل نہیں ہوگا۔ یہ کلمات دراصل کلماتِ معرفت ہیں۔ اِس طرح عملاً یہ صورتِ حال ہے کہ اللہ کے کلماتِ معرفت ابھی تک غیر دریافت شدہ (undiscovered) حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔

ایسا کیوں ہے۔ اس کا جواب اللہ کے تخلیقی پلان میں ملتا ہے۔ اللہ کے تخلیقی پلان کے مطابق، انسان کی زندگی دو دوروں میں تقسیم ہے — موجودہ دنیا کی عارضی مدت، اور آخرت کی ابدی مدت۔ جس طرح انسان اب تک اپنے دماغ کے امکانات کو استعمال نہ کرسکا، اُسی طرح کائنات میں بکھرے ہوئے کلماتِ معرفت بھی اب تک غیر دریافت شدہ حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔

اِس معاملے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا آغاز ہے اور آخرت کی دنیا اس کی تکمیل۔

موجودہ دنیا میں اُن انسانوں کا انتخاب (recruitment) کیا جارہا ہے جو آخرت میں انجام دئے جانے والے تکمیلی عمل کو جاری رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ قیامت میں یہ ہوگا کہ نا اہل افراد چھانٹ کر کائناتی کوڑا خانے میں ڈال دئے جائیں گے اور جن لوگوں نے اہلیت ثابت کی ہے، ان کو منتخب کر کے اُس دنیا میں داخل کر دیا جائے گا جس کا نام جنت ہے۔

اِس معاملے کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ قیامت سے پہلے کی دنیا ناتمام انسانی تہذیب (human civilization) کی دنیا تھی۔ اور قیامت کے بعد کامل خدائی تہذیب (divine civilization) کی دنیا بنے گی۔ بظاہر انسانی تہذیب کا دور اپنی آخری حد پر پہنچ چکا ہے۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ خدائی تہذیب بننے کا فائنل عمل شروع ہوجائے، وہ خدائی تہذیب جو ابد تک محیط ہے۔

موجودہ انسانی تہذیب کچھ انسانوں نے اپنی سرگرمیوں کے تحت بنائی تھی۔ اِسی طرح بعد کی خدائی تہذیب بھی کچھ خوش قسمت افراد بنائیں گے جن کے ساتھ مزید تعاون کے لیے فرشتے موجود ہوں گے۔ موجودہ دنیا میں تہذیب کے بننے کا عمل مشقت (90:4) کے دوران انجام پایا تھا، لیکن خدائی تہذیب کا عمل اس کے برعکس، ایک پُر مسرت (joyful) عمل ہوگا، جس کا اشارہ قرآن کی اِس آیت میں موجود ہے: **إن اصحاب الجنة اليوم فی شغل فاكهون** (36:55)۔ قرآن میں جنت کے بارے میں یہ آیت آئی ہے کہ: **وأتوا به متشابهاً** (2:25)۔ اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ جنت کے پھل دنیا کے پھل کی مانند ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس سے مکمل انسانی زندگی مراد ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جس طرح موجودہ دنیا میں کامل سرگرمی کی زندگی گزارتا ہے، اُسی طرح جنت میں بھی وہ ایک کامل سرگرمی کی زندگی گزارے گا، فرق یہ ہے کہ موجودہ دنیا کی سرگرمیاں غیر معیاری ماحول کے اندر انجام پاتی ہیں، اور جنت میں یہ سرگرمیاں معیاری ماحول کے اندر انجام پائیں گی۔ موجودہ دنیا میں انسان کو حَزَن (34:35) اور کَبَد (90:4) کے درمیان عمل کرنا پڑتا ہے، لیکن جنت کی تمام سرگرمیاں پُر مسرت سرگرمیاں (joyful activities) ہوں گی۔

جنّتی وجود

قرآن کی سورہ التین میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے انسان کو اعلیٰ بناوٹ کے ساتھ پیدا کیا، پھر اس کو نہایت پستی میں ڈال دیا (95:1-5)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے ایک جنتی مخلوق ہے، مگر موت سے قبل کی زندگی میں اس کو ایک غیر جنتی دنیا میں رہنا پڑتا ہے۔ تخلیقِ انسانی کے بارے میں یہی دریافت سب سے بڑی دریافت ہے۔ جس آدمی کو یہ دریافت ہوجائے، اس کا شعور بہت زیادہ بلند ہوجائے گا۔ وہ کہے گا کہ خدایا، میرا یہ وجود جنت کے لیے ڈزائن کیا گیا تھا، مگر وہ مجبور ہے کہ وہ غیر جنت میں رہے۔ یہ دماغ تو نے اس لئے بنایا تھا کہ وہ جنتی ماحول میں سوچے، لیکن وہ اپنے آپ کو غیر جنتی ماحول میں پارہا ہے۔ یہ آنکھ جنتی مناظر کو دیکھنے کے لیے بنی تھی، لیکن یہاں جنتی مناظر موجود نہیں۔ یہ کان جنتی آوازوں کو سننے کے لیے بنائے گئے تھے، لیکن وہ مجبور ہیں کہ وہ غیر جنتی آوازوں کو سنیں۔ یہ نظامِ تنفس جنتی ہواؤں میں سانس لینے کے لیے بنا تھا، لیکن یہاں وہ غیر جنتی ہواؤں میں سانس لینے کے لئے مجبور ہے۔ یہ نظامِ ہضم جنتی غذاؤں کے لئے تخلیق کیا گیا تھا، لیکن یہاں اس کے لیے صرف غیر جنتی غذائیں دستیاب ہیں۔ یہ ہاتھ جنتی چیزوں کو چھونے کے لیے بنے تھے، لیکن یہاں ان کے لئے غیر جنتی چیزوں کے سوا کوئی اور چیز موجود نہیں۔ یہ پاؤں جنتی باغوں میں چلنے کے لئے بنے تھے، لیکن یہاں وہ مجبور ہیں کہ صرف غیر جنتی جنگل میں چلیں۔ یہی وہ بات ہے جو حدیث میں اِس طرح کہی گئی ہے: **الدنیا سجن المؤمن (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 5256)** یعنی دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے۔ جس انسان کو اِس حقیقت کا شعور دریافت کے درجے میں حاصل ہوجائے، اس کے لیے یہ دریافت ایک پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) بن جائے گی۔ وہ اِس ریفرنس کو لے کر اللہ سے دعا کرے گا کہ خدایا، یہ تیری حکیمانہ تخلیق کے خلاف ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ تو موت کے بعد کی زندگی میں مجھے جنت میں داخل کرے گا، جہاں تیری پیدا کی ہوئی اِس شخصیت کو حقیقی معنوں میں فل فل مینٹ (fulfilment) حاصل ہوجائے۔

اہلِ جنت کے دو گروہ

قرآن کی سورہ الواقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ جنت کے دو بڑے طبقے ہوں گے۔ ایک، السابقون (سبقت کرنے والے) اور دوسرے، اصحاب الیمین (دائیں طرف والے) پہلے گروہ کے لیے آخرت میں شاہانہ انعامات ہیں، اور دوسرے گروہ کے لیے عام انعامات (56: 10-27)۔

درجہ اول اور درجہ دوم میں، یہ فرق کس بنیاد پر ہوگا۔ قرآن کے مطابق، اس کی وجہ فتح (57: 10) ہے۔ جو لوگ فتح سے پہلے کے دور میں حق کو مانیں اور اس کا ساتھ دیں، وہ السابقون کا درجہ پائیں گے۔ اور جو لوگ فتح کے بعد کے دور میں حق کو قبول کریں اور اس کے ساتھی بنیں، وہ اصحاب الیمین کے گروہ میں جگہ پائیں گے۔ یہ محض زمانے کا فرق نہیں، بلکہ نوعیتِ ایمان کا فرق ہے۔

حق جب ظاہر ہوتا ہے تو ابتداءً وہ مجرّد صورت میں ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک ایسی نظری حقیقت کی ہوتی ہے جس کی پشت پر دلائل کی طاقت کے سوا کوئی اور طاقت موجود نہ ہو۔ بعد کے زمانے میں جب حق کی دعوت فتح و غلبہ کے مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے تو اُس وقت حق کی حیثیت صرف نظری صداقت کی نہیں ہوتی، اب ہر آنکھ والے کو حق ایک ٹھوس واقعہ کی صورت میں دکھائی دینے لگتا ہے۔

پہلے دور میں حق کو لفظی دلیل سے پہچاننا تھا، دوسرے دور میں حق کی اہمیت کو منوانے کے لیے کھلے ہوئے واقعات موجود ہوتے ہیں۔ پہلے دور میں حق کو مانتے ہی آدمی اپنے ماحول کے اندر اجنبی بن جاتا تھا، دوسرے دور میں حق کے ساتھ وابستہ ہونا آدمی کو عزت اور مقبولیت کا مقام دیتا ہے۔ پہلے دور میں حق کا ساتھ دینے والا صرف کھوتا ہے، دوسرے دور میں حق کا ساتھ مزید پانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ پہلے دور میں بنیاد کے نیچے دفن ہونا پڑتا تھا، دوسرے دور میں گنبد کی بلندیاں مل جاتی ہیں جن کے اوپر آدمی کھڑا ہو سکے۔ معرفت کا یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر پہلے مرحلے میں حق کا ساتھ دینے والے کے لیے درجۂ اول کا مقام ہے اور دوسرے مرحلے میں حق کا ساتھ دینے والے کے لیے درجۂ ثانی کا مقام۔

جنّتی شخصیت

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **یدخل الجنّة أقوامٌ أفئدتهم مثل أفئدةِ الطّير (صحيح مسلم، رقم الحديث: 7341)** یعنی جنت میں ایسے لوگ جائیں گے جن کے دل چڑیوں کے دل کی مانند ہوں۔

چڑیا ایک حیوان ہے، مگر چڑیا کے اندر ایک ایسی استثنائی صفت ہوتی ہے جو کسی دوسرے حیوان میں نہیں، وہ یہ کہ چڑیا نفرت اور انتقام (revenge) کے جذبات سے خالی ہوتی ہے۔ تمام دوسرے جانور دفاعی طور پر حملہ کرنے کا مزاج رکھتے ہیں، لیکن چڑیا اِس مزاج سے مکمل طور پر خالی ہوتی ہے۔ آپ چڑیا کو دیکھئے تو وہ اپنی شکل ہی سے معصومیت کا پیکر دکھائی دے گی۔ اِس لیے کبوتر (pigeon) کو امن کی علامت (symbol of peace) قرار دیا گیا ہے۔

حدیث کے مطابق، یہی جنّتی صفت اُس انسان سے مطلوب ہے جو جنت کا طالب ہو۔ جنتی انسان وہ ہے جو ہر قسم کے منفی جذبات سے مکمل طور پر خالی ہو، صرف اِس فرق کے ساتھ کہ چڑیا کے اندر یہ مثبت صفت جبلّت (instinct) کے طور پر ہوتی ہے اور جنتی انسان کے اندر یہ مثبت صفت آزادانہ شعور کے تحت۔

جنّتی انسان وہ ہے جو اپنی تربیت کرکے اپنے آپ کو ایسا بنائے کہ اس کا دل نفرت اور انتقام جیسی چیزوں سے مکمل طور پر خالی ہوجائے، جو غصے کو پی جانے والا ہو، جو منفی ردّعمل کا مزاج نہ رکھتا ہو، جو نفرت کے باوجود محبت کرنے والا انسان ہو، جو کسی امید کے بغیر لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرے، جو لوگوں کے درمیان اِس طرح رہے، جیسے کہ سب لوگ اُس کے بھائی اور بہن ہیں، جو شیطان سے بھاگے اور فرشتوں کو اپنا ہم نشین بنائے، جو شکایتوں کو صبر کے خانے میں ڈال دے، جو دوسروں کا حق ادا کرے اور اپنا حق خدا سے مانگے — یہی وہ اعلیٰ صفات ہیں جو کسی انسان کو جنت میں داخلے کا مستحق بنائیں گی۔

سب سے بڑی خوشی

ایک روایت الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ صحیحین میں آئی ہے۔ صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں: عن أبي سعيد قال: قال رسول الله ﷺ إن اللّٰه تعالىٰ يقول لأهل الجنة: يا أهل الجنّة، فيقولون: لبّيك ربّنا وسعديك، والخير كلّه في يديك. فيقول: هل رضيتم. فيقولون: وما لنا لا نرضى يا ربّ، وقد أعطيتنا ما لم تعط أحداً من خلقك. فيقول: ألا أعطيكم أفضل من ذلك. فيقولون: يا ربّ، وأيّ شئ أفضل من ذلك. فيقول: أحلُّ عليكم رضواني فلا أسخط عليكم بعده أبداً (صحيح مسلم، رقم الحديث: 7318)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اہلِ جنت سے کہے گا کہ اے اہلِ جنت، وہ کہیں گے اے ہمارے رب لبیک وسعدیک والخیر کلہ فی یدیک۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، کیا تم راضی ہو۔ وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب، ہم کیوں نہ راضی ہوں، حالاں کہ تو نے ہم کو وہ چیز عطا فرمائی جو تو نے مخلوقات میں سے کسی دوسرے کو نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، کیا میں تم کو اس سے بھی زیادہ افضل چیز نہ دوں۔ وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب، وہ کیا چیز ہے جو اس سے افضل ہے۔ اللہ فرمائے گا، میں تمھارے لیے اپنی رضا کو واجب کرتا ہوں، اِس کے بعد اب میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔

جنت بلاشبہہ تمام نعمتوں کا مجموعہ ہے۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں انسان کی تمام خواہشیں اور تمنائیں کامل درجے میں پوری ہوں گی۔ جو لوگ جنت میں داخل ہوں گے، وہ یہ محسوس کریں گے کہ اُنھیں تمام مسرتیں اپنی حقیقی صورت میں حاصل ہوگئیں ہیں۔ لیکن امکانی طور پر ایک اندیشہ اُن کے لیے پھر بھی موجود رہے گا، وہ یہ کہ جنت ان کو اللہ کے عطیہ کے طور پر ملی ہے، وہ خود اُس کے خالق نہیں ہیں۔ اللہ اگر چاہے تو جنت کو اُن سے چھین بھی سکتا ہے۔ مذکورہ حدیث اِسی اندیشے کا جواب ہے۔ جب خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی ابدی رضا کا اعلان کردیا جائے گا تو اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ جنت اب ہمیشہ کے لیے ان کی قیام گاہ بن چکی ہے، وہ ان سے کبھی چھینی جانے والی نہیں۔ یہ بلاشبہہ سب سے بڑی خوشی ہوگی جو اہلِ جنت کو حاصل ہوگی۔

حرصِ جنت، خوفِ جہنم

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔سنن الترمذی کے الفاظ یہ ہیں: **عن أنس بن مالك قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من سأل الله الجنّة ثلاث مرات، قال الجنة: اللهم أدخله الجنة. ومن استجار من النار ثلاث مرات، قالت النار: اللهم أجره من النار (الترمذي، رقم الحديث: 2572؛ أخرجه أيضاً النسائي وابن ماجه وابن حبّان في صحيحه والحاكم)**۔یعنی جس نے اللہ سے جنت مانگی تین بار، جنت کہے گی کہ اے اللہ، تو اس کو جنت میں داخل کردے۔اور جس شخص نے جہنم سے پناہ مانگی تین بار، جہنم کہے گی کہ اے اللہ، تو اس کو جہنم سے پناہ دے دے۔

اِس حدیثِ رسول میں تین بار سے مراد تین گنتی نہیں ہے، بلکہ تین موقع (occasion) ہے۔ اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو شخص گنتی کے اعتبار سے، اِن الفاظ کو تین بار بول دے، وہ اِس انعام کا مستحق بن جائے گا۔ اِس سے مراد دراصل وہ انسان ہے جس نے جنت اور جہنم کو دریافت کیا، جنت اور جہنم کی سوچ جس کے تفکیری عمل (thinking process) میں شامل ہوگئی۔ جو جنت کا سب سے زیادہ حریص بن گیا اور جہنم سے سب سے زیادہ ڈرنے لگا۔ بڑھے ہوئے شعور کی بنا پر جس کا یہ حال ہوگیا کہ وہ سوچنے لگا کہ اگر جنت نہ ملی تو میرا کیا حال ہوگا، اور اگر مجھ کو جہنم میں ڈال دیا گیا تو میں کیسے اس کا تحمل کروں گا۔

پھر اُس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ فرشتوں کے ریکارڈ میں کم از کم تین بار یہ واقعہ درج ہوا کہ وہ جنت اور جہنم کی یاد میں تڑپ رہا ہے اور اپنی تنہائیوں میں خدا کو پکارتے ہوئے وہ یہ کہہ رہا ہے کہ — خدایا، تو مجھ کو اپنے اُن بندوں میں شامل فرما جن کو تو جنت کا انعام عطا فرمائے گا، خدایا، تو مجھ کو اپنے اُن بندوں میں شامل فرما جن کو تو جہنم کی آگ سے نجات دے گا — جس انسان کے اوپر کم از کم تین بار یہ طوفانی تجربہ گزرا، وہ مذکورہ حدیثِ رسول کا مصداق قرار پائے گا۔اس حدیث رسول میں دراصل ایک حقیقتِ واقعہ کو بیان کیا گیا ہے، نہ کہ کسی قسم کی لفظی گنتی کو۔

طالبِ دنیا، طالبِ آخرت

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ البیہقی کے الفاظ یہ ہیں: **إنّ أخوف ما أتخوّف علی أمّتي الهویٰ وطول الأمل، فأمّا الهویٰ فیصدّ عن الحق، وأمّا طول الأمل فینسی الآخرة۔ وهذه الدنیا مُرتحلة ذاهبة، وهذه الاٰخرة مرتحلة قادمة۔ ولکلّ واحدة منهما بنون۔ فإن استطعتم أن لا تکونوا من بني الدنیا فافعلوا۔ فإنکم الیوم في دار العمل ولا حساب، وأنتم غداً في دار الآخرة ولا عمل** (شعب الإیمان، رقم الحدیث: 10132)

حضرت جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا— سب سے زیادہ ڈر کی بات جس کا مجھے اپنی امت کے بارے میں اندیشہ ہے، وہ خواہش اور لمبی آرزوئیں ہیں۔ خواہش آدمی کو حق سے روک دیتی ہے۔ اور لمبی آرزوئیں انسان کو آخرت سے غافل کر دیتی ہیں۔ یہ دنیا گزرنے والی اور جانے والی ہے۔ اور آخرت چل رہی ہے اور آنے والی ہے۔ اور اِن دونوں میں سے ہر ایک کے طلب گار ہیں۔ اگر تم سے ہو سکے تو تم اپنے آپ کو طالبِ دنیا ہونے سے بچاؤ۔ کیوں کہ آج تم ایک ایسی دنیا میں ہو، جہاں عمل ہے، لیکن حساب نہیں۔ اور کل تم آخرت کی دنیا میں ہوگے، جہاں حساب ہے، مگر عمل نہیں۔ اِس حدیث رسول سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے دو دور ہیں— موت سے پہلے کا دور، اور موت کے بعد کا دور۔ موت سے پہلے کے دور میں تیاری ہے، مگر انجام نہیں۔ اور موت کے بعد کے دور میں انجام ہے، مگر تیاری نہیں۔ انسانی زندگی کے بارے میں اِس حقیقت کو جاننا ہی سب سے بڑا علم ہے اور سب سے بڑی دانش مندی۔ تیاری کے بارے میں بنیادی بات یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو خواہشوں سے بچائے، جو کہ آدمی کو صراطِ مستقیم سے ہٹانے والی ہیں۔ اِس اعتبار سے انسانوں کی دو قسمیں ہیں— طالبِ دنیا، اور طالبِ آخرت، نادان وہ ہے جو طالبِ دنیا بنے۔ اور دانش مند وہ ہے جو طالب آخرت بنے۔ طالبِ دنیا کے لیے ابدی ناکامی ہے، اور طالب آخرت کے لیے ابدی کامیابی۔

جنت کی قیمت

ایک روایت، معمولی لفظی فرق کے ساتھ، حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آخرت میں ایک جہنمی شخص کو جہنم سے نکالا جائے گا۔ اُس سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنے انجام کو کیسا پایا۔ وہ شخص کہے گا کہ بہت برا انجام۔ پھر اس سے پوچھا جائے گا کہ اگر تمھارے پاس زمین کے برابر سونا ہو تو تم اس سونے کو دے کر اِس عذاب سے نجات حاصل کرنا چاہوگے۔ وہ کہے گا کہ ہاں۔ پھر اس سے کہا جائے گا: **قد کنتَ سُئلتَ ما هو أيسر من ذلك (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 6538)** یعنی دنیا میں تم سے اِس سے بہت کم کا مطالبہ کیا گیا تھا، مگر تم نے اس کو پورا نہیں کیا۔

اِس حدیث میں ''أیسر'' (کم) سے کیا مراد ہے۔ اِس سے مراد اعتراف ہے۔ اگر انسان سے جنت کی قیمت کے طور پر سونا مانگا جائے، تو وہ جنت کی مادی قیمت ہوگا۔ لیکن انسان سے اِس طرح کی کوئی مادی قیمت (material price) نہیں مانگی گئی۔ انسان سے جو کچھ مانگا گیا، وہ صرف اعتراف (acknowledgement) تھا، مگر انسان غیر اللہ میں اتنا زیادہ مشغول رہا کہ وہ اعتراف کی یہ قیمت ادا نہ کرسکا۔

اعتراف کیا ہے، اعتراف کوئی سادہ چیز نہیں، وہ ہمیشہ دریافت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جب ایک انسان گہرے غور وفکر سے کام لیتا ہے، تو اُس پر ربانی حقیقتیں منکشف ہونے لگتی ہیں۔ وہ ایک طرف، اللہ کی معرفت حاصل کرتا ہے، اور دوسری طرف وہ تخلیقِ الٰہی کی حقیقتوں کو دریافت کرتا ہے۔ اس کو جنت اور جہنم کا شعور حاصل ہوتا ہے۔

یہ دریافتیں اس کے ذہن میں ایک فطری بھونچال پیدا کردیتی ہیں۔ اِس شعور اور اِس کیفیت کے ساتھ کسی کی زبان پر اعترافِ خداوندی کا جو کلمہ جاری ہو، وہی اعتراف اس کے لیے جنت میں داخلے کا استحقاق پیدا کرے گا۔

جنت کی طلب

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ما رأيت مثل الجنة نام طالبها (الترمذي، رقم الحديث: 2601)** یعنی میں نے نہیں دیکھا کہ جنت جیسی چیز کے لیے اُس کے طالب سو گئے ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ جنت بے حد قیمتی چیز ہے۔ اِس اعتبار سے، ہر انسان کو اُس کا طالب بننا چاہیے، لیکن عجیب بات ہے کہ لوگ اس کے بارے میں غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

اپنی اندرونی طلب کے تحت ہر آدمی اپنی مفروضہ جنت کے لیے دوڑ رہا ہے۔ کوئی اپنی اولاد میں اس کو تلاش کررہا ہے اور کوئی اپنے کاروبار میں، کوئی عہدہ میں اس کو تلاش کررہا ہے اور کوئی شہرت میں، کوئی دولت میں اس کو تلاش کررہا ہے اور کوئی اقتدار میں۔ کوئی اس کو منبر پر تلاش کررہا ہے اور کوئی اسٹیج پر۔ لیکن ہر ایک اپنی تلاش میں ناکام ہے، کیوں کہ جنت دراصل آخرت میں ہے، موجودہ دنیا میں وہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ آدمی کے اندر فطری طور پر جو طلب ہے، وہ جنت کی طلب ہے۔ اس سے مراد وہ جنت ہے جو کسی انسان کو آخرت میں ملے گی۔ لیکن انسان اپنی طلب کو دنیا کی چیزوں کے حصول میں لگا دیتا ہے۔ وہ جنت کے بجائے، غیر جنت کا طالب بن جاتا ہے۔ یہی انسان کی اصل محرومی ہے۔

جنت وہ آئڈیل جگہ ہے جہاں انسان کو پورے معنوں میں فل فل مینٹ (fulfilment) حاصل ہوگا۔ لیکن اِس جنت کا ملنا، موجودہ دنیا میں کسی کے لیے ممکن نہیں۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کی مطلوب جنت جہاں واقع ہے، وہاں وہ اس کو پانے کی کوشش نہیں کرتے۔ اور جہاں ان کی مطلوب جنت سرے سے موجود ہی نہیں، وہاں وہ اپنا پورا وقت اور اپنی پوری توانائی لگا کر اس کو ڈھونڈ رہے ہیں۔

یہ سب سے بڑی نادانی ہے جس میں تمام عورت اور تمام مرد مبتلا ہیں۔ اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو قرآن کے مطابق، اِس معاملے میں لوگوں کی مثال اُس انسان جیسی ہے جو اپنی پیاس بجھانے کے لیے سراب کی طرف دوڑے۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچے تو وہ صرف یہ جانے کہ اس کا مطلوب پانی وہاں موجود ہی نہیں (24:39)

نجاتِ آخرت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحب زادی فاطمہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: **یـــا فـاطـمـة، أنـقـذي نفسك من النّار، فإني لا أملك لكم من الله شيئاً** (**صحيح مسلم، رقـم الـحـديـث**: 522) یعنی اے فاطمہ، اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ کیوں کہ میں اللہ کے مقابلے میں تمھارے لیے کچھ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اِسی طرح حضرت عائشہ کی ایک روایت کے مطابق، آپ نے فرمایا کہ کسی شخص کا کوئی عمل اُس کو جنت میں نہیں لے جائے گا، حتی کہ مجھے بھی نہیں۔ میرے لیے بھی صرف اللہ کی مغفرت اور رحمت سے جنت میں پہنچنا ممکن ہوگا (**صـحـيـح الـبـخـاری، رقم الحديث**: 4850)

آخرت میں جنت کا ملنا کسی انسان کے لیے آخری کامیابی کا معاملہ ہوگا۔ یہ عظیم واقعہ صرف خدا کے فیصلے کے تحت انجام پائے گا۔ جنت میں داخلہ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ یہ خدا کی قدرتِ کاملہ کا اظہار ہے۔ جنت صرف معترفین کے لیے ہے، یعنی اُن لوگوں کے لیے جو کامل اعتراف کے ساتھ جنت میں داخل ہوں۔ یہ کامل اعتراف حقیقی اعتراف ہوگا، نہ کہ صرف لفظی اعتراف۔

اعترافِ کامل کا یہ احساس کسی انسان کے اندر صرف اُس وقت پیدا ہوگا جب کہ وہ فی الواقع یہ محسوس کرے کہ جنت مجھے صرف فضلِ خداوندی کی بنا پر مل سکتی ہے۔ جو یہ کہہ سکے کہ خدایا، میں کامل طور پر غیر مستحق تھا۔ یہ صرف تیری غیر معمولی عنایت ہے کہ تو نے میرے عدم استحقاق کے باوجود محض اپنے فضل سے مجھے جنت دے دی۔

حقیقت یہ ہے کہ جنت اتنی عظیم ہے کہ کوئی بھی عمل یا تمام انسانوں کا مجموعی عمل بھی اس کی قیمت نہیں بن سکتا۔ جو آدمی جنت کو اِس طرح دریافت کرلے کہ جنت کی ابدی نعمتوں کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو کامل طور پر غیر مستحق سمجھنے لگے، وہی جنت میں داخل ہوگا۔ انسان کا کوئی عمل جنت میں داخلے کا ٹکٹ نہیں بن سکتا۔ جنت میں داخلے کا ٹکٹ یہ ہے کہ آدمی اپنے غیر مستحق ہونے کو دریافت کرلے۔

اہلِ جنت کون

صحیح البخاری اور صحیح مسلم میں ایک لمبی حدیث آئی ہے۔ اِس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ جہنم میں جانے والے زیادہ تر متکبّر ہوں گے اور جنت میں جانے والے زیادہ ضعفاء ہوں گے: **تحاجّت الجنة والنار. فقالت النار: أوثرتُ بالمتكبرين والمتجبّرين. وقالت الجنة: مالي، لا يدخُلني إلا ضعفاء الناس وسقطُهم (صحيح البخاري، رقم الحديث: 4850)۔**

اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے، وہ کوئی پُر اسرار بات نہیں، اِس میں دراصل انسانی تاریخ کے ایک تجربے کو بیان کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت سے انسانوں کو انسانِ قوی کی حیثیت سے پیدا کیا، یعنی ایسے لوگ جو اپنے ذہن اور اپنی صلاحیت کے اعتبار سے اعلیٰ شخصیت کے مالک تھے۔ مگر اسی کے ساتھ اُن کو امتحانی مصلحت کی بنا پر آزادی حاصل تھی۔ اپنی آرزوؤں کا غلط استعمال کرتے ہوئے وہ سرکش اور متکبر بن گئے۔ اِس طرح انھوں نے اپنے آپ کو جہنم کا مستحق بنالیا۔

اس کے برعکس، اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کو ضعیف انسان کی حیثیت سے پیدا کیا۔ اُن کو بھی امتحانی مصلحت کی بنا پر آزادی حاصل تھی، لیکن اپنے فطری ضعف کے باعث وہ متواضع (modest) بن گئے۔ اپنے ضعف کی تلافی کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ اللہ کو یاد کرنے والے بن گئے۔

ایسا اِس لیے ہوا کہ اُن کے لیے عملاً اِس کے سوا کوئی اور انتخاب (choice) ممکن نہ تھا۔ اِس طرح ضعفاء کے اندر وہ صفات پیدا ہوئیں جو اُنھیں جنت میں داخلے کے قابل بنانے والی تھیں۔

تاہم اِس میں استثنا بھی ممکن ہے۔ مثلاً حضرت عمر فاروق انتہائی قوی انسان کی حیثیت سے پیدا ہوئے تھے، لیکن ان کے ایمان نے ان کو انتہائی متواضع انسان بنا دیا۔ اِسی طرح ایسے افراد ہو سکتے ہیں جو جسمانی اعتبار سے آخری حد تک ضعیف ہوں، لیکن ذہن کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ اُن کو آخری حد تک قوی بنا دے، تاکہ ضعف کے باوجود اعلیٰ معرفت کا حصول اُن کے لیے ممکن ہو جائے۔

انسان اور جنت

حدیث کی کتابوں میں ایک روایت اِن الفاظ میں آئی ہے: **لتدخلنَّ الجنَّةَ إلا مَن أبىٰ، وشرد على الله شِرادَ البعير** (مسند احمد، رقم الحدیث 22226) یعنی تم ضرور جنت میں داخل ہوگے، سوا اُس کے جس نے انکار کیا، اور وہ اللہ سے بھاگا جیسے اونٹ بدک کر بھاگتا ہے۔

اللہ نے انسان کو اصلاً جنت کے لیے پیدا کیا ہے۔ اللہ کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، انسان جیسی مکرم مخلوق کا مقام صرف جنت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اور جنت دونوں ایک دوسرے کا مثنّٰی (counter part) ہیں۔ انسان جنت کے لیے ہے، اور جنت انسان کے لیے۔

اللہ نے جنت میں داخلے کے لیے جو شرط مقرر کی ہے، وہ انتہائی حد تک قابلِ عمل ہے، وہ کسی بھی درجے میں انسان کے لیے نا قابلِ عمل نہیں۔ وہ شرط یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو جس فطری حالت پر پیدا کیا ہے۔ اُسی فطری حالت پر وہ جئے اور پھر اسی فطری حالت کے ساتھ وہ اللہ تک پہنچ جائے (**إلا من أتى الله بقلبٍ سليم**)

جنت میں داخلے کی واحد شرط یہ ہے کہ آدمی خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت پر قائم ہو۔ وہ خدا کی فطرت سے انحراف نہ کرے۔ یہ خدائی فطرت ہر انسان کو الہام کردی گئی ہے (91:8)۔ اگر آدمی اپنے آپ کو ڈسٹریکشن (distraction) سے بچائے، تو وہ یقینی طور پر اپنی اِس فطرت کو پہچان لے گا۔ ہر انسان کے اندر ضمیر (conscience) موجود ہے۔

یہ ضمیر اِسی خدائی فطرت کی ایک داخلی علامت ہے۔ خدا کے پیغمبر اِسی لیے آئے کہ وہ انسان کو اس فطرت سے باخبر کریں، تاکہ جو چیز لاشعور کی سطح پر انسان کے اندر موجود ہے، اس کو وہ شعور کی سطح پر دریافت کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان جنت کے لیے ہے، اور جنت انسان کے لیے۔ اِس میں استثنا (exception) صرف اُس شخص کا ہے جو خود ہی اپنے آپ کو بھٹکا کر جنت کے سوا کسی اور منزل کا مسافر بن جائے۔

فردوس کا طالب

حضرت عُبادہ بن الصامت سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **في الجنة مأة درجة۔ ما بين كلّ درجتين كما بين السماء والأرض۔ والفردوس أعلاها درجة، منها تفجر أنهار الجنة الأربعة، ومن فوقها يكون العرش۔ فإذا سألتم الله فاسئلوه الفردوس**''۔ (رواہ الترمذي، رقم الحديث: 2471) یعنی جنت کے ایک سو درجے ہیں۔ ہر دو درجے کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا کہ زمین اور آسمان کے درمیان فاصلہ۔ اور فردوس، جنت کا سب سے اونچا درجہ ہے۔ اُس سے جنت کے چار چشمے جاری ہوتے ہیں۔ اور اس کے اوپر خدا کا عرش ہے۔ پس جب تم اللہ سے جنت کا سوال کرو تو تم اُس سے فردوس کا سوال کرو۔

اِس حدیثِ رسول میں جنت کا سوال کرنے کا مطلب صرف جنت کے لیے لفظی دعا کرنا نہیں ہے۔ اِس حدیث میں جنت کا سوال کرنے سے مراد جنت کا طالب بننا ہے۔ انسان کی نفسیات یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اعلیٰ ترین چیز کا طالب بنتا ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے انسان اعلیٰ سے کم تر چیز پر راضی نہیں ہوتا۔

نفسیاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو فردوس کا طالب بننے کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ ترین جنت کو پانے کے لیے تم اس کے لیے اعلیٰ ترین عمل کرنے والے بن جاؤ۔ تم اپنے آپ کو معرفت اور تزکیہ کے اعتبار سے، اعلیٰ ترین سطح پر پہنچاؤ، تا کہ تم اعلیٰ ترین جنت کے مستحق قرار پاؤ۔ تم اپنی شخصیت کی تعمیر اُن اعلیٰ تقاضوں کے مطابق کرو جو کہ اعلیٰ جنت میں داخلے کے لیے مطلوب ہیں۔ تم عاملِ فردوس بن کر، اپنے بارے میں طالبِ فردوس کا ثبوت دو۔ اِس حدیث میں بظاہر اللہ سے فردوس کا سائل بننے کا ذکر ہے، لیکن باعتبارِ حقیقت اِس کا مطلب یہ ہے کہ تم فردوس کی نسبت سے، اُس کے عامل بن جاؤ، تا کہ تم اُس خوش نصیب گروہ میں شامل ہو جاؤ جس کو آخرت میں جنت الفردوس میں بسایا جائے، یہ جنت الفردوس خداوندِ عالم کے پڑوس کا دوسرا نام ہے— فردوس کے لیے اعلیٰ عمل یہ ہے کہ جنت کے سوا کوئی اور چیز آدمی کے مطلوب کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔

جنت اور جہنم

جنت اور جہنم کے بارے میں ایک لمبی روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ سنن ابی داؤد کے الفاظ یہ ہیں: عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال : لما خلق الله الجنة قال لجبريل: اذهب فانظر إليها۔ فذهب فنظر إليها وإلى ما أعدّ الله لأهلها فيها، ثم جاء فقال: أي ربّ، وعزّتك لا يسمع بها أحد إلا دخلها۔ ثم حفّها بالمكاره۔ ثم قال يا جبريل، اذهب فانظر إليها۔ فذهب فنظر إليها۔ ثم جاء فقال: أي ربّ، وعزتك لقد خشيتُ أن لا يدخلها أحد۔ قال: فلما خلق الله النار، قال يا جبريل: اذهب فانظر إليها۔ فذهب فنظر إليها۔ ثم جاء فقال أي ربّ، وعزتك لا يسمع بها أحد فيدخلها۔ فحفّها بالشهوات۔ ثم قال يا جبريل، اذهب فانظر إليها۔ فذهب فنظر إليها۔ ثم جاء فقال: أي رب، وعزتك لقد خشيتُ أن لا يبقىٰ أحد إلا دخلها (سنن الترمذی، رقم الحديث: 2560؛ سنن أبي داؤد، رقم الحديث: 4744 ؛ سنن النسائی، رقم الحديث: 3763)۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ نے جنت کو پیدا کیا تو جبریل سے کہا: جاؤ اور جنت کو دیکھو۔ پھر جبریل گئے اور انھوں نے جنت کو دیکھا اور جنت میں انسان کے لیے جو نعمتیں مہیا کی گئی ہیں، اُن کا مشاہدہ کیا۔ پھر جبریل واپس آئے اور کہا کہ اے میرے رب، تیرے عزت وجلال کی قسم، جو شخص بھی جنت کے بارے میں سنے گا، وہ ضرور اُس میں داخل ہوگا۔ پھر اللہ نے جنت کو ناخوشگوار چیزوں سے ڈھانک دیا۔ پھر کہا کہ اے جبریل، جاؤ اور اس کو دیکھو۔ جبریل گئے اور انھوں نے جنت کو دیکھا۔ پھر جبریل واپس آئے اور کہا کہ اے میرے رب، تیرے عزت وجلال کی قسم، مجھے ڈر ہے کہ کوئی بھی شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ جب اللہ نے جہنم کو پیدا کیا تو کہا کہ اے جبریل، جاؤ اور جہنم کو دیکھو۔ جبریل گئے اور انھوں نے جہنم کو دیکھا۔ پھر جبریل واپس آئے اور انھوں نے کہا کہ اے میرے رب، تیرے عزت وجلال کی قسم،

جو شخص بھی اس کے بارے میں سنے گا، وہ اتنا زیادہ خوف زدہ ہوگا کہ وہ اُس میں کبھی داخل نہیں ہوگا۔ پھر اللہ نے جہنم کو شہوات سے ڈھانک دیا۔ پھر اللہ نے کہا کہ اے جبریل جاؤ اور جہنم کو دیکھو۔ جبریل گئے اور انھوں نے جہنم کو دیکھا۔ پھر جبریل واپس آئے اور انھوں نے کہا کہ اے میرے رب، تیرے عزت وجلال کی قسم، مجھے ڈر ہے کہ کوئی بھی شخص نہیں بچے گا جو اُس میں داخل نہ ہو جائے۔

جنت اور جہنم کو لوگ اگر ان کی اصل صورت میں دیکھ لیں، تو ہر آدمی جنت کا شائق بن جائے، اور ہر آدمی جہنم سے بھاگنے لگے۔ لیکن موجودہ دنیا آزمائش کی دنیا ہے۔ اِس آزمائش کی بنا پر ایسا ہے کہ جنت کا راستہ ناخوش گوار چیزوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ اِس کے برعکس، جہنم کا راستہ ہر طرف خوش گوار چیزوں سے بھرا ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جنت میں داخلے کا مستحق بننے کے لیے آدمی کو اپنی خواہشات (desires) پر روک لگانا پڑتا ہے۔ اِس کے برعکس، جہنم کا معاملہ یہ ہے کہ آدمی اپنی خواہشوں پر بے روک ٹوک چلتا رہے تو آخر کار وہ جہاں پہنچے گا، وہ جہنم کا گڑھا ہوگا۔

اپنی خواہشوں پر روک لگانے سے آدمی کے اندر وہ مزکّیٰ شخصیت (purified personality) بنتی ہے جو جنت میں داخلے کی مستحق قرار پائے۔ اِس کے برعکس، اپنی خواہشوں کی پیروی کرنے سے آدمی کے اندر وہ غیر مزکّیٰ شخصیت بنتی ہے جس کا ٹھکانہ صرف جہنم ہو۔ یہی بات قرآن کی سورہ الشّمس میں اِس طرح کہی گئی ہے: **قد أفلح من زکّاها۔ وقد خاب من دسّاها** (91:9-10)۔

جنت میں داخلے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے اوپر مسلسل نگراں بنا ہوا ہو، وہ اپنا راستہ گہری سوچ کے تحت متعین کرے۔ اِس کے برعکس، جو شخص بے قید زندگی گزارے، اُس کا انجام یہ ہوگا کہ وہ بظاہر خوشیوں میں جیتا ہوا آخر کار ایک ایسی دنیا میں پہنچے گا جہاں ہر قسم کی خوشیاں ہمیشہ کے لیے اُس سے چھن چکی ہوں گی۔

آخرت کی جنت اُس کے لیے ہے جو اِس دنیا کی لذتوں سے اپنے آپ کو بے رغبت بنالے، اور آخرت کی جہنم اُس کے لیے ہے جو اِس دنیا کی لذتوں میں گم رہے، یہاں تک کہ وہ اِسی حال میں مر جائے۔

جنت کا سودا

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **من خاف أدلج، ومن أدلج بلغ المنزل۔ ألا، إن سلعة الله غالیةٌ۔ ألا، إنّ سلعة الله الجنة** (الترمذي، رقم الحدیث: 2388) یعنی جس کو اندیشہ ہوتا ہے، وہ سفر میں اِدلاج کرتا ہے۔ اور جو ادلاج کرتا ہے، وہ منزل پر پہنچتا ہے۔ سن لو، اللہ کا سودا بہت قیمتی ہے۔ سن لو، اللہ کا سودا جنت ہے۔

'ادلاج' کا مطلب ہے — رات کے اندھیرے میں سفر شروع کرنا۔ قدیم عرب میں یہ رواج تھا کہ مسافر رات کے اندھیرے سے اپنا سفر شروع کرتا تھا، تاکہ صبح کو دھوپ تیز ہونے سے پہلے وہ اپنی منزل پر پہنچ جائے۔ یہ صحرائی سفر کا طریقہ تھا، کیوں کہ صحرائی سفر میں یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر آدمی تیز دھوپ کی زد میں آجائے تو وہ خود بھی مر جائے گا اور اس کا اونٹ بھی ہلاک ہو جائے گا۔

جنت کے طالب کا معاملہ بھی یہی ہے۔ جنت کے طالب کو نہایت دور اندیشی کے ساتھ اپنا منصوبہ بنانا ہے۔ اس کو اتنی زیادہ تیاری کے ساتھ جنت کے سفر پر روانہ ہونا ہے کہ کوئی قابلِ قیاس یا نا قابلِ قیاس عذر (excuse) اس کے راستے میں رکاوٹ نہ بن سکے۔ کوئی بھی چیز اس کو درمیانی راستے سے منحرف نہ کر دے۔ کوئی بھی چیز اس کو سیدھے راستے سے ہٹانے والی ثابت نہ ہو۔

ایک تاجر دنیا کے تجارتی سودے کے لیے آخری حد تک اہتمام کرتا ہے۔ خدا کا سودا جو کہ جنت ہے، وہ تمام سودوں سے زیادہ قیمتی سودا ہے۔ اِس لیے آدمی کو چاہیے کہ وہ جنت کے سفر کی منصوبہ بندی میں آخری حد تک اہتمام کرے، جس طرح وہ دنیا کے سفر میں منصوبہ بندی (planning) کا اہتمام کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ہر طرح غفلت کا شکار ہونے سے بچائے — جنت کسی انسان کو حقیقی عمل کی بنیاد پر ملے گی، نہ کہ محض خوش فہمیوں کی بنیاد پر۔

منصوبہ بند عمل کامیابی کا ذریعہ ہے۔ دنیا کی کامیابی منصوبہ بند عمل کے ذریعہ ممکن ہوتی ہے۔ اِسی طرح آخرت کی کامیابی بھی منصوبہ بند عمل (Akhirat-oriented planning) کے ذریعہ ہی ممکن ہوگی۔

طالبِ جنت، ہاربِ جہنم

ایک حدیث کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ما رأیتُ مثلَ النار نام هاربها، وما رأيت مثلَ الجنة نام طالبها (الترمذي، كتاب الجنة)** ۔حدیث میں ہاربِ نار (جہنم سے بھاگنے والا) اور طالب جنت (جنت کا چاہنے والا) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ اسلوب بہت بامعنی اسلوب ہے۔ اِس میں اِس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ آدمی کی تخلیق اِس ڈھنگ پر کی گئی ہے کہ وہ عین اپنی فطرت کے اعتبار سے ہاربِ جہنم اور طالبِ جنت بنے۔ اگرچہ اپنی فطرت سے انحراف کرکے، وہ اِس سے مختلف انسان بن جاتا ہے۔

انسان تکلیف کو برداشت نہیں کرپاتا۔ کسی بھی قسم کا دکھ انسان کے لیے آخری حد تک ناپسندیدہ چیز ہے۔ انسان کا حال یہ ہے کہ وہ راحت کو دل وجان سے چاہتا ہے، وہ خوشی اور لذت کا انتہائی حد تک دلدادہ ہے۔ چناں چہ اس کی پوری زندگی انھیں دو چیزوں کے گرد گھومتی ہے، یعنی مصیبت سے اپنے آپ کو بچانا، اور دنیا کی راحت کو اپنے لیے جمع کرنا۔ مگر تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی انسان کے لیے نہ تو یہ ممکن ہے کہ وہ تکلیف اور مصیبت سے اپنے آپ کو مکمل طور پر بچالے، اور نہ کسی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ راحت اور خوشی کو حقیقی معنوں میں اپنے لیے حاصل کرلے۔ آدمی ساری زندگی اِسی کی دوڑ دھوپ میں لگا رہتا ہے، مگر آخر کار اُس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ مصیبتوں سے محفوظ زندگی حاصل کرتا ہے اور نہ وہ آرام وراحت کی دنیا اپنے لیے بنا پاتا ہے۔

ایک طرف انسان کا یہ جذبہ ہے، اور دوسری طرف موجودہ دنیا میں اُس کا ناقابلِ حصول ہونا۔ اِن دونوں باتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اِس جذبے کا اصل رخ آخرت کی طرف تھا، مگر انسان نے انحراف کرکے اُس کا رخ دنیا کی طرف موڑ دیا۔ انسان کی فطرت ہر لمحہ پکار رہی ہے کہ اے انسان، تو ہاربِ جہنم اور طالبِ جنت بن۔ کامیاب وہ ہے جو اِس آواز کو سن کر اس کی پیروی کرے۔ ناکام وہ ہے جو اِس آواز کو نہ سنے اور آخر کار وہ ابدی حسرت اور مایوسی کے گڑھے میں جا گرے۔

اعترافِ عجز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے قدیم عرب میں ایک شخص پیدا ہوا۔ اُس کا نام عبداللہ بن جُدعان تھا۔ وہ نہایت شریف (noble) اور سخی (generous) آدمی تھا۔ وہ کثرت سے لوگوں کو کھلاتا تھا اور لوگوں کی مدد کرتا تھا۔

عبداللہ بن جدعان کے بارے میں ایک روایت صحیح بخاری میں آئی ہے جو کہ حسب ذیل ہے:

عن عائشة قالت قلتُ يا رسول الله ان ابن جدعان كان في الجاهلية يطعم المسكين ويصل الرحم، فهل ذلك نافعه. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا، إنّه لم يقل يوماً ربِّ اغفرلي خطيئتي يومَ الدين. (صحيح البخاري، رقم الحديث: 315)

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے اللہ کے رسول، عبداللہ بن جدعان لوگوں کو کھانا کھلاتا تھا اور مہمانوں کی عزت کرتا تھا۔ کیا اس کا یہ عمل قیامت کے دن اس کو فائدہ پہنچائے گا۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، کیوں کہ اس نے کسی دن یہ نہ کہا کہ اے میرے رب، جزا (قیامت) کے دن میرے گناہ کو بخش دے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے جو چیز مطلوب ہے، وہ کیا ہے۔ اللہ کی یہ مطلوب چیز اعتراف (acknowledgement) ہے۔ بندہ جب اپنی بندگی اور خدا کی خدائی کی معرفت حاصل کرتا ہے تو اس کے اندر شدید طور پر اپنی عاجزی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ خدا کی عظمت اور کمال کے سامنے اُس کو اپنا وجود سراپا تقصیر نظر آنے لگتا ہے۔ یہ عارفانہ احساس اُس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ خدا کے آگے گر پڑے۔ وہ خدا سے رحمت اور بخشش کی التجا کرنے لگے۔

''خدایا مجھے بخش دے'' عجز کا کلمہ ہے۔ اور عجز کا کلمہ ہی جنت کی آخری قیمت ہے۔ جس آدمی کے پاس نہ عمل ہو اور نہ اعترافِ بے عملی تو اُس کو جنت میں داخلہ آخر کس بنیاد پر دیا جائے گا۔

جنت کی قیمت

جنت خدا کی بنائی ہوئی ایک انوکھی دنیا ہے۔ جنت میں اعلیٰ معیار کی حد تک ہر قسم کی راحت اور خوشی موجود ہے۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں انسان کو ہر قسم کا فُل فِل مینٹ (fulfillment) ہمیشہ کے لیے حاصل ہوگا (41:31)۔

جنت کی یہ انوکھی دنیا کس کو ملے گی۔ جنت کی یہ دنیا موت کے بعد کی ابدی زندگی میں اس عورت یا مرد کو ملے گی جو اس کی قیمت ادا کرے۔ جنت اُس کے لیے ہے جو حقیقی معنوں میں ربانی انسان یا خدا والا انسان بن جائے، جو بظاہر خدا سے دور ہوتے ہوئے معرفت کی سطح پر خدا سے قریب ہو جائے۔ جنت خدا کے پڑوس کا نام ہے۔ آخرت کی دنیا میں خدا کا پڑوس صرف اُس شخص کو ملے گا جو آخرت سے پہلے کی دنیا میں خدا کے پڑوس میں جینے لگے۔

انسان اپنے آپ کو ایک پیدا کئے جانے والی مخلوق کی صورت میں دیکھتا ہے، خدا کو اُسے لم یلد ولم یولد کی صورت میں دریافت (discover) کرنا ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان دیکھ کر چیزوں کے اوپر یقین کرتا ہے، خدا کے اوپر اس کو دیکھے بغیر یقین کرنا ہے۔ انسان مال اور اولاد جیسی چیزوں سے بے پناہ محبت کرتا ہے، اس کو خدا کے ساتھ ایسا تعلق قائم کرنا ہے، جب کہ وہ سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے لگے اور سب سے زیادہ خدا سے محبت کرنے لگے۔

انسان آج کی چیزوں میں جیتا ہے اور وہ آج کی چیزوں کو اہمیت دیتا ہے، جنت اُس انسان کے لیے ہے جو آج کی چیزوں سے اوپر اٹھ جائے اور صرف ایک خدا کو اپنا سپریم کنسرن بنالے۔ انسان کا یہ حال ہے کہ وہ بھرپور دل چسپی کا تعلق اپنے لوگوں سے رکھتا ہے اور خدا کے ساتھ اس کا تعلق صرف رسمی اور ظاہری سطح پر ہوتا ہے، ایسے لوگوں کو جنت میں داخلہ ملنے والا نہیں۔ جنت میں داخلہ صرف وہ لوگ پائیں گے جن کا حال یہ ہو جائے کہ خدا کے سوا دوسری تمام چیزوں سے ان کا تعلق صرف دنیوی ضرورت کے طور پر ہو اور دل چسپی اور قلبی لگاؤ کے اعتبار سے ان کا تعلق تمام تر خدا سے ہو جائے۔

جنت میں داخلے کی شرط

آدم پہلے انسان تھے اور پہلے پیغمبر بھی۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کر کے اُن کو اور ان کی بیوی حوا کو جنت میں رکھا، اور کہا کہ تم دونوں یہاں رہو اور آزادانہ طور پر یہاں کے سامانِ راحت سے فائدہ اٹھاؤ۔ لیکن تم اِس شجرِ ممنوعہ کے قریب نہ جانا، ورنہ تم ظالم ہو جاؤ گے (2:35)۔

مگر شیطان کے وسوسے سے متاثر ہو کر انھوں نے ممنوعہ درخت کا پھل کھا لیا۔ اس کے بعد آدم اور حوا دونوں جنت سے نکال کر موجودہ زمین میں ڈال دیے گیے۔ اور آدم سے اور ان کی پوری نسل سے یہ کہہ دیا گیا کہ جو عمل کا ثبوت دے گا، وہی ابدی جنت میں جگہ پائے گا۔

زندگی کے آغاز کی یہ مثال بتاتی ہے کہ جنت کے حصول کی شرط کیا ہے۔ جنت کسی کو پُر اسرار طور پر نہیں ملے گی اور نہ کسی کی سفارش کسی کو جنت کا مستحق بنائے گی۔ جنت کسی کو پیدائشی حق کے طور پر ملنے والی نہیں، یہاں تک کہ پیغمبر کو بھی نہیں:

Paradise is not a birth right, even for the Prophets.

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کے ذریعے سارے انسانوں کے لیے یہ مثال قائم کر دی اور بتا دیا کہ جنت کسی خود ساختہ عقیدے کے تحت کسی کو ملنے والی نہیں۔ یہ اصول اتنا عام ہے کہ اِس میں پیغمبروں تک کا کوئی استثنا نہیں ہے۔

حضرت آدم کے واقعے میں ایک اور بے حد اہم بات معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ جنت کے حصول کا مدار سب سے پہلے جس چیز پر ہے، وہ ہے اپنی خواہشوں پر کنٹرول اور اپنی عقل کو اتنا زیادہ ترقی دینا کہ وہ شیطان کے وسوسوں سے بچ سکے۔ انسان کے اندر ابدی کامیابی کی خواہش بے پناہ طور پر موجود ہے۔ اِسی خواہش کے راستے سے شیطان نے آدم کے اوپر حملہ کیا اور وہ کامیاب ہو گیا۔ اِسی طرح انسان کے اندر بہت سی خواہشیں ہیں۔ ہر خواہش انسان کے اندر شیطان کے داخلے کا دروازہ ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی خواہش کے ہر دروازے پر چوکی دار بنا رہے، تا کہ شیطان اس کے اندر داخل ہو کر اُس کو خدا کی رحمت سے دور نہ کر سکے۔

جنت ایک نظریۂ حیات

جنت کا عقیدہ سادہ طور پر صرف ایک عقیدہ نہیں ہے، وہ پورے معنوں میں ایک نظریہ حیات ہے۔ جنت کے عقیدہ کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہے۔ جنت کی اہمیت کو صرف اُس وقت سمجھا جاسکتا ہے، جب کہ اس کو انسان کی پوری زندگی سے جوڑ کر دیکھا جائے۔

انسان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ ایک متلاشیٔ جنت حیوان (paradise-seeking animal) ہے۔ انسان کی پوری فطرت ایک ایسی دنیا چاہتی ہے جو اُس کے لیے آئڈیل دنیا (ideal world) ہو، جہاں اُس کو تمام چیزیں معیاری درجے میں حاصل ہوں۔ اِسی کا نام جنت ہے۔ اور اِس جنت کا حصول ہر عورت اور ہر مرد کا مشترک خواب ہے۔

انسان کی موجودہ حالت کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام انسان آخری حد تک مادّی چیزوں کے حریص بنے ہوئے ہیں۔ ہر آدمی زیادہ سے زیادہ دولت اور زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ سب اِسی لیے ہے کہ انسان یہ چاہتا ہے کہ اپنی فطرت میں چھپی ہوئی جنت کو وہ اِس دنیا میں واقعہ بنا سکے۔ مگر یہاں ایک حقیقت اُس کے لیے مستقل رکاوٹ ہے۔ موجودہ دنیا اپنے اسباب کے اعتبار سے ایک غیر معیاری دنیا (imperfect world) ہے۔ اِس قسم کی غیر معیاری دنیا میں، معیاری جنت کی تعمیر سرے سے ممکن ہی نہیں۔

امکان اور واقعہ کے درمیان یہی تضاد اِس دنیا کی تمام برائیوں کا اصل سبب ہے۔ اِسی بنا پر لوگ مستقل طور پر ذہنی تناؤ (tension) میں جیتے ہیں، اِسی بنا پر لوگ تشدد پسند بن جاتے ہیں، اِسی بنا پر لوگ جھنجھلاہٹ (frustration) کا شکار رہتے ہیں۔

اِس مسئلے کا حل صرف ایک ہے، وہ یہ کہ لوگوں کے اندر اِس حقیقت کا شعور پیدا کیا جائے کہ جنت کسی کو صرف اگلی دنیا میں مل سکتی ہے، نہ کہ موجودہ دنیا میں۔ جنت کا عقیدہ آدمی کو حقیقت پسند بناتا ہے، اور حقیقت پسندی ہی تمام کامیابیوں کا واحد راز ہے۔

جنت کی دنیا

ایک صاحب نے کہا کہ جنت میں داخلے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر جنتی کردار پایا جاتا ہو۔ مگر مشاہدہ بتاتا ہے کہ ساری تاریخ میں بہت کم لوگ ایسے ہوئے ہیں جو جنتی کردار کے حامل ہوں۔ ایسی حالت میں جنت تو صرف ایک سونی جگہ ہوگی، نہ کہ رونقوں سے بھری ہوئی جگہ۔

میں نے کہا کہ جنت کی سب سے بڑی رونق خود خداوندِ ذوالجلال کی ذات ہے۔ خدا کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ وہ آسمان اور زمین کا نور ہے (24: 35)۔ یہ نور جنت میں بدرجۂ کمال موجود ہوگا۔ پوری جنت خدا کے نور سے بھری ہوئی ہوگی۔ جنت کے ہر عورت اور مرد کو خدا کی موجودگی کا مستقل احساس ہوگا۔ جنت میں ہم اِس قابل ہوں گے کہ خدا کی موجودگی کو مسلسل طور پر محسوس کرسکیں:

We will be able to feel continuously the presence of God.

اِس کے علاوہ، جنت میں خدا کے فرشتے بے شمار تعداد میں موجود ہوں گے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں آنے والے پیغمبر جنت کے ممتاز افراد کی حیثیت سے وہاں موجود ہوں گے۔ اِس کے علاوہ، پوری تاریخ میں پیدا ہونے والی تمام صالح عورتیں اور تمام صالح مرد وہاں اکھٹا کیے جائیں گے۔ اِس طرح وہ بے شمار بچے وہاں بسائے جائیں گے جو معصومیت کی عمر میں مرگئے۔ یہ بچے جنت کی خصوصی رونق ہوں گے۔ غالباً اِنھیں کے بارے میں قرآن میں آیا ہے: **ویطوف علیهم ولدان مخلّدون، إذا رأیتهم حسبتهم لؤلؤاً منثوراً** (76: 19) یعنی ان کے پاس پھر رہے ہوں گے ایسے بچے جو ہمیشہ بچے ہی رہیں گے۔ تم اُنھیں دیکھو تو سمجھو کہ موتی ہیں جو بکھیر دئے گئے ہیں۔

جس جنت میں اتنی زیادہ رونقیں اور اتنی زیادہ پرکیف سرگرمیاں موجود ہوں، وہ جنت ایک سونی جنت کیسے ہوسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنت ایک انتہائی پررونق جگہ ہوگی۔ چناں چہ حدیث میں جنت کے بارے میں یہ الفاظ آئے ہیں: **فیها ما لا عین رأت، ولا أذن سمعت، ولا خطر علیٰ قلب بشر** (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 7310)۔

انوکھی تخلیق

شَمسی نظام (solar system) اور اس کے اندر استثنائی نوعیت کا سیارہ زمین (Planet earth) ایک انوکھی تخلیق ہے۔ یہاں انسان کے لیے اس کی ضرورت کی تمام چیزیں اعلیٰ معیار کے ساتھ موجود ہیں۔لیکن اِسی کے ساتھ یہاں ایک اور چیز بھی ہے جس کو قرآن میں کبد (90:5) کہا گیا ہے،یعنی یہاں اگر چہ انسان کے لیے ہر قسم کی سہولتیں موجود ہیں،لیکن اِسی کے ساتھ یہاں انسانی زندگی کے ہم راہ مشقت (distress) شامل کردی گئی ہے۔انسان کچھ بھی کرے،لیکن وہ اپنی زندگی کو کسی بھی حال میں دردوکرب سے بچا نہیں سکتا۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ جنت جب جنت میں داخل ہوں گے اور وہاں کے ماحول کا تجربہ کریں گے تو ان کی زبان سے نکلے گا: **الحمد لله الذي أذهب عنّا الحزن** (35:34) یعنی اُس اللہ کا شکر ہے جس نے خوف وحزن کو ہم سے دور کردیا:

Praise be to God who has taken away all sorrow from us.

اہلِ جنت کا یہ کلمہ دراصل دریافت کا ایک کلمہ ہوگا۔ وہ جنت کی صورت میں ایک نئے اور انوکھے تخلیقی کرشمہ کی دریافت کریں گے،یعنی یہ دریافت کہ جو خالق کبد والی دنیا کی تخلیق کرسکتا تھا، وہ اِس طاقت کا بھی حامل تھا کہ ایک اور دنیا کی تخلیق کرے جہاں خوف اور حُزن کی کوئی صورت نہ پائی جائے۔ایسی ایک جنت بنانے کے لیے ایک اور دنیا تخلیق کرنے کی ضرورت تھی اور خدا نے جنت کی صورت میں اُس نئی دنیا کی تخلیق کردی۔

اہل جنت جب ایک ایسی انوکھی دنیا کو پائیں گے تو کمالِ استعجاب سے وہ کلمہ ان کی زبان پر جاری ہوجائے گا جس کو قرآن میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: **وقالوا الحمد لله الذی أذهب عنا الحزن** ۔خوف وحزن سے خالی دنیا کی تخلیق ایک ایسا انوکھا واقعہ ہے جس کو ظہور میں لانا، قادرِ مطلق خدا کے سوا کسی اور کے لیے ممکن نہیں۔

جنت کس کے لیے

ایک تعلیم یافتہ غیر مسلم نے کہا کہ میں لوگوں کے درمیان اچھے اخلاق کے ساتھ رہتا ہوں، کبھی کسی کو تکلیف نہیں دیتا۔ میری کوشش یہ رہتی ہے کہ میں اپنے سماج کا اچھا ممبر بنوں۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ موت کے بعد مجھ کو جنت ملے گی۔ جب میں ایک اچھا انسان ہوں تو خدا مجھے جہنم میں کیوں ڈال دے گا۔

میں نے کہا کہ صرف اچھے اخلاق کی بنا پر کوئی شخص جنت میں نہیں جائے گا۔ جنت کیا ہے، جنت دراصل خدا کے پڑوس کا نام ہے۔ خدا اپنے پڑوس میں صرف ان لوگوں کو رہنے کی جگہ دے گا جو خدائی اخلاقیات کے حامل ہوں، صرف سماجی اخلاقیات کی بنا پر کوئی شخص جنت میں داخلے کا مستحق نہیں بن سکتا۔

اصل یہ ہے کہ ایک اخلاق وہ ہے جو انسان بمقابلہ انسان (man versus man) کی نسبت سے پیدا ہوتا ہے، اور دوسرا اخلاق وہ ہے جو انسان بمقابلہ خدا (man versus God) کی نسبت سے پیدا ہوتا ہے۔ دونوں قسم کے اخلاق کا محرّک بالکل الگ الگ ہے۔ انسان کی نسبت سے جو اخلاق کسی کے اندر پیدا ہوتا ہے وہ دراصل سماجی اخلاق ہوتا ہے۔ اس کا محرّک یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے سماج کے اندر بے ضرر زندگی حاصل کر سکے۔ وہ لوگوں کی نظر میں اچھا بنا ہوا ہو۔ لوگ اس کو سماج کا اچھا ممبر سمجھیں۔

اس کے مقابلے میں خدا کی نسبت سے جو اخلاق پیدا ہوتا ہے اس کا سرچشمہ دراصل معرفتِ خداوندی ہوتا ہے۔ ایک آدمی جب اپنے خالق کو دریافت کرتا ہے، تو یہ دریافت اس کے ذہن کو بالکل بدل دیتی ہے۔ اس کی ربّانی فطرت جاگ اٹھتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کے اندر وہ تمام صفات پیدا ہو جاتی ہیں جن کو اعلیٰ انسانی اخلاق کہا جاتا ہے۔

انسان کی نسبت سے جو اخلاقیات پیدا ہوتی ہیں وہ سماجی محرک کے تحت پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے سماج سے رشتہ ٹوٹنے کے بعد ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ایسا اخلاق وقتی مقصد کے لیے ہوتا ہے اور وقت گذرنے کے ساتھ ہی وہ ختم بھی ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں خدا کی نسبت سے جو اخلاقیات پیدا ہوتی ہیں وہ ابدی محرک کے تحت پیدا ہوتی ہیں۔ ان کا رشتہ خدا کی ابدیت کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے۔

اِس لیے ایسا انسان اِس قابل ٹھیرتا ہے کہ وہ خدا کی ابدی جنت میں جگہ پائے۔

خدائی اخلاقیات دراصل خدا کی معرفت سے پیدا ہونے والے کردار کا نام ہے۔ مثلاً خدا خالق ہونے کی حیثیت سے اپنے بندوں کے ساتھ محبت کرتا ہے۔ اس لیے ایسا انسان دوسرے انسانوں سے محبت کرنے لگتا ہے۔ خدا یوم الحساب کا جج ہے۔ یہ عقیدہ ایسے آدمی کے اندر شدید محاسبہ (accountability) کا احساس پیدا کردیتا ہے۔ وہ ہر ایسے قول یا فعل سے بچنے لگتا ہے جس میں یہ اندیشہ ہو کہ خدا اس کو پکڑے گا اور اس کو سخت سزا دے گا۔ ایسے انسان کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ دینے والا بھی خدا ہے اور چھیننے والا بھی خدا۔ یہ احساس اس کے اندر کبر کی نفسیات کو مکمل طور پر ختم کردیتا ہے۔ کسی انسان کو کم سمجھنا اس کے لیے ایک ایسی روش بن جاتی ہے جس کا وہ تحمل نہ کرسکے۔

پہلی قسم کے انسان کا اخلاق آزادانہ اخلاق ہوتا ہے، جب کہ دوسری قسم کے انسان کا اخلاق خدا کے ساتھ عبدیت کا تعلق قائم کرنے کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ پہلی قسم کے انسان کا اخلاق دُنیوی اخلاق ہوتا ہے، اور دوسری قسم کے انسان کا اخلاق جنّتی اخلاق۔ سماجی اخلاق ہمیشہ ایک حد پر پہنچ کر ختم ہوجاتا ہے۔ جب کہ خدائی اخلاق کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کی کبھی اور کسی حال میں کوئی حد نہیں آتی۔

ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے اور جنت کی قیمت خدا کی معرفت ہے۔ معرفتِ خداوندی سے کم تر درجے کی کوئی چیز جنت کی قیمت نہیں بن سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ جنت کی تصغیر ہے کہ معرفتِ اعلیٰ سے کم تر کسی چیز کو جنت کی قیمت سمجھا جائے۔

معرفت کیا ہے، معرفت (realization) دراصل خدا کی دریافت (discovery) کا نام ہے۔ یہ نہ دکھائی دینے والے خدا کو بصیرت کی آنکھ سے دیکھ لینا ہے۔ یہ اعلیٰ شعور کا ایک ایسا درجہ ہے جب کہ آدمی کے لیے خدا کے سوا ہر چیز غیر اہم بن جائے، جب کہ خدا کے سوا ہر چیز اپنی کشش کھودے۔ جب کہ خدا ہی انسان کا سب سے بڑا کنسرن (concern) بن جائے۔

یہ معرفت کوئی سادہ بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معرفت کے اوپر شبہات (doubts) کے

ہزاروں پردے پڑے ہوئے ہیں۔ جو آدمی شبہات کے اِن پردوں کو پھاڑ سکے وہی اُس اعلیٰ یقین کے درجے تک پہنچتا ہے جس کو معرفت کہا جاتا ہے۔ معرفت کے متلاشی کو بہر حال اس امتحان میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ جو آدمی شبہات کے پردے کو پھاڑنے کے اِس امتحان میں پورا اُترے وہی معرفتِ خداوندی کا تجربہ کرسکتا ہے۔

حصولِ معرفت کی حقیقی پہچان صرف ایک ہے، اور وہ داخلی ہے۔ یعنی یہ کہ آدمی خدا کو اس طرح پائے کہ وہ کامل طور پر اس کی فطرت کی آواز بن جائے۔ آدمی پیدائشی طور پر ایک متلاشی انسان ہے۔ آدمی پیدائشی طور پر حقیقتِ اعلیٰ کو دریافت کرنا چاہتا ہے۔ معرفت اسی تلاش کا جواب ہے۔ ایک بچّہ اپنی ماں کی تلاش میں ہو تو اپنی ماں کو پا کر وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اُس سے لپٹ جاتا ہے۔ یہی معاملہ صاحبِ معرفت کا ہے۔ جب کسی انسان کو حقیقی معنوں میں خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے تو وہ اس کو پانے کے بعد اِس طرح کامل طور پر اپنے خدا کے ساتھ جُڑ جاتا ہے جس طرح ایک چھوٹا بچہ اپنی ماں کے ساتھ۔

معرفت کے معاملے میں کوئی بھی عُذر (excuse) قابلِ قبول نہیں۔ جو آدمی موجودہ دنیا میں معرفت کے حصول میں اندھا ثابت ہو وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ معرفت جب اپنے دلائل اور اپنی نشانیوں کے ساتھ سامنے آتی ہے تو کسی بینا انسان کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اس کو نہ پہچانے۔ اس کے وجود میں چھپا ہوا احساسِ معرفت کافی ہو جاتا ہے کہ وہ اس کو پہچاننے سے محروم نہ رہے۔

ایک بچے کی ماں غائب ہو اور پھر وہ اس کے سامنے آجائے تو یہ ناممکن ہوتا ہے کہ بچہ اپنی ماں کو پہچاننے میں ناکام رہ جائے۔ بچّے کے اندر ماں کی معرفت اتنی زیادہ قوی ہوتی ہے کہ اس کے لیے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ اس کی ماں اس کے سامنے آجائے اور وہ اس کو پہچاننے سے قاصر رہے۔ اسی طرح جب دلائل اور نشانیوں کے ذریعے خدا کی معرفت کسی آدمی کے سامنے کھل جائے تو وہ اس کا تحمّل نہیں کرسکتا کہ وہ اس کو نہ پہچانے۔ جو بچہ اپنی ماں کو نہ پہچانے وہ بلاشبہہ اندھا ہے، وہ اپنی باہر کی آنکھ سے بھی محروم ہے اور اپنی اندر کی آنکھ سے بھی محروم۔

جنت کی قیمت

جنت ابدی راحتوں کی دنیا ہے۔ وہ کون لوگ ہیں جو موت کے بعد اس قابل ٹھیریں گے کہ وہ جنت کی معیاری دنیا میں جگہ پائیں۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے موت سے پہلے کی زندگی میں، فکری اور عملی اعتبار سے، اپنے آپ کو جنت جیسی معیاری دنیا میں رہنے کا مستحق بنایا ہوگا۔

یہ جنت کا کم تر اندازہ ہے کہ کسی اور چیز کو جنت کی قیمت سمجھ لیا جائے۔ مثلاً یہ ماننا کہ کسی بزرگ کا دامن تھامنے سے جنت مل جائے گی، اِسی طرح کسی گروہ سے وابستہ ہونا، کچھ رسمی اعمال کر لینا، کسی مقدس مقام کی زیارت کر لینا، دین کے نام سے کسی دھوم کا مظاہرہ کرنا، حمد اور نعت کے لفظی ترانے اسٹیج پر گانا، اَوراد و وظائف میں مشغول رہنا، دین کے نام پر شان دار بلڈنگ بنانا، جلسے اور جلوس کے ہنگامے کھڑے کرنا، اسلام کو اپنے لیے فخر کی چیز بنا لینا، وغیرہ۔ اِس قسم کی کسی چیز کا کوئی تعلق جنت سے نہیں، اِس قسم کی کوئی بھی چیز آدمی کو ہرگز جنت میں لے جانے والی نہیں۔

جنت میں صرف وہ لوگ داخل کیے جائیں گے جو جنّتی شخصیت لے کر وہاں پہنچیں۔ جنتی شخصیت کو قرآن میں تزکیہ یافتہ شخصیت (purified personality) کہا گیا ہے (20: 76)۔ جنتی شخصیت وہ ہے جو جنت کے تقاضوں کی نسبت سے ایک تیار شدہ شخصیت (prepared personality) ہو۔ شخصیت کی یہ تیاری اِسی موجودہ دنیا میں ہوتی ہے۔ موجودہ دنیا میں مختلف قسم کے حالات اور تجربات کے دوران آدمی اپنے آپ کو پاکیزہ شخصیت بناتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو منفی جذبات سے بچا کر مثبت مزاج پر قائم رکھتا ہے۔ ناموافق حالات کے باوجود وہ اصول پسند بنا رہتا ہے، وہ انصاف کی روش سے کبھی نہیں ہٹتا۔ وہ اپنی خواہشوں پر کنٹرول کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو آزادی کے غلط استعمال سے بچاتا ہے۔ وہ کسی دباؤ کے بغیر دوسروں کا حق ادا کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ وہ دوسروں کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کو پورا کرتا ہے۔ نہ کوئی ناکامی اُس کو مایوس کرتی ہے اور نہ کوئی کامیابی اس کو سرکش بناتی ہے۔ یہی جنّتی شخصیت ہے، اور ایسے ہی لوگ جنت کے باغوں میں جگہ پائیں گے۔

سب سے بڑا مسئلہ

انسان کی زندگی ایک باشعور زندگی ہے۔ انسان ایک زندہ وجود ہے اور اسی کے ساتھ وہ اپنے زندہ ہونے کا شعور بھی رکھتا ہے۔ اس کا یہ شعور حسّاسیت (sensitivity) کی حد تک بڑھا ہوا ہے۔ انسان کامل درجے میں باشعور ہے اور اسی کے ساتھ وہ کامل درجے میں حسّاس بھی ہے۔ انسان کی اِس صفت کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس کو کوئی اچھا تجربہ ہو تو وہ بہت زیادہ خوش ہوتا ہے، اور اگر اس کو کوئی بُرا تجربہ پیش آئے تو وہ بہت زیادہ پریشان ہوجاتا ہے۔ خوشی اور غم دونوں قسم کے جذبات انسان کے اندر آخری انتہائی درجے تک پائے جاتے ہیں۔

انسان کے اندر یہ دونوں صفتیں پیدائشی طور پر پائی جاتی ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ آدمی بہت زیادہ جنت کا طالب بنے اور وہ بہت زیادہ جہنم سے ڈرنے والا بن جائے۔ کیوں کہ موت کے بعد ہر آدمی کا آخری ٹھکانہ یا تو جنت میں ہونے والا ہے، یا جہنم میں۔ جنت ابدی طور پر خوشیوں اور راحتوں کی جگہ ہے اور جہنم ابدی طور پر غم اور حسرت کی جگہ۔ آدمی اپنے عمل کے اعتبار سے دونوں میں سے کسی انجام تک لازماً پہنچنے والا ہے۔ اِس لیے ہر انسان کو اِس معاملے میں سب سے زیادہ فکر مند ہونا چاہیے۔ مگر عجیب بات ہے کہ انسان اِس سنگین ترین معاملے میں اُس حدیثِ رسول کی تصویر بنا ہوا ہے جو اِن الفاظ میں آئی ہے: **ما رأيتُ مثلَ الجنّة نامَ طالِبُهَا، ومارأيتُ مثلَ النّارِ نامَ هَارِبُهَا (الترمذی، کتاب صفةُ جهنّم)**۔ یعنی کیسی عجیب بات ہے کہ لوگ جنت جیسی قیمتی چیز کے طالب نہیں بنتے، اور کیسی عجیب بات ہے کہ لوگ جہنم جیسی خوف ناک چیز سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے۔

خدا کا خوف کوئی منفی چیز نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی معرفت جب اپنے آخری درجے میں پہنچتی ہے تو وہ خدا کا خوف بن جاتی ہے۔ ایسا آدمی بے پناہ حد تک جنت کا طالب بن جاتا ہے۔ اِسی کے ساتھ اُس کو ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ اگر خدا نے اس کے لیے جنت کا فیصلہ نہ کیا تو اس کا کیا حال ہوگا۔ یہ معرفت کا اعلیٰ درجہ ہے، اور اِسی اعلیٰ معرفت کا نام تقویٰ ہے۔

سفارش نہیں، استحقاق

بعد کے زمانے میں مسلمانوں میں بہت سی ایسی موضوع روایتیں رائج ہوئیں جو یہ بتاتی تھیں کہ جنت میں داخلے کا معاملہ سفارش (recommendation) پر مبنی ہے، نہ کہ استحقاق (merit) پر۔ مثلاً یہ کہ جس گھر میں ایک حافظ ہو، اس کی سفارش پر اس کے خاندان کے بہت سے لوگ جنت میں داخل کر دیے جائیں گے۔ اسی طرح پیغمبر کے بارے میں بہت سی موضوع روایتیں رائج ہوئیں۔ مثلاً: الصّالح للہ و الطّالح لي (نیک خدا کے لیے ہے، اور بد میرے لیے)۔ مگر یہ تمام روایتیں قطعی طور پر بے بنیاد ہیں، اسلام میں ان کی کوئی اصل نہیں:

It has no basis in fact.

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا مستحقینِ جنت کے انتخاب (selection) کی دنیا ہے۔ جنت میں صرف اُنھیں لوگوں کو داخلہ ملے گا جنھوں نے موجودہ دنیا میں اپنے عمل سے اس کا استحقاق ثابت کیا ہو۔ قرآن کی سورہ نمبر 53 میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں انسان کے لیے وہی ہے جس کے لیے اُس نے دنیا کی زندگی میں کوشش کی (53: 29)۔ اسی طرح قرآن کی سورہ نمبر 2 میں بتایا گیا ہے کہ آخرت کے دن کسی آدمی کے لیے نہ خرید وفروخت کام آئے گی اور نہ دوستی اور نہ سفارش (2: 254)۔

سفارش جیسی چیزوں کو جنت میں داخلے کا ذریعہ سمجھنا، جنت کی تصغیر (underestimation) ہے۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں تمام انسانوں کی زندگی کا اعمال نامہ (record) تیار کیا جا رہا ہے۔ جنت ایک اعلیٰ ترین مقام ہے، اور موجودہ دنیا کے ریکارڈ کی بنیاد پر اعلیٰ ترین انسانوں کو وہاں آباد کرنے کے لیے منتخب کیا جائے گا۔ قرآن کے مطابق، جنت وہ جگہ ہے جو خدائے برتر کے پڑوس میں بنے گی، اور جہاں سچے لوگ سچائی کی دنیا میں ابدی جگہ پائیں گے (54: 55)۔ جنت خدا کے پڑوس (66: 11) میں رہنے کا نام ہے۔ یہ تصور مضحکہ خیز حد تک بے اصل ہے کہ خدائے برتر کے پڑوس میں داخلہ کسی کو محض انسانی سفارش کی بنیاد پر حاصل ہو جائے۔

شخصیت کی تعمیر

قرآن کی سورہ نمبر 90 میں ارشاد ہوا ہے: **لقد خلقنا الإنسان فی کبد (البلد : 4)**
یعنی اللہ نے انسان کو مشقت (toil) میں پیدا کیا۔

قرآن کی اِس آیت میں مشقت (کبد) کا لفظ منفی مفہوم (negative sense) میں نہیں آیا ہے، بلکہ وہ مثبت مفہوم (positive sense) میں آیا ہے۔ اِس اعتبار سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اِس سے مراد جدوجہد (struggle) ہے۔

یعنی موجودہ دنیا میں انسان ایسی حالت میں رہتا ہے کہ اس کو زندگی کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے، وہ سخت محنت کے کورس سے گزرتا ہے۔ یہ انسانی شخصیت کی مثبت تعمیر کے لیے ضروری ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ — سہولت نہیں، بلکہ کوشش، آسانی نہیں، بلکہ مشکل وہ چیز ہے جو انسان کو انسان بناتی ہے:

It is not ease but effort, not facility but difficulty that make men.

انسان ابتدائی طور پر خام لوہا (ore) کے مانند ہے۔ لوہے سے مشین بنتی ہے، لیکن اس کے لیے لمبا عمل (process) درکار ہوتا ہے۔ خام لوہے کو آگ کی بھٹی سے گزرنا ہوتا ہے، اس کے بعد وہ اسٹیل بنتا ہے، پھر مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد وہ مشین کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔

یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ انسان امکانی طور پر اعلیٰ صلاحیت لے کر پیدا ہوتا ہے، لیکن اپنے فطری امکانات کو واقعہ بنانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے سخت مراحل سے گزرے۔ اِنھیں مراحل کے درمیان اس کا ذہنی ارتقاء ہوتا ہے، اس کے اندر وہ چیز پیدا ہوتی ہے جس کو پختگی (maturity) کہا جاتا ہے۔ زندگی کے سخت مراحل سے گزرے بغیر کوئی شخص اعلیٰ انسان نہیں بنتا۔ اِس دنیا میں ہر مشکل ایک چیلنج (challenge) ہے۔ یہ دراصل چیلنج ہی ہے جس کا سامنا کرنے کے بعد انسان اعلیٰ ترقی کے درجے تک پہنچتا ہے۔

جنت کی دعا

جنت کے لیے سب سے زیادہ موثر دعا کیا ہے، یہ وہ دعا ہے جو کسی ایسے پوائنٹ آف ریفرنس کے حوالے سے کی گئی ہو جو خدا کی رحمت کو انووک (invoke) کرنے والا ہو۔ دعا کی یہی وہ قسم ہے جس کو حدیث میں اسم اعظم کے ساتھ دعا کرنا بتایا گیا ہے۔ ایسی دعا کسی انسان کی زبان سے اُس وقت نکلتی ہے جب کہ وہ شب وروز اسی میں جی رہا ہو۔ مثال کے طور پر قرآن کی سورہ فاطر میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ ایمان جب جنت میں داخل کئے جائیں گے تو جنت کو دیکھ کر وہ کہیں گے: **الحمد لله الذي أذهب عنا الحزن** (35:34)۔

اِس آیت کو پڑھ کر آپ کا شعور آپ کو یاد لائے کہ موجودہ دنیا بھی جنت کی مانند ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ موجودہ دنیا جنت مع الحزن (paradise with sorrow) ہے، جب کہ آخرت کی جنت جنت بغیر الحزن (paradise without sorrow) ہوگی۔ پھر آپ کو یاد آئے کہ موجودہ حزن والی دنیا امکان کی مصلحت کی بنا پر ہر ایک کو دی گئی ہے، جب کہ آخرت کی بے حَزن دنیا صرف کچھ خوش قسمت انسانوں کو ملے گی۔ اب اِس تصور کو لے کر آپ قرآن کو پڑھیں اور پھر اِس آیت تک پہنچیں: **ألكم الذكر وله الأنثى، تلك إذاً قسمة ضيزىٰ** (53:21-22)۔

اِس آیت پر غور کرتے ہوئے آپ کو اپنا معاملہ یاد آئے اور آپ تڑپتے ہوئے الفاظ میں یہ کہیں کہ — خدایا، تو انسانوں کے لیے غیر منصفانہ تقسیم (unfair division) کو ناپسند کرتا ہے، پھر کیا تو خود ایسا کرے گا کہ دنیا کی زندگی میں تو مجھ کو حزن والی جنت دے اور آخرت میں برعکس معاملے کرتے ہوئے تو اُس جنت کو مجھ سے چھین لے، جب کہ کچھ اور لوگوں کے ساتھ تو ایسا کرے کہ دنیا میں اُن کو حزن والی جنت دے اور آخرت میں تو اُن کو حَزن سے خالی جنت عطا کردے۔ میں تجھ سے یہ امید کرتا ہوں کہ تو جس سلوک کو انسان کے لیے ناپسند کرتا ہے، اُس کو تو میرے معاملے میں اختیار نہیں کرے گا۔ تو نے جس طرح مجھ کو دنیا میں حزن والی جنت دی ہے، اِسی طرح تو مجھ کو آخرت میں حزن سے خالی جنت بھی عطا فرمادے۔

جنت کا تمدنی تعارف

قرآن کی سورہ محمد میں بتایا گیا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو آخرت کی دنیا میں جنت میں داخلے کے مستحق قرار پائیں گے۔ اِس سلسلے میں قرآن میں یہ آیت آئی ہے: **ویُدخلهم الجنة عرّفها لهم** (47:6) یعنی اللہ اُن کو جنت میں داخل کرے گا جس کی اُس نے اُنھیں پہچان کرادی ہے۔

اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی پہچان سے جنت میں داخلے کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔ موجودہ دنیا میں جو لوگ جنت کو پہچان کے درجے میں پالیں، وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت میں واقعہ کے طور پر جنت میں داخلے کے مستحق قرار پائیں گے۔

جس آدمی کی معرفت اتنی گہری ہو کہ وہ جنت کا حریص بن جائے، وہ جنت کے اشتیاق میں جینے لگے، ایسا آدمی اِسی دنیا میں جنت کا تعارف حاصل کرلیتا ہے۔ وہ دیکھنے سے پہلے جنت کو دیکھنے لگتا ہے۔ وہ داخلے سے پہلے جنت کا ادراک کرلیتا ہے۔

جنت کا یہ تعارف کسی آدمی کو ابتداءً قرآن کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ قرآن سے کسی آدمی کے اندر جنّتی غور وفکر کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اِس کے بعد جنت کے عملی تعارف کے لیے دو خاص ذریعے ہیں— فطری تعارف، اور تمدنی تعارف۔ فطری تعارف سے مراد وہ تعارف ہے جو مناظرِ فطرت کے ذریعے کسی انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ فطرت کے مناظر گویا کہ جنت کا بعید تعارف ہیں۔

جنت کا تمدنی تعارف پہلی بار موجودہ زمانے میں ممکن ہوا ہے۔ جدید تہذیب نے جو ترقی یافتہ دنیا بنائی ہے، وہ گویا کہ جنت کا تمدنی تعارف ہے۔ جدید تہذیب (modern civilization) کی پیدا کردہ مادی سہولتیں گویا کہ جنت کی پُر راحت دنیا کا ابتدائی تجربہ کرارہی ہیں۔ مناظرِ فطرت کے ذریعے گویا کہ خود خالق کی طرف سے جنت کے تعارف کا اہتمام کیا گیا ہے— انسان کے اندر اگر معرفت کا شعور بیدار ہو چکا ہو تو وہ مناظرِ فطرت میں جنت کے باغوں کو دیکھے گا، اور جدید تمدنی ترقیوں کے ماحول میں جنت کا ابتدائی مشاہدہ کرے گا۔

معرفت، جنت

دنیا میں آخری قابلِ یافت چیز معرفت ہے، اور آخرت میں آخری قابلِ یافت چیز جنت۔ معرفت کیا ہے، معرفت حقیقت اعلیٰ کو دریافت کرنے کا دوسرا نام ہے۔

حقیقتِ اعلیٰ کا علم بالقوہ طور پر (potentially) ہر آدمی کے اندر موجود ہے۔ اِسی بالقوہ کو بالفعل (actual) بنانے کا دوسرا نام معرفت ہے۔

جو آدمی دریافت کے اِس اعلیٰ درجے تک پہنچ جائے، اُس کو عارف (realized person) کہا جاتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو جنت میں بسائے جائیں گے۔ جنت دراصل دار العارفین ہے، جہاں یہ اصحابِ معرفت خدا کی رحمت سے، ابدی طور پر بسائے جائیں گے۔

معرفت محض ایک نظریاتی علم کا نام ہے— معرفت دراصل ایک فکری طوفان کا نام ہے، معرفت ایک ایسا انقلابی تجربہ ہے جو انسان کی شخصیت کی تشکیل میں سب سے بڑے عامل (factor) کی حیثیت رکھتا ہے۔ معرفت ہی کے ذریعے وہ اعلیٰ شخصیت بنتی ہے جو جنت کے اعلیٰ درجات میں بسائے جانے کے قابل ہو۔ قرآن میں جنت کو خداوندِ ذو الجلال کا پڑوس بتایا گیا ہے۔

ایسی لطیف اور نفیس جنت میں قیام کرنے کے قابل صرف وہ افراد ہوتے ہیں جو اس کے لیے موزوں بن سکیں۔ انسانی زبان میں یہ کہ وہ اعلیٰ درجے میں خدا شناس بن چکے ہوں۔ وہ خداوند عالم کے ہم ذوق ہوں۔ وہ اپنے اندر خدائی اخلاقیات رکھتے ہوں۔ وہ آخری حد تک نو پرابلم انسان (no problem) بن چکے ہوں، جو قرآن کے اِن الفاظ کا مصداق ہوں: **رضي الله عنهم، ورضوا عنه** (5: 119)۔

ایسے ہی لوگ اصحاب معرفت ہیں۔ ایسے ہی لوگ جنت کے دار العارفین میں عزت اور آرام کی جگہ پائیں گے۔ اِس کے برعکس، جو لوگ معرفت سے خالی ہوں، اُن کو رد کرکے کائنات کے ابدی کوڑے خانے میں ڈال دیا جائے، جہاں وہ حسرت کے عذاب کو بھگتتے رہیں گے۔

جنت: عطیۂ خداوندی

تمام حیوانات اپنی ضرورت کے مقام پر چل کر یا رینگ کر پہنچتے ہیں۔ مگر اس میں صرف ایک استثنا ہے اور وہ مچھلی کا استثنا ہے۔ مچھلی پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، مگر مچھلی کے اندر یہ طاقت نہیں کہ وہ رینگ کر یا چل کر پانی میں پہنچ جائے۔ وہ دریا کے کنارے تڑپتی رہے گی، لیکن خود سے وہ دریا کے اندر نہ جا سکے گی، الا یہ کہ کوئی شخص اس کو اٹھا کر پانی میں ڈال دے۔

یہ واقعہ تمثیل کی زبان میں ایک حقیقت کو بتاتا ہے، اور وہ جنت کا معاملہ ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی زیادہ صالح اور متقی ہو، مگر اس کا ذاتی عمل اس کو جنت میں نہیں پہنچا سکتا۔ کسی شخص کا جنت میں پہنچنا صرف اُسی وقت ممکن ہے جب کہ اللہ اپنی رحمت کے ذریعے اس کو جنت میں داخل کردے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو ایک حدیث میں اِن الفاظ میں بیان کی گئی ہے: **إنّه لا يدخل أحداً الجنة عمله۔ قالوا: ولا أنت يا رسول الله، قال: ولا أنا، إلا أن يتغمّدني اللّٰه بمغفرة ورحمة (صحيح البخاری، رقم الحديث: 5673)** یعنی بے شک کسی آدمی کا عمل اُس کو جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ صحابہ نے کہا، اے خدا کے رسول، کیا آپ بھی۔ آپ نے فرمایا ہاں، الا یہ کہ اللہ مجھے اپنی مغفرت اور رحمت سے ڈھانک لے۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی انسانی عمل جنت کی قیمت نہیں۔ انسانی عمل صرف اِس لیے ہے کہ وہ اللہ کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ اِسی لیے انسانی عمل میں سب سے بڑی چیز معرفتِ الٰہی ہے۔ معرفتِ الٰہی میں جو شخص پورا اترے گا، اللہ اس کی طرف متوجہ ہوگا اور اپنی عنایتِ خاص کے تحت اس کے لیے جنت میں داخلے کا فیصلہ فرمائے گا۔ جنت کسی کو اللہ کی عنایت سے ملے گی، نہ کہ اپنے عمل کی قیمت کے طور پر۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا چند سالہ عمل کبھی ابدی جنت کے برابر نہیں ہوسکتا۔ کوئی شخص جو اپنے عمل کو جنت کی قیمت سمجھے، اُس کا معاملہ آخرت میں اُس شخص جیسا ہوگا جس کے پاس صرف ایک پیسہ ہو اور وہ ہوائی جہاز خریدنے کے لیے پہنچ جائے۔

جنت اور انسان

جنت اور انسان ایک دوسرے کا مثنیٰ (counterpart) ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے تکمیلی (complementary) چیز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جنت انسان کے لیے بنائی گئی ہے اور انسان جنت کے لیے۔ حقیقت یہ ہے کہ — جنت مطلوبِ انسان ہے اور انسان مطلوبِ جنت۔ انسان کے بغیر جنت ادھوری ہے، اور جنت کے بغیر انسان ادھورا۔ یہ بات خود تخلیقی منصوبے میں شامل ہے کہ اِس دنیا میں جنتی انسان تیار ہوں جو جنت کی ابدی دنیا میں بسائے جاسکیں۔

قرآن کی سورہ النساء میں یہ آیت آئی ہے: **ما یفعل الله بعذابکم إن شکرتم و اٰمنتم، و کان الله شاکراً علیما** (4:147) یعنی اللہ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا، اگر تم شکرگزاری کرو اور ایمان لاؤ۔ اللہ بڑا اقدرداں ہے، وہ سب کچھ جاننے والا ہے۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے تخلیقی منصوبے کا تقاضا اِس طرح پورا نہیں ہوتا کہ لوگ بُرے اعمال کرکے اپنے آپ کو جہنم کا مستحق بنالیں۔ اللہ کا تخلیقی منصوبہ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنے آپ کو جنت کا مستحق ثابت کریں اور پھر آخرت میں پہنچ کر وہ جنت کے باغوں میں آباد ہوں۔

مفسر ابوالبرکات النسفی (وفات: 1310ء) نے مذکورہ آیت کی تشریح کے تحت لکھا ہے: **الإیمان: معرفة المنعم، والشکر: الاعتراف بالنعمة** (تفسیر النسفي، 1/259) یعنی ایمان، منعم کی معرفت ہے، اور شکر، نعمت کے اعتراف کا نام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے جُڑی ہوئی ہیں۔ ایمان کا مطلب یہ ہے کہ آدمی شعوری طور پر اپنے رب کو دریافت کرے، وہ مخلوق کے ذریعے خالق کا تعارف حاصل کرے۔ شکر کا مطلب خدا کی نعمتوں کا اعتراف ہے۔ اِس دنیا میں جو کچھ انسان کو ملا ہوا ہے، وہ سب خدائے برتر کا انعام (blessings) ہے۔ اِس انعام کے لیے دل سے منعم (giver) کا معترف ہونا، بلاشبہہ کسی انسان کے لیے سب سے بڑی عبادت کی حیثیت رکھتا ہے۔

جنت کے باغوں میں

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں اِس طرح آئی ہے: عن أنس قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا مررتم برياض الجنّة فارتعوا. قالوا: وما رياض الجنة. قال: حِلَق الذّكر (سنن الترمذي، رقم الحديث: 3431) یعنی حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم جنت کے باغوں سے گزرو تو چرنے کی کوشش کرو۔ سوال کیا گیا کہ جنت کے باغات کیا ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ذکر کے حلقے۔

اِس حدیث میں 'حِلَقُ الذکر' کا لفظ علامتی معنی (symbolic sense) میں ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہر جگہ تمھارے لیے جنتی تجربے کے مواقع موجود ہیں۔ اِن مواقع کو پہچانو اور اُن کو استعمال کرو۔ اِس طرح دنیا میں تمھاری پوری زندگی جنت کا تجربہ بن جائے گی:

Make your living in this world like living in the Paradise.

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا کو جنت کے متشابہ (similar) بنایا گیا ہے (2:25)، یعنی موجودہ دنیا میں وہ تمام اجزا محدود طور پر موجود ہیں جو جنت میں لامحدود طور پر موجود ہوں گے۔ موجودہ دنیا جنت کا امپرفیکٹ ورژن (imperfect version) ہے، اور جنت موجودہ دنیا کا پرفیکٹ ورژن (perfect version)۔ جس انسان کو موجودہ دنیا کی اِس متشابہ جنت حیثیت کی دریافت ہوجائے، وہ موجودہ دنیا میں جنت کا تجربہ کرنے لگے گا۔ اُس انسان کے لیے موجودہ دنیا گویا کہ جنت کی چراگاہ بن جائے گی، اُس کو موجودہ دنیا کے ہر تجربے میں جنت کی غذا ملنے لگے گی۔

یہ سارا معاملہ ایمانی شعور کی بیداری کا معاملہ ہے۔ جس آدمی کے اندر ایمانی شعور پوری طرح بیدار ہوجائے، اُس کا یہ حال ہوجائے گا جیسے کہ وہ جنت کے باغوں میں واک (walk) کر رہا ہے۔ ایسے آدمی کے لیے موت کا مطلب یہ ہوگا جیسے کہ کوئی شخص اپنے گھر کے ایک کمرے سے نکل کر اس کے دوسرے کمرے میں داخل ہوجائے۔

جنت کا انعام

موجودہ دنیا اور آخرت کی دنیا کا فرق یہ نہیں ہے کہ موجودہ دنیا میں ''نماز روزہ'' کرو اور اپنی خاص طرح کی شناخت (identity) بنالو اور اس کے بعد آخرت میں جنت کا انعام حاصل کرو۔

اصل یہ ہے کہ اہلِ ایمان کو موجودہ دنیا میں اپنے اندر مزکّی شخصیت (purified personality) بنانا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ملے گا کہ وہ جنت کی پر کیف سرگرمیوں (joyful activities) میں پُر اعزاز کردار (role) ادا کرنے کے لیے منتخب کئے جائیں گے۔

جنت صرف ایک عیش کدہ نہیں ہے، بلکہ جنت پر مسرت سرگرمیوں کا ایک وسیع مقام ہے۔ اِن سرگرمیوں کو ایک لفظ میں، ربانی سرگرمیاں (devine activites) کہا جاسکتا ہے۔

موجودہ دنیا میں انسان کی سرگرمیاں محدود مادی سرگرمیاں (material activities) تھیں۔ آخرت کی جنت میں انسان کی سرگرمیاں لامحدود ربانی سرگرمیاں ہوں گی جو ابدی طور پر بلا انقطاع جاری رہیں گی۔

جنت کی یہ اعلیٰ سرگرمیاں منتخب ربانی افراد، فرشتوں کی مدد سے انجام دیں گے۔ اِن سرگرمیوں کے دوران جنتیوں کو اعلیٰ دریافتیں ہوں گی، ان کو اعلیٰ روحانی تجربات ہوں گے، ان کو اعلیٰ مشاہدات حاصل ہوں گے، وہ وہاں اعلیٰ صحبتوں کا ماحول پائیں گے، وہ ایک کائناتی ماحول میں اعلیٰ ربانی کارنامے انجام دیں گے، وہ جنت میں نعمت اور اقتدار (76:20) کے اُن اعلیٰ درجات کا تجربہ کریں گے جن کا اِس دنیا میں تصور نہیں کیا جاسکتا۔

اِسی حقیقت کو ایک حدیثِ رسول میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **فیھا ما لا عین رأت، ولا أذن سمعت، ولا خطر علی قلب بشر (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 7310)** یعنی جنت کے اندر وہ چیز ہوگی جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال گزرا۔

جنت کیا ہے

ایک نوجوان کو جدید طرز کی لگزری کار (luxury car) ملی۔ وہ اُس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ جب وہ اس لگزری کار کے اندر داخل ہو کر اس کی آرام دہ سیٹ پر بیٹھا تو اُس نے کہا— میں اپنے آپ کو بادشاہ کی طرح محسوس کر رہا ہوں:

I feel like a king.

دوسرا انسان وہ ہے جس نے اِس جدید طرز کی لگزری کار کو دیکھا تو وہ یہ سوچ کر حیرانی میں پڑ گیا کہ کیا زبردست وہ انجینئرنگ مائنڈ (engineering mind) ہوگا جس نے اس شان دار کار کا منصوبہ بنایا اور پھر اس کو عملاً تیار کرلیا۔

اِس مثال میں پہلا انسان اپنی ذات میں جی رہا ہے، اور دوسرا انسان انجینئر کی ذات میں۔ پہلا انسان کار میں خوش ہے، اور دوسرا انسان کار بنانے والے کے کمالات کا اعلیٰ اعتراف کر رہا ہے۔

اِس مثال سے جنت کے معاملے کو سمجھا جاسکتا ہے۔ جنت میں داخل ہونے والے دو قسم کے لوگ ہوں گے— ایک وہ جو جنت کی نعمتوں کو پا کر خوش ہوں، جو جنت کی پُر راحت زندگی میں گم ہو جائیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مخلص شخصیت کے حامل تھے، لیکن وہ اعلیٰ معرفت کے درجے کو نہ پہنچ سکے۔

دوسرے اہل جنت وہ ہیں جو اعلیٰ معرفت کی سطح پر مومن بنے ہوں۔ یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے تو وہ جنت بنانے والے کے کمالات میں سرشار رہیں گے۔ وہ سوچیں گے کہ وہ خدا کتنی قدرت والا خدا ہے جس نے انسان کے اندر لذت کا احساس پیدا کیا اور پھر لذت کے تمام سامانوں کی تخلیق کی اور پھر جنت کی وہ آئڈیل دنیا بنائی جہاں احساس لذت اور سامانِ لذت دونوں اکھٹا ہوں اور وہ ابدی طور پر خوف اور حُزن سے خالی زندگی گزارتے رہیں۔ احساسِ لذت اور سامانِ لذت دونوں، خدا کی تخلیق ہیں۔ اِسی طرح جنت بھی خدا کی ایک تخلیق ہے۔ جنت کا تجربہ بلا شبہہ خدا کی معرفت کا اعلیٰ تجربہ ہوگا۔ جنت کی معرفت اس کا اولین پہلو ہے، اور جنت کی راحت اس کا ثانوی پہلو۔

امپرفیکٹ جنت، پرفیکٹ جنت

موجودہ زمین پر وہ تمام چیزیں موجود ہیں جن کا وعدہ قرآن میں جنت کے لیے کیا گیا ہے۔ پھر دونوں میں فرق کیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ موجودہ دنیا امپرفیکٹ دنیا (imperfect world) ہے، اور جنت پرفیکٹ دنیا (perfect world)۔ اِسی معنی میں موجودہ دنیا کی نعمتوں کو قرآن میں جنت کی نعمتوں کے مشابہ (similar) بتایا گیا ہے (2:25)۔

بظاہر موجودہ دنیا میں انسان کی تمام پسندیدہ چیزیں موجود ہیں۔ مگر موجودہ دنیا میں یہ چیزیں چکھنے کے لیے ہیں، وہ سیر ہونے کے لیے نہیں، یہاں وہ صرف بقدرِ ذائقہ (taste) ہیں۔ جہاں تک فل فل مینٹ (fulfilment) کی بات ہے، وہ صرف آخرت کی جنت میں اُن سچے انسانوں کو ملے گا جو جنت کے داخلے کے لیے منتخب کئے جائیں گے۔

یہ نہایت عجیب بات ہے کہ وسیع کائنات میں صرف انسان ہے جس کے اندر ذائقہ (taste) کا تصور پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر حیوانات کے منہ میں بھی زبان ہوتی ہے، لیکن حیوانات کی زبان میں وہ ذائقہ خانے (taste buds) نہیں ہوتے جو انسان کی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ دوسری تمام لذتوں کا ہے۔

انسان کے اندر خصوصی طور پر اِس قسم کی صلاحیت کا ہونا بتاتا ہے کہ تمام مخلوقات میں صرف انسان ہے جس کو جنت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ جنت انسان کے لیے ہے اور انسان جنت کے لیے۔ انسان کو خصوصی طور پر یہ موقع دیا گیا ہے کہ وہ جنت کی نعمتوں کا جزئی تجربہ کرے اور پھر وہ جنت کی اعلیٰ نعمتوں کا حریص بنے۔

انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی اِس خصوصی حیثیت کو دریافت کرے اور اِس امکان کو اپنے لیے واقعہ بنانے کی کوشش کرے۔ یہی انسانی کامیابی کا واحد معیار ہے۔ اِس معاملے میں جو شخص کامیاب ہوا، وہ کامیاب ہے، اور جو شخص اِس معاملے میں ناکام ہوا، وہ ناکام۔

زمین کی وراثت

مچھلی ایک زندہ حیوان ہے۔ مچھلی اپنے آپ میں ایک مکمل وجود ہے، لیکن مچھلی کو زندہ رہنے کے لیے ایک مَوطِن یا فطری جائے رہائش (habitat) درکار ہے۔ مچھلی کو اگر پانی سے نکال کر صحرا (desert) میں ڈال دیا جائے تو وہ بدستور مچھلی ہوگی، لیکن وہاں وہ صرف تڑپتی رہے گی۔ صحرا کے ماحول میں اس کو زندگی کی نعمت حاصل نہ ہوسکے گی۔ یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان مکمل معنوں میں ایک زندہ وجود ہے۔ لیکن حقیقی معنوں میں زندہ رہنے کے لیے اس کو ایک موطِن (habitat) درکار ہے۔ موجودہ زمین انسان کے لیے اِسی قسم کا ایک موطن ہے۔ انسان کرۂ ارض پر ہی حقیقی معنوں میں زندہ رہ سکتا ہے اور ترقی کرسکتا ہے۔ انسان کو اگر موجودہ زمین سے نکال کر چاند جیسے کسی کرہ پر ڈال دیا جائے تو انسان وہاں بے آب مچھلی کی طرح تڑپے گا۔ وہ ایک قسم کی زندہ لاش بن کر رہ جائے گا۔

موجودہ دنیا انسان کے لیے ایک ایسا معلوم واقعہ ہے جس کی روشنی میں وہ جنت اور جہنم کے معاملے کو پوری طرح سمجھ سکتا ہے۔ غور کیجئے تو موجودہ زمین میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جن کو جنت کی صفت بتایا گیا ہے۔ مثلاً یہاں کے قدرتی مناظر میں اتنا حسن ہے کہ آدمی جب اس کو دیکھتا ہے تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ دور سے جنت کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں اچھے انسانوں کے ساتھ برے انسان بھی آباد ہیں۔ یہ برے انسان زمین کو ہر قسم کے فساد سے بھر دیتے ہیں۔ اگر ایسا ہو کہ زمین سے برے انسان نکال دئے جائیں اور صرف اچھے لوگ یہاں آباد ہوں تو یہ زمین جنت کا نمونہ بن جائے گی۔ یہی بات ایک اسرائیلی پیغمبر کی زبان سے اِن الفاظ میں آئی ہے:

> دنیا کے آخر میں فرشتے نکلیں گے اور شریروں کو راست بازوں سے جدا کریں گے اور اُن کو آگ کی بھٹی میں ڈال دیں گے۔ وہاں رونا اور دانت پیسنا ہوگا (متی 50-49 :13)

یہی بات حضرت داؤد کے مزامیر میں اس طرح آئی ہے:

> صادق زمین کے وارث ہوں گے۔ اور وہ اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے۔ (زبور 29 :37)

فطرت میں تضاد

وسیع کائنات میں صرف ایک سیارہ ہے جو انسانی زندگی کے لیے سازگار ہے۔ یہ سیارہ زمین ہے۔ حال میں امریکا کے ایک سائنسی ادارے نے تحقیق کر کے بتایا ہے کہ انسان جس طرح زمین کے وسائل کو استعمال کر رہا ہے، اِس رفتار کے مطابق، موجودہ زمین 2030 تک انسان کے لیے ناقابلِ رہائش ہوجائے گی۔ اِس کے بعد زمین پر لائف سپورٹ سسٹم کا موجودہ نظام اتنا زیادہ بگڑ جائے گا کہ یہاں انسان اور زندگی کی دوسری انواع کا تقریباً خاتمہ ہوجائے گا۔ اِس معاملے کا ایک سنگین نظریاتی پہلو ہے۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے لامحدود خواہشیں رکھتا ہے، لیکن اِس کائنات میں جو واحد دنیا انسان کو رہنے کے لیے ملی ہے، وہ صرف محدود ذرائعِ حیات کی حامل ہے۔ دونوں کے درمیان یہ تضاد اب ایک ثابت شدہ حقیقت بن چکا ہے۔

جس خالق نے انسان کو بنایا ہے، وہی خالق زمین کو بنانے والا بھی ہے، پھر ایک ہی خالق کی دو مخلوق کے درمیان یہ تضاد کیوں۔ یہ تضاد آخرت کے تصور کے حق میں ایک واضح دلیل ہے۔ اِس فرق کی توجیہہ اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ خالق نے انسان کی زندگی کو دو دوروں میں تقسیم کر دیا ہے— موت سے پہلے کے دورِ حیات کے لیے خالق نے موجودہ زمین بنائی، اور موت کے بعد کے دورِ حیات کے لیے خالق نے ایک اور دنیا تعمیر کی جس کو آخرت (hereafter) کی دنیا کہا جاتا ہے۔

تضاد کے اِس معاملے کی توجیہہ خالق کے تخلیقی پلان سے ملتی ہے۔ خالق کا تخلیقی پلان یہ ہے کہ موجودہ غیر معیاری دنیا میں ہر عورت اور مرد کو آباد ہونے کا موقع ملے، لیکن آخرت کی معیاری دنیا میں صرف اُن لوگوں کو بسایا جائے جو موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو اُس کا اہل ثابت کریں۔ موجودہ دنیا میں یہی انتخاب ہو رہا ہے۔ آخری فیصلہ لوگوں کے اپنے قول وعمل کے ریکارڈ کے مطابق ہوگا۔ دانش مند وہ ہے جو اپنے آپ کو آخرت کی معیاری دنیا میں بسائے جانے کا اہل ثابت کرے۔ نادان وہ ہے جو موجودہ موقع کو غفلت میں ضائع کر دے اور آخر میں اس کے پاس حسرت اور افسوس کے سوا کچھ اور باقی نہ رہے۔

زیادہ بڑا ایمپائر

ایک صاحب کے یہاں اعلیٰ صلاحیت کا ایک بیٹا پیدا ہوا۔ اس کے غیر معمولی اوصاف کو دیکھ کر باپ نے کہا کہ — میرا بیٹا مستقبل میں ایک ایمپائر بنائے گا:

My son will be an empire builder.

باپ کا یہ اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ بیٹا جب بڑا ہوا تو اس نے ایک بزنس شروع کیا۔ اس کی خداداد صلاحیت کی بنا پر اس کے کام میں غیر معمولی ترقی ہوئی، یہاں تک کہ وہ اپنا ایک بزنس ایمپائر بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ لیکن یہ ایمپائر زیادہ دن تک اس کا ساتھ نہ دے سکا۔ آخر کار ایک محدود مدت کے بعد وہ بھی مر کر اس دنیا سے اُسی طرح چلا گیا جس طرح دوسرے لوگ اِس دنیا میں آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔

یہ مادی ایمپائر (material empire) کی بات ہے۔ مادی ایمپائر صرف مختصر مدت تک آدمی کا ساتھ دیتا ہے، لیکن یہاں ایک اور ایمپائر ہے جو ہمیشہ کے لیے آدمی کے ساتھ رہتا ہے۔ یہ فکری ایمپائر (intellectual empire) ہے۔ فکری ایمپائر سے مراد ہے — ذہنی ارتقا، روحانی دریافت، شخصیت کی تعمیر، انسانی امکانات (potentials) کو واقعہ (actual) بنانا۔ یہی وہ انسان ہے جس کو مذہب کی زبان میں ربانی انسان کہا جاتا ہے۔

ربانی انسان وہ ہے جو اپنے خالق کو دریافت کرے، جو اپنی عقلی صلاحیتوں کو استعمال کرکے خدا کی معرفت حاصل کرے، جو خدا کے تخلیقی پلان کو جانے اور اس کے مطابق، اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کرے، جو اپنے آپ کو جنتی کردار والا انسان بنائے، ایسا انسان جس کو موت کے بعد کی دنیا میں ابدی جنت میں بسایا جائے گا۔ دوسرے لوگ اگر مادی دنیا میں اپنا ایک خارجی ایمپائر بناتے ہیں تو ایسا شخص خود اپنے اندر ایک داخلی ایمپائر بناتا ہے۔ مادی ایمپائر صرف کچھ مدت تک کسی آدمی کا ساتھ دیتا ہے، لیکن روحانی ایمپائر (spiritual empire) وہ ہے جو ہمیشہ ہمیشہ تک کسی آدمی کو حاصل رہے گا۔ اول الذکر اگر وقتی خوشی کا ذریعہ ہے تو ثانی الذکر ابدی خوشی کا ذریعہ۔

دنیا اور آخرت کا فرق

موجودہ دنیا انسان کے چارج میں دی گئی ہے۔ یہاں کی تمام سرگرمیاں انسان کے ذریعے انجام پاتی ہیں۔ موجودہ دنیا انسانی تعلقات پر مبنی ہے۔ براہِ راست یا بالواسطہ طور پر تمام عورت اور مرد ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہاں ایک کا کام دوسرے سے بنتا ہے۔ یہی اجتماعیت خاندان اور سماج اور قوم تینوں سطح پر قائم ہے۔

مگر آخرت کی دنیا اِس سے بالکل مختلف ہوگی۔ آخرت کی دنیا میں بھی آج کی طرح سب کچھ ہوگا، لیکن آخرت کی دنیا کے انچارج فرشتے ہوں گے۔ آخرت کی دنیا میں اہلِ جنت کو انعام ملے گا، اور اہلِ جہنم کو سزا۔ لیکن دونوں صورتوں میں انتظامی بندوبست مکمل طور پر فرشتوں کے ہاتھ میں ہوگا۔

موجودہ دنیا میں آدمی دیکھتا ہے کہ اس کا کام بنانے کے لیے ہر جگہ اُس کو انسان مل جاتے ہیں۔ ہر سطح پر ایسے افراد مل جاتے ہیں جو ایک دوسرے کا کام انجام دیتے رہیں۔ موجودہ دنیا کی یہ صورتِ حال آدمی کو غفلت میں مبتلا رکھتی ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھتا رہتا ہے کہ موجود دنیا میں جس طرح اُس کا کام رشتے داروں اور غیر رشتے داروں کے ذریعے انجام پا رہا ہے، اِسی طرح آخرت میں بھی اس کے تمام کام انجام پاتے رہیں گے۔

مگر یہ سخت قسم کی غلط فہمی ہے۔ آخرت کی دنیا میں وہ تمام انسانی تعلقات ٹوٹ جائیں گے جو آج ہر سطح پر نظر آرہے ہیں۔ آخرت کے تمام کام فرشتے انجام دیں گے۔ یہ فرشتے صرف وہی کریں گے جس کا خدا نے اُن کو حکم دیا ہے (**ویفعلون ما یُؤمرون**) ۔

یہ صورت حال بے حد سنگین ہے۔ موجودہ دنیا کی حالت پر قیاس کرتے ہوئے آدمی یہ سمجھتا رہتا ہے کہ آخرت میں بھی اس کو اپنے آدمی مل جائیں گے جو اس کا کام بنادیں گے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے تمام اپنے لوگ وہاں اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہوں گے۔ وہاں ہر انسان اپنے آپ کو اکیلا پائے گا۔ وہاں فرشتوں کے سوا کوئی اور نہ ہوگا جو اس کا کام بنائے۔

جنت: مادّی یا روحانی

ایک بار مولانا سید سلیمان ندوی (وفات: 1953) اور ڈاکٹر محمد اقبال (وفات: 1938) کے درمیان ایک مسئلے پر بحث ہوئی۔ مسئلہ یہ تھا کہ جنت مادی ہے یا روحانی۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا کہنا تھا کہ جنت مادی ہے۔ اور ڈاکٹر محمد اقبال کا خیال تھا کہ جنت روحانی ہے۔ جب دونوں میں اتفاق نہ ہوسکا تو مولانا سید سلیمان ندوی نے یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ — ٹھیک ہے، آپ اپنی روحانی جنت میں جائیں گے اور ہم اپنی مادی جنت میں جائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ جنت روحانی بھی ہے اور مادی بھی۔ جنت محض ایک عیش کدہ نہیں ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے: وأتوا به متشابها (2:25) یعنی موجودہ دنیا کی سرگرمیوں کی طرح جنت کی دنیا بھی کامل طور پر سرگرمیوں کی دنیا ہوگی۔ البتہ یہ سرگرمیاں شغلِ فاکہ (36:55) کی صورت میں ہوں گی، یعنی پر مسرت سرگرمیاں (joyful activities)۔ یہ سرگرمیاں ہر قسم کی اُن سرگرمیوں پر محیط ہوں گی جن کو ذہنی اور فکری سرگرمیاں (intellectual activites) کہا جاتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جنت میں مادی نعمتیں بھی ہوں گی۔ یہ نعمتیں اہلِ جنت کو خدا کی طرف سے ضیافت (hospitality) کے طور پر ملیں گی، جیسا کہ قرآن کی سورہ حم السجدہ میں آیا ہے: **نُزلاً من غفورٍ رحیم:**

As a rich hospitality from one who is everforgiving and most merciful (41:32)

جنت میں اہلِ جنت پُر مسرت قسم کی اعلیٰ ربانی سرگرمیوں میں مصروف ہوں گے۔ یہ سلسلہ ابد تک جاری رہے گا۔ اِس طرح جنت میں اہلِ جنت کو یہ موقع ملے گا کہ وہ اپنی لامحدود صلاحیتوں کو مکمل طور پر استعمال کرسکیں۔ مادی نعمتوں کے لیے انھیں مزید کچھ نہیں کرنا ہوگا۔

اہلِ جنت کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے مہمان کی ہوگی اور ان کو ہر قسم کا سامانِ ضیافت اللہ کی طرف سے فراہم کیا جاتا رہے گا۔

جنت کا تصور

توفیق الحکیم (وفات: 1987) مصر کے معروف ادیب تھے۔ خود اپنے بیان کے مطابق، وہ فکری تضاد میں مبتلا تھے۔ انھوں نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ: **إني أعيش في الظاهر كما يعيش الناس في هذه البلاد۔ أما في الباطن، فما زالت الهتي وعقائدي ومثلي العُليا۔ كل آلامي مرجعها هذا التناقض بين حياتي الظاهرة وحياتي الباطنة** (بظاہر میں ایسی ہی زندگی گزار رہا ہوں جیسا کہ عام لوگ اِن شہروں میں زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن میرے باطن میں میرے کچھ معبود وعقائد اور بلند آئڈیلز ہیں۔ میرے سارے کرب کا سبب میری ظاہری اور باطنی زندگی کا یہی تناقص ہے)۔

توفیق الحکیم نے لکھا ہے کہ: **إني لا أستطيع أن أعيش في جنة لا أطّلع فيها** (''أنا'' **لعباس محمود العقّاد**، صفحہ 126) یعنی اگر جنت میں مجھ کو اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کا موقع نہ ملا، تو ایسی جنت میں قیام میرے لیے ناممکن ہو جائے گا۔

توفیق الحکیم اور اِس طرح کے دوسرے لوگوں کے ذہن میں جنت کا جو تصور ہے، وہ یہ کہ جنت صرف ایک عیش کدہ ہے۔ ذہین انسان کو اِس قسم کا تصورِ جنت زیادہ اپیل نہیں کرتا، کیوں کہ جسمانی راحت کے علاوہ، انسان کی ایک اور ضرورت ہے، اور وہ عقلی تسکین ہے۔ ہمارے علماء اور واعظین عام طور پر جنت کا جو تصور دیتے ہیں، اُس میں یہ ہوتا ہے کہ جنت میں آرام وراحت کا سامان تو وافر مقدار میں ہوگا، لیکن وہاں عقل ودانش کی تسکین کا کوئی سامان نہیں ہوگا۔ جدید ذہن کو جنت کا یہ تصور اپیل نہیں کرتا۔ وہ اس کو اپنی حقیقی طلب سے کم تر سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جنت میں آرام وراحت کا سامان تو صرف اہلِ جنت کی ضیافت کے لیے ہوگا۔ اہلِ جنت کا اصل مشغلہ تو یہ ہوگا کہ وہ کلمات اللہ (31:27) کو اَن فولڈ کر کے ایک برتر تہذیب (super civilization) کو وجود میں لائیں گے۔ یہ ایک ربانی تہذیب (divine civilization) یہ ایک پُرمسرت ذہنی اور فکری سرگرمی (intellectual activities) کا دور ہوگا جو ابدی طور پر جاری رہے گا۔

احساسِ ابدیت

انسان کو اس کے پیدا کرنے والے نے احساسِ ابدیت (sense of eternity) کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس کے جینٹک کوڈ (genetic code) میں موت (death) کا اندراج نہیں۔ اپنی فطرت یا اپنے لاشعور کے اعتبار سے انسان اِس احساس میں جیتا ہے کہ پیدا ہونے کے بعد اب وہ ابدی ہو چکا ہے۔ اُس پر موت وارد ہونے والی نہیں۔

حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ ہر پیدا ہونے والے انسان کو ایک دن مرنا ہے، مگر انسان کا داخلی احساس یہ ہوتا ہے کہ میں اپنی تخلیق کے اعتبار سے ایک ابدی وجود کی حیثیت رکھتا ہوں۔

یہ دوطرفہ تقاضا ہر عورت اور ہر مرد کو ایک بے حد نازک امتحان میں مبتلا کر دیتا ہے، یعنی احساسِ ابدیت کے باوجود احساسِ موت میں جینا۔ اپنے آپ کو ابدی مخلوق (eternal being) سمجھتے ہوئے اِس یقین میں جینا کہ میں لازماً ایک دن مر جاؤں گا، موجودہ دنیا میں ہمیشہ کے لیے رہنا میرے لیے مقدر نہیں۔

یہ احساسِ ابدیت ایک اعتبار سے ایک عظیم نعمت ہے۔ یہ احساس آدمی کو یہ یقین عطا کرتا ہے کہ وہ کائنات کی دوسری چیزوں کے برعکس، ایک دوامی وجود ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کو یہ کرنا ہے کہ وہ موت اور محاسبۂ آخرت کو مسلسل طور پر یاد رکھے۔ اِس دوطرفہ تقاضے میں جینا بلا شبہ سب سے زیادہ سخت امتحان ہے۔ جنت میں وہ انسان داخل ہوگا جو اِس نازک امتحان میں پورا اترے۔

اگر آدمی باشعور ہو تو یہ دوطرفہ احساس اس کے لیے اس کی شخصیت کے ارتقا کا سب سے بڑا ذریعہ بن جائے گا۔ اپنی ابدیت کو سوچ کر وہ خدا کا بے حد شکر گزار بن جائے گا کہ اس کے خالق نے اس کو ابدیت کی عظیم نعمت عطا فرمائی۔ دوسری طرف، موت اور محاسبۂ آخرت کا معاملہ مسلسل طور پر اس کی اصلاح کا سبب بنا رہے گا۔ ایک طرف وہ خدا کا شکر گزار بندہ ہوگا اور دوسری طرف خدا کے خوف میں جینے والا بندہ بھی۔ روحانی تزکیہ یا تعمیر شخصیت کا اِس سے بڑا اور کوئی ذریعہ نہیں۔

ایک استثنائی معاملہ

وسیع خلا میں بے شمار مخلوقات ہیں— ستارے اور سیارے، سورج اور چاند، دریا اور پہاڑ، درخت اور حیوانات، وغیرہ۔ اِن میں سے کوئی بھی نہیں جس کا معاملہ موت اور آخرت کا معاملہ ہو۔ انسان ہمیشہ سے کائنات کا مطالعہ کرتا رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں دور بین (telescope) اور خوردبین (microscope) نے اِس مطالعہ اور مشاہدہ کا دائرہ بہت وسیع کردیا ہے۔

اِس وسیع کائنات میں صرف انسان ہے جس کا معاملہ استثنائی طور پر یہ ہے کہ وہ ایک وقتِ خاص میں مرتا ہے اور اس کے بعد وہ آخرت کے عالم میں اپنی اگلی زندگی شروع کرتا ہے۔ یہ آخرت کی دنیا بر وقت نا قابلِ مشاہدہ ہے۔ یہ نا قابلِ مشاہدہ دنیا صرف اُس وقت کسی کے لیے قابلِ مشاہدہ بنتی ہے جب کہ بالفعل وہ اپنے اِس دوسرے دورِ حیات میں داخل ہو چکا ہو۔

موت اور آخرت کا یہ استثنائی معاملہ انسان کا بلا شبہہ سب سے بڑا امتحان ہے۔ مشاہدہ اور تجربہ کا جو عام انسانی اصول ہے، اس کے تحت کوئی شخص موت اور آخرت کے مسئلے کو سمجھ نہیں سکتا۔ موت اور آخرت کے تصور کو ذہن میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر تجریدی فکر (detached thinking) کی صلاحیت موجود ہو۔ وہ عام مشاہداتی اصول سے اوپر اٹھ کر سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ صرف اِسی قسم کی استثنائی صلاحیت رکھنے والے شخص کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ موت اور آخرت کے معاملے کو دریافت کرے اور اس کے مطابق، اپنی زندگی کا منصوبہ بنائے۔

موت اور آخرت کے اسی استثنائی پہلو کی بنا پر ایسا ہے کہ لوگ موت اور آخرت کے حقیقی شعور سے محروم رہتے ہیں، موت اور آخرت کا معاملہ اُن کے شعور کا غالب حصہ نہیں بنتا۔ موت اور آخرت کے معاملے کو یا تو وہ مانتے نہیں، یا وہ صرف اس کو رسمی طور پر مانتے ہیں، اور رسمی طور پر ماننے کا کوئی فائدہ نہیں۔ موت اور آخرت کو ماننا وہی ماننا ہے جو آدمی کے اندر آخرت رخی سوچ (Akhirat-oriented thinking) پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائے۔

دنیا اور آخرت

دنیا کا مطلب ہے آج میں جینا، آخرت کا مطلب ہے کل میں جینا۔ دنیا کا مطلب ہے قبل از موت زندگی کی فکر کرنا، آخرت کا مطلب ہے بعد از موت زندگی کی تیاری کرنا۔ دنیا کا مطلب ہے حال کی تعمیر اور آخرت کا مطلب ہے مستقبل کی تعمیر۔

کسی انسان کے لیے زندگی کی دو قسمیں ہیں — دنیا پرستانہ زندگی اور آخرت پسندانہ زندگی۔ دنیا پرستانہ زندگی یہ ہے کہ آدمی دنیا کی ترقی کو اپنا مقصد بنائے۔ اس کی دلچسپی صرف دنیا کی چیزوں سے ہو۔ وہ دنیا کی کامیابی کو کامیابی سمجھے اور دنیا کی ناکامی کو ناکامی۔ اس کا دماغ صرف دنیا کو لے کر سوچے اور اس کا دل دنیا کے معاملات میں اٹکا ہوا ہو۔

دنیا پرست انسان وہ ہے جس کی محبت بھی دنیا کے لیے ہو اور اس کی نفرت بھی دنیا کے لیے۔ وہ دنیا کی چیزوں کے ملنے پر خوش ہوتا ہو اور جب دنیا کی چیزیں نہ ملیں تو وہ مایوس ہو جائے۔ دنیا میں کوئی عزت کا مقام پانا، اُس کے اندر فخر (pride) کا جذبہ پیدا کرے اور دنیا میں بے عزتی کا تجربہ اس کو منفی احساس (negativity) میں مبتلا کر دے۔

آخرت پسندانہ زندگی کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ آخرت پسند انسان وہ ہے جس کا واحد کنسرن (sole concern) صرف آخرت بن جائے، جو ہر وقت آخرت کے بارے میں سوچے، جو موت کے بعد آنے والے واقعات پر فکر مند رہتا ہو، جو میدانِ حشر میں پیش آنے والے محاسبہ (accountability) کو یاد کرتا رہے۔

آخرت پسند انسان وہ ہے جس کے ذہن پر آخرت کا احساس اتنا زیادہ چھا جائے کہ دنیا کی ہر چیز اُس کو بے قیمت معلوم ہونے لگے، جو آخرت کی جنت کا حریص ہو اور آخرت کی جہنم کی یاد اس کو بے چین کر دے، جو قیامت سے پہلے قیامت کو دیکھ لے، جو میدانِ حشر میں اللہ کے سامنے کھڑا ہونے سے پہلے اپنے آپ کو اللہ کے سامنے کھڑا ہوا پائے۔

ملنے سے محروم

دریا کے دو ساحل ہوتے ہیں، لیکن وہ ایک دوسرے کے ساتھ ملنے سے محروم رہتے ہیں۔ تقریباً یہی حال انسان کا ہے۔ انسان کو اُس کے پیدا کرنے والے نے بے شمار خواہشات (desires) کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ دوسری طرف، اِس دنیا میں خواہشات کی تکمیل کا سامان بھی وافر مقدار میں موجود ہے، لیکن کوئی انسان اپنی خواہشات کی تکمیل (fulfilment) نہیں کر پاتا، یہاں تک کہ وہ مر جاتا ہے۔ گویا کہ ایک طرف، خواہشات کی دنیا (world of pleasure) ہے جس کے اوپر لکھا ہوا ہے— نو ٹیکر (no taker)۔ دوسری طرف انسان کی دنیا ہے جو خاموش زبان میں یہ کہہ رہی ہے کہ:

water water everywhere, not a drop to drink.

یہ متضاد صورتِ حال (contradictory situation) ہزاروں سال سے جاری ہے۔ ہر ایک شعوری یا غیر شعوری طور پر اِس سوال کا جواب جاننا چاہتا ہے، لیکن کسی کو اِس کا جواب معلوم نہیں۔ اِسی کا ایک اظہار یہ ہے کہ ہر مقبول ناول جو لکھا گیا ہے، وہ المیہ (tragedy) ہے، کوئی بھی مقبول ناول طربیہ (comedy) نہیں۔ ناول انسانی تجربے کا اظہار ہوتا ہے اور موجودہ حالت میں، المیہ ہی انسانی مائنڈ کو ایڈریس کرتا ہے، نہ کہ طربیہ۔

یہ صورتِ حال آخرت کے مذہبی عقیدے کی تصدیق ہے۔ اِس صورتِ حال کی توجیہہ صرف اُس وقت ممکن ہے جب کہ یہ مانا جائے کہ دو ''ساحل'' جو موت سے پہلے کے مرحلۂ حیات میں یکجا نہ ہو سکے، وہ موت کے بعد کے مرحلۂ حیات میں یکجا ہوں گے۔ اور پھر انسان کو وہ فُل فِل مینٹ (fulfilment) مل سکے گا جو موجودہ دنیا میں اس کو نہ مل سکا۔ یہاں ایک طرف مچھلی ہے اور دوسری طرف پانی۔ مچھلی پانی کے بغیر ہے، اور پانی مچھلی کے بغیر۔ اِس طرح دونوں ناتمام حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ صورتِ حال آخرت میں ختم ہوگی۔ اُس وقت انسان کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ وہ حقیقی معنوں میں اپنی زندگی کی کہانی کو ''طربیہ'' کے اصول پر لکھ سکے۔

انسان کا مستقبل

انسان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان ایک لذت پسند حیوان (pleasure-seeking animal) ہے۔ انسان کے اندر بے پناہ حد تک یہ جذبہ پایا جاتا ہے کہ وہ چیزوں سے محظوظ ہو سکے — سوچنے میں لذت، بولنے میں لذت، دیکھنے میں لذت، سننے میں لذت، کھانے میں لذت، چھونے میں لذت، رفاقت میں لذت، غرض انسان کے اندر لامحدود طور پر لذت پسندی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ چیزوں سے محظوظ ہونا انسان کے لیے ایک اعلیٰ ترین محبوب تجربہ ہے۔

لیکن موت سے قبل کی دنیا میں جو زندگی انسان کو حاصل ہے، اُس میں وہ کسی بھی چیز سے پوری طرح محظوظ نہیں ہو پاتا۔ موجودہ امتحان کی دنیا میں سامانِ حیات کی محدودیت (limitations) اِس میں فیصلہ کن طور پر رکاوٹ ہے کہ انسان کسی بھی چیز سے پوری طرح محظوظ ہو سکے۔ فطری طور پر لذت پسندی کا مزاج ہونے کے باوجود موجودہ دنیا میں کسی بھی انسان کو فُل فِل مینٹ (fulfilment) حاصل نہیں ہوتا۔

اسلامی عقیدے کے مطابق، اِس فل فل مینٹ کا مقام موت کے بعد آنے والی دنیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کون انسان ہے جس کو اِس اگلی دنیا میں فل فل مینٹ کا موقع ملے گا۔ اگر دوبارہ اِس کے حصول کے لیے اعمال کی کڑی شرط ہو تو غالباً کوئی بھی انسان اِس پر پورا نہیں اترے گا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ بے پناہ حد تک لذتوں کا طالب ہونے کے باوجود انسان اِن لذتوں کی تکمیل سے ابدی طور پر محروم رہے گا، موت سے پہلے کی دنیا میں خود دنیا کی محدودیت (limitations) کی بنا پر، اور موت کے بعد کی زندگی میں اپنی عملی کوتاہی کی بنا پر۔

اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ جنت کسی کو اپنے اعمال کی مقدار کی بنا پر نہیں ملے گی، بلکہ وہ صرف اللہ کی رحمت سے ملے گی۔ یہ وہ انوکھے لوگ ہیں جنھوں نے سب کچھ کرنے کے باوجود حقیقی طور پر اپنے عمل کو حذف کر دیا ہو، اور وہ حقیقی طور پر اللہ کی رحمت کے امیدوار بن گئے ہوں۔

جنت کی تلاش

ہر آدمی کے ذہن میں ایک خوب صورت دنیا بسی ہوئی ہے، ایک ایسی دنیا جو کامل ہو، جو معیاری ہو، جہاں اس کی تمام آرزوئیں پوری ہوسکیں۔ یہی ذہنی تصور ہر آدمی کے لیے اس کے عمل کا سب سے بڑا محرک ہے۔ ہر عورت اور مرد اس کو حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی پوری زندگی اور اپنی ساری طاقت اِس کے راستے میں لگا دیتے ہیں، لیکن آخر میں یہ ہوتا ہے کہ ہر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنی مطلوب دنیا کو نہ پاسکا۔ ہر آدمی اپنی زندگی اعلیٰ حوصلے کے ساتھ شروع کرتا ہے، لیکن ہر آدمی اِس احساس کے ساتھ مرجاتا ہے کہ وہ ساری کوشش کے باوجود اپنی مطلوب دنیا کو پانے میں ناکام رہا۔

یہی پوری انسانیت کی تاریخ ہے۔ اِس میں کسی عورت یا کسی مرد کا کوئی استثنا نہیں۔ یہ انسانیت کا سب سے بڑا سوال ہے۔ کیوں ایسا ہے کہ لوگ امیدوں اور حوصلوں کے ساتھ اپنی زندگی کا آغاز کرتے ہیں، لیکن وہ محرومی کے احساسات کو لے کر مرجاتے ہیں۔

اِس کا جواب یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں جو خوب صورت دنیا بسی ہوئی ہے، وہ خدا کے تخلیقی پلان کے مطابق، جنت کی دنیا ہے۔ اور جنت کسی کو موت کے بعد آنے والے مرحلۂ حیات میں ملے گی، نہ کہ موت سے پہلے والے مرحلۂ حیات میں۔ انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی مطلوب جنت کو موجودہ دنیا ہی میں پالے، مگر جنت کا حصول موجودہ دنیا میں ممکن نہیں۔

اِس معاملے میں انسان اور جنت کی مثال مچھلی اور پانی جیسی ہے۔ مچھلی کو سکون صرف پانی کے اندر ملتا ہے، پانی کے باہر نہیں۔ اِسی طرح انسان کو صرف جنت میں سکون ملے گا، جنت کے باہر اس کو سکون، یا فل فل مینٹ (fulfilment) ملنے والا نہیں۔

جنت کی تلاش دراصل مستقبل کی تلاش کا دوسرا نام ہے، اور مستقبل صرف مستقبل میں ملتا ہے، وہ کسی کو حال میں ملنے والا نہیں۔ انسان کو اگر اِس حقیقت کی دریافت ہوجائے تو وہ موجودہ دنیا کو مطلوب جنت کی تیاری کی جگہ سمجھے گا، نہ کہ خود مطلوب جنت کو پانے کی جگہ۔

شور، شور، شور

شور (noise) ایک مسئلہ ہے۔ شور ایک برائی ہے۔ شور ایک کثافت ہے۔ موجودہ زمانے میں جن چیزوں کو کثافت سمجھا جاتا ہے، اُن میں سے ایک شور کی کثافت (noise pollution) بھی ہے۔ شور اُسی طرح تباہی پیدا کرتا ہے جس طرح کوئی بم دھماکہ (bomb explosion) تباہی پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ شور کے دھماکے اور بم کے دھماکے میں صرف ظاہری فرق ہے، حقیقت کے اعتبار سے اِن دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

موجودہ زمانے میں شور کا مسئلہ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے — لاؤڈ اسپیکر کا شور، جلسوں اور نعروں کا شور، مشینوں کا شور، گاڑیوں کا شور، ہارن کا شور، ریڈیو اور موبائل کا شور، وغیرہ۔ قدیم زمانے میں گدھے کو شور کرنے والا حیوان سمجھا جاتا تھا۔ موجودہ زمانے میں انسان اُس سے ہزار گنا زیادہ شور کرنے والا حیوان بن گیا ہے۔

شور کوئی سادہ چیز نہیں۔ شور کسی انسان کو فرشتوں کی صحبت سے محروم کر دیتا ہے۔ اور جو انسان فرشتوں کی صحبت سے محروم ہو جائے، وہ نہایت آسانی کے ساتھ شیطانوں کا ہم نشیں بن جاتا ہے۔ فرشتے وہ نہ دکھائی دینے والی طاقت ہیں جو کسی عورت یا مرد کو برائی سے بچاتے ہیں۔ فرشتوں کی صحبت کسی انسان کو جنتی شخصیت بناتی ہے۔ جو انسان فرشتوں کی صحبت سے محروم ہو جائے، وہ لازمی طور پر جہنمی شخصیت بن کر رہ جائے گا۔ ایسے لوگوں کو جنت کی خوشبو کبھی نصیب نہ ہوگی۔

جنت وہ معیاری دنیا ہے جہاں شور نہ ہوگا۔ شور اور جنت دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ ایسی حالت میں جو لوگ شور کلچر (noise culture) کو اختیار کریں، وہ گویا کہ اپنے آپ کو جنت کے لیے غیر مستحق بنا رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کا صرف ایک انجام ہے، وہ یہ کہ ایسے لوگوں کو جہنم کے پُرشور مسکنِ شیاطین (pandemonium) میں ڈال دیا جائے، جہاں وہ ابدی طور پر شور وغوغا کی عذاب گاہ میں پڑے رہیں اور کبھی اُس سے نکل نہ سکیں۔

بے اطمینانی کا سبب

موجودہ دنیا میں ہر عورت اور ہر مرد بے اطمینانی (dissatisfaction) کی نفسیات میں جیتا ہے۔ ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ کھونے کے احساس میں جیتا ہے، نہ کہ پانے کے احساس میں۔ یہ حالت اتنی عام ہے کہ اِس میں کوئی استثناء نہیں۔

اِس کا سبب کیا ہے۔اس کا سبب دراصل وہی ہے جس کو مہجوریٔ وطن کا غم (home sickness) کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، انسان جب پیدا کیا گیا تو اس کو جنت میں بسایا گیا تھا۔ گویا کہ جنت ہی انسان کا وطن ہے۔ اس کے بعد انسان کو جنت سے نکال کر کرۂ ارض (planet earth) پر بھیج دیا گیا۔ اِس اعتبار سے گویا کہ تمام انسان جو موجودہ زمین پر ہیں، وہ پناہ گُزیں (refugees) کی حیثیت سے یہاں رہ رہے ہیں۔ یہی لوگوں کی بے اطمینانی کا اصل سبب ہے۔ غیر شعوری طور پر ہر آدمی ہوم سِک (homesick) بنا ہوا ہے۔ کوئی بھی تدبیر اِس احساس کو دور کرنے والی ثابت نہیں ہوتی۔

اِس مسئلے کا حل صرف ایک ہے، وہ یہ کہ لوگوں کو خدا کے تخلیقی پلان (creation plan) سے باخبر کیا جائے۔ اُن کو بتایا جائے کہ وہ موجودہ زمین پر عارضی مدت کے لیے ہیں۔ اگر انھوں نے حسنِ عمل کا ثبوت دیا تو دوبارہ وہ جنت میں داخلے کی سعادت حاصل کرلیں گے۔

ایک آدمی اپنے وطن جانے کے لیے کسی سواری میں سفر کررہا ہے۔ دورانِ سفر اس کو مختلف قسم کی پریشانیاں پیش آتی ہیں۔ لیکن وہ مطمئن رہتا ہے کہ چند گھنٹے کے بعد وہ اپنے وطن میں پہنچ جائے گا۔ اگر لوگ خدا کے تخلیقی پلان سے باخبر ہوجائیں تو بھی اِسی طرح اپنے آپ کو وقتی مسافر سمجھیں گے۔ مستقبل کی کامیابی کا احساس اُن کے حال کی پریشانی کو ان کے لیے غیر اہم بنا دے گا۔ لوگوں کو بے اطمینانی اور ذہنی تناؤ (tension) سے نکالنے کی یہی واحد تدبیر ہے۔ اِس کے سوا کوئی بھی تدبیر اِس معاملے میں کارگر نہیں ہوسکتی۔

جنت کا مستحق کون

جنت خوشیوں اور راحتوں کی ایک نا قابلِ قیاس دنیا ہے۔ جنت صرف اُن لوگوں کو ملے گی جو نا قابلِ قیاس کردار کی قیمت دے کر، اس کا استحقاق ثابت کردیں۔ جنت، ابدی خدا کے پڑوس میں ابدی سیٹ حاصل کرنے کا نام ہے (54:55)۔ اِس قسم کی غیر معمولی اقامت گاہ صرف انھیں خوش قسمت لوگوں کو مل سکتی ہے جو اُس کی اعلیٰ قیمت دینے کا حوصلہ کرسکیں۔

جنت کی نا قابلِ قیاس سیٹ کو پانے کے لیے انسان کو نا قابلِ قیاس عمل کا ثبوت دینا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی نا قابلِ مشاہدہ (unobservable) کو قابلِ مشاہدہ (observable) بنا سکے۔ وہ زمان ومکان (time and space) کے اندر رہتے ہوئے، زمان ومکان کے باہر دیکھنے والی نگاہ پیدا کرے۔ وہ الفاظ کے تاریک جنگل میں معانی کی روشنی کو پاسکے۔ وہ خواہشوں کے سمندر میں رہتے ہوئے، اپنے آپ کو اِس سمندر میں ڈوبنے سے بچائے۔ وہ انانیت (egoism) کا پہاڑ ہوتے ہوئے، اپنے آپ کو بے انا (egoless) بنا سکے۔ وہ بدخواہ لوگوں کی بھیڑ میں رہتے ہوئے، اپنے آپ کو لوگوں کا خیر خواہ (well wisher) بنائے۔ وہ ایک کم زور انسان ہوتے ہوئے، ایک طاقت ور انسان کا رول ادا کرے۔ وہ کامل آزادی کا مالک ہوتے ہوئے، اختیارانہ طور پر اپنے آپ کو سرینڈر کردے۔ وہ نہ بولے ہوئے الفاظ کو سنے، اور نہ دکھائی دینے والی حقیقت کا اعتراف کرے۔ وہ جھوٹ سے بھری ہوئی دنیا میں سچ بولنے کا ثبوت دے۔ وہ بددیانتی (dishonesty) کے ماحول میں، دیانت داری (honesty) کے رویہ پر قائم رہے۔

خدا کے فرشتے دن رات سرگرم ہیں کہ وہ اُن لوگوں کی فہرست تیار کریں جو آخرت میں خدا کے پڑوس میں بننے والی جنت میں داخلے کے مستحق قرار پائیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کی اعلیٰ معرفت نے ان کو اِس قابل بنایا کہ انھوں نے ہر دوسری چیز سے اپنی توجہ ہٹا کر صرف ایک خدا کو اپنا سپریم کنسرن (supreme concern) بنالیا۔ جن کا حال یہ تھا کہ ان کے

شوقِ جنت نے ان کے لیے دنیا کی ہر پرکشش چیز کو بے کشش بنا دیا۔ خدا کی عظمت (glory of God) کے احساس نے جن کے اندر سے فخر (pride) اور بڑائی کے تمام جذبات کو مٹا دیا۔ خدا کی پکڑ کے اندیشے نے جن کا یہ حال کیا کہ لذتوں کے درمیان رہتے ہوئے، لذتوں سے محظوظ ہونا ان کے لیے ممکن نہ رہا۔

جن لوگوں کا حال یہ ہوا کہ جو آوازیں دوسروں کے لیے قابلِ سماعت آوازیں تھیں، وہ ان کے لیے نا قابلِ سماعت آوازیں بن گئیں۔ جن کو دنیا کی ترقی اور دنیا کی محرومی، دونوں یکساں طور پر بے معنیٰ نظر آنے لگیں۔ جن کا حال یہ تھا کہ اپنے آپ کو صحیح ثابت کرنے کے بجائے، ان کے لیے یہ کہنا زیادہ محبوب بن گیا کہ — میں غلطی پر تھا:

I was wrong

جنت ایک حقیقی مقام ہے۔ وہ حقیقی اوصاف کی قیمت ہی پر کسی کو حاصل ہوگا۔ جنت میں وہ انسان بسائے جائیں گے جو ربانی اوصاف کے حامل ہوں۔ جو لوگ موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو اِن ربانی اوصاف کا حامل بنائیں، وہی وہ لوگ ہیں جو جنت میں بسائے جانے کے قابل ٹھیریں گے۔ جنت کسی کو پُر اسرار اسباب کے تحت نہیں ملے گی، بلکہ وہ کامل طور پر معلوم اسباب کے تحت ملے گی۔ اور وہ معلوم اسباب یہی ہیں کہ موجودہ دنیا میں آدمی اپنے آپ کو اِن ربانی اوصاف کا حامل بنائے۔

جنت سچے انسانوں کی کالونی ہے۔ موجودہ دنیا میں انھیں سچے انسانوں کا انتخاب (recruitment) کیا جا رہا ہے۔ موجودہ دنیا کی زندگی میں جو لوگ کامل طور پر سچے انسان ثابت ہوں، وہی جنت کی ابدی دنیا میں بسائے جانے کے قابل ٹھیریں گے۔

ایک تأثّر

جنت خدا کے محبوب بندوں کی دنیا ہے، اور جہنم خدا کے مبغوض بندوں کی دنیا۔ جنت خدا کے انعام یافتہ لوگوں کی بستی ہے، اور جہنم خدا کے سزا یافتہ لوگوں کی بستی۔

جنت اُن لوگوں کے لیے ہے جو سچائی کا اعتراف کریں، جہنم اُن لوگوں کے لیے ہے جو سچائی کی آواز سنیں اور اس کو نظر انداز کر دیں۔ مگر آج وہ روح کہیں نظر نہیں آتی جس کو اعتراف میں لذت ملے۔ ہر آدمی بے اعترافی کی شاخ پر اپنا آشیانہ بنائے ہوئے ہے۔ جنت اُن لوگوں کے لیے ہے جو ہر قسم کی ظاہری عظمتوں سے اپنے آپ کو اوپر اٹھائیں اور خالص عظمتِ خداوندی میں جینے والے بن جائیں۔ اِس کے برعکس، جہنم اُن لوگوں کے لیے ہے جو غیر خدائی عظمتوں میں جئیں۔ آج کا انسان غیر خدائی عظمتوں میں گم ہے۔ خدائی عظمتوں میں جینے والا انسان ڈھونڈنے پر بھی کہیں نظر نہیں آتا۔

جنت اُن لوگوں کے لیے ہے جو آخرت کے لیے متحرک ہوں، اور جہنم اُن لوگوں کے لیے جو دنیا کی خاطر حرکت میں آئیں۔ جنت اُن لوگوں کے لیے ہے جن کا یہ حال ہو کہ خدا اور رسول کے حکم کا ایک حوالہ اُنھیں جھکنے پر مجبور کر دے، اور جہنم ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا اور رسول کے حکم پر جھکنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ مگر آج یہ حال ہے کہ انسان کے نزدیک، خدا اور رسول کے حکم کی کوئی اہمیت نہیں۔ اُس کے لیے جو چیز سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، وہ اُس کی شخصی یا قومی خواہشیں ہیں، نہ کہ خدا اور رسول کا حکم۔

جنت اُن لوگوں کے لیے ہے جو ربّانی اخلاقیات میں جئیں، جنھیں سچ بولنے میں لذت ملے، جن کی روح حق کی ادائیگی میں تسکین پائے۔ اِس کے برعکس، جہنم اُن لوگوں کے لیے ہے جو جھوٹ میں لذت پائیں، جو ناانصافی کو اپنی غذا بنائے ہوئے ہوں۔

جہنم کے دروازے پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے، اور جنت کی طرف جانے والا راستہ بالکل سونا پڑا ہوا ہے۔ کیسا عجیب ہے یہ غیر خدائی منظر جو آج خدا کی دنیا میں ہر طرف نظر آتا ہے۔

ڈوائن سویلائزیشن

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ — خدا انھیں جنت میں داخل کرے گا جس کی اس نے انھیں پہچان کرادی ہے (47: 6)۔ اِس پہچان کا ذریعہ کیا ہے۔ یہ دراصل موجودہ انسانی تہذیب (human civilization) ہے۔ اِس تہذیب کے ظہور میں آنے سے پہلے انسان زمین پر رہتا تھا، لیکن انسان کی زندگی میں جنت جیسی کشش موجود نہ تھی۔ حتی کہ اس زمانے میں بادشاہوں کے محل بھی پتھروں کے ڈھیر کی مانند ہوتے تھے۔ موجودہ تہذیب نے پہلی بار انسانی زندگی کو راحت اور خوب صورتی عطا کی۔ اِس طرح وہ جنت کا ایک بعید تعارف بن گئی۔ مگر مختلف محدودیتوں (limitations) کی وجہ سے یہ تعارفی جنت اصل جنت کا صرف جزئی تعارف تھی۔

موجودہ جنت کیسے بنی۔ یہ دراصل سائنٹسٹ کمیونٹی تھی جس نے اپنی دریافتوں سے اس جنت کی تعمیر کو ممکن بنایا۔ یہ موجودہ دنیا کی تعارفی جنت تھی۔ اگلے دورِ حیات میں اصل جنت کی تعمیر ہوگی۔ موجودہ دنیا اگر انسانی جنت (human paradise) تھی تو آخرت کی جنت خدائی جنت (divine paradise) ہوگی۔ انسانی جنت کو سائنٹسٹ کمیونٹی (scientist community) نے بنایا، اور خدائی جنت کو عارف کمیونٹی (realized community) فرشتوں کی مدد سے بنائے گی۔

موجودہ دنیا اِسی قسم کے عارفین کی تربیت گاہ ہے۔ ہر پیدا ہونے والا انسان اس تربیتی کورس سے لازماً گزرتا ہے۔ جو لوگ اس تربیتی کورس میں کامیاب نہ ہوسکیں، ان کو اگلے دورِ حیات میں رد کردیا جائے گا۔ اور جو لوگ اِس تربیتی کورس میں کامیاب رہیں، ان کو منتخب کرکے اُس عارف کمیونٹی کی تشکیل کی جائے گی جو اگلے دورِ حیات میں پرفکٹ (perfect paradise) کی تعمیر کرے گی۔ اس جنت میں وہ تمام سرگرمیاں ہوں گی جو موجودہ دنیا میں پائی جاتی ہیں، مگر دونوں میں یہ فرق ہوگا کہ موجودہ دنیا کی انسانی سرگرمیاں یہاں کے محدود ماحول میں انجام پاتی ہیں، جب کہ جنت میں یہ سرگرمیاں وہاں کے لامحدود ربانی ماحول میں انجام پائیں گی۔

جنت کی زندگی

جاپان کے سفر (دسمبر 1990) میں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ میں نے کہا کہ موجودہ دنیا عارضی جگہ ہے اور آخرت ابدی قیام کی جگہ۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنی ''جنت'' ابدی دنیا میں تعمیر کرے۔ انھوں نے کہا: انسان کسی راحت یا لذت کی چیز سے تھوڑی دیر کے بعد اکتا جاتا ہے۔ چنانچہ جدید ترقی یافتہ دنیا میں بہت بڑے پیمانے پر اکتاہٹ (boredom) کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ ایسی حالت میں ابدی جنت سے کیا فائدہ۔

جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے، وہ ہمیشہ سے یہی بات کہتے آرہے ہیں۔ مگر یہ صرف ایک مغالطہ (fallacy) ہے۔ اصل یہ ہے کہ اکتاہٹ (boredom) استعدادِ تلذذ (ability to enjoy) کے خاتمہ کی بنا پر آتی ہے، نہ کہ خود خواہشِ تلذذ (desire to enjoy pleasure) کے خاتمہ کی بنا پر۔

ان حضرات نے یہ فرض کر لیا ہے کہ جب ہم کسی لذت سے انجوائے (enjoy) کرنا چاہتے ہیں تو کچھ دیر بعد اس سے ہمارا جی بھر جاتا ہے۔ اور پھر اس میں ہمارے لئے لذت باقی نہیں رہتی۔ مگر یہ مفروضہ بجائے خود غلط ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے اپنے اندر غیر تسکین پذیر فطرت (insatiable nature) رکھتا ہے۔ انسان کو جو چیزیں مرغوب ہیں، ان سے وہ ابدی طور پر محظوظ ہونا چاہتا ہے۔

مگر موجودہ دنیا میں انسان بے شمار محدودیتوں (limitations) کا شکار ہے۔ چناں چہ انسان جب بھی کسی مرغوب چیز سے انجوائے کرنا چاہتا ہے تو تھوڑی دیر کے بعد اس کی محدودیت اس کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ رغبت کے باوجود وہ اس چیز سے انجوائے کرنے کی طاقت کھو دیتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم ایک لذیذ چیز کھاتے ہیں تو اس چیز کی لذت ہمارے لئے ختم نہیں ہوتی بلکہ ہمارا پیٹ بھر جاتا ہے، اس لئے ہم کو اسے چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ اسی طرح اکثر

دولت مند لوگ رغبت کے باوجود چیزوں کو کھانا چھوڑ دیتے ہیں، کیوں کہ انہیں اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ موٹے ہوکر طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہو جائیں گے۔

یہی حال تمام دوسری لذتوں کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکتاہٹ یا بے رغبتی ہماری انجوائے کرنے کی استعداد کی حد ہے نہ کہ خود رغبت کی حد۔

جنت وہ جگہ ہے جہاں نہ صرف یہ ہوگا کہ تمام لذتیں مزید اضافہ کے ساتھ زیادہ مکمل حالت میں انسان کو دی جائیں گی، بلکہ ان لذتوں سے انجوائے کرنے کی استعداد کے سلسلہ میں اس کی محدودیت بھی ختم کر دی جائے گی۔

جنت میں یہ تضاد ختم ہو جائے گا کہ آدمی انجوائے کرنا چاہتا ہے مگر اپنی کسی محدودیت کی بنا پر وہ اپنی مرغوب چیزوں سے انجوائے نہیں کر پاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جنت انسان کے لئے ابدی خوشیوں کی جگہ بن جائے گی۔

دنیا میں آدمی کو جس اکتاہٹ (بورڈم) کا تجربہ ہوتا ہے وہ دراصل ایک تضاد کا نتیجہ ہے۔ آدمی پیدائشی طور پر ایک معیار پسند (idealist) مخلوق ہے۔ وہ چیزوں کو ان کی آئڈیل صورت میں پانا چاہتا ہے، مگر اس دنیا میں ہر چیز غیر معیاری یا غیر آئڈیل ہے۔ بورڈم کا اصل سبب یہی ہے۔

آدمی اپنے شوق کے تحت ایک چیز کی طرف دوڑتا ہے۔ اس کو پانے سے پہلے وہ اس فریب میں رہتا ہے کہ یہ عین وہی آئڈیل چیز ہے جس کا وہ طالب تھا۔ مگر حاصل کر لینے کے بعد جب وہ اس کا تجربہ کرتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کے مطلوب آئڈیل سے بہت کم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں آدمی کو تلاش کی لذت تو ملتی ہے، مگر یافت کی لذت اسے نہیں ملتی۔

موجودہ دنیا میں آدمی کے لئے فریب لذت ہے اور آخرت میں حقیقی لذت۔ آخرت کی ہر چیز معیاری ہوگی۔ اس بنا پر وہ آدمی کے لئے حقیقی اور لامحدود لذت کا ذریعہ بن جائے گی۔ آدمی جو کچھ چاہتا ہے وہ جنت میں اس کو مزید اضافہ کے ساتھ مل جائے گا، اس لئے وہاں اس کے لئے اکتاہٹ کا کوئی سوال نہ ہوگا۔

جنت کا ٹکٹ

مغربی دنیا کے ایک سفر میں میری ملاقات ایک مسلمان سے ہوئی۔ ان کی عمر پچاس سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ انھوں نے کہا کہ مجھ کو تو جنت کا ٹکٹ چاہیے، مجھ کو آپ صرف یہ بتائیے کہ جنت کا ٹکٹ کیا ہے۔

میں نے کہا کہ معروف معنوں میں جنت کا کوئی ٹکٹ نہیں۔ یہ جنتی ٹکٹ کا معاملہ نہیں، یہ جنتی شخصیت کا معاملہ ہے۔ آخرت کی قیمتی جنت اُس آدمی کو ملے گی جس نے اپنے اندر جنتی شخصیت کی تعمیر کی تھی۔ جنت میں داخلہ کسی کو ''ٹکٹ'' کے ذریعے نہیں ملے گا۔ جنت کی قیمت آدمی کا اپنا وجود ہے، اپنے وجود کی قیمت دے کر ہی کوئی شخص جنت کی دنیا میں اپنے لیے داخلہ پا سکتا ہے۔

جنت میں داخلے کی شرط یہ ہے کہ آدمی مُزکّٰی شخصیت (20:76) لے کر وہاں پہنچا ہو، یعنی وہ ایک ایسا انسان ہو جس کے اندر پاکیزہ روح بسی ہوئی ہو، جس کا دل اور دماغ آلائشوں سے پاک ہو، جس نے اپنے اندر ربانی شخصیت کا باغ اگایا ہو۔ موجودہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جس کے ایک طرف کیچڑ ہے اور دوسری طرف صاف وشفاف پانی۔ آدمی چاہے تو اپنے کو کیچڑ میں آلودہ کرے، اور چاہے تو صاف پانی میں نہا کر وہ صاف ستھرا بن جائے۔ جو لوگ اپنے آپ کو آلودہ کریں، وہ آخرت میں جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔ اور جو لوگ اپنے آپ کو پاک کریں، اُن کو جنت کی ابدی نعمت گاہوں میں بسایا جائے گا۔

اعتراف کے موقع پر اعتراف کرنا، اپنی شخصیت کو پاک کرنا ہے اور اعتراف کے موقع پر بے اعترافی کا رویہ اختیار کرنا، اپنی شخصیت کو آلودہ کرنا۔ اِسی طرح ایک موقع آتا ہے جس میں ایک شخص اعلیٰ اخلاق کا ثبوت دیتا ہے اور دوسرا شخص پست اخلاق کا۔ ایک موقع آتا ہے جس میں ایک شخص حق تلفی کرتا ہے اور دوسرا شخص حق رسانی۔ ایک موقع آتا ہے جس میں ایک شخص امین (honest) ثابت ہوتا ہے اور دوسرا شخص خائن (dishonest)۔ ایک موقع آتا ہے جس میں ایک شخص تواضع (modesty) کے راستے پر چلتا ہے اور دوسرا شخص سرکشی کے راستے پر — اِن میں سے پہلا آدمی اپنی شخصیت کو پاک کرنے والا ہے اور بلاشبہہ جنت کی نفیس دنیا میں ایسے ہی مزکی انسانوں کو داخلہ ملے گا۔ اِس کے برعکس، دوسرا آدمی اپنی شخصیت کو آلودہ کرنے والا ہے اور جہنم بلاشبہہ ایسے ہی غیر مزکّی لوگوں کا ٹھکانا ہوگا۔

فہرستِ آرزو

کلیری سمپسن (Cleary Simpson) امریکا کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ مختلف قسم کے وقتی جاب کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ ان کی تمناؤں کے مطابق، اُن کو امریکا کے ٹائم میگزین میں اپنی پسند کا کام مل گیا۔ اس وقت وہ ٹائم میگزین کے دفتر (نیویارک) میں ڈائرکٹر (Advertising Sales Director) ہیں۔

ٹائم کے شمارہ 5 اگست 1991 (صفحہ 4) میں مذکورہ خاتون کا ہنستا ہوا پُر ابتہاج فوٹو چھپا ہے۔ وہ اِس عہدے کے ملنے پر انتہائی خوش ہیں۔ تصویر کے نیچے اُن کا پر مسرت تاثر اِن لفظوں میں درج ہے— ٹائم کے لیے کام کرنا ہمیشہ سے میری فہرستِ آرزو پر تھا:

Working for Time was always on my wish list.

ہر آدمی کسی چیز کو سب سے بڑی چیز سمجھتا ہے، وہ اس کی تمنا میں جیتا ہے، وہ اس کا خواب دیکھتا ہے، وہ اِس انتظار میں رہتا ہے کہ کب وہ دن آئے جب کہ وہ اپنی اِس محبوب چیز کو پالے۔ یہ چیز اس کی فہرستِ آرزو میں سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ درج ہوتی ہے۔ موجودہ دنیا میں کوئی بھی ایسا آدمی نہیں جس کے لیے کوئی نہ کوئی چیز اِس طرح مرکزِ تمنا بنی ہوئی نہ ہو۔

مومن وہ ہے جس نے جنت کو اپنی فہرستِ آرزو (wish list) میں لکھ رکھا ہو، یعنی ابدی اور معیاری نعمتوں کی وہ دنیا جہاں وہ اپنے رب کو دیکھے گا، جہاں سچے انسانوں سے اس کی ملاقات ہوگی، جہاں وہ خدا کی رحمتوں کے سائے میں زندگی گزارے گا، وہ دنیا جو لغو اور تاثیم (56: 25) سے پاک ہوگی، جہاں صَخب (شور) اور نصب (تکان) کو ختم کردیا جائے گا، جس کا ماحول چاروں طرف حمد اور سلامتی سے بھرا ہوا ہوگا (56: 26)، جہاں خوف اور حزن (35: 34) کو حذف کیا جاچکا ہوگا، جہاں ایسی آزادی ہوگی جس پر کوئی قید نہیں (76: 20)، جہاں ایسی لذتیں ہوں گی جن کے ساتھ محدودیت (limitation) شامل نہیں۔

پندرہ بلین سالہ منصوبہ

سائنٹفک اکاؤنٹ کے مطابق، تقریباً پندرہ بلین سال پہلے، خالق کے حکم سے خلا (space) میں ایک بڑا کاسمک بال وجود میں آیا۔ اِس میں وہ تمام اَجزا (particles) موجود تھے جو آج ہماری کائنات کا حصہ ہیں۔ خالق کے حکم سے اِس عظیم گولے میں ایک انفجار (explosion) ہوا۔ اِس انفجار کو عام طور پر بگ بینگ (Big Bang) کہا جاتا ہے۔

کاسمک بال میں انفجار کے بعد اُس کے تمام اجزا وسیع خلا میں پھیل گئے۔ اُس کے بعد خالق کے پلان کے مطابق، وہ مختلف صورتوں میں مجتمع ہونا شروع ہوگئے۔ اِن ذرات کے اجتماع سے ان گنت ستارے بنے، کہکشائیں بنیں، ڈارک میٹر بنا، سولر سسٹم بنا، اِس طرح بتدریج وہ پوری دنیا وجود میں آئی جس کو ہم کائنات (universe) کہتے ہیں۔

اِس کے بعد خالق نے سیارۂ زمین (planet earth) کو اپنے خصوصی پلان کو بروئے کار لانے کے لیے منتخب کیا۔ لمبی مدت کے عمل کے بعد، سیارۂ زمین ٹھنڈا ہوا۔ خالق کے حکم سے یہاں پانی بنا، بارشیں ہوئیں اور دریا اور سمندر وجود میں آئے۔ سیارۂ زمین کا تقریباً تین چوتھائی حصہ پانی سے بھر گیا۔ اُس کے بعد خالق کے منصوبے کے مطابق، سیارۂ زمین پر سبزہ اُگا اور زمین کی خشکی کا حصہ ہرے بھرے درختوں اور جنگلوں سے بھر گیا۔

اِس کے بعد زمین پر خالق کے خصوصی پلان کے مطابق، اس کا اگلا حصہ ظہور میں آیا، یعنی حیوانات کی دنیا وجود میں آئی۔ بے شمار قسم کے جانور، مچھلیاں، چڑیاں، چوپائے اور طرح طرح کی ذی حیات اشیاء سے زمین بھر گئی۔

خالق کے منصوبے کے مطابق، اُس کا اگلا مرحلہ یہ تھا کہ یہاں انسان کو پیدا کر کے سیارۂ زمین پر اس کو بسایا جائے۔ چناں چہ انسانِ اوّل کے طور پر آدم اور ان کی بیوی حوا کو پیدا کیا گیا۔ پھر اُس پہلے جوڑے سے انسانی نسل چلی، یہاں تک کہ زمین کے مختلف حصوں میں انسان کی آبادیاں قائم ہوگئیں۔

اِس کے بعد خدا کے منصوبے کا ایک اور حصہ ظہور میں آیا۔ یہ پیغمبروں کا پیدا ہونا تھا۔ زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کے درمیان خالق نے اپنے پیغمبر بھیجے۔ یہ تمام پیغمبر، انسان تھے۔ خالق نے ان کو خصوصی طور پر اِس لیے بھیجا کہ وہ انسانوں کو ان کی قابلِ فہم (understandable) زبان میں یہ بتائیں کہ ان کے بارے میں خالق کا تخلیقی پلان (creation plan) کیا ہے۔

پیغمبروں کی آمد کا یہ سلسلہ لمبی مدت تک چلتا رہا۔ پہلے انسان، آدم خود بھی ایک پیغمبر تھے۔ اس کے بعد ہر نسل میں پیغمبر آتے رہے۔ مثلاً حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور آخر میں پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

پیغمبروں کے ذریعے خدا نے ہر نسل کے انسانوں کو بتایا کہ موجودہ دنیا سلیکشن گراؤنڈ کے طور پر بنائی گئی ہے۔ انسان کی آبادکاری کی اصل اور ابدی جگہ تو جنت ہے۔ جنت ابدی بھی ہے اور ہر اعتبار سے آئڈیل بھی۔ مگر جنت میں داخلہ صرف انتخابی بنیاد (selective basis) پر ہوگا۔

موجودہ دنیا میں خالق کی طرف سے غیر مَرئی (invisible) ریکارڈنگ کا نظام عالمی پیمانے پر قائم کیا گیا ہے۔ اِس نظام کے تحت، ہر عورت اور ہر مرد کے قول و عمل کا مسلسل ریکارڈ تیار کیا جارہا ہے۔ یہ ریکارڈ قیامت کے دن سامنے آجائے گا۔ پھر لوگوں کے اعمال کے ریکارڈ کے مطابق، اُن افراد کو منتخب کیا جائے گا، جو اپنے عمل کے اعتبار سے جنت کی کامل دنیا میں بسائے جانے کے اہل ثابت ہوں گے۔ بقیہ لوگوں کو چھانٹ کر اُنھیں کائنات کے کوڑا خانے میں ڈال دیا جائے گا، تاکہ وہ ابدی طور پر محرومی اور حسرت کے عذاب کو بھگتتے رہیں۔

خالق نے چاہا کہ وہ کچھ منتخب لوگوں کو اپنے اِس خصوصی انعام سے نوازے کہ وہ جنت کی معیاری دنیا میں ہر قسم کی لذت اور مسرت کے ماحول میں ابدی طور پر آباد رہیں، اور اپنی ہستی کے کامل فُل فِل مینٹ (fulfilment) کا تجربہ کریں۔ یہ خالق کی خصوصی طور پر دی ہوئی ایک انوکھی رحمت ہوگی جو صرف منتخب قسم کے کچھ خوش قسمت لوگوں کے حصے میں آئے گی۔

خالق نے چاہا کہ وہ چمتکار کے طور پر اِس دنیا کو پیدا نہ کرے، بلکہ وہ پوری طرح اسباب و علل

کے ذریعے اُس کو وجود میں لائے۔ حضرت موسیٰ، خدا کے پیغمبر تھے۔ انھوں نے ایک لکڑی زمین پر ڈالی اور خدا کے حکم سے وہ ایک زندہ سانپ بن گئی۔ خدا چاہتا تو اِسی طرح پوری کائنات کو اچانک معجزاتی طور پر پیدا کر دیتا۔ مگر ایسا کرنے کی صورت میں انسان کے اندر تخلیقیت (creativity) کا ارتقا نہ ہوتا، نہ سائنس بنتی اور نہ تہذیب وجود میں آتی۔ اِس لیے خالق نے کائنات کو ایک لمبے پراسس (process) کے روپ میں پیدا کیا، تاکہ انسان اپنی سوچ کو عمل میں لائے اور ذہنی ارتقا کے اعلیٰ درجے تک پہنچ سکے۔ یہ ایک لمبا منصوبہ تھا۔ چناں چہ اس کی تکمیل میں تقریباً 15 بلین سال گزر گئے۔

قرآن میں بار بار یہ بات کہی گئی ہے کہ آسمان اور زمین اور اس کی تمام چیزیں انسان کے لیے بنائی گئی ہیں۔ اِس لحاظ سے دیکھئے تو کائنات کی تخلیق کا 15 بلین سالہ منصوبہ گویا صرف انسان کے لیے تھا۔ اب انسان سے کیا مطلوب ہے، وہ صرف ایک چیز ہے، اور وہ ہے معرفت الٰہی۔ انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ تخلیق میں غور وفکر کرکے خالق کی معرفت حاصل کرے۔ یہی معرفت، جنت کی قیمت ہے۔ معرفت کا یہ عمل کوئی محدود عمل نہیں۔ وہ موجودہ دنیا میں شروع ہوتا ہے اور آخرت کی دنیا تک جاری رہتا ہے۔ یہ ایک ابدی عمل ہے جس کا آغاز تو معلوم ہے، لیکن اس کی انتہا (end) معلوم نہیں۔ معرفت کے حصول کا عمل دنیا میں ابتدائی طور پر جاری ہوتا ہے اور آخرت میں وہ اپنی انتہائی صورت میں جاری رہے گا۔ یہی معرفت، انسان کا اصل امتیاز ہے۔ یہی معرفت، انسان کو جنت میں داخلے کا مستحق بناتی ہے۔ یہی معرفت کسی انسان کے لیے اِس انعام کا سبب بنے گی کہ اُس کو خداوند ذوالجلال کے قریب مقعدِ صدق (54:55) میں جگہ ملے۔

موجودہ گلوبل وارمنگ، خالق کی طرف سے اِس بات کا الارم ہے کہ تخلیق کا پہلا مرحلہ ختم ہو چکا، یعنی افراد کے انتخاب کا مرحلہ۔ اب خالقِ کائنات غیب کا پردہ پھاڑ کر سامنے آجائے گا۔ وہ کامل انصاف کے مطابق، لوگوں کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کرے گا۔ اب آخری وقت آگیا ہے کہ انسان جاگے اور تیاری کرکے اپنے آپ کو اِس قابل بنائے کہ قیامت کے بعد بننے والی اگلی دنیا میں وہ ابدی جنت میں جگہ پاسکے۔

آخرت کا سفر

موت کی یاد

قرآن کی سورہ آلِ عمران میں یہ آیت آئی ہے: کلّ نفس ذائقة الموت (3:185) یعنی ہر انسان موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے۔ موت کے بارے میں بہت سی روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: أكثروا ذكرَ هاذم اللّذاتِ، الموت (الترمذي، رقم الحديث: 2307) یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کرو، موت لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے۔

اِس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ — موت کو بہت زیادہ یاد کرو جو مبنی برخواہش سوچ کو ڈھانے والی ہے، اور مبنی برحقیقت سوچ کو پیدا کرنے والی ہے:

Remember death much. It demolishes desire-based thinking, and produces reality-based thinking.

لذت (pleasure) کو وسیع معنی میں لیا جائے تو اِس میں انسان کی تمام سرگرمیاں شامل ہوجاتی ہیں۔ ہر کام جو آدمی کرتا ہے، وہ اِسی لیے کرتا ہے کہ اس میں کہیں نہ کہیں اس کو لذت مل رہی ہوتی ہے۔ معلوم مادی لذتوں (material pleasures) کے علاوہ، وہ تمام چیزیں بھی اِس فہرست میں شامل ہیں جو بظاہر غیر مادی نظر آتی ہیں۔ مثلاً عزت، شہرت، اقتدار، اسٹیج، سماجی رتبہ، مقبولیت، عوامی استقبال، وغیرہ۔ غرض تمام مادی اور غیر مادی چیزیں اِس فہرستِ لذت میں شامل ہیں۔ اگر لذت نہ ملے تو آدمی کوئی کام نہیں کرے گا۔

اِس طرح موت کا احساس آدمی کو آخری حد تک سنجیدہ اور حقیقت پسند بنا دیتا ہے۔ وہ کسی ایسی چیز کو اپنا ہدف (goal) نہیں بنا سکتا جو آج ملے اور کل کے دن وہ مکمل طور پر اُس سے چھن جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت کی حیثیت کسی عورت یا مرد کے لیے سب سے بڑے معلم (teacher) کی ہے۔ موت کا تصور آدمی کے اندر انقلاب پیدا کر دینے والا ہے۔

بڑھاپے کی عمر

قرآن کی سورہ فاطر میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **أولم نعمّر کم ما یتذکر فیہ من تذکر** (37 :34) یعنی کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی کہ جو شخص یاد دہانی حاصل کرنا چاہے، وہ اس میں یاد دہانی حاصل کر سکے۔ اِس مفہوم کی متعدد روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ ملاحظہ ہو: (صحیح البخاري، 6419)۔

حدیث میں آیا ہے کہ جس آدمی کو لمبی عمر یا بڑھاپے کی عمر ملے، اس کے پاس اللہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ آدمی کے اوپر پہلے بچپن کا دور آتا ہے، اس کے بعد جوانی کا دور آتا ہے، اس کے بعد بڑھاپے کا دور آتا ہے۔ بڑھاپے کا دور موجودہ دنیا میں کسی انسان کے لیے آخری دور ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد جو مرحلہ آتا ہے، وہ موت کا مرحلہ ہے، نہ کہ کوئی اور مرحلہ۔

اِس اعتبار سے بڑھاپا گویا کہ موت کی پیشگی اطلاع (prior notice) ہے۔ بڑھاپے میں جسم کے تمام اعضا (organs) کمزور ہوجاتے ہیں، حتی کہ بعض اعضا اپنا کام کرنا بند کر دیتے ہیں۔ یہ واقعات بتاتے ہیں کہ موت کا وقت قریب آ گیا۔ وہ گویا کہ موت کی جبری یاد دہانی (compulsory reminder) ہیں۔ بڑھاپا آدمی کو قبر کے کنارے کھڑا کر دیتا ہے۔

اگر آدمی کا ذہن بیدار ہو تو بڑھاپے کی عمر کو پہنچ کر وہ سوچنے لگے گا کہ اب بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے، جب کہ میری موت واقع ہو اور میں اللہ کے سامنے حساب کتاب کے لیے حاضر کر دیا جاؤں۔ اِس طرح بڑھاپے کے تجربات آدمی کو جھنجھوڑتے ہیں، وہ اس کو آخرت کی یاد دہانی کراتے ہیں۔ بڑھاپا آدمی کو بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا میں تمھارا سفر اب ختم ہو چکا۔ اب تمھیں لازماً اگلے دورِ حیات میں داخل ہونا ہے اور حشر کی خدائی عدالت کا سامنا کرنا ہے— بلاشبہہ وہ انسان سب سے زیادہ بد بخت انسان ہے جس کو بڑھاپے کا زمانہ ملا، لیکن وہ اس سے یاد دہانی حاصل نہ کر سکا، وہ بدستور غفلت میں رہا، یہاں تک کہ وہ اِسی حال میں مر گیا۔

کامل محرومی

قرآن کی سورہ آل عمران میں موت کے بارے میں یہ آیت آئی ہے: **کل نفس ذائقة الموت** (3:185) یعنی ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ یہ آیت ہر انسان کے لیے ایک سنگین انتباہ (warning) کی حیثیت رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت کسی آدمی کے لیے کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ موت کا مطلب ایک قسم کی دنیا سے نکل کر دوسری قسم کی دنیا میں داخل ہونا ہے۔

موجودہ دنیا میں انسان کے ساتھ **سخر لکم ما فی السماوات وما فی الأرض** (45:13) کا معاملہ کیا گیا ہے۔ موت کے بعد کی دنیا میں اچانک اس کے ساتھ **حرّم لکم ما فی السماوات وما فی الأرض** کا معاملہ پیش آجائے گا۔ موجودہ دنیا میں انسان کو بظاہر سب کچھ ملا ہوا ہے، لیکن موت کے بعد کی دنیا میں برعکس طور پر وہ پائے گا کہ وہ تمام چیزوں سے کلی طور پر محروم ہو چکا ہے — اس کی فیملی، اس کا سامانِ حیات، اس کے اعوان وانصار، غرض زمین سے آسمان تک کی ہر چیز اس کا ساتھ چھوڑ دے گی۔ یہ اُسی طرح کا ایک شدید تر واقعہ ہوگا جیسے مچھلی کو پانی سے نکال کر صحرا میں ڈال دیا جائے۔

یہ انسانی زندگی کا سب سے زیادہ نازک معاملہ ہے جس کے بارے میں ہر عورت اور مرد کو سب سے زیادہ سوچنا چاہیے۔ ہر ایک کو چاہیے کہ وہ اسی حقیقت کے مطابق سوچے، ہر ایک کو چاہئے کہ وہ اِسی حقیقت کے مطابق اپنی زندگی کا منصوبہ بنائے، ہر ایک کو چاہئے کہ وہ اِسی حقیقت کو اپنی کامیابی اور ناکامیابی کا اصل مدار سمجھے، ہر ایک کو چاہیے کہ وہ اِسی سوچ کو لے کر رات کو سوئے اور وہ اِسی سوچ کو لے کر صبح کو جاگے، ہر ایک کو چاہیے کہ وہ اِسی حقیقت کو اپنی زندگی کا مرکز ومحور بنالے، ہر ایک کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ اِسی حقیقت کو لے کر جئے اور اِسی حقیقت کو لے کر اس کی موت آئے۔ ہر ایک کو چاہیے کہ وہ اِسی حقیقت کو اپنا سب سے بڑا کنسرن (supreme concern) بنالے۔ جو لوگ اِس حقیقت کو اپنا سب سے بڑا کنسرن بنالیں، وہی موجودہ دنیا میں صحیح زندگی گزاریں گے اور وہی موت کے بعد آنے والی اگلی دنیا میں جنت میں داخلے کے مستحق قرار پائیں گے۔

آنے والا کل

قرآن کی سورہ القیامہ کی ایک آیت یہ ہے: **كلّا بل تحبّون العاجلة، وتذرون الآخرة** (75: 20-21) یعنی ہرگز نہیں ، بلکہ اصل یہ ہے کہ تم عاجلہ سے محبت کرتے ہو، اور تم آخرت کو نظر انداز کیے ہوئے ہو:

Nay, but you love the present life, and neglect the hereafter.

کوئی انسان جب پیدا ہو کر اس دنیا میں آتا ہے، تو وہ دیکھتا ہے کہ اِس دنیا میں ہر طرف اس کے لیے مختلف قسم کے مواقع (opportunities) موجود ہیں۔ وہ اِن مواقع کو استعمال کرنے کے لیے اُن کے اوپر ٹوٹ پڑتا ہے، ٹھیک اُسی طرح جیسے کوئی جانور ہری گھاس کو دیکھ کر اس کے اوپر ٹوٹ پڑتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اِن مواقع کے ذریعے وہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرلے۔

یہ سب سے بڑی بھول ہے، جس میں ہر انسان مبتلا ہے۔ موجودہ دنیا کے مواقع اِس لیے نہیں ہیں کہ اُن کے ذریعے صرف وقتی قسم کے دنیوی فائدے حاصل کیے جائیں، بلکہ یہ مواقع اِس لیے ہیں، تاکہ انسان اُن کی مدد سے وہ اعلیٰ کام کرے، جو آخرت میں اُس کے لیے مفید بننے والا ہو۔ مثلاً کسی کے پاس مال ہے تو وہ اِس لیے نہیں ہے کہ وہ اُس کے ذریعے اپنی خواہشوں کو پورا کرے۔ وہ سماج کے اندر اپنے اسٹیٹس (status) کو زیادہ سے زیادہ بڑھائے۔ وہ اعلیٰ معیار کے مطابق اپنی زندگی گزارے۔ بلکہ مال کا صحیح مصرف یہ ہے کہ — بقدرِ ضرورت وہ اس کو اپنے پاس رکھے، اور بقیہ مال کو وہ خدا کی راہ میں خرچ کرے۔ مثلاً دعوت الی اللہ کا کام۔

موجودہ دنیا عارضی ہے، اور بعد کو آنے والی دنیا ابدی۔ مگر عجیب بات ہے کہ آدمی اپنا سب کچھ عارضی دنیا کی ترقی اور خوش حالی میں لگا دیتا ہے، لیکن آخرت کی ابدی زندگی کے معاملے کو وہ اِس طرح چھوڑے ہوئے ہوتا ہے، جیسے کہ وہ کبھی پیش آنے والا ہی نہیں۔ دانش مند وہ ہے جو آخرت کی فکر میں جیے، اور نادان وہ ہے جو آخرت کی فکر سے غافل ہو جائے۔

ڈر والے اور بے ڈر والے

قرآن کی سورہ الانشقاق میں بتایا گیا ہے کہ قیامت میں جن لوگوں کو اُن کے عملِ صالح کی بنیاد پر جنت میں داخلہ ملے گا، ان کا اعمال نامہ ان کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ وہ اس کو پا کر خدا کا شکرادا کریں گے اور خوشی خوشی اپنے اہل وعیال کی طرف لوٹیں گے (84: 7-9)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن کے مطابق، اپنے گھر والوں کے درمیان خدا سے ڈر کر رہتے تھے (52: 26)۔

جو شخص دنیا میں خدا کی پکڑ سے ڈرا، آخرت میں وہ ڈر والی زندگی سے محفوظ رہے گا اور اپنے صالح اہل وعیال کے ساتھ جنت کی بے خوف زندگی گزارے گا۔ اِس کے برعکس حال اُن لوگوں کا ہوگا جو دنیا میں خدا سے بے خوف تھے اور آخرت کی پکڑ سے بے پروا ہو کر اپنے اہل وعیال کے درمیان مگن رہتے تھے (83: 31)۔ جن لوگوں کا دنیا میں یہ حال تھا، ان کو ان کا اعمال نامہ ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ خدا کے فرشتے ان کو پکڑ کر جہنم میں ڈال دیں گے، جہاں انھیں دوبارہ خوشی حاصل نہ ہوگی۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ایک شخص اگر دنیا میں صالح زندگی اختیار کرے اور اپنے آپ کو جنت کے اعلیٰ درجے کا مستحق بنائے، تو اس کی صالح ذریت کو اَپ گریڈ (upgrade) کر کے یک جا طور پر جنت کے اعلیٰ درجات میں داخل کر دیا جائے گا (52: 21)۔

دنیا میں زندگی گزارنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک، یہ کہ اپنے گھر والوں کے درمیان آخرت کا فکرمند بن کر رہنا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو آخرت میں جنت کی بے خوف دنیا میں داخلے کا موقع ملے گا۔ اِس کے برعکس، جو لوگ اپنے گھر والوں کے درمیان اِس طرح رہیں کہ ان کو آخرت کی کوئی پروا نہ ہو، وہ خدا کی پکڑ سے بے خوف ہو کر اپنے گھر والوں کے درمیان خوش وخرم زندگی گزاریں، وہ آخرت کی دنیا میں دوبارہ خوشیوں کی زندگی سے محروم رہیں گے — جو شخص دنیا میں ڈرا، اس کو آخرت میں دوبارہ ڈرایا نہیں جائے گا۔

بڑھاپے کی عمر

حدیث میں آیا ہے کہ — اُس انسان پر افسوس ہے جس کو 60 سال کی عمر ملی، اس کے باوجود اس نے جنت حاصل نہ کی (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 6419) یہ صرف عمر کی بات نہیں ہے، بلکہ اِس میں ایک نہایت گہری حقیقت بیان کی گئی ہے۔

وہ گہری حقیقت یہ ہے کہ زیادہ عمر کا مطلب زیادہ تجربہ ہے، اور زیادہ تجربے کے باوجود جو آدمی جنت والا عمل نہ کرے، وہ بلاشبہہ ایک بدنصیب انسان ہے۔ اس کا معاملہ ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کو جنت کے گیٹ کے پاس پہنچایا جائے، اس کے باوجود وہ گیٹ کے اندر داخل نہ ہو۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ہر آدمی کو اِس دنیا میں صرف محدود عمر حاصل ہوتی ہے۔ آدمی جب پیدا ہوتا ہے، اُسی وقت اس کا کاؤنٹ ڈاؤن (countdown) شروع ہوجاتا ہے۔ گویا کہ زندگی کا سفر موت کی طرف سفر ہے۔ جب بڑھاپا آتا ہے تو آدمی کے لیے وہ نصف موت کا تجربہ ہوتا ہے۔ بڑھاپے کی عمر قربتِ موت (near death) کے ہم معنیٰ ہے۔ بڑھاپا ہر صبح وشام آدمی کو موت کی یاد دلاتا ہے۔

ایسی حالت میں آدمی کو چاہیے کہ جب وہ بڑھاپے کی عمر کو پہنچے تو وہ زیادہ سے زیادہ، موت کو اور موت کے بعد آنے والے حالات کو یاد کرے۔ وہ اِس حقیقت کو اپنے ذہن میں بار بار تازہ کرے کہ موت سے پہلے وہ اپنے آپ کو قدرت کی حالت میں پاتا ہے، موت کے بعد اچانک وہ اپنے آپ کو عجز کی حالت میں پائے گا۔

اِس احساس کا تقاضا ہے کہ اُس کا دل نرم ہو۔ وہ خدا کی پکڑ سے ڈرے۔ وہ آخرت کے اعتبار سے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ تیار کرے۔

جو آدمی بڑھاپے کی عمر کو پہنچے، لیکن وہ اپنے بڑھاپے سے تقویٰ کی خوراک حاصل نہ کرے، وہ بلاشبہہ ایک بدنصیب انسان ہے۔ اُس کا انجام ابدی بربادی اور ابدی حسرت کے سوا اور کچھ نہیں۔

موت: اصلاح کا سب سے بڑا ذریعہ

حدیث میں آیا ہے کہ موت کو بہت زیادہ یاد کرو (أکثروا ذکر هادم اللذات، الموت)۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہی چیز لوگوں کی زندگی میں سب سے زیادہ مفقود ہے۔ اِس کا سبب غالباً یہ ہے کہ انسان کے ڈی این اے (DNA) میں سب کچھ ہے، مگر اس میں موت کا اندراج نہیں۔ لیکن موت کو یاد کرنے کے لیے ڈی این اے میں اس کے اندراج کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ روزانہ صبح وشام لوگ مرتے رہتے ہیں اور یہی عام واقعہ اِس کے لیے کافی ہے کہ لوگ اپنے مرنے کو مسلسل طور پر یادرکھیں۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی موت سے غافل نہ ہوں۔

موت گویا کہ ایک حدِ فاصل ہے۔ موت کے ایک طرف موجودہ دنیا ہے، جس کو ایک سرسبز باغ (green garden) کہا جاسکتا ہے۔ موت کے دوسری طرف، آخرت کی دنیا ہے جو گویا کہ ایک صحرا (desert) ہے۔ موت کے وقت ایسا ہوتا ہے کہ اچانک آدمی موجودہ سرسبز دنیا سے نکل کر ایک لامحدود صحرا میں پہنچ جاتا ہے۔ وہ اچانک پاتا ہے کہ پچھلی سرسبز دنیا میں اب وہ واپس نہیں جاسکتا۔ اس کے آگے وہ لامحدود صحرا ہوتا ہے جہاں اُس کے لیے زندگی کے سامانوں میں سے کوئی سامان موجود نہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ: کفی بالموت واعظاً (البیهقی، رقم الحدیث: 10072) یعنی انسان کی نصیحت کے لیے موت ہی کافی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اگر موت کو یاد کرتا رہے تو صرف یہی چیز اِس کی زندگی کی اصلاح کے لیے کافی ہوجائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ موت کی یاد کیرم بورڈ کی اصطلاح میں گویا ماسٹر اسٹروک (master stroke) کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ آدمی کی پوری زندگی کو بدل دیتی ہے۔

موجودہ دنیا میں انسان مختلف سہاروں کے درمیان جیتا ہے۔ یہ سہارے اُس کو ہمیشہ بھلاوے میں رکھتے ہیں۔ موت کی یاد اس کو بتاتی ہے کہ یہ تمام سہارے اچانک ٹوٹ جائیں گے۔ موت آتے ہی آدمی بالکل بے سہارا بن کر رہ جائے گا— موت کا یہی وہ پہلو ہے، جس کی بنا پر اس کو اصلاح کا سب سے بڑا ذریعہ بتایا گیا ہے۔

موت کا استحضار

ایک حدیث کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **موتوا قبل أن تموتو** (**حاشية السندي على ابن ماجه، رقم الحديث**: 122) یعنی موت سے پہلے مر جاؤ۔

اِس حدیث میں وہی بات کہی گئی ہے جو ایک دوسری روایت میں اِن الفاظ میں آئی ہے: **أكثروا ذكر هادم اللذات الموت** (**الترمذي، كتاب الزهد**) یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کرو، جو لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے۔

موت کے بارے میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں۔ اُن سب کا خلاصہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے — موت کے زندہ استحضار میں جینا۔

موت کا زندہ استحضار کوئی سادہ بات نہیں۔ کیرم بورڈ کی اصطلاح کے مطابق، یہ ایک ماسٹر اسٹروک (master stroke) ہے۔ موت کا زندہ استحضار آدمی کی پوری شخصیت کو ہلا دیتا ہے۔ وہ اس کے اندر ایک روحانی انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔

اگر آپ کی پیدائش 10 جولائی کو ہوئی ہے تو یہ سوچیے کہ 10 جولائی سے پہلے میرا کوئی وجود نہ تھا۔ جلد ہی جب موت آئے گی تو اس کے بعد بھی موجودہ دنیا میں میرا کوئی وجود نہ ہوگا۔ آدمی اگر اِس حقیقت کو دھیان میں رکھے تو یہی ایک چیز اس کی پوری زندگی کی اصلاح کے لیے کافی ہو جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ موت کی زندہ یاد کسی انسان کے لیے ایک دھماکہ سے کم نہیں۔ موت کی زندہ یاد آدمی سے انا (ego) کے جذبے کو چھین لیتی ہے۔ موت کی زندہ یاد برتری کے احساس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ موت کی زندہ یاد غصہ، حسد اور انتقام جیسے منفی جذبات کو مٹا دیتی ہے۔

موت کی زندہ یاد آدمی کے اندر سے حرص کو اِس طرح ختم کر دیتی ہے جیسے کہ اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ موت کی زندہ یاد آدمی کو محاسبہ کی سوچ میں جینے والا بنا دیتی ہے، اور جو آدمی محاسبہ کی سوچ میں جینے لگے، اس کو غلط کام میں ملوث ہونا ایسا ہی معلوم ہوگا جیسے کہ جلتی ہوئی آگ میں کودنا۔

موت کیا ہے

موت ایک ایسی سنگین حقیقت ہے جس کا سامنا ہر عورت اور مرد کو لازماً کرنا ہے۔ کوئی بھی چھوٹا یا بڑا، کمزور یا طاقت ور اِس عام قانون سے مستثنیٰ نہیں۔ موت کیا ہے—— موت ایک لفظ میں، موجودہ دنیا سے جبری اخراج ہے اور اگلی دنیا میں جبری داخلہ:

Death is a compulsory exit from this world
and a compulsory entrance to the next world.

زندگی ایک سفر ہے اور موت اِس سفر کا اختتام۔ موت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی موجودہ دنیا سے نکل کر آخرت کی دنیا میں داخل ہو جائے۔ یہ داخلہ ایک ابدی داخلہ ہے۔ دوسرے سفروں میں واپسی ممکن ہوتی ہے، لیکن موت کا سفر ایک ایسا سفر ہے جس کے بعد پچھلی دنیا کی طرف واپسی ممکن نہیں۔ موت کا یہ پہلو اتنا سنگین ہے کہ، حدیث کے الفاظ میں، وہ ہر قسم کی لذتوں کو ڈھا دینے والا ہے۔ جو آدمی موت کو حقیقی طور پر یاد رکھے، وہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت میں جینے لگے گا۔

موت ایک ایسا واقعہ ہے جب کہ آدمی اچانک اکیلا ہو جاتا ہے۔ اس کا گھر، اس کا خاندان، اس کے ساتھی، اس کا کاروبار، اس کی شہرت وعظمت ہر چیز اچانک اس سے الگ ہو جاتی ہے۔ وہ ایک ایسی جگہ پہنچ جاتا ہے، جہاں وہ مکمل طور پر بے سہارا ہوتا ہے۔

مزید یہ کہ دنیا میں اس کے لیے یہ موقع تھا کہ وہ یہاں کے ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے اپنے لیے ایک دنیا کی تعمیر کرے، موت کے بعد یہ تمام ذرائع اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر وہ چاہے کہ وہ دوبارہ اپنی زندگی کا نیا منصوبہ بنائے اور پھر سے اپنی زندگی کی تشکیل کرے، تو آخرت کے عالم میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔

موت زندگی کا خاتمہ نہیں۔ موت ایک نئے دورِ حیات کا آغاز ہے۔ عقل مند وہ ہے جو آج کے ملے ہوئے مواقع کو کل کے لیے استعمال کرے۔

موت کی یاد کیا ہے

موت کی یاد کیا ہے، موت کی یاد کا مطلب دراصل یہ ہے کہ موت رُخی منصوبہ بندی (death-oriented planning) کی جائے، موت کی صورتِ حال سے عہد برآ ہونے کے لیے اس کی پیشگی تیاری کی جائے۔ موت کے لیے سوچنا ویسا ہی ہے جیسے زندگی کے لیے سوچنا۔

کسی گھر میں جب ایک بچہ پیدا ہوتا ہے تو فوراً ہی اس کی زندگی کی پلاننگ (planning) شروع ہوجاتی ہے۔ اُس کو تعلیم کے ایک ایسے کورس میں داخل کیا جاتا ہے جس کی تکمیل اس کے لیے بہتر جاب (job) کی یقینی ضمانت ہو۔

یہی معاملہ موت کا ہے۔ موت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اِس کے لیے تیار کرے کہ وہ موت کے بعد کے مرحلۂ حیات میں اپنے لیے ایک اچھی جگہ حاصل کرسکے۔

موت کی یاد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی موت کے بعد پیش آنے والے مرحلۂ حیات پر غور کرے، وہ اُس کے مطابق اپنا ذہن بنائے، وہ اپنے اندر وہ صفات پیدا کرے جو موت کے بعد کی زندگی میں کام آنے والی ہیں، وہ اپنے اندر ایسی شخصیت کی تعمیر کرے جو موت کے بعد کے حالات میں اس کو سرفرازی عطا کرنے والی ہو۔

موجودہ زندگی میں اگر ایک شخص اچھی تعلیم حاصل نہ کرسکے تو اپنی عمر کے باقی حصے میں وہ ہمیشہ حسرت (regret) میں پڑا رہتا ہے۔ وہ سوچتا رہتا ہے کہ کاش، میں نے اچھی تعلیم حاصل کی ہوتی تو آج میں اچھا جاب حاصل کرسکتا تھا۔ یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانے پر موت کے بعد آنے والے مرحلۂ حیات (post-death period) کا ہے۔

جو لوگ موت سے پہلے، موت کے بعد والی زندگی کے لیے تیاری کریں، وہ وہاں خوشیوں کے ماحول میں زندگی گزاریں گے، اور جو لوگ ایسا نہ کرسکیں، وہ ہمیشہ کے لیے حسرت میں پڑے رہیں گے، جب کہ دنیا کی حسرت کے مقابلے میں، آخرت کی حسرت ناقابلِ بیان حد تک دردناک ہے۔

موت کا بھونچال

دروازے پر دستک ہوئی۔کوئی صاحب مجھ سے ملنے کے لیے آئے تھے دستک کی آواز سن کر اچانک مجھے خیال آیا کہ اِسی طرح ایک دن موت کا فرشتہ یہاں آجائے گا۔موت کا فرشتہ جب آئے گا تو اس کو دستک دینے کی ضرورت نہیں ہوگی،حتی کہ اس کے لیے یہ بھی ضروری نہیں ہوگا کہ گھر کا دروازہ کھلے اوراس کے بعد وہ اندرداخل ہو۔موت کے فرشتے کو نہ صاحبِ خانہ سے اجازت لینے کی ضرورت ہوگی اورنہ کسی کی رکاوٹ اس کے لیے روک ثابت ہوگی۔وہ یک طرفہ فیصلے کے تحت اچانک آدمی کے پاس پہنچ جائے گا اوراس کی روح قبض کر کے چلا جائے گا۔

موجودہ دنیا میں دو چیزیں ایسی ہیں جو مکمل طور پر بلا اطلاع آتی ہیں۔ان کو نہ ہم روک سکتے ہیں اورنہ ان کی آمد کو پیشگی طور پر جان سکتے ہیں۔یہ دو چیزیں ہیں— موت اوربھونچال۔

بھونچال زمین کے اوپر آتا ہے اورموت انسان کے اوپر آتی ہے۔مگر حقیقت یہ ہے کہ موت بھونچال سے زیادہ خطرناک ہے۔بھونچال بے روح مادّے کے اوپر آتا ہے،لیکن موت زندہ انسان کے اوپر آتی ہے۔ بھونچال کی تباہی آج (today) کی نسبت سے ہوتی ہے، اور موت کی تباہی کل (tomorrow) کی نسبت سے۔موت کا سنگین ترین پہلو یہ ہے کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں،موت ایک نئی زندگی کا آغاز ہے۔موت کے بعد آدمی ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔اس کے پیچھے وہ دنیا ہوتی ہے جس کو وہ مکمل طور پر چھوڑ چکا،اوراس کے آگے وہ دنیا ہوتی ہے جہاں وہ بالکل اکیلا ہوتا ہے اورکامل طور پر بے سروسامان بھی۔حدیث میں آیا ہے: **الكيس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت (الترمذي، كتاب القيامة)** یعنی عقل مند وہ ہے جو دنیا کے معاملے میں اپنے نفس پر قابو رکھے اورموت کے بعد کے معاملے کو اپنے عمل کا نشانہ بنائے۔موت آدمی کے لیے اِسی حقیقت کی یاددہانی ہے۔ موت زندگی کے لیے سب سے بڑے معلم کی حیثیت رکھتی ہے۔جو آدمی موت سے یہ سبق لے سکے،اس کا پورا رویہ درست ہوجائے گا۔وہ ہر معاملے میں آخری حد تک محتاط بن جائے گا۔

سب سے بڑی غلط فہمی

موجودہ دنیا میں آدمی کو ضرورت کی تمام چیزیں ملی ہوئی ہیں۔ یہ صورتِ حال ہر شخص کو غلط فہمی میں ڈالے ہوئے ہے۔ ہر آدمی سمجھتا ہے کہ یہ چیزیں اس کا حق ہیں اور وہ ہمیشہ اِسی طرح اُس کو حاصل رہیں گی۔ حالاں کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں آدمی کو صرف عارضی طور پر امتحان کے لیے دی گئی ہیں۔امتحان کی مقرر مدت تک وہ اس کو حاصل رہیں گی اور اس کے بعد اچانک وہ اس سے چھن جائیں گی۔موت ختمِ مدت کا یہی لمحہ ہے۔

موت کے بعد انسان اِسی طرح باقی رہے گا، مگر چیزیں سب کی سب اُس سے چھن چکی ہوں گی۔انسان ایک محتاج مخلوق ہے۔اس کو اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے بہت سی چیزیں درکار ہیں۔ یہ تمام چیزیں پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دے دی ہیں۔

مگر قبل از موت دورِ حیات اور بعد از موت دورِ حیات میں ایک فرق ہے۔قبل از موت دورِ حیات میں یہ چیزیں عمومی تقسیم (general distribution) کے طور پر سب کو ملی ہوئی ہیں، لیکن بعد از موت دورِ حیات میں یہ صورت حال بدل جائے گی۔ اُس وقت انتخابی تقسیم (selective distribution) کا اصول رائج ہو جائے گا، اور پھر کوئی پائے گا اور کوئی مکمل طور پر محروم رہے گا۔موت اِسی سنگین واقعے کے لیے ایک یاددہانی کی حیثیت رکھتی ہے۔

دنیا میں روزانہ ایک لاکھ سے زیادہ لوگ مرجاتے ہیں۔ یہ مرنے والے لوگ خاموش زبان میں یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم زندگی کے پہلے دور سے نکل کر دوسرے دور میں جا رہے ہیں۔تمھارے اوپر بھی لازماً یہ وقت آنے والا ہے۔ہم اپنا موقع کھو چکے۔تم ہوشیار ہو جاؤ اور ہماری طرح کھونے والے مت بنو۔ہم اب لوٹ کر دوبارہ اس دنیا میں نہیں آسکتے۔تمھارے اوپر بھی ایک دن وہ لمحہ آئے گا، جب کہ تم موجودہ ملے ہوئے موقع کو پوری طرح کھو دو گے۔ اِس حقیقت کو جانو اور اس کے مطابق، اپنی زندگی کا منصوبہ بناؤ۔

نامعلوم منزل کی طرف سفر

نومبر 1984 میں مجھے ایک انوکھے قسم کا دعوت نامہ ملا۔ یہ دعوت نامہ بظاہر ایک کانفرنس کی طرف سے تھا، لیکن اس میں ضروری تفصیلات موجود نہ تھیں۔ مجھ کو جو چیز ملی، وہ صرف فرسٹ کلاس کا ایک رٹرن ٹکٹ تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا: Delhi-Casablanca-Delhi

جب یہ ہوائی ٹکٹ مجھ کو ملا، اُس وقت کیسا بلانکا (مراکو) میرے لیے ایک غیر معروف نام تھا۔ میں کیسا بلانکا کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ میں اِس سفر کے بارے میں سخت متردد تھا۔ لیکن جب تاریخ آئی تو میں بادلِ ناخواستہ دہلی ائر پورٹ گیا اور ڈرتے ہوئے ہوائی جہاز کے اندر بیٹھ گیا۔ ہوائی جہاز بلند ہو کر فضا میں اڑنے لگا۔ میرے دل میں عجیب وغریب قسم کے خیالات آرہے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ جہاز مجھ کو کہاں پہنچائے گا اور وہاں سے پھر میں کہاں جاؤں گا۔

ہوائی جہاز پرواز کرتا رہا، یہاں تک کہ وہ وقت آیا جب کہ اناؤنسر نے یہ اعلان کیا کہ ہمارا جہاز جلد ہی کیسا بلانکا کے ائر پورٹ پر اترنے والا ہے۔ تمام مسافر ایک ایک کرکے جہاز سے اتر گئے۔ آخر میں میں اپنی سیٹ سے اٹھا اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے ہوائی جہاز کے باہر آیا۔ اُس وقت میرا عجیب حال تھا۔ ائر پورٹ پر کوئی مجھ کو ریسیو (receive) کرنے والا موجود نہ تھا۔ (بقیہ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، الرسالہ جنوری 1985، صفحہ 31-30)

یہ واقعہ مجھ کو اکثر یاد آتا رہتا ہے۔ مجھ کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ میں ایک غیر مرئی جہاز پر بیٹھا ہوں اور وہ جہاز مجھ کو لئے ہوئے تیزی سے آخرت کی دنیا کی طرف مسلسل چلا جارہا ہے۔ اچانک وہ وقت آئے گا، جب کہ یہ اعلان کیا جائے گا کہ ہمارا جہاز آخرت کے ائر پورٹ پر اتر گیا۔ مسافر ہوائی جہاز سے نکل کر باہر چلے جائیں۔ جب میں باہر آؤں گا تو وہاں ایک بالکل اجنبی دنیا ہوگی، جہاں نہ کوئی ساتھی ہوگا اور نہ کوئی سامان۔ اپنے لوگوں میں سے کوئی وہاں موجود نہ ہوگا جو میرا استقبال کرے — کیسا عجیب وقت آنے والا ہے، میرے لیے بھی، اور دوسروں کے لیے بھی۔

عجیب بھول

جج نے ملزم کے مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے کہا— کل صبح 6 بجے تم کو پھانسی دے دی جائے گی۔ ملزم اس کو سن کر زور زور سے ہنسنے لگا۔ جج نے پوچھا: تم کیوں ہنس رہے ہو۔ ملزم نے جواب دیا: جناب، میں تو صبح 8 بجے تک سوتا رہتا ہوں۔ یہ ایک لطیفہ ہے، لیکن عملاً تمام لوگ اِسی طرح کی خودساختہ سوچ میں مبتلا ہیں۔ عورت بھی اور مرد بھی۔ غریب بھی اور امیر بھی، بوڑھے بھی اور جوان بھی۔

لوگوں کی یہی عجیب سوچ موت کے بارے میں ہے۔ ہر روز اور ہر جگہ لوگ مر رہے ہیں۔ ہر آدمی دیکھتا ہے کہ کل ایک شخص زندہ موجود تھا اور آج وہ مر کر اِس دنیا سے چلا گیا۔ اِس قسم کے واقعات ہر آدمی کو ہر روز یاد دلاتے ہیں کہ کل ''6 بجے'' تمھارا وقت آ سکتا ہے، لیکن ہر آدمی مذکورہ ملزم کی طرح اِس نفسیات میں جی رہا ہے کہ میں تو ''8 بجے'' تک سوتا ہوں، پھر موت کا فرشتہ مجھ کو کہاں پائے گا جو میری روح قبض کرے۔

ہر آدمی کسی نہ کسی محفوظ قلعے میں جی رہا ہے۔ کوئی شخص اپنی فیملی میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے، کوئی اپنی شہرت کو، کوئی شخص اپنی دولت کو اور کوئی اپنے عہدے کو اپنے لیے محفوظ پناہ گاہ سمجھے ہوئے ہیں۔ ہر ایک شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھتا ہے کہ میں اتنا زیادہ دور ہوں کہ موت کے فرشتے کی رسائی وہاں تک ہونے والی نہیں۔

اِسی خودساختہ نفسیات کا یہ نتیجہ ہے کہ کوئی شخص اپنی موت کے بارے میں نہیں سوچتا، کسی مجلس میں موت کا تذکرہ نہیں ہوتا، کوئی شخص موت کے تصور سے خوف زدہ نہیں ہوتا، کسی کا یہ حال نہیں کہ موت کے تصور نے اس کی لذتوں کو ڈھا دیا ہو، موت کے تصور نے اس کے عیش کو مکدّر کر دیا ہو، کسی پر یہ حالت نہیں گزرتی کہ موت کی یاد اس کے دن کے چین کو چھین لے اور موت کی یاد اس کی رات کی نیند کو ختم کر دے— موت کا تصور سب سے بڑا انقلابی تصور ہے۔ لیکن کوئی شخص موت کی یاد میں جینے والا نہیں، اِس لیے کسی آدمی کی زندگی میں انقلاب بھی برپا نہیں ہوتا۔

خوش گوار آغاز، دردناک انجام

ایک مسلمان نے محنت سے تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے ایک مشہور کالج سے قانون کی ڈگری لی۔ اِس کے بعد انھوں نے چارٹرڈ اکاؤنٹنسی کا کورس امتیازی نمبر کے ساتھ پاس کیا۔ جلد ہی بعد اُن کو ایک پٹروڈالر والے ملک میں چیف اکاؤنٹنٹ کا عہدہ مل گیا۔ وہاں انھوں نے کافی پیسہ کمایا۔ اس کے بعد وہ اپنے ملک میں واپس آگئے۔ یہاں کے ایک بڑے شہر میں انھوں نے بلڈر کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ انھوں نے کافی دولت کمائی اور کئی پراپرٹی بنائی۔ وہ قرآن کے الفاظ میں اِسی تکاثر میں ہمہ تن مشغول تھے کہ صرف 65 سال کی عمر میں اچانک ان کا انتقال ہوگیا۔ اچانک وہ خالی ہاتھ اِس دنیا سے چلے گئے۔

اِس واقعے کو سن کر میں نے سوچا کہ موجودہ زمانے میں کم وبیش ہر آدمی کا یہی کیس ہے۔ اِس دنیا میں ہر آدمی ہارڈ لائف جیتا ہے اور پیسہ کماتا ہے، صرف اِس لیے کہ وہ اپنے نااہل بچوں کو ایزی منی (easy money) دے کر اِس دنیا سے چلا جائے۔

یہ گویا ایک خوش گوار آغاز کا ایک دردناک انجام ہے۔ ہر آدمی کم وبیش اِس کی ایک مثال ہے۔ جاہل اور عالم، مذہبی اور غیر مذہبی، تقریباً سب کا کیس یہی ہے۔ ہر آدمی بظاہر اپنے کو کامیاب سمجھتا ہے، لیکن موت ہر آدمی کے لیے یہ سبق لے کر آتی ہے کہ تم صرف ایک محروم انسان ہو۔ اِس صورتِ حال نے ہر آدمی کے کیس کو کامیابی سے محرومی کی طرف سفر کا کیس بنادیا ہے۔

یہ اندوہ ناک صورت حال اِس لیے جاری ہے کہ مرنے والا دوبارہ لوٹ کر اِس دنیا میں نہیں آتا، تاکہ وہ لوگوں کو زندگی اور موت کی حقیقت سے باخبر کرائے۔ مرنے کے بعد انسان حقیقت سے باخبر ہوجاتا ہے، مگر یہ باخبر انسان دوبارہ دنیا کی طرف نہیں لوٹتا— زندہ انسان حقیقت سے بے خبر ہے، اور یہ بے خبر انسان مرنے والوں سے پوچھ کر حقیقت کو دریافت نہیں کرسکتا۔ انسانی تاریخ اِس دوطرفہ محرومی کا دوسرا نام ہے۔

طربیہ یا المیہ

پنڈت جواہر لال نہرو (وفات: 1964) ایک دولت مند باپ کے بیٹے تھے۔ چناں چہ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ — نہرو اپنے منہ میں چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے تھے:

Nehru was born with a silver spoon in his mouth.

جواہر لال نہرو کو اپنی زندگی میں بہت زیادہ شہرت اور کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن 1962 کے حادثے کے بعد وہ سخت مایوسی کا شکار ہوئے اور اِسی حال میں صرف 75 سال کی عمر میں وہ اچانک مر گئے۔ وہ اِس دنیا سے اِس طرح چلے گئے کہ ان کے اپنے مادی وجود کے سوا تمام دوسری چیزیں ان کا ساتھ چھوڑ چکی تھیں۔

یہی کم وبیش ہر پیدا ہونے والے انسان کا حال ہے۔ ہر ایک گویا کہ ''چاندی کے چمچہ'' کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور پھر جلد ہی ایک عاجز اور مجبور انسان کی حیثیت سے وہ اِس دنیا سے چلا جاتا ہے:

Everyone is born with a silver spoon in his mouth. But everyone dies helplessly without any spoon in his mouth.

انسانی زندگی کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے جس کے بارہ میں ہر عورت اور مرد کو سوچنا چاہیے۔ ہر آدمی کا کیس عملاً صرف ایک ہے —

کامیاب زندگی، ناکام موت، امیدوں کے ساتھ آغاز، مایوسی کے ساتھ خاتمہ۔ ہر عورت اور مرد کی کہانی ایک ایسی کہانی ہے جو اپنے آغاز میں طربیہ (comedy) ہے، اور اپنے انجام میں صرف المیہ (tragedy)۔

اِس دنیا میں کامیاب انسان وہ ہے جو اِس حقیقت کو جانے اور اِس حقیقت کے گہرے شعور کے ساتھ اپنی زندگی کا منصوبہ بنائے۔ یہی موجودہ دنیا میں کسی عورت یا کسی مرد کی کامیابی کا راز ہے۔ یہی وہ معیار ہے جس پر کسی انسان کی کامیابی یا ناکامی کا تعین کیا جائے گا۔

موت سے ہار

یوپی کے ایک گاؤں کا واقعہ ہے۔ یہاں کسی قسم کی کوئی ترقی موجود نہ تھی۔ 1947 سے پہلے کی بات ہے، یہاں کے ایک زمین دار کے گھر میں پہلی بار ہینڈ پمپ لگایا گیا۔ گاؤں کے لوگوں نے دیکھا کہ جب اس کو چلایا جاتا ہے تو اس سے پانی نکلنے لگتا ہے۔ یہ دیکھ کر دلت خاندان کی ایک بوڑھی عورت نے تعجب سے کہا: مَنئی مَوتیاِ سے ہارا ہے (آدمی صرف موت سے ہارا ہے)۔

گاؤں کی اس بوڑھی خاتون کے لیے ہینڈ پمپ بہت بڑی چیز تھی، اِس لیے اُس نے ایسا کہا۔ لیکن یہی بات دوسری تمام ترقیوں کی نسبت سے بھی درست ہے۔

انسان بڑی بڑی ترقیاں کرتا ہے، وہ بادشاہت قائم کرتا ہے، وہ دولت کے انبار اکھٹا کرتا ہے، وہ خشکی پر کار دوڑاتا ہے، وہ سمندروں میں جہاز چلاتا ہے، وہ فضا میں ہوائی جہاز اڑاتا ہے، وہ بڑی بڑی صنعتیں قائم کرتا ہے، وہ عالمی کمیونی کیشن کے طریقے ایجاد کرتا ہے، وہ نہایت اونچی عمارتیں (sky scrapper) کھڑی کرتا ہے، وغیرہ۔

موت کے مقابلے میں ہر ایک کے لیے شکست مقدر ہے۔ کسی کا عہدہ، کسی کی مقبولیت، کسی کی دولت، کسی کا اقتدار، غرض کسی کی کوئی چیز اس کو موت سے بچانے والی ثابت نہیں ہوتی۔

ہر پیدا ہونے والے مرد اور عورت کا یہ انجام ہوتا ہے کہ وہ مجبور ہو کر موت کے فیصلے کو قبول کرتا ہے، ہر آدمی کچھ مدت تک زمین کے اوپر چلتا ہے، پھر اس کو موت آجاتی ہے اور اس کو قبر کے گڑھے میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ یہ انجام ہر عورت اور مرد کے لیے مقدر ہے۔ اِس معاملے میں کسی بھی شخص کا کوئی استثنا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موت کا سوال سب سے بڑا سوال ہے جس پر ہر زندہ انسان کو سوچنا چاہیے۔ موت کا مسئلہ وہ سب سے بڑا مسئلہ ہے جس کی حقیقت جاننے کے لیے اپنے ساری توانائی لگا دینا چاہیے۔ جو لوگ موت کو نہ جانیں، وہ یقینی طور پر زندگی کو بھی نہیں جانتے۔

مستقبل سے بے خبر

اِس زمانے میں ہر آدمی کا کیس صرف ایک ہے— حال (present) سے باخبر اور مستقبل (future) سے بے خبر۔ اِنھیں دولفظوں میں آج کے تمام انسانوں کی کہانی چھپی ہوئی ہے۔ اِس میں مذہبی انسان اور غیر مذہبی انسان کا کوئی فرق نہیں۔

یہ صورت حال اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک نئی صورتِ حال ہے۔ پچھلے زمانوں میں بھی انسان عاجلہ پسند ہوتا تھا، لیکن پچھلے زمانے کے انسان کی عاجلہ پسندی محدود درجے میں ہوا کرتی تھی۔ موجودہ زمانے میں جو نئے اسباب پیدا ہوئے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ صرف ایک چیز ہر آدمی کا نشانہ بن گیا ہے۔ ہر آدمی اپنی ساری توانائی مال کے حصول میں لگا دیتا ہے، پھر اچانک اس کی موت آجاتی ہے۔ وہ اپنی ساری کمائی کو چھوڑ کر ایک نامعلوم منزل کی طرف چلا جاتا ہے۔ یہی نامعلوم منزل ہر انسان کا مستقبل ہے، لیکن کسی عورت یا مرد کو اِس مستقبل کی کوئی فکر نہیں۔

انسان کو دو قسم کے مستقبل (future) کا سامنا کرنا پڑتا ہے — ایک، قریبی مستقبل۔ قریبی مستقبل کا تعلق موت سے پہلے والی زندگی سے ہے۔ اور دوسرا، بعید مستقبل۔ بعید مستقبل کا تعلق اُس زندگی سے ہے جو موت کے بعد سامنے آنے والی ہے۔ قریبی مستقبل کا سوال ایک عارضی سوال ہے، لیکن بعید مستقبل کا سوال ایک ابدی سوال۔

حدیث میں آیا ہے کہ: **مَنْ أحبَّ دنیاہ أخسّر بآخرته، ومن أحبّ آخرته أضرّ بدنیاہ۔ فآثروا ما یبقی علی ما یفنیٰ** (**رواہ أحمد والبیهقي** بحوالہ **مشکاۃ المصابیح، رقم الحدیث** 5179) یعنی جو شخص دنیا سے محبت کرے گا، وہ اپنی آخرت کا نقصان کرے گا۔ اور جو شخص اپنی آخرت سے محبت کرے گا، وہ اپنی دنیا کا نقصان کرے گا۔ تم فنا ہونے والی چیز پر باقی رہنے والی چیز کو ترجیح دو۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی ترجیح (priority) کا نام ہے۔ صحیح ترجیح آدمی کو کامیابی کی طرف لے جاتی ہے، اور غلط ترجیح ہمیشہ ناکامیابی کی طرف۔

موت، موت کی یاد

موت بلاشبہہ ہر انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ موت گویا ایک انفرادی زلزلہ ہے۔ عام زلزلہ زمین کی سطح پر واقع ہوتا ہے اور موت ایک فرد کی سطح پر پیش آتی ہے۔ جس طرح انسان زلزلے کو روکنے پر قادر نہیں، اُسی طرح کوئی شخص موت کو روکنے پر بھی قادر نہیں۔ زلزلہ بھی یک طرفہ فیصلے کے تحت بلا اطلاع آتا ہے، اِسی طرح موت بھی یک طرفہ فیصلے کے تحت کسی شخص پر وارد ہوتی ہے۔ زلزلے کو لوٹانا ممکن نہیں۔ اِسی طرح موت کو لوٹانا بھی ممکن نہیں۔ زلزلے کے مقابلے میں انسان مکمل طور پر بے بس ہوتا ہے۔ اِسی طرح موت کے مقابلے میں بھی انسان مکمل طور پر بے بس ہے۔ انسان کو کوئی ذاتی اختیار نہ زلزلے کے اوپر ہے اور نہ موت کے اوپر۔

موت قاطعِ حیات ہے، اور موت کا ذکر قاطعِ خودی۔ خودی (ego) کسی انسان کی سب سے بڑی صفت ہے۔ مگر یہی خودی انسان کی تمام خرابیوں کا سبب بن جاتی ہے۔ خودی کی بنا پر کسی انسان کے اندر وہ شخصیت بنتی ہے جس کو خود پسند (self-centered) شخصیت کہا جاتا ہے۔ یہی وہ خود پسند شخصیت ہے جو آدمی کے اندر ذاتی بڑائی کا جذبہ پیدا کرتی ہے، اِسی خود پسندی کا نتیجہ وہ تمام منفی اوصاف ہوتے ہیں جن کو غرور، حسد، ظلم، تشدد پسندی اور انتقام، وغیرہ جیسے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔

موت اِن تمام منفی جذبات کے لیے قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس آدمی کو حقیقی معنوں میں موت کا زندہ شعور حاصل ہو، جو اِس حقیقت کو دریافت کرلے کہ مجھے لازماً مرنا ہے اور موت کے بعد مجھے رب العالمین کے سامنے حاضر ہونا ہے، وہ ایک کٹ ٹو سائز (cut to size) انسان بن جاتا ہے۔ ایسا انسان آخری حد تک ایک متواضع (modest) انسان ہوجائے گا۔ ذاتی بڑائی کا احساس اُس سے چھن جائے گا۔ وہ کامل طور پر عجز (helplessness) کے احساس میں جینے لگے گا۔ بے اعترافی کا طریقہ چھوڑ کر وہ اعتراف کا طریقہ اختیار کرلے گا۔ وہ حق کے آگے جھک جائے گا، بجائے اِس کے کہ وہ حق کو خود اپنے سامنے جھکانے کی کوشش کرے۔

موت کا تجربہ

امریکا کی مشہور ٹینس کھلاڑی مارٹینا (Martina Navratilova) کی عمر 55 سال ہے۔ وہ طبی مشورے کے لئے ایک ڈاکٹر کے پاس گئی۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ تمھارے پھیپھڑے میں کینسر ہو چکا ہے اور وہ اگلے اسٹیج میں ہے۔ ڈاکٹر کی تشخیص (diagnosis) کو بتاتے ہوئے مذکورہ خاتون نے کہا کہ یہ خبر میرے لیے نائن الیون کے برابر ہے:

It was such a shock for me. It was my 9/11.

خاتون نے یہ بات اس لیے کہی کہ موت اُس کو بالکل قریب دکھائی دینے لگی۔ لیکن موت کے بعد کا جو مرحلہ ہے، وہ اِس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ موت، قرآن کے الفاظ میں، اسباب کے کامل تقطّع (2: 165) کا نام ہے۔ موت کے بعد اچانک آدمی ایک اور دنیا میں پہنچ جاتا ہے جو موجودہ دنیا کے مقابلے میں ہر اعتبار سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ موت کے بعد اچانک انسان پر دو سنگین حقیقتیں کھل جاتی ہیں — ایک یہ کہ اب موت سے پہلے والے دور میں واپسی ممکن نہیں، جہاں اس نے اپنی ایک دنیا بنائی تھی۔ دوسرے یہ کہ موت کے بعد والے دور میں وہ اپنے لیے ایک اور دنیا نہیں بنا سکتا۔ یہ احساس آدمی کو ابدی مایوسی اور ابدی حسرت میں مبتلا کر دے گا، اور بلا شبہہ ابدی مایوسی اور ابدی حسرت سے زیادہ اذیت ناک تجربہ اور کوئی نہیں۔

موجودہ دنیا کا معاملہ یہ ہے کہ یہاں اگر ایک چانس (chance) کھو یا جائے تو اس کے بعد اس کو دوسرا چانس (second chance) مل جاتا ہے جس کے ذریعے وہ اپنی ہاری ہوئی بازی کو دوبارہ جیت میں تبدیل کر سکے۔ لیکن آخرت میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ آخرت میں ایسا نہیں ہو سکتا کہ آدمی اپنے لیے دوسرا چانس پالے۔ آخرت میں کسی انسان کے لیے دوبارہ کوئی چانس نہیں۔ پہلے چانس یا دوسرے چانس یا تیسرے چانس کا معاملہ صرف موجودہ دنیا میں پیش آتا ہے۔ آخرت کی دنیا مکمل طور پر اِس سے مختلف ہے۔ آخرت میں صرف انجام ہے، وہاں کسی کو دوبارہ نیا آغاز ملنے والا نہیں۔

موت کا سبق

17 جنوری 2010 کو جیوتی باسو (Jyoti Basu) کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 96 سال تھی۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے بڑے لیڈروں میں سے تھے۔ وہ مسلسل 23 سال تک ویسٹ بنگال کے چیف منسٹر رہے۔ ان کی وفات کا سبب ڈاکٹروں نے جسم کے کئی اعضا کا فیل ہو جانا (multi organ failure) بتایا ہے۔

انسان کو اِس دنیا میں جو جسم ملا ہے، وہ ایک مکمل نوعیت کا زندہ کارخانہ ہے۔ اِس میں بیک وقت بہت سے نظام کام کررہے ہیں— سوچنے کا نظام، دیکھنے کا نظام، سننے کا نظام، ہضم کا نظام، حرکتِ قلب کا نظام، سانس لینے کا نظام، اعضا کو متحرک کرنے کا نظام، وغیرہ۔

یہ تمام نظام نہایت متوافق طور پر عمل کرتے ہیں تب یہ ممکن ہوتا ہے کہ کوئی انسان ایک زندہ وجود کے طور پر دنیا میں اپنا کام کرے۔

مثلاً نظامِ حافظہ اگر کام نہ کرے تو آدمی کو کوئی بات یاد نہیں رہتی، نظامِ بصارت کام نہ کرے تو آدمی اندھا ہو جاتا ہے، نظامِ سماعت کام نہ کرے تو آدمی کو کچھ سنائی نہیں دیتا، نظامِ نطق کام نہ کرے تو آدمی گونگا ہو جاتا ہے، نظامِ ہضم کام نہ کرے تو آدمی کی صحت خراب ہو جاتی ہے، نظامِ حرکت کام نہ کرے تو آدمی اپاہج بن جاتا ہے۔ نظامِ تنفس کام نہ کرے تو آدمی کے لیے سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اگر نظامِ قلب کام نہ کرے تو آدمی کے لیے زندہ رہنا ہی ناممکن ہو جاتا ہے، وغیرہ۔

موت اِس حقیقت کا اعلان ہے کہ انسان کے وجود کے مختلف نظام کسی اور کے قبضۂ اختیار میں ہیں۔ وہ جب تک چاہے، انسان کو زندہ رکھے اور جب چاہے، انسان پر موت طاری کردے۔ ہر روز دنیا میں موت کے تقریباً ایک لاکھ واقعات ہوتے ہیں جو انسان کو یہ سب سے بڑی خبر سنا رہے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہی سب سے بڑی خبر ہے جس کا شعوری علم کسی زندہ انسان کو نہیں۔

موت کا زندہ تصور

31 جنوری 2010 کو میرے چھوٹے بھائی عبد المحیط خاں (انجینئر) کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت وہ فیض آباد (یوپی) میں تھے۔ ان کی عمر تقریباً 75 سال تھی۔ میں نے اپنی لمبی عمر میں ہزاروں افراد کو مرتے ہوئے دیکھا ہے یا ان کی موت کی خبر سنی ہے۔ لیکن میرے بھائی کی موت میرے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ اس نے میرے اندر ایک نیا تصور پیدا کیا۔ اس کو اگر میں کوئی نام دوں تو میں کہوں گا کہ موت کا زندہ تصور (living concept of death)۔

میں نے غور کیا کہ موت کے بارے میں یہ نیا شعور میرے اندر کیوں پیدا ہوا۔ اصل یہ ہے کہ ہم لوگ 6 بھائی بہن تھے۔ چھوٹے بھائی کے انتقال کے بعد مجھے اچانک محسوس ہوا کہ میرے سوا تمام بھائی بہن مر چکے ہیں۔ اِس اعتبار سے، اب میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ اِس احساس سے مجھے سخت جھٹکا لگا۔ میں نے سوچا کہ میرے بھائی اور بہن کل تک اِسی دنیا میں تھے جہاں کہ میں ہوں، لیکن اب وہ ایک ایک کرکے مر چکے ہیں، یہاں تک کہ 6 بہن بھائیوں میں اب میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ وہ لوگ اِس دنیا سے نکل کر ایک اور دنیا میں پہنچ چکے ہیں۔ اب نہ وہ مجھ سے مل سکتے ہیں اور نہ میں اُن سے مل سکتا۔ موت نے مجھ کو اپنے تمام بھائی بہنوں سے ابدی طور پر جدا کر دیا۔

موت کیا ہے۔ موت ایک جبری انخلا (compulsory expulsion) کا معاملہ ہے۔ موجودہ زندگی میں ہر آدمی اپنے لیے ایک دنیا بناتا ہے— گھر، جائداد، بزنس، اولاد، تعلقات، شہرت، عوامی حلقہ، عہدہ، سماجی پوزیشن، وغیرہ۔ اِن تمام چیزوں کی بنیاد پر ہر آدمی کی اپنی ایک چھوٹی یا بڑی دنیا ہوتی ہے، جس کے اندر وہ اپنے صبح وشام گزارتا ہے۔ وہ اس کو اپنی دنیا سمجھتا ہے۔ لیکن اچانک موت کا وقت آجاتا ہے اور فرشتے اس کو جبری طور پر موجودہ دنیا سے نکال کر اُس دنیا میں پہنچا دیتے ہیں، جہاں اس کے پاس اپنے ذاتی وجود کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا— موت کے واقعے کو صرف وہ شخص جانتا ہے جو اِس حقیقت کا زندہ شعور رکھتا ہو۔

موت سے پہلے، موت کے بعد

پوری انسانی تاریخ میں انسان جس سب سے بڑی فراموشی میں مبتلا رہا ہے، وہ صرف ایک ہے، اور وہ موت کا معاملہ ہے۔ اِس معاملے میں انسان کی غفلت کا یہ عالم ہے کہ مشکل سے چند ایسے افراد دریافت کیے جاسکتے ہیں جو اِس معاملے میں فراموشی کا شکار نہ ہوں۔

موجودہ دنیا دار الامتحان (testing ground) ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کو جو کچھ ملا ہوا ہے، وہ سب کا سب سامانِ امتحان کے طور پر ملا ہوا ہے۔ موت اِس مدتِ امتحان کو ختم کرتی ہے۔ اِس لیے موت کے آتے ہی ہر انسان سے وہ تمام چیزیں اچانک چھن جائیں گی جو اُس کو یہاں امتحان کے طور پر ملی ہوئی تھی۔

موت کے بعد آدمی اچانک ایک نئی دنیا میں داخل ہوجاتا ہے۔ یہ دنیا اپنے عمل کے نتائج پانے کی دنیا ہے۔ موت سے پہلے آدمی اگر سامانِ امتحان میں جی رہا تھا تو موت کے بعد اُس کو اپنے عمل کے نتائج کے درمیان جینا پڑے گا۔ موت سے پہلے کی زندگی عارضی زندگی ہے، یعنی بہ مشکل سو سال، لیکن موت کے بعد کی زندگی ابدی زندگی ہے، اُس کا کبھی خاتمہ ہونے والا نہیں۔

موت سے پہلے کی زندگی میں انسان کو بے شمار چیزیں ملی ہوئی ہیں۔ یہ تمام چیزیں پیدا ہوتے ہی اُس کو اپنے آپ حاصل ہوجاتی ہیں۔ اِس لیے آدمی اِن چیزوں کو فار گرانٹیڈ (for granted) طور پر لیتا رہتا ہے۔ وہ سوچ نہیں پاتا کہ یہ تمام عطیات اچانک اس سے منقطع ہوجائیں گے۔ موت کے بعد آدمی اچانک اپنے آپ کو اِس حال میں پائے گا کہ وہ بالکل تنہا اور بے سہارا ہوگیا۔

اِس سنگین حقیقت کے بارے میں سوچنا انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ لیکن آدمی بے فکری کی حالت میں پڑا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اچانک مر کر اِس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ وہ اِس حدیثِ رسول کا مصداق بن جاتا ہے: **ما رأیتُ مثلَ النار نام ھاربھا، وما رأیت مثل الجنة نام طالبھا (الترمذی، کتاب صفة جھنم)۔**

بریک اِن ہسٹری

Break in History

گورنمنٹ سروس کے قاعدوں میں سے ایک قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی سرکاری ملازم بغیر رخصت (without an approved leave) دفتر میں حاضر نہ ہو، تو گورنمنٹ کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ اس کو شکستِ ملازمت (break in service) کا کیس قرار دے دے۔ شکستِ ملازمت کا مطلب یہ ہے کہ اس کی سینیر ٹی (seniority) ختم ہوجائے گی۔ وہ حقوق ملازمت کے اعتبار سے واپس ہو کر اپنے پہلے دن کے حال پر پہنچ جائے گا، جب کہ اس کا تقرّر ہوا تھا، اس کے لیے ملازمت کے پچھلے ایام کے اعتبار سے پروموشن (promotion) کا حق باقی نہ رہے گا:

A break in service is any separation from employment status.

یہ اصول زیادہ بڑے پیمانے پر ہر عورت اور مرد پر منطبق ہوتا ہے۔ اِس دوسرے عمومی اصول کو شکستِ تاریخ (break in history) کہا جاسکتا ہے، یعنی تاریخ کا ختم ہوجانا۔ کسی آدمی نے اپنے عمل سے اپنی جو تاریخ بنائی ہے، اس کا اچانک مٹ جانا اور انسان کا اپنے بے تاریخ دَور کی طرف لوٹ جانا۔

اِس دنیا میں ہر آدمی اپنی بنائی ہوئی تاریخ کی بنا پر کھڑا ہوتا ہے۔ ایک انسان یہاں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ دھیرے دھیرے بڑا ہوتا ہے۔ اس کو مختلف قسم کے مواقع ملتے ہیں، جن کو استعمال کر کے وہ اپنی ایک تاریخ بناتا ہے۔ گھر اور جائداد اور خاندان اور حلقہ اور شہرت اور اقتدار اور مال اور اسباب، وغیرہ۔ اِس قسم کی چیزیں اس کے گرد اکٹھا ہوجاتی ہیں۔

اِس طرح اس کی اپنی بنائی ہوئی ایک تاریخ ہوتی ہے جس کے ذریعے اس کا تشخّص قائم ہوتا ہے، اس کے ذریعے وہ اپنے آپ کو جانتا ہے اور اس کے ذریعے دوسرے لوگ اس کو پہچانتے ہیں۔ یہ معاملہ ہر عورت اور مرد کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ہر ایک مسلسل جدوجہد کے ذریعے اپنی ایک تاریخ بناتا ہے جس کے اوپر وہ کھڑا ہوتا ہے۔

لیکن کوئی بھی شخص لمبی مدت تک اپنی تاریخ میں جینے کا موقع نہیں پاتا۔ سو سال کے اندر ہی اچانک وہ لمحہ آجاتا ہے جس کو موت کہتے ہیں۔ موت ایک ناقابلِ واپسی فیصلے کے طور پر ہر شخص کے اوپر آتی ہے اور اچانک قبل از موت مرحلۂ حیات سے جدا کر کے اُس کو بعد از موت مرحلۂ حیات میں پہنچا دیتی ہے۔

موت کو اِس اعتبار سے شکستِ تاریخ (break in history) کا معاملہ کہا جاسکتا ہے۔ شکستِ تاریخ کا یہ واقعہ ہر عورت اور ہر مرد کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ہر عورت اور مرد کا یہ معاملہ ہے کہ وہ اپنی ساری طاقت خرچ کر کے اپنی امیدوں اور اپنی تمناؤں کی ایک دنیا بناتے ہیں۔

ہر انسان اپنی بنائی ہوئی اِس دنیا میں جی رہا ہوتا ہے کہ اچانک اس کے لیے موت کا وقت آجاتا ہے۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنی اِس بنائی ہوی دنیا کو چھوڑ کر اچانک ایک اور دنیا میں پہنچ جائے، جس کے لیے اُس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اُس کے پیچھے اس کی بنائی دنیا ہوتی ہے جس کو وہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ چکا، اور اس کے آگے ایک ابدی صحرا ہوتا ہے جس کے لیے اس نے کچھ نہیں کیا۔ یافت کے احساس میں جینے والا انسان اچانک کامل محرومی کے دور میں داخل ہو جاتا ہے۔

قبل از موت کا مرحلۂ حیات ہر انسان کے لیے پہلا اور آخری موقع ہے، اس کے بعد کسی کو دوسرا موقع ملنے والا نہیں۔ اِس پہلے موقع کو جس شخص نے صرف دُنیوی ساز و سامان کی فراہمی میں لگایا، وہ موت کے بعد کے مرحلۂ حیات میں کامل محرومی میں جینے پر مجبور ہوگا۔ کیوں کہ موت اس کی پچھلی تاریخ کو اُس سے جدا کر دے گی، اور موت کے بعد دوبارہ نئی تاریخ بنانے کا موقع اُس سے ہمیشہ کے لیے چھن چکا ہوگا۔

کیسا عجیب ہے آج کا وہ موقع جس کو انسان کھو رہا ہے، اور کیسی بھیانک ہوگی کل کی وہ محرومی جس سے انسان دوچار ہوگا، اور جس سے اپنے آپ کو بچانا کسی کے لیے ممکن نہ ہوگا۔

واپسی ممکن نہ ہوگی

آج کل کے لوگوں کو جب میں ہنستے ہوئے اور تفریح کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے ایک عجیب دھکّا لگتا ہے۔ شدّتِ احساس سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ کیسا عجیب انجام ان کے سامنے آنے والا ہے، لیکن وہ اِس سے بے خبر ہوکر قہقہہ لگارہے ہیں۔ وہ جلد ہی ایک بھیانک انجام سے دوچار ہونے والے ہیں۔ وہ اِس انجام سے اپنے آپ کو ہرگز بچا نہیں سکتے، لیکن اُس سے کامل بے خبری کی بنا پر وہ قہقہہ لگا رہے ہیں۔ حالاں کہ ضرورت یہ تھی کہ وہ چپ ہوجائیں اور آنے والے بھیانک انجام سے بچنے کی تدبیر کریں۔

یہ انجام موت ہے۔ ہر آدمی جو پیدا ہوا ہے، اس کو بہر حال مرنا ہے۔ کوئی بھی شخص اپنے آپ کو موت سے نہیں بچا سکتا اور نہ وہ اِس پر قادر ہے کہ وہ اپنے آپ کو زندگی سے محروم کرلے۔ پیدا ہونے کے بعد ہر آدمی ابدی ہوچکا ہے۔ ہر آدمی کو بہر حال جینا ہے، حتیٰ کہ موت کے بعد بھی۔

موت کے بعد اچانک ہر آدمی اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پائے گا، جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔ اِس اگلی دنیا میں آدمی اِس حال میں پہنچے گا کہ اُس کے پاس موجودہ دنیا کی طرف دوبارہ آنے کے لیے رِٹرن ٹکٹ نہ ہوگا— موجودہ دنیا عمل کی دنیا ہے، یہاں کوئی جزا نہیں۔ اگلی دنیا جزا کی دنیا ہوگی، وہاں کسی کے لیے عمل کا موقع نہ ہوگا۔ یہ ہر عورت اور ہر مرد کا مقدر ہے، کوئی بھی شخص اپنی اِس تقدیر کو بدل نہیں سکتا۔

موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے ہم کو سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ پیدا کرنے والے کا تخلیقی پلان (creation plan) کیا ہے۔ پیدا کرنے والے نے یہ عجیب وغریب دنیا کیوں بنائی اور اس کے اندر انوکھی صلاحیتوں والا انسان کس لیے بسایا۔ لوگوں کی موجودہ بے خبری اِس تخلیقی پلان کو نہ جاننے کی بنا پر ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کوئی اور انجام اُن کے سامنے آنے والا نہیں۔ اگر انسان یہ جانے کہ وہ ایک لمبے سفر کا مسافر ہے۔ اس کو موجودہ دنیا سے گزر کر آخرت کی دنیا میں داخل ہونا ہے تو اس کی زندگی کا سارا نقشہ بدل جائے۔

موت ایک رِمائنڈر

موت مرنے والے کے لیے موت ہے، اور زندہ رہنے والے کے لیے اپنی موت کا رمائنڈر (reminder)۔ جب کوئی شخص مرتا ہے تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بولنے والا چپ ہوگیا، لیکن اُس کا چُپ ہونا اپنے آپ میں ایک اعلان ہوتا ہے۔ یہ اعلان کہ — آنے والا وقت میرے اوپر آچکا، اب یہی وقت تمھارے اوپر آنے والا ہے۔ تم آنے والے وقت کے لیے تیار ہو جاؤ۔

رواج ہے کہ جب کسی شخص کی عمر کا ایک سال پورا ہوتا ہے اور اس کی عمر کا اگلا سال شروع ہوتا ہے تو اُس وقت اس کی سال گرہ (birthday) منائی جاتی ہے۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اُس کو موت کی یاد کا دن سمجھا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر عورت اور مرد کی عمر کا مسلسل کاؤنٹ ڈاؤن (count down) ہو رہا ہے۔ ہر سال گرہ صرف یہ بتاتی ہے کہ تمھاری مدتِ حیات کا ایک اور سال کم ہوگیا۔ موت اِسی کاؤنٹ ڈاؤن کی تکمیل ہے۔

لوگ اپنے یومِ پیدائش کو ہیپی برتھ ڈے (happy birthday) کے طور پر مناتے ہیں، لیکن حقیقتِ واقعہ کے اعتبار سے دیکھیے تو معاملہ اِس کے برعکس ہے۔ ہر نئی سال گرہ دراصل اِس بات کی یاد دہانی ہے کہ موت یا یوم الحساب کا وقت اور زیادہ قریب آچکا، آخرت کی تیاری کا ایک اور سال کم ہوگیا۔

موت کا ایک پہلو یہ ہے کہ آدمی موجودہ دنیا سے چلا گیا۔ موت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آدمی اپنی تمناؤں کی تکمیل کے بغیر مر جائے۔ یہ اِس بات کا اشارہ ہے کہ موجودہ دنیا انسان کے لیے تمناؤں کی تکمیل کی دنیا نہ تھی۔ تمناؤں کی تکمیل کی دنیا صرف اگلی دنیا ہے۔ عقل مند وہ ہے جو اِس اشارے کو سمجھے اور موجودہ دنیا کی زندگی کو تیاری کا مرحلہ سمجھ کر اپنے آپ کو اگلی دنیا کے قابل بنائے۔

زندگی عمل کا وقفہ ہے اور موت خدا کی عدالت میں پیشی کا وقت۔ یہ ہر انسان کے لیے بے حد سنگین معاملہ ہے۔ دانش مند وہ ہے جو اِس معاملے کو سمجھے اور اس کو اپنا سب سے بڑا کنسرن (supreme concern) بنائے۔

تعزیتی جلسے ایک بدعت

آج کل عام طور پر یہ رواج ہے کہ جب کوئی بڑا شخص مرتا ہے تو تعزیت کے نام پر جلسے کیے جاتے ہیں اور تعزیتی بیانات اخباروں میں چھپوائے جاتے ہیں۔ یہ طریقہ بلاشبہہ ایک بدعت ہے۔ اِس قسم کی تعزیت کا اسلام کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ محض ایک مظاہرہ ہے، نہ کہ کوئی اسلامی عمل۔ اِس طریقے کے بدعت ہونے کا یقینی ثبوت یہ ہے کہ رسول اور اصحابِ رسول کے زمانے میں تعزیتی دھوم کا ایسا کوئی واقعہ ثابت نہیں۔

موت کے بارے میں اسلام کا طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ دوسرے کی موت کو دیکھ کر اپنی موت کو یاد کیا جائے، اور اپنی تنہائیوں میں خدا سے اپنے لیے اور مرنے والے کے لیے دعائیں کی جائیں۔ موت کا واقعہ خدا کی طرف سے ایک یاد دہانی ہے، یہ یاد دہانی کہ جس طرح ایک شخص کی موت ہوئی ہے، اُسی طرح دوسرے تمام مردوں اور عورتوں کی موت واقع ہوگی۔ موت کے واقعے کو اِسی یاد دہانی کے اعتبار سے لینا چاہیے، نہ کہ کسی اور اعتبار سے۔ دوسرے تمام طریقے جو آج کل مسلمانوں میں رائج ہیں، وہ سب کے سب بدعت ہیں، اور بدعت بلاشبہہ صرف ایک ضلالت ہے، نہ کہ کوئی مطلوب اسلامی فعل۔ کسی بڑے انسان کی موت کے بعد جو تعزیتی جلسے کیے جاتے ہیں، یا تعزیتی بیانات جاری ہوتے ہیں، اُن میں صرف مرنے والے کا تعریفی تذکرہ کیا جاتا ہے، نہ کہ موت کا تذکرہ۔ حالاں کہ ایسے موقع پر اصل ضرورت یہ ہے کہ موت کو یاد کیا جائے۔ موت کے بارے میں اپنے شعور کو زندہ کیا جائے۔ موت کے بعد پیش آنے والے حساب و کتاب کو سوچ کر خدا سے دعائیں کی جائیں۔

موت کا مطلب مرنے والے کے لیے یہ ہے کہ وہ عمل کی دنیا سے نکل کر جزا کی دنیا میں چلا گیا۔ وہ اپنے خالق کے سامنے حساب و کتاب کے لیے کھڑا کر دیا گیا۔ جہاں تک زندہ رہنے والوں کا معاملہ ہے، موت اُن کے لیے ایک سنگین یاد دہانی (reminder) ہے۔ ان کو یہ سوچ کر اور زیادہ سرگرم ہو جانا ہے کہ عمل کی دنیا سے نکلنے اور جزا کی دنیا میں داخل ہونے کا وقت بہت قریب آ گیا۔

خوشی صرف آخرت میں

چارلی چپلن (Charlie Chaplin) ایک برٹش فلم اسٹار تھا۔ اس کی پیدائش 1889 میں ہوئی۔ اور 88 سال کی عمر میں 1977 میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ایک مزاحیہ اداکار (comedian) تھا۔ اس کا شو (show) دیکھ کر لوگ بہت زیادہ ہنستے تھے۔ مگر خود چارلی چپلن اندر سے غم گین رہتا تھا۔ تمام مادّی ساز وسامان کے باوجود، اس کو اپنی زندگی میں خوشی حاصل نہیں ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار ایک نفسیاتی ڈاکٹر (psychiatrist) کے پاس ایک شخص آیا۔ اُس نے کہا کہ میں بہت زیادہ افسردہ رہتا ہوں، آپ مجھ کو کوئی ایسی تدبیر بتایئے کہ میں خوش رہ سکوں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ تم چارلی چپلن کا شو (show) دیکھا کرو۔ آنے والے نے کہا کہ میں ہی تو چارلی چپلن ہوں۔ میں دوسروں کو ہنساتا ہوں، لیکن میرا دل اندر سے روتا ہے۔

چارلی چپلن ایک کامیڈین (comedian) تھا، مگر جب موت کا وقت قریب آیا، تو وہ اپنی نفسیات کے اعتبار سے ایک ٹریجڈین (tragidian) بن چکا تھا۔ وہ شخص جو دوسروں کو ہنساتا تھا، اس نے اپنی حالت پر ایک بار اِن الفاظ میں تبصرہ کیا کہ — میں بارش میں چلنا پسند کرتا ہوں، تاکہ کوئی میرے بہتے ہوئے آنسوؤں کو نہ دیکھ سکے:

I always like to walk in the rain, so that no one can see me crying.

یہی اِس دنیا میں ہر عورت اور مرد کی کہانی ہے۔ لوگ مصنوعی طور پر ہنستے ہیں، لیکن اندر سے انھیں کوئی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ لوگ مصنوعی طور پر اپنی کامیابی کے قصے بیان کرتے ہیں، لیکن اندر سے وہ شکست خوردہ نفسیات میں مبتلا رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی کے لیے بھی خوشی اور راحت نہیں۔ خوشی اور راحت صرف آخرت میں ہے جو موت کے بعد آنے والے دورِ حیات میں صرف خدا پرست عورتوں اور مردوں کو حاصل ہوگی۔ بنانے والے نے موجودہ دنیا کو عمل کے لیے بنایا ہے۔ یہاں صرف عمل برائے مسرت (happiness) ممکن ہے، نہ کہ خود مسرت کا حصول۔

موت کے بعد

موت ہر انسان کے لیے ایک غیر مطلوب واقعہ ہے۔ آدمی لمبی مدت تک جینا چاہتا ہے، مگر وہ اچانک ایک دن مر جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی سفر میں تھا، وہ زیادہ دور تک جانا چاہتا تھا، مگر منزل پر پہنچنے سے پہلے موت نے یک طرفہ فیصلے کے تحت، اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے۔ یہ ہر عورت اور ہر مرد کا سوال ہے۔ ہر ایک یہ جاننا چاہتا ہے کہ کیوں کر ایسا ہوتا ہے۔ زندگی کیا ہے اور موت کیا۔ کیوں ایسا ہے کہ آدمی زیادہ دن تک جینا چاہتا ہے، مگر اس کو درمیان ہی میں اس کی مرضی کے بغیر، موت کے فیصلے کو قبول کرنا پڑتا ہے۔

جب ہم اِس معاملے پر غور کرتے ہیں تو ہم کو سب سے پہلا سُراغ (clue) ڈی این اے (DNA) کی جدید دریافت میں ملتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، ہر انسان کے اندر اس کا ڈی این اے بھی موجود ہوتا ہے۔ ہر انسان کا ڈی این اے گویا کہ اس کی شخصیت کا مکمل انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اِس ڈی این اے کو ڈی کوڈ (decode) کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ہماری بڑی سے بڑی انسائیکلو پیڈیا سے بھی سیکڑوں گنا زیادہ بڑا ہے۔ ہر انسان کے ڈی این اے میں اس کی شخصیت (personality) کے تمام چھوٹے اور بڑے پہلو موجود ہیں۔

مگر عجیب بات ہے کہ ڈی این اے انسانی شخصیت کے صرف ایک پہلو کے اندراج سے خالی ہے۔ کسی انسان کے ڈی این اے کا مطالعہ کرکے، اس کے بارے میں ہر بات کو معلوم کیا جاسکتا ہے، مگر صرف ایک بات کو معلوم کرنا ممکن نہیں، اور وہ یہ کہ کسی انسان کی موت کب واقع ہوگی۔ یہ فطرت کی طرف سے اِس بات کا اعلان ہے کہ انسان اپنی حیثیت کے اعتبار سے ایک نہ مرنے والی مخلوق ہے۔ انسان کے لیے مسلسل زندگی ہے، حقیقی معنوں میں اس کی شخصیت پر موت وارد ہونے والی نہیں۔

اب یہاں انسانی شخصیت کے ایک اور پہلو کو شامل کر لیجیے، وہ یہ کہ تمام ذی حیات چیزوں میں صرف انسان ہے جو کل (tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔ تمام حیوانات صرف آج (today) میں

جیتے ہیں، کسی حیوان کا کوئی کل نہیں۔ اپنے محدود شعور کے اعتبار سے حیوانات میں سے ہر ایک کا معاملہ یہ ہے کہ وہ آج میں پیدا ہوئے اور آج ہی میں ان کا خاتمہ ہوگیا۔ مگر انسان استثنائی طور پر ایک ایسی مخلوق ہے جو واضح طور پر کل (tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔

اِس معاملے میں درست رائے قائم کرنے کے لیے ایک پہلو کو شامل کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، ہر آدمی جو اِس دنیا میں پیدا ہوتا ہے، وہ ان گنت تمناؤں (ambitions) کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ مگر اِسی کے ساتھ دوسری حقیقت یہ ہے کہ ہر آدمی اِس طرح مر جاتا ہے کہ اس کی تمنائیں پوری نہیں ہوتیں۔ اِس اعتبار سے، ہر آدمی نامکمل تمناؤں (unfulfilled desires) کا کیس ہے۔ کائنات کے عام نظام کو دیکھیے تو یہ واقعہ بالکل بے جوڑ ہے۔ اِس وسیع کائنات میں صرف انسان ہے جو اِس مسئلے سے دوچار ہے، انسان کے سوا کوئی بھی دوسری مخلوق اِس مسئلے سے دوچار نہیں۔

یہ صورتِ حال بتا رہی ہے کہ اِس مسئلے کا جواب ہونا چاہیے۔ انسان کی تمناؤں کو اُسی طرح فل فل مینٹ ملنا چاہیے جس طرح دوسری مخلوقات کو ملا ہوا ہے۔ یہ صورتِ حال بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا کے بعد ایک اور دنیا آنے والی ہے، یعنی وہ دنیا جہاں انسان اپنی تمناؤں کی کامل تسکین پا سکے۔

اِس طرح اِس معاملے کا ایک اور پہلو بہت زیادہ اہم ہے، وہ یہ کہ انسان کے اندر فطری طور پر انصاف (justice) کا ذہن پایا جاتا ہے۔ انسان فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ اِس دنیا میں عدل کے ساتھ فیصلہ ہو۔ نیک لوگوں کو ان کی نیکی کا پورا بدلہ ملے، اور بُرے لوگوں کو ان کی برائی کی سزا دی جائے۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ یہ تقاضا بھی چاہتا ہے کہ ایک دنیا آئے، جہاں عدل کا یہ تقاضا پورا ہو۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔

مذکورہ سوالات کو سامنے رکھ کر سوچا جائے تو آخرت (hereafter) کا نظریہ بالکل حقیقی نظریہ معلوم ہوتا ہے۔ آخرت کے نظریے کو ماننے کی صورت میں آدمی کو ہر سوال کا مکمل جواب مل جاتا ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ پر درست ہو جاتی ہے:

Every thing falls into place.

قیامت کا تجربہ

نومبر 1984 میں میرا ایک سفر کیسا بلانکا (مراکو) کے لیے ہوا تھا۔ 25 نومبر 1984 کی شام کو جہاز نے مجھے کیسا بلانکا (Casablanca) کے ائرپورٹ پر اتار دیا۔ اُس وقت میں اکیلا تھا۔ یہاں ایک عجیب تجربہ پیش آیا۔ مجھے ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے بلایا گیا۔ کانفرنس کی طرف سے مجھے ہوائی جہاز کا ٹکٹ تو بھیج دیا گیا تھا، لیکن کیسا بلانکا میں مقامِ اجتماع کا کوئی پتہ میرے پاس نہ تھا۔ میرے پاس منتظمینِ کانفرنس کا کوئی نمبر بھی نہ تھا جس کے ذریعے میں اُن سے رابطہ قائم کرسکوں۔

میں ائرپورٹ پر اترا تو وہاں کانفرنس کا کوئی آدمی مجھے رسیو (receive) کرنے کے لیے موجود نہ تھا۔ ائرپورٹ کے مختلف لوگوں سے میں نے جاننا چاہا تو معلوم ہوا کہ یہ سب لوگ فرانسیسی زبان بولتے ہیں، وہ نہ عربی زبان سمجھتے تھے اور نہ انگریزی زبان۔ کچھ دیر کے لیے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں یہاں ایک بے جگہ شخص (displaced person) بن گیا ہوں۔ یہاں نہ میرا کوئی ساتھی ہے، نہ میرے لیے قیام کی کوئی جگہ ہے، نہ میرے لیے زندگی کے دوسرے سامان۔ محسوس ہوا کہ یہ میرے لیے ایک اجنبی جگہ ہے اور یہاں میں بالکل تنہا ہو گیا ہوں۔

پریشانی کے عالم میں میں اِدھر اُدھر دوڑتا رہا، لیکن کوئی شخص وہاں میری مدد کرنے والا نہیں ملا۔ آخر کار میں اِسی پریشانی کی حالت میں ائرپورٹ کے باہر آ گیا۔ یہاں میں ایک اجنبی انسان کی طرح کھڑا ہوا تھا، اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں۔

کچھ دیر کے بعد مجھے نظر آیا کہ ایک آدمی سڑک کے دوسری طرف سے چل کر میری طرف آ رہا ہے۔ وہ میرے پاس آیا اور اردو زبان میں مجھ سے بات کرنے لگا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ایک پاکستانی مسلمان ہیں اور یہاں کسی سروس کے تحت رہتے ہیں۔ اُن کو میرے حالات سن کر مجھ سے ہمدردی ہوئی۔ وہ فرانسیسی زبان جانتے تھے۔ وہ مجھ کو لے کر ائرپورٹ میں واقع پولیس کے دفتر میں گئے۔ انھوں نے پولس والوں سے فرانسیسی زبان میں بات کی۔ پولس والوں نے کہا کہ اِس بارے میں

ہمارے پاس کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں، البتہ ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ کیسا بلانکا کے ہوٹل ''سفیر'' میں ایک کانفرنس ہورہی ہے۔ اِس کے بعد مذکورہ پاکستانی مسلمان نے کہا کہ میں صرف یہ کرسکتا ہوں کہ آپ کو اپنی گاڑی میں لے چلوں اور ہوٹل ''سفیر'' کے باہر اتار دوں۔ چناں چہ انھوں نے مجھ کو اپنی گاڑی پر بٹھایا اور ہوٹل سفیر کے گیٹ پر مجھ کو چھوڑ کر چلے گئے۔

میں ڈرتے ہوئے ہوٹل کے اندر داخل ہوا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے کانفرنس کے بعض افراد مل گئے جو مجھ کو پہچانتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں میرے لیے ایک کمرہ رِزرو (reserve) ہے۔ اِس کے بعد انھوں نے مجھ کو ہوٹل کا کارڈ دے کر اس کے کمرہ نمبر 1207 میں پہنچا دیا۔

25 نومبر 1984 کو جو مذکورہ واقعہ میرے ساتھ پیش آیا، وہ میرے لیے قیامت کا ایک محدود تجربہ تھا۔ آدمی پیدا ہونے کے بعد اپنے ماں باپ اور اپنے رشتے داروں کے درمیان رہتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے، جہاں اس کو فطرت کی طرف سے ایک مکمل قسم کا لائف سپورٹ سسٹم (life support system) ملا ہوا ہے۔ آدمی اپنا ایک گھر بناتا ہے اور اپنے لیے تمام ضروری سازوسامان کی ایک دنیا تعمیر کرتا ہے۔

ہر آدمی اپنی بنائی ہوئی دنیا میں آزادی کے ساتھ ایک مطمئن زندگی گزارتا ہے۔ اچانک ایک سنگین واقعہ پیش آتا ہے۔ یہ موت کا واقعہ ہے۔ موت آدمی کو اس کی بنائی ہوئی دنیا سے مکمل طور پر جدا کر کے ایک اور دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ یہاں وہ اُن چیزوں سے محروم ہوجاتا ہے، جن کے درمیان وہ اپنی تمام ضروریات پوری کرتے ہوئے زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے دوست اور رشتے دار بھی اُس سے مکمل طور پر جدا ہوجاتے ہیں۔ اِس دوسری دنیا میں آدمی تنہا بھی ہوتا ہے اور پوری طرح بے سروسامان بھی۔

25 نومبر 1984 کو میرے ساتھ جو تجربہ گزرا، وہ میرے لیے اِسی قسم کا ایک محدود تجربہ تھا۔ یہ موت کے بعد آنے والی دنیا کی ایک جُزئی تصویر تھی۔ اگلی دنیا کی اِس قسم کی جزئی تصویر کبھی نہ کبھی ہر انسان کو دکھائی جاتی ہے، تاکہ وہ موت کے بعد سامنے آنے والے حالات کا پیشگی تعارف حاصل کرلے اور اس کے لیے ضروری تیاری کرسکے۔

تعمیرِ دنیا، تعمیرِ شخصیت

ایک آدمی ایک معاشی کام شروع کرتا ہے۔ اُس میں اس کو کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ پیسے کی طاقت سے اس کے سب کام بننے لگتے ہیں۔ وہ اپنے لیے ایک گھر چاہتا ہے تو وہ ایک اچھا گھر بنا لیتا ہے۔ وہ اپنے لئے ایک سواری چاہتا ہے تو اس کو بازار سے ایک اچھی سواری مل جاتی ہے۔ وہ اپنے بچوں کی اچھی تعلیم چاہتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ یہ مقصد بھی اس نے حاصل کرلیا۔ غرض، دنیوی اعتبار سے وہ پورے معنوں میں ایک کامیاب انسان بن جاتا ہے۔

یہ تجربہ آدمی کے اندر یہ ذہن پیدا کرتا ہے کہ اِس دنیا میں پیسہ سب کچھ ہے۔ پیسہ کماؤ اور ہر چیز حاصل کرلو۔ اِسی مزاج کو ایک فارسی شاعر نے اِن الفاظ میں بیان کیا — اے زر، تو خدا نہیں۔ لیکن خدا کی قسم، تو عیب کو چھپانے والا ہے اور حاجتوں کو پورا کرنے والا ہے:

اے زر، تو خدا نۂ ولیکن بہ خدا   ستّارِ عیوب وقاضیُ الحاجاتی

دوسری طرف، وہ انسان ہے جو خدا سے ڈرتا ہے، جو خدا پرستی کی زندگی اختیار کرتا ہے، جو آخرت کو اپنی منزلِ مقصود بناتا ہے۔ ایسا شخص بھی ایک دنیا کی تعمیر کرتا ہے۔ یہ خود اپنی شخصیت کی تعمیر ہے، جو انسان کے داخل میں ہوتی ہے۔ وہ مادّی چیزوں کی طرح لوگوں کو دکھائی نہیں دیتی، لیکن بلاشبہہ دنیا کی تعمیر سے زیادہ بڑا کام اپنی شخصیت کی تعمیر ہے۔

دنیا کی تعمیر، موت سے پہلے کی زندگی میں ہوتی ہے اور موت کے وقت وہ اِس دنیا میں رہ جاتی ہے۔ موت کے وقت جب آدمی اپنی زندگی کا اگلا سفر کرتا ہے تو وہ دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز اپنے ساتھ نہیں لے جاتا۔ اِس کے برعکس، جو آدمی اپنے اندر ربانی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے، وہ ابدی طور پر اس کے ساتھ رہتی ہے۔ ایسا آدمی جب مرتا ہے تو وہ اپنی اِس شخصیت کے ساتھ اگلے دورِ حیات میں داخل ہوتا ہے۔ یہ ربانی شخصیت اس کے لیے جنت میں داخلے کا اجازت نامہ ہوتی ہے۔ اپنی اِس شخصیت کی بنا پر وہ جنت میں اپنے لئے ابدی مقام حاصل کرلیتا ہے، اور اِس سے بڑی کوئی کامیابی کسی انسان کے لیے نہیں۔

سانس کا کاروبار

دہلی میں ہمارے محلے میں ایک صاحب تھے۔لوگ ان کوملّا جی کہتے تھے۔وہ بھینس پالتے تھے اور دودھ کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کی دوستی ایک ہندو تاجر سے تھی۔ ان کے یہاں لوہے کا کاروبار تھا۔ایک بار ایسا ہوا کہ ملا جی کی ایک بھینس مرگئی۔ وہ اپنے ہندو دوست سے ملے۔اس سے بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میری ایک بھینس مرگئی۔ یہ سن کر لوہے کے ہندو تاجر نے کہا کہ ملا جی، تمھارا تو سانس کا کاروبار ہے۔آیا آیا، نہ آیا' یعنی ایک بھینس صرف اُس وقت تک زندہ ہے جب تک کہ اُس کا سانس چل رہا ہے۔سانس اگر رک جائے تو بھینس کی زندگی بھی ختم ہوجائے گی۔ مذکورہ تاجر نے یہ بات ملا جی کے کاروبار کے بارے میں کہی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر زندہ انسان کا معاملہ یہی ہے۔ مذکورہ تاجر کو کہنا چاہیے تھا کہ — ملا جی، ہمارا اور تمھارا معاملہ تو سانس کا معاملہ ہے۔آیا آیا، نہ آیا۔

جیسا کہ معلوم ہے، انسان کے جسم میں مختلف قسم کے نظام ہیں جو اس کی زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ اسی طرح انسان کے اندر ایک وہ نظام ہے جس کو نظامِ تنفس (respiratory system) کہا جاتا ہے۔ یہ نظام انسانی زندگی کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔ یہ نظامِ تنفس جب تک کام کررہا ہے، انسان زندہ ہے۔ یہ نظام اپنا کام نہ کرے تو انسان چند منٹ کے اندر مرجائے گا۔

کسی آدمی پر جب موت آتی ہے تو آخر وقت میں اس کی سانس اکھڑ جاتی ہے۔ اِس حالت کو غرغرہ کہا جاتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کہ انسان کا نظامِ تنفس معتدل حالت میں اپنا کام کرنا بند کردیتا ہے اُس وقت انسان کے گلے سے عجیب قسم کی آواز آنے لگتی ہے۔ چند منٹ تک یہ آواز آتی ہے، اس کے بعد انسان پر وہ حالت طاری ہوجاتی ہے جس کو موت کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے کی موت خود اپنی موت کی یاددہانی ہے۔ ہر موت زندہ لوگوں کو بتاتی ہے کہ جس طرح مرنے والا مرگیا، اُسی طرح زندہ رہنے والا بھی مرے گا۔ ہر موت یاد دلاتی ہے کہ اے لوگو، مستقبل کی تیاری کرو، کیوں کہ آخرکار جو چیز تمھارے حصے میں آنے والی ہے، وہ تمھارا مستقبل ہے، نہ کہ تمھارا ماضی اور حال۔

موت کا تصور

موت (death) کے لفظ کو اگر آپ ڈکشنری میں دیکھیں تو اس میں موت کا مطلب یہ لکھا ہوا ہوگا کہ — زندگی کا ابدی خاتمہ:

Permanent cessation of life

موت کی یہ لغوی تعریف، موت کی منفی تصویر پیش کرتی ہے۔ اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ آدمی مکمل انسان کی حیثیت سے پیدا ہو، لیکن تھوڑی مدت تک زندہ رہ کر ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ ہو جائے۔ اس کی تمام آرزوئیں (desires) اور اس کی تمام صلاحیتیں اِس طرح مٹ جائیں کہ دوبارہ اُن کا وجود میں آنا ممکن نہ رہے۔

اسلام اِس کے مقابلے میں، زندگی کا مثبت تصور پیش کرتا ہے۔ اسلام کے مطابق، موت زندگی کا خاتمہ نہیں، موت کا مطلب انسان کے لیے اس کے دوسرے دورِ حیات کا آغاز ہے:

Death is not the end of life. Death marks the beginning of the second phase of human life.

اسلام کے مطابق، انسان کو ابدی مخلوق (eternal being) کے طور پر پیدا کیا گیا، پھر اس کے عرصۂ حیات (life span) کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا— قبل از موت حصہ، اور بعد از موت حصہ۔ قبل از موت عرصۂ حیات تیاری کی جگہ ہے اور بعد از موت عرصۂ حیات تیاری کے مطابق، اپنا مستقل انجام پانے کی جگہ۔

اِس تخلیقی پلان کے مطابق، آدمی کو چاہیے کہ وہ موت سے پہلے کی زندگی کو تیاری کا دور (preparatory period) سمجھے اور اس کو کامل طور پر تیاری میں گزارے۔ کیوں کہ موت کے بعد زندگی کا جو دور آدمی کے سامنے آئے گا، اُس میں عمل کرنا نہ ہوگا، بلکہ صرف اپنے عمل کا انجام پانا ہوگا۔

موت کا واقعہ دراصل، زندگی کا پیغام ہے۔ موت کا پیغام یہ ہے کہ — جو کرنا ہے، اُس کو آج کے دن کرلو۔ کیوں کہ کل کے دن کرنے کا وقت باقی نہیں رہے گا۔

زندگی کا خاتمہ

26 ستمبر 2008 کو نئی دہلی کے پارلیامنٹ انکسی میں ایک خصوصی پروگرام تھا۔ اِس پروگرام کو نئی دہلی کے ایف اے این ایس (Foundation for Amity & National Solidarity) نے آرگنائز کیا تھا۔ اس کے صدر لوک سبھا کے اسپیکر مسٹر سوم ناتھ چٹرجی تھے۔

اِس موقع پر مشہور جرنلسٹ خشونت سنگھ (پیدائش: 1915) کو نیشنل ایمٹی ایوارڈ دیا گیا۔ اسٹیج سے مسٹر خشونت سنگھ کے تعارف میں جو تقریر ہوئی، اُس میں بتایا گیا کہ زندگی کے بارے میں مسٹر خشونت سنگھ کا نظریہ یہ ہے کہ:

Enjoy good things in life.

مگر خود مسٹر خشونت سنگھ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے اِس نظریے کی زندہ تردید بنے ہوئے تھے۔ تقریباً 95 سال کی عمر کو پہنچ کر وہ بہت کم زور ہو چکے تھے، وہ جھک کر چلتے تھے، ان کے اوپر مایوسی چھائی ہوئی تھی، چہرے سے مسکراہٹ غائب تھی۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے سوچا کہ انسان، دنیا میں انجوائے کرنے کا نظریہ بناتا ہے، حالاں کہ اس کے لیے مقدر ہے کہ وہ بہت جلد انجوائے کرنے کے قابل ہی نہ رہے:

Enjoy good things in life only to become so
weak that you are unable to enjoy anything.

یہ صرف ایک شخص کی کہانی نہیں، یہی پوری تاریخ کی کہانی ہے۔ ہر زمانے میں انسان کا یہی حال ہوا ہے کہ وہ اپنے لیے خوشیوں کا ایک محل بنانا چاہتا ہے، لیکن آخر میں بڑھاپا آتا ہے اور اس کے سارے منصوبے کو ناکام کر دیتا ہے۔

یہاں انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی سوچ پر نظر ثانی کرے۔ لیکن انسان اپنی سوچ پر نظر ثانی نہیں کر پاتا، یہاں تک کہ مایوسی کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے، حالاں کہ اگر وہ اپنی سوچ پر نظر ثانی کرے تو عین ممکن ہے کہ اس کی زندگی ٹریجڈی (المیہ) کے بجائے، کامیڈی (طربیہ) میں بدل جائے۔ اس کا خاتمہ امید پر ہو، نہ کہ نا امیدی پر۔

ہر شخص موت کا مسافر

ایک خبر میڈیا میں آئی ہے۔ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (9 اکتوبر 2008) میں یہ خبر حسب ذیل الفاظ میں چھپی ہے:

British reality TV star Jade Goody, who has been diagnosed with cancer, says she has started planning for her funeral, adding she wants "people to cry over me". "Most people plan their weddings. But I am planning my funeral", Goody told OK! Magazine. Goody was diagnosed with cervical cancer in August 2008 just as she prepared to appear in the Indian version of the British reality TV show celebrity Big Brother. (p. 21)

برطانی ٹی وی اسٹار جیڈ گوڈی اپنے پروفیشن کے اعتبار سے چوٹی (peak) پر تھیں۔ اچانک اگست 2008 کے طبی معائنے میں اُن کو بتایا گیا کہ اُن کو کینسر کی بیماری ہوچکی ہے، یعنی لا علاج بیماری۔ انھوں نے اپنے مستقبل کے پروفیشنل منصوبوں کو منسوخ کردیا۔ انھوں نے کہا کہ اب مجھے موت کی تیاری کرنی ہے۔ لوگ شادی کا منصوبہ بناتے ہیں، مجھ کو اپنی موت کا منصوبہ بنانا ہے:

Most people plan their weddings. But I am planning my funeral.

یہی ہر عوت اور ہر مرد کی کہانی ہے۔ لوگ زندگی کا جشن منانے کے لیے سرگرم رہتے ہیں، حالاں کہ ہر ایک کا آخری انجام یہ ہے کہ جشن کی تکمیل سے پہلے اُس پر موت آئے اور وہ موجودہ دنیا سے نکل کر اگلی دنیا میں پہنچ جائے۔ ایسی حالت میں ہر عورت اور مرد کو یہ کرنا ہے کہ وہ قبل از موت مرحلۂ حیات کو صرف ایک وقتی سفر سمجھے اور اپنی ساری توجہ بعد از موت مرحلۂ حیات کی تیاری میں لگا دے۔

لوگ اپنا برتھ ڈے مناتے ہیں، حالاں کہ ہر سال گرہ صرف اِس بات کا اعلان ہے کہ آدمی کی عمر کا ایک سال اور کم ہوگیا۔ ایسی حالت میں، ہر عورت اور مرد کو چاہیے کہ وہ ہر سال کی تکمیل پر آنے والی موت کو یاد کرے۔ کیوں کہ اگلی سال گرہ کا آنا یقینی نہیں، لیکن موت کا آنا یقینی ہے۔ عقل مند وہ ہے جو اِس سب سے بڑی حقیقت کو یاد رکھے جس کا دوسرا نام موت ہے۔

موت کا سبق

میں ایک جنازہ میں شریک ہوا۔ موت کے بعد مرنے والے شخص کو نہلایا گیا۔ اس کو نئے کپڑے کا کفن پہنایا گیا۔ لوگوں نے کھڑے ہو کر اس کی نماز جنازہ پڑھی اور پھر وہ میت کو اپنے کاندھوں پر لے کر چلے، یہاں تک کہ قبر میں احترام کے ساتھ لٹا کر اس کو ڈھک دیا گیا۔ میں نے سوچا کہ ایک مردہ جسم کے ساتھ اتنے زیادہ اہتمام کا حکم اسلام نے کیوں دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا جسم مٹی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، مگر اس کو عام مٹی کی طرح اِدھر اُدھر پھینک نہیں دیا جاتا، بلکہ اس کے ساتھ باقاعدہ انسان کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔

''مٹی'' کے ساتھ ''انسان'' جیسا معاملہ کرنے کا حکم مرنے والے کے اعتبار سے نہیں ہے، بلکہ زندہ رہنے والے کے اعتبار سے ہے۔ مردہ انسان کے ذریعہ زندہ انسانوں کو یہ سبق دیا جاتا ہے کہ بالآخران کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ زندہ لوگ مرنے والے کے روپ میں خود اپنے آپ کو دیکھیں۔ وہ موت سے پہلے موت کا تجربہ کریں۔ یہ تجربہ اس طرح بھی ممکن تھا کہ ایک مقرر دن میں کاغذ کا ایک انسانی پتلا بنایا جائے اور اس کے ساتھ تمام رسوم ادا کر کے اس کو مٹی کے گڑھے میں ڈال دیا جائے۔ اسلام نے اس تجربہ کو حقیقی بنانے کے لیے حقیقی انسان کے مردہ جسم کو استعمال کیا۔

ایک انسان ہماری طرح ایک زندہ انسان تھا۔ چلتے چلتے اس کے قدم جواب دے گئے۔ بولتے بولتے اس کی زبان بند ہوگئی۔ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں بے نور ہوگئیں۔ لوگوں کے نزدیک اس کی جو قیمت تھی، وہ سب اچانک ختم ہوگئی۔ اب خدا اِس واقعہ کو استعمال کرتا ہے، تاکہ اپنے جیسے ایک انسان کے ذریعہ وہ لوگوں کو زندگی کا سبق یاد دلائے۔ لوگ اس کو اہتمام کے ساتھ تیار کرتے ہیں اور پھر لے کر چلتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخری مرحلہ میں پہنچ کر جب اس کو قبر کے گڑھے میں لٹا دیا جاتا ہے تو ہر آدمی یہ کرتا ہے کہ تین بار اپنے ہاتھ میں مٹی لے کر قبر میں ڈالتا ہے۔ پہلی بار مٹی ڈالتے ہوئے وہ کہتا ہے: **منها خلقناكم** (اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا تھا)، جب وہ دوسری بار مٹی ڈالتا ہے تو کہتا ہے: **وفيها نعيدكم** (اسی میں ہم تم کو دوبارہ ڈال رہے ہیں) اور پھر تیسری بار مٹی ڈالتے ہوئے وہ کہتا ہے: **ومنها نخرجكم تارةً أخرىٰ** (اور اسی سے ہم تم کو دوبارہ نکالیں گے)۔ یہ تین بار مٹی ڈالنا، اس پورے معاملہ کا کلائمکس ہے۔ اس طرح ایک زندہ واقعہ کے ذریعہ بتایا جاتا ہے کہ انسان کیا ہے اور اس کا آخری انجام کیا۔

مرنے والوں کا تذکرہ

یہ ایک عام رواج ہے کہ جب کوئی شخص مرتا ہے تو اس کے بارے میں رسائل و جرائد میں مضامین شائع کیے جاتے ہیں، اس کی یاد میں تعریفی مضامین چھپتے ہیں، اس کی یاد میں شان دار جلسے کیے جاتے ہیں۔ اِن سب میں یہ ہوتا ہے کہ مرنے والے کے کارنامے اور اس کی عظمتیں بیان کی جاتی ہیں۔ یہ طریقہ سخت مغالطہ انگیزی (misleading) کا ذریعہ ہے۔

کسی کی موت پر جو اصل واقعہ پیش آتا ہے، وہ یہ ہے کہ مرنے والا اپنی عظمت کے تمام نشانات کو اچانک چھوڑ دیتا ہے۔ موت اس کو ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیتی ہے جہاں وہ بالکل تنہا اور بے سروسامان ہوتا ہے۔ حال (present) کے لحاظ سے مرنے والے کا اصل پہلو یہی ہوتا ہے۔ لیکن تمام لکھنے اور بولنے والے، مرنے والے کے حال کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے، وہ صرف اس کے ماضی (past) کو لے کر اس کی دنیوی بڑائیاں بیان کرتے ہیں، حالاں کہ مرنے والا عملاً اپنے اِس ماضی سے مکمل طور پر منقطع ہو چکا ہوتا ہے۔

موت کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ کسی انسان کے لیے انقطاعِ کلّی (total detachment) کے ہم معنی ہوتی ہے۔ موت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے اپنی زندگی کے پہلے موقع (first chance) کو کھو دیا، اور جہاں تک دوسرے موقع (second chance) کا سوال ہے، وہ کبھی کسی کو ملنے والا نہیں۔ ہر مرنے والا دراصل زندگی کے اِس سنگین پہلو کو یاد دلاتا ہے۔ لیکن یہی وہ پہلو ہے جس کا تذکرہ نہ تحریروں میں کیا جاتا ہے اور نہ تقریروں میں۔

مرنے والے کے فضائل وکمال کو پڑھ کر یا سن کر بظاہر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ وہ آج بھی اُنھیں فضائل کا حامل ہے، حالاں کہ ایسا ہرگز نہیں۔ مقررین اور محررین جس انسان کے بارے میں یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ ایک تاریخ ساز انسان تھا، عین ممکن ہے کہ اس وقت خود مرنے والے کا حال یہ ہو کہ وہ ایک بے تاریخ انسان بن کر حسرت و بے بسی کے عالم میں پڑا ہو۔

زندگی کے اُس پار

آدمی بظاہر ایک کامل وجود ہے۔ مگر حقیقت میں وہ صرف ایک ناقص وجود ہے۔ انسان کے پاس آنکھ ہے، مگر وہ خارجی روشنی کے بغیر دیکھ نہیں سکتا۔ انسان کے پاس کان ہے، مگر خارجی ہوا کے بغیر وہ سن نہیں سکتا۔ انسان کے پاس چلنے کے لیے پاؤں ہے، مگر زمین میں متوازن قوتِ کشش نہ ہوتو وہ چل نہیں سکتا۔ انسان کے پاس کھانے کے لیے منھ ہے، لیکن خارج میں غذا کا سامان نہ ہو تو وہ کھانے کی ضرورت پوری نہیں کرسکتا۔

اب ایک ایسے وقت کا تصور کیجیے، جب کہ آپ پوری طرح اپنے اِسی وجود کے ساتھ زندہ حالت میں ہوں، لیکن وہاں آپ کی ضرورت کے تمام خارجی سامان آپ سے چھن چکے ہوں۔ آپ کے پاس آنکھ ہو، مگر وہاں دیکھنے کے لیے خارجی روشنی موجود نہ ہو۔ آپ کے پاس منھ ہو، لیکن کھانے کی چیزیں وہاں سے غائب ہو چکی ہوں۔ آپ کے پاس پاؤں ہو، مگر وہاں متوازن کشش والی زمین آپ کے پاؤں کے نیچے موجود نہ ہو، مزید یہ کہ وہاں آپ اکیلے ہو گئے ہوں۔ آپ کے تمام اپنے لوگ آپ کا ساتھ چھوڑ چکے ہوں۔

یہ کوئی فرضی بات نہیں۔ یہی صورتِ حال ہر عورت اور مرد کے ساتھ موت کے بعد پیش آنے والی ہے، اور موت ہر عورت اور مرد پر لازماً آنے والی ہے۔ کوئی بھی شخص جو آج زندہ ہے، وہ ضرور ایک دن مرے گا۔ اور پھر موت کے بعد وہ اپنے آپ کو جس دنیا میں پائے گا، وہ وہی دنیا ہوگی جس کا بیان اوپر کیا گیا۔

یہ آنے والا دن ہر ایک کی طرف دوڑا چلا آ رہا ہے۔ ہر عورت اور مرد کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہ اس آنے والے دن کو جانے اور اس کے لیے تیاری کرے۔ وہ دن جب آئے گا، تو وہ پوائنٹ آف نو رٹرن (point of no return) کی سطح پر آئے گا۔ اس کے بعد آدمی کو صرف بھگتنا ہوگا، نہ کہ پیچھے لوٹ کر دوبارہ تیاری کرنا۔ پیدائش کے بعد ہی ہر عورت اور مرد کا، کاؤنٹ ڈاؤن (countdown) شروع ہو جاتا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ اس کا یہ کاؤنٹ ڈاؤن کب اپنے آخری نمبر پر پہنچ جائے۔

موت ایک یاد دہانی

ایک دن میں اپنے معاصرین (contemporaries) کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ افراد جو میرے زمانے میں پیدا ہوئے، جن کے ساتھ میں نے زندگی کا سفر طے کیا، جن کے ساتھ میں زمین پر چلتا پھرتا رہا— مسٹر اے کو میں نے زندہ حالت میں دیکھا تھا، مگر آج وہ اِس دنیا میں نہیں ہیں۔ مسٹر بی، مسٹر سی، مسٹر ڈی، مسٹر ای، سب کا یہی انجام ہو چکا ہے۔

اِس طرح میں اپنے جاننے والوں میں سے ایک ایک شخص کو یاد کرتا رہا۔ مجھے یاد آیا کہ یہ سارے لوگ اب وفات پا چکے ہیں۔ یہاں تک کہ پچھلے دنوں مجھے خبر ملی کہ مسٹر وائی کی بھی وفات ہوگئی۔ میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔ میری زبان سے نکلا کہ— میری باری بہت قریب آ گئی:

The countdown has reached the last but one number.

پھر میں نے سوچا کہ یہ معاملہ صرف میرا ذاتی معاملہ نہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہی معاملہ ہر عورت اور مرد کا معاملہ ہے۔ ہر ایک روزانہ دیکھ رہا ہے کہ اس کے آس پاس کے لوگ مرتے جا رہے ہیں۔ میڈیا کے ذریعہ ہر ایک، دور دور کے لوگوں کے بارے میں بھی اِسی طرح موت کی خبریں سنتا رہتا ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ کوئی شخص یہی بات خود اپنے بارے میں نہیں سوچتا۔ کوئی عورت یا مرد سنجیدگی کے ساتھ یہ غور نہیں کرتا کہ اِسی طرح میں خود بھی بہت جلد مرنے والا ہوں۔ وہ موت سے پہلے کی زندگی کے مسائل کے بارے میں تو ہر وقت سوچتا ہے، لیکن موت کے بعد کے مسائل کے بارے میں کوئی غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

جاننے کے باوجود نہ جاننے کے اِس عجیب ظاہرہ کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر عورت اور مرد اپنے ڈی این اے (DNA) سے کنٹرول ہوتا ہے۔ آدمی اپنا ہر چھوٹا یا بڑا کام ڈی این اے کی رہ نمائی میں کرتا ہے۔ مگر یہاں معاملہ یہ ہے کہ زندگی کے بارے میں تو ہر ایک کے ڈی این اے میں سب کچھ تفصیل کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ مگر ایک بات کسی کے ڈی این اے میں

سرے سے درج نہیں۔ اور وہ موت (death) کا معاملہ ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے تمام معاملات تو ڈی این اے کے کوڈ میں درج ہیں۔ اُنھیں کی مسلسل طور پر ڈی کوڈنگ (de-coding) ہوتی رہتی ہے، مگر موت کا تعلق ڈی این اے سے نہیں۔ ہر ایک کی موت براہِ راست طور پر خالق کے حکم سے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ایک کے لیے موت کا وقت الگ الگ ہے۔ لوگوں کی موت کا کوئی یکساں وقت نہیں۔

انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ موت کے بارے میں خود شعوری (self-consciousness) کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرے۔ وہ اِس معاملے میں اپنے ڈی این اے سے باہر آ کر سوچے۔ ایسا کرنے کی صورت ہی میں آدمی موت کی حقیقت کو اپنے ذہن میں تازہ کرے گا۔ ایسا کرنے کی صورت ہی میں یہ ممکن ہوگا کہ وہ موت کے سنگین معاملے کو سمجھے۔ وہ موت سے پہلے کے دورِ حیات میں موت کے بعد کے دورِ حیات کی تیاری کرے۔

انسان ایک ابدی مخلوق ہے۔ ڈی این اے اس ابدیت (eternity) کی تصدیق کرتا ہے۔ مگر خالق نے اپنے تخلیقی پلان کے مطابق، انسان کی طویل زندگی کو دو دوروں میں بانٹ دیا ہے — موت سے پہلے کا دورِ حیات، اور موت کے بعد کا دورِ حیات۔ اِس تخلیقی پلان کے مطابق، موت سے پہلے کا مختصر دورِ حیات امتحان (test) کے لیے ہے۔ اور موت کے بعد کا طویل تر دورِ حیات ٹسٹ پیریڈ کے ریکارڈ کے مطابق، اپنے عمل کا ابدی انجام پانے کے لیے۔

اِس وقت تمام لوگ وقتی خوشی (right here, right now) کے تصور کے تحت جی رہے ہیں۔ وہ حال رخی (present-oriented) زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن اگر انھیں حقیقتِ واقعہ کا شعور ہو جائے تو ان کی زندگی کا نقشہ بالکل بدل جائے۔ اب آنے والا دن ان کا سب سے بڑا کنسرن بن جائے۔ ہر ایک مستقبل رخی (future-oriented) زندگی گزارنے لگے۔ حال رخی زندگی، تعمیرِ دنیا کے اصول پر قائم ہے، جب کہ مستقبل رخی زندگی آخرت کے لیے تیاری کے اصول پر قائم ہوتی ہے — جو لوگ اِس حقیقت کو جان لیں، وہی کامیاب ہیں اور جو لوگ اِس حقیقت سے بے خبر ہیں، وہی ناکام۔

دوڑ بے منزل

ہر آدمی بے تکان بول رہا ہے۔ ہر آدمی آخری حد تک اپنی ضرورتوں کو بڑھائے ہوئے ہے۔ ہر آدمی لامحدود طور پر اپنی خواہشوں کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ عیش اور راحت کی تمام چیزیں وہ اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے اکھٹا کر لے۔ یہ مادّیت کی طرف مجنونانہ دوڑ ہے، مگر نتیجہ کیا نکل رہا ہے— ہر آدمی اِس احساس میں جیتا ہے کہ اس کی تمنائیں پوری نہیں ہوئیں۔ جو فُل فِل مینٹ وہ چاہتا تھا، وہ اس کو حاصل نہ کر سکا۔ ہر عورت اور مرد اِسی محرومی کے احساس میں جیتے ہیں۔ اِسی حال میں اُن کے رات اور دن گزرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اُن کی تمناؤں کا گھروندا حالات کے طوفان سے ٹکرا کر بکھر جاتا ہے۔ اور اگر حالات اس کو نہ توڑیں تو موت ہر حال میں اپنے وقت پر آتی ہے اور ہر ایک کو مجبور کرتی ہے کہ وہ موت کے بے رحم فیصلے کو قبول کرے، جس طرح اس سے پہلے اِس دنیا میں آنے والے تمام لوگ موت کے فیصلے کو مجبورانہ طور پر قبول کر چکے ہیں۔

لوگ موت سے پہلے کی عارضی زندگی کا سامان درست کرنے میں لگے ہوئے ہیں، حالاں کہ اصل ضرورت یہ ہے کہ موت کے بعد کی ابدی زندگی کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا جائے۔ موت سے پہلے کی زندگی، امتحان کی زندگی ہے۔ اِس بنا پر یہ خدا کی ذمے داری ہے کہ وہ ہر ایک کے لیے وہ سامان فراہم کرے، جس کے ذریعے وہ اپنا امتحان دے سکے۔ مگر جہاں تک موت کے بعد کی زندگی کا معاملہ ہے، اس کی ذمے داری خدا نے نہیں لی ہے۔ موت کے بعد کی زندگی میں سارا معاملہ آدمی کے اپنے عمل پر منحصر ہے۔

موجودہ زندگی کا اصول یہ ہے کہ کچھ نہ کرو، تب بھی تم کو ضرورت کا سامان یک طرفہ طور پر فراہم کیا جائے گا۔ مگر اگلی زندگی کا معاملہ اِس سے بالکل مختلف ہے۔ اگلی زندگی کا اصول ہے— جیسا بونا، ویسا کاٹنا۔ مگر عجیب بات ہے کہ لوگ موجودہ زندگی کے لیے تو خوب دوڑ دھوپ کر رہے ہیں، لیکن اگلی زندگی کے معاملے کو وہ سرتاسر بھولے ہوئے ہیں۔ موجودہ زندگی میں آج کی کمی، کل کے دن زیادہ عمل کر کے پوری کر لی جاتی ہے، لیکن اگلی زندگی میں کسی عورت اور مرد کے لیے یہ موقع نہ ہوگا کہ وہ اپنے ماضی کی کمیوں کی دوبارہ تلافی کر سکے۔

جب پردہ ہٹے گا

آج تمام حقیقتیں عالمِ غیب میں ہیں۔ ایک وقت آئے گا، جب کہ پردہ ہٹے گا اور تمام حقیقتیں سامنے آجائیں گی۔ لیکن جب پردہ ہٹے گا تو اُس وقت عمل کا موقع ختم ہو چکا ہوگا۔ انسان کرنا چاہے گا، مگر وہ کر نہ سکے گا۔ انسان لوٹنا چاہے گا، مگر وہ لوٹ نہ سکے گا۔

اِس معاملے میں ایک سنگین حقیقت یہ ہے کہ آدم نے جنت میں ایک غلطی کی اور اُنھیں جنت سے باہر آنا پڑا۔ اِس غلطی کے باوجود آدم کو دوسرا موقع (second chance) دیا گیا تھا، یعنی بہتر عمل کرکے دوبارہ وہ جنت میں جاسکتے تھے۔ یہ خصوصی معاملہ انسان کی صرف پہلی نسل کے لیے کیا گیا تھا۔ انسان کی بعد کی نسلوں کے لیے کوئی دوسرا موقع نہیں۔

انسانیت کی بعد کی نسلوں کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں عمل کا صرف ایک موقع پائیں۔ اگر وہ اِس پہلے موقع (first chance) کو استعمال نہ کرسکے تو ان کو کوئی دوسرا موقع ملنے والا نہیں۔ اُنھیں صرف ایک موقع ملا ہے۔ وہ یا تو اِس موقع کو استعمال کریں، یا وہ اِس موقع کو کھودیں۔ اگر انھوں نے اِس پہلے موقع کو استعمال کیا تو وہ بعد کی زندگی میں جنت میں جگہ پائیں گے۔ اور اگر انھوں اس پہلے موقع کو کھودیا تو اُن کو دوبارہ کوئی اور موقع حاصل ہونے والا نہیں۔

اِس صورتِ حال کا یہ تقاضا ہے کہ ہر عورت اور مرد جو اِس دنیا میں آتے ہیں، وہ یہاں بے حد محتاط زندگی گزاریں۔ وہ اپنے ایک لمحے کو ہزاروں سال سے زیادہ اہم سمجھیں۔ وہ آخرت کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا کنسرن (concern) بنائیں۔

ہر عورت اور مرد کو چاہئے کہ وہ اپنے عمل کی منصوبہ بندی تمام تر مستقبل کے اعتبار سے کریں، نہ کہ صرف حال کے اعتبار سے۔ وہ گہرے مطالعے کے ذریعے خالق کے تخلیقی پلان (creation plan) کو سمجھیں، اور اس کے مطابق، اپنی زندگی کا نقشہ بنائیں۔

جس خوشی کی ہمیں تلاش ہے

ایک بار میں راجستھان کے ایک مقام پر گیا۔ یہ سفر مولانا محمد تقی امینی (وفات: 1991) کے ساتھ ہوا تھا۔ ہم دونوں ایک صاحب سے ملے۔ وہ آبادی سے باہر ایک فارم ہاؤس میں رہتے تھے۔ اُن کو اپنے والد سے کافی مال وراثت میں ملا تھا۔

انھوں نے اپنی پسند کی ایک خاتون سے شادی کی، اور دونوں اس فارم ہاؤس میں رہنے لگے۔ بظاہر یہ فارم ہاؤس ایک خوب صورت دنیا کا منظر پیش کر رہا تھا، لیکن اُس کے اندر جو عورت اور مرد رہ رہے تھے، وہ کامل افسردگی کی تصویر تھے۔

اِن دونوں نے اپنی پسند کی شادی کی، اور پھر اِس فارم ہاؤس کے اندر ایک پُرمسرت اِزدواجی زندگی گزارنے لگے۔ کچھ سالوں تک دونوں بہت خوش تھے۔ اُس کے بعد دونوں، فارم ہاؤس کی اِس زندگی سے اکتا گیے۔ میں اور مولانا محمد تقی امینی اُس گھر میں ایک رات اور ایک دن ٹھیرے۔

اِس مدتِ قیام میں میں نے ایک بار بھی نہیں دیکھا کہ وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے ہوں۔ یہ فارم ہاؤس جو کبھی خوشیوں کا گھوارہ معلوم ہوتا ہوگا، اب وہ افسردگی کا ایک قبرستان بنا ہوا نظر آتا تھا۔

میں نے اپنی زندگی میں اِس طرح کے بہت سے لوگ دیکھے ہیں، مسلمانوں میں بھی اور غیر مسلموں میں بھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے نہایت محنت سے مال کمایا، لیکن جب مال اُنھیں حاصل ہوگیا تو انھوں نے دریافت کیا کہ مال میں اُن کے لیے کوئی خوشی نہیں۔

کسی نے نہایت ذوق وشوق کے ساتھ اپنی پسند کی شادی کی، لیکن تھوڑے دنوں کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ شادی اُن کے لیے صرف ایک خشک ذمے داری ہے، نہ کہ خوشیوں کی پُرمسرت زندگی۔ کسی نے اپنی پوری زندگی کو سیاست میں وقف کیا، تاکہ وہ سیاسی اقتدار کی کرسی پر پہنچ سکے، لیکن جب سیاسی اقتدار حاصل ہوگیا تو اُس کے لیے خوشیوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ کسی کا نشانہ یہ تھا

کہ اُس کے پاس ایک کشادہ اور خوب صورت مکان ہو، لیکن مکان جب بن کر تیار ہوگیا تو اس کے چہرے سے خوشی رخصت ہوچکی تھی، وغیرہ۔

موجودہ دنیا کا سب سے زیادہ الم ناک پہلو یہ ہے کہ یہ دنیا انسان کے لیے المیہ (tragedy) کے سوااور کچھ نہیں۔ بڑے بڑے ادیبوں نے ہر زبان میں لاکھوں کی تعداد میں ناول لکھے ہیں۔ یہ ناول گویا انسانی جذبات کی ترجمانی کی حیثیت رکھتے ہیں، تاہم یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ کسی بھی زبان میں کوئی طربیہ (comedy) ناول کبھی زیادہ مقبول نہ ہوسکا۔ دنیا میں جتنے بھی مقبول ناول ہیں، وہ سب کے سب المیہ (tragedy) ہیں۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ ہر انسان اِس احساس میں جی رہا ہے کہ وہ جس خوشی کو پانا چاہتا تھا، وہ اس کو حاصل نہ ہوسکی۔ یہی وجہ ہے کہ المیہ ناول انسان کے دل کو چھوتے ہیں، طربیہ ناول انسان کے مائنڈ کو ایڈریس نہیں کرتے۔

یہ انسانی زندگی کا بڑا عجیب پہلو ہے کہ ہر انسان کی عمر کا پہلا نصف حصہ خوشی کی تلاش میں گزرتا ہے، اور بقیہ نصف حصہ اِس احساس میں کہ بظاہر خوشیوں کے سامان حاصل کرنے کے باوجود میں اپنے لیے خوشیوں کی مطلوب دنیا نہ بنا سکا۔

تاریخ کا یہ تجربہ بتاتا ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی اِس لیے نہیں ہے کہ وہ یہاں اپنے لیے خوشیوں کی ایک دنیا بنائے۔ موجودہ زندگی صرف اس لیے ہے کہ آدمی حسنِ عمل سے اپنے آپ کو اِس قابل بنائے کہ وہ موت کے بعد کی ابدی زندگی میں خوشیوں کی مطلوب دنیا پاسکے۔

موت سے پہلے کا مرحلۂ حیات، اپنے آپ کو جنت کا مستحق بنانے کا مرحلہ ہے، اور موت کے بعد کا مرحلۂ حیات حسب استحقاق جنت میں داخلے کا مرحلہ، یعنی خوشیوں کی اُس دنیا میں داخلے کا مرحلہ، جس کو ہر آدمی کی روح تلاش کررہی ہے۔

آخری انجام

اورنگ زیب عالم گیر (وفات: 1707) کی بیٹی شہزادی زیب النساء بیگم (وفات: 1701) محل میں پیدا ہوئی۔ شاہانہ ماحول میں اس کی پرورش ہوئی۔ مگر آخر میں وہ بیمار ہوگئی۔ 62 سال کی عمر میں بعض تلخ تجربات کے بعد مایوسی کے عالم میں دہلی میں اس کی موت ہوئی۔ مرنے سے پہلے شہزادی نے اپنے مزار کے کتبہ کے لیے حسب ذیل فارسی شعر لکھا:

بر مزارِ ما غریباں، نَے چراغے، نَے گلے نَے پرِ پروانہ رقصد، نے صدائے بلبلے

یعنی مجھ غریب کی قبر پر نہ کوئی چراغ ہے اور نہ کوئی پھول۔ اِس لیے میرے مزار پر نہ کوئی پروانہ رقص کرتا ہے اور نہ کسی بلبل کی آواز سنائی دیتی ہے۔

موت اور آخری انجام کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ہر عورت اور مرد آخر کار اِسی قسم کے انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہر پیدا ہونے والے کے لیے آخر کار یہی مقدر ہے کہ وہ بے بسی کے عالم میں مرے اور ہمیشہ کے لیے اِس دنیا سے چلا جائے۔ یہ انجام ہر ایک کے لیے مقدر ہے، خواہ بظاہر وہ دولت واقتدار کے ماحول میں پیدا ہو یا غربت و بے کسی کے ماحول میں۔

کیا انسان اِسی لیے پیدا ہوا تھا کہ اِس طرح وہ ایک ناکام زندگی گزارے اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے مٹ کر ختم ہوجائے۔ یہ تصور عقل کے بھی خلاف ہے اور فطرت کے بھی خلاف۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی معنویت (meaning) کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ موجودہ دنیا کو آخرت کی دنیا کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے۔ آخرت کی دنیا انسانی زندگی کو بامعنی بناتی ہے۔ آخرت کو مانے بغیر انسان کی زندگی سراسر بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ آخرت کا یہ تصور اپنے آپ میں اِس بات کا ثبوت ہے کہ آخرت کا تصور ایک حقیقی تصور ہے۔ وہ کوئی بے بنیاد مفروضہ نہیں۔ آخرت کو مانے بغیر موجودہ دنیا کی کوئی بامعنی توجیہہ ممکن نہیں۔ آخرت کا عقیدہ انسان کو ایک بامقصد نشانہ دے دیتا ہے۔ آخرت کو ماننے کے بعد، موت سے پہلے کی زندگی بھی بامعنی بن جاتی ہے اور موت کے بعد کی زندگی بھی بامعنیٰ۔

شاکراور کفور

موت سے پہلے کا زمانہ حیات امتحان کا زمانہ ہے۔ موت کے بعد کا زمانہ حیات امتحان کے مطابق، اپنا انجام پانے کا زمانہ۔ یہ امتحان، قرآن (76:7) کے مطابق اِس بات کا ہے کہ کون شاکر بنتا ہے اور کون کفور، کون اعتراف کی زندگی جیتا ہے اور کون بے اعترافی میں مرجاتا ہے۔ شکر کی حقیقت اعتراف ہے اور کفر کی حقیقت بے اعترافی۔

آخرت میں جب تمام انسان خالق کے ساتھ حاضر کیے جائیں گے تو ہر ایک کے سابقہ اعمال کے مطابق، اس کی ابدی زندگی کا فیصلہ کیا جائے گا۔ خالق کی عدالت میں کسی کو شاکر ڈکلیر کیا جائے گا اور کسی کو کافر ڈکلیر کیا جائے گا۔ یہ فیصلہ اِس بنیاد پر ہوگا کہ کسی شخص نے موت سے پہلے کی زندگی میں کس قسم کے عمل کا ثبوت دیا۔

کسی انسان کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کو موت کے بعد اگلے دور حیات میں جنت میں داخلہ مل جائے۔ جنت میں یہ داخلہ کسی پراسرار بنیاد پر نہیں ہوگا، بلکہ وہ مکمل طور پر ایک معلوم بنیاد پر ہوگا۔ قرآن کی مذکورہ آیت یہ بتاتی ہے کہ یہ بنیاد شکر یا اعتراف ہے۔

موجودہ دنیا کی زندگی میں خدا کے فرشتے ہر انسان کے قول وعمل کا ریکارڈ بنا رہے ہیں۔ اِس ریکارڈ کے مطابق، جو شخص شاکر ثابت ہوگا، اس کے لیے جنت میں داخلے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اور جو شخص کفور ثابت ہوگا، وہ ہمیشہ کے لیے جنت سے محروم کردیا جائے گا۔

شاکر انسان کے اندر ایک مکمل شخصیت بنتی ہے۔ اِس شخصیت کو دوسرے الفاظ میں ربانی شخصیت کہا جا سکتا ہے۔ اِس شخصیت کی تعمیر آدمی خود کرتا ہے۔ کوئی شخص اپنے شعور کو جتنا زیادہ بیدار کرے گا، اتنا ہی وہ اپنے اندر ربانی شخصیت بنانے میں کامیاب ہوگا۔ یہ ربانی شخصیت زندہ شعوری عمل کے ذریعے بنتی ہے، وہ نہ خوش فہمیوں کے ذریعے بنتی ہے اور نہ کسی پراسرار طریقے کے ذریعے۔

وقت مقرر ہے

ہندستان میں ایک مشہور مقولہ ہے — قبضہ سچا، دعوی جھوٹا۔ مگر امریکا کا معاملہ اِس کے برعکس ہے۔ امریکا کا اصول یہ ہے کہ — دعویٰ سچا، قبضہ جھوٹا۔ ہندستان میں ہر جگہ یہ مثال دیکھی جاسکتی ہے کہ ایک گھر یا زمین اگر ایک بار کسی کے قبضے میں آ جائے تو اس کو عدالتی کارروائی کے ذریعے وہاں سے نکالنا عملی طور پر سخت دشوار ہو جاتا ہے۔ مگر امریکا میں ایسا نہیں ہوتا۔

ایک بار میں امریکا گیا۔ وہاں میں لاس اینجلس (Los Angeles) میں ایک صاحب کے ساتھ ان کے گھر پر ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں اُن کا ایک اور گھر تھا جس کو انھوں نے وقتی طور پر ایک شخص کو کرایہ پر دے دیا تھا۔ جب مدت پوری ہوئی تو انھوں نے اُس آدمی سے گھر چھوڑنے کے لیے کہا، مگر وہ آدمی گھر چھوڑنے پر راضی نہ ہوا۔ اِس کے بعد مالکِ مکان نے یہ کیا کہ ضروری کاغذات کے ساتھ ایک درخواست پولس آفیس میں بھیج دی۔ اِس کے بعد پولیس اُس گھر میں پہنچی، اور اس نے کرایے دار کو حکم دیا کہ وہ فوری طور پر گھر خالی کرے، ورنہ اس کو گرفتار کرلیا جائے گا۔ اِس کے بعد مذکورہ کرائے دار خاموشی کے ساتھ اُس گھر کو چھوڑ کر چلا گیا۔

یہ واقعہ دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ ایک اور معاملے میں ہر شخص کا کیس یہی ہے۔ ہر شخص موجودہ زمین پر ایک محدود مدت (limited period) کے لیے آباد کیا گیا ہے۔ اِس کے بعد ہر شخص کو لازماً اس زمین کو چھوڑ دینا ہے۔ مقرر مدت پوری ہوتے ہی خدا کے فرشتے آئیں گے اور جبری طور پر (compulsively) وہ انسان کو اِس زمین سے بے دخل (evict) کردیں گے۔

اگر کوئی شخص چاہے کہ وہ اِس زمین پر اپنے قبضے کو مسلسل باقی رکھے تو ایسا ہونا کبھی ممکن نہیں۔ موجودہ زمین پر انسان کا قیام خالق کی مرضی کے تحت صرف محدود مدت تک کے لیے ہے۔ جب یہ مدت پوری ہوگی تو اس کے بعد وہی معاملہ پیش آئے گا جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

فإذا جاء أجلهم لا يستأخرون ساعة ولا يستقدمون (7:34)

موت کے کنارے

ایک معروف مسلم شخصیت کا مضمون نظر سے گزرا۔ وہ اب بڑھاپے کی عمر کو پہنچ چکے ہیں۔ انھوں نے اِس مضمون میں اپنا حال بتاتے ہوئے لکھا تھا کہ — میں بھی اپنی کمزوری اور انحطاطِ صحت کو دیکھتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ غالب نے شاید کچھ ایسے ہی حالات میں دو شعر کہے ہوں گے:

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر، جہاں کوئی نہ ہو　　ہم سخن کوئی نہ ہو، ہم زباں کوئی نہ ہو

پڑیئے گر بیمار، تو کوئی نہ ہو تیماردار　　اور اگر مر جایئے، تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

بڑھاپے کی عمر درحقیقت موت کو یاد دلانے والی (reminder) ہوتی ہے۔ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ کر کسی عورت یا مرد کو سب سے زیادہ جو بات یاد کرنی چاہیے، وہ یہ ہے کہ اب میری موت بہت قریب آ چکی ہے۔ یہ یاد اس کو خدا اور آخرت کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ کر دے گی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ انسان موت کے عین قریب پہنچ کر بھی موت کو یاد نہیں کرتا، بلکہ وہ دوسری دوسری باتوں میں الجھا رہتا ہے۔ مذکورہ اقتباس اِسی قسم کی ایک مثال ہے۔

مضمون نگار نے اپنے بڑھاپے کا ذکر کرتے ہوئے غالب کا ایک شعر نقل کر دیا، حالاں کہ اُنھیں یہ لکھنا چاہیے تھا کہ اب میں موت کے کنارے پہنچ چکا ہوں۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ میں خدا کے سامنے اس طرح حاضر کر دیا جاؤں کہ میرے پاس بے بسی (helplessness) کے سوا کوئی اور سرمایہ موجود نہ ہو۔

یہ بلاشبہہ سب سے زیادہ خسارے کی بات ہے۔ موت ہر انسان کے لیے آخرت کی دنیا میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ موت کے بعد ہر انسان پر وہ وقت آنے والا ہے، جب کہ وہ اپنے خالق کے سامنے حساب کتاب کے لیے پیش کر دیا جائے۔ ہر انسان کو سب سے زیادہ اِسی آنے والے وقت کے بارے میں غور کرنا چاہیے، مگر عجیب بات ہے کہ انسان اسی اہم ترین بات کو سب سے زیادہ بھولا ہوا رہتا ہے۔ وہ اس کے بارے میں صرف اُس وقت سوچتا ہے جب کہ سوچنے کا وقت نکل چکا ہو۔

موت سے بے خبر

لوگ ہر روز مر رہے ہیں۔ ہر روز انسان موت کی کوئی نہ کوئی خبر سنتا ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ کوئی شخص خود اپنی موت کے بارے میں نہیں سوچتا۔ وہ دوسروں کی موت کے بارے میں جانتا ہے، لیکن خود اپنی موت کے بارے میں وہ شعوری طور پر بے خبر رہتا ہے۔

اِس بے خبری کا سبب کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر بات جو آدمی جانتا ہے، وہ سوچ کر جانتا ہے۔ سوچنے سے باتیں آدمی کے علم میں آتی ہیں۔ جس چیز کے بارے میں آپ نہ سوچیں، اُس کے بارے میں آپ باخبر بھی نہیں ہو سکتے۔

انسان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اپنی محدودیت کی بنا پر کسی ایک ہی چیز پر فوکس (focus) کر پاتا ہے۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ہر لمحہ علائقِ دنیا (worldly relations) میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ صرف اپنے ذاتی معاملات کے بارے میں سوچتے ہیں۔

اِس معاملے میں لوگوں کی بے خبری کا حال یہ ہے کہ وہ قبرستان میں ایک مرے ہوئے انسان کو دیکھتے ہیں، لیکن وہ بدستور اپنے دنیوی معاملات پر سوچتے رہتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں موبائل نے لوگوں کی اِس غیر ضروری مصروفیت میں اور زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔ ہر آدمی کو بہر حال موت کا سامنا کرنا ہے، لیکن موت کا شعور صرف اُس انسان کو حاصل ہوگا جو دنیوی معاملات سے منقطع (detached) ہو کر موت کے بارے میں سوچ سکے۔

لوگوں کی اِس عادت کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کی سوچ کا دائرہ صرف اپنے دنیوی معاملات اور تعلقات تک محدود رہتا ہے۔ موت کا معاملہ کسی بھی وقت ان کے فوکس میں نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام عورتیں اور تمام مرد موت کے درمیان رہتے ہوئے بھی موت سے بے خبر رہتے ہیں۔ وہ موت کے واقعہ کو شعوری طور پر صرف اُس وقت جانتے ہیں جب کہ موت کا فرشتہ آجائے اور ان کی روح کو قبض کر کے جبری طور پر اُن کو موت کے بعد والی دنیا میں داخل کر دے۔

موت یک طرفہ معاملہ

زلزلہ ہمیشہ یک طرفہ طور پر آتا ہے۔ زلزلہ ایک ایسا فیصلہ کن واقعہ ہے جس میں انسان کی رائے اوراس کے اختیار کا کوئی دخل نہیں۔ یہی معاملہ موت کا ہے۔ موت ہمیشہ یک طرفہ طور پر آتی ہے۔ موت کے معاملے میں انسان کو کوئی ذاتی اختیار حاصل نہیں۔ موت کا یہ پہلو بے حد سنگین ہے۔ اِس کا تقاضا ہے کہ آدمی ہر لمحہ موت کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہے۔

موت جب کسی انسان کے اوپر آتی ہے تو وہ اچانک اس کو بالکل اکیلا بنا دیتی ہے۔ موت سے پہلے آدمی بے شمار چیزوں کے درمیان ہوتا ہے— گھر، خاندان، ساتھی، مددگار، نیز ایک پورا عالمِ فطرت جو ہر لمحہ اس کی حاجتیں پوری کرنے کے لیے موجود رہتا ہے۔

موت کے بعد آدمی اچانک محسوس کرتا ہے کہ اس کا وجود تو اب بھی وہی ہے۔ اُس کا وجود پہلے کی طرح اب بھی اس کے ساتھ ہوتا ہے، لیکن اپنے وجود کے باہر کی تمام چیزیں اس کا ساتھ چھوڑ چکی ہوتی ہیں۔ وہ اپنے سامنے دیکھتا ہے تو وہاں اس کو کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے پیچھے دیکھتا ہے تو وہاں اس کو کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ وہ اپنے دائیں دیکھتا ہے تو وہاں اس کو ہر طرف سناٹا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے بائیں دیکھتا ہے تو وہاں بھی اس کو سناٹے کے سوا کوئی اور چیز دکھائی نہیں دیتی۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ یہاں اس کے لیے بے بسی اور بے چارگی کے سوا کچھ اور موجود نہیں۔

موت سے پہلے کی دنیا میں آدمی کو بہت کچھ ملا ہوا رہتا ہے، مگر یہ تمام چیزیں صرف وقتی سامانِ حیات کے طور پر ہیں، وہ صرف موت سے پہلے کے دورِ حیات کے لیے ہیں، موت کے بعد کے دورِ حیات میں وہ دوبارہ کسی کو ملنے والی نہیں۔ البتہ جو عورت یا مرد اپنے کو مستحق ثابت کریں، ان کو موت کے بعد کے دورِ حیات میں یہ تمام چیزیں مزید اضافے کے ساتھ بطور انعام حاصل ہو جائیں گی۔ استحقاق (deservation) کے بغیر کسی بھی عورت یا مرد کو آخرت کی زندگی (life-Hereafter) میں دوبارہ یہ سامانِ حیات ملنے والا نہیں۔

موت کا واقعہ

ہر عورت اور ہر مرد کو موت (death) کا سامنا کرنا ہے، کسی کو آج موت آنے والی ہے اور کسی کو کل۔ موت ہر پیدا ہونے والے انسان کا سب سے زیادہ بھیانک مسئلہ ہے۔ موت کا مطلب ہے— موجودہ دنیا سے کامل طور پر منقطع ہو جانا:

Death means total detachment from the present world.

موت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کا اپنا وجود تو اس کے ساتھ رہتا ہے، لیکن بقیہ تمام چیزیں اس سے مکمل طور پر چھن جائیں— گھر، خاندان، ساتھی، سامانِ حیات، آدمی کی تاریخ، غرض سب کچھ اچانک اس سے اِس طرح چھن جائے کہ دونوں ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موت ہر عورت اور مرد کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ہر انسان کو یہ سوچنا ہے کہ موت کے بعد اس کے ساتھ کیا پیش آئے گا۔ ہر انسان کو اُس دن کی تیاری کرنا ہے جب کہ وہ موجودہ دنیا میں زندگی کا سفر طے کرکے وہاں پہنچے گا، جہاں اُس کے پیچھے وہ دنیا ہوگی جس کو وہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ چکا، اور اس کے آگے وہ دنیا ہوگی جہاں سے لوٹنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ یہ لمحہ ہر عورت اور مرد پر آنے والا ہے۔ اِس معاملے میں کسی عورت یا مرد کا کوئی استثنا نہیں۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس کے بارے میں ہر عورت اور مرد کو سب سے زیادہ سوچنا چاہیے۔ مزید یہ کہ موت کے بعد آنے والے دورِ حیات میں یہ ممکن نہ ہوگا کہ آدمی دوبارہ عمل کرے، وہ دوبارہ اپنے لیے ایک نئے مستقبل کی تعمیر کرے۔ عمل کا موقع صرف موت سے پہلے والے دورِ حیات میں ہے۔ موت کے بعد والے دورِ حیات میں عمل نہیں ہے، بلکہ صرف انجام ہے۔ ہر آدمی کو چاہیے کہ موت کے بعد اس کے ساتھ جو کچھ پیش آنے والا ہے، اس کو وہ آج ہی جان لے، کیوں کہ موت کے بعد جاننے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں جاننے والا صرف وہی شخص ہے جو موت سے پہلے اس کی حقیقت کو دریافت کرلے۔ موت کے بعد ہر شخص اس کی حقیقت سے باخبر ہو جائے گا، مگر اس وقت کا جاننا کوئی جاننا نہیں— یہی ہر انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

موت کا دھماکہ

ایک دولت مند آدمی کا واقعہ ہے۔ اُس نے اپنے گھر کے ایک ملازم سے کہا کہ میرا بستر ٹھیک کردو، مجھے سونا ہے۔ یہ بہت نرم اور آرام دہ بستر تھا۔ ملازم نے بستر ٹھیک کیا۔ اِس کے بعد تھوڑی دیر کے لیے وہ بستر پر لیٹ گیا۔ ملازم تھکا ہوا تھا، چناں چہ اُس کو فوراً نیند آ گئی۔

مذکورہ دولت مند آدمی جب اپنے کمرے میں آیا تو اُس نے دیکھا کہ اس کا ملازم اس کے بستر پر سو رہا ہے۔ یہ دیکھ کر دولت مند آدمی کو غصہ آ گیا۔

اُس نے دھکا دے کر ملازم کو جگایا اور ڈانٹ کر کہا کہ میں نے تم کو بستر ٹھیک کرنے کے لیے کہا تھا، نہ کہ خود اُس پر سونے کے لیے۔ یہ سن کر ملازم نے کہا:

سر، اُس وقت کو یاد کیجیے جب کہ آپ پر موت آئے گی اور آپ کو اِس نرم بستر کے بجائے قبر کے تاریک گڑھے میں لٹا دیا جائے گا۔

مذکورہ دولت مند آدمی کے لیے ملازم کا یہ قول ایک دھماکہ ثابت ہوا۔ اس قول کو سن کر وہ لرز اٹھا۔ اِس کے بعد وہ بہت زیادہ موت کے بارے میں سوچنے لگا۔

یہ سوچ اتنی بڑھی کہ دولت کے باوجود اُس کا آرام وعیش اُس سے چھوٹ گیا۔ سب کچھ ہونے کے باوجود وہ اِس طرح رہنے لگا جیسے کہ اُس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ وہ زندگی سے زیادہ موت کو حقیقی سمجھنے لگا۔ اِس کے بعد وہ بالکل سادہ زندگی گزارنے لگا، یہاں تک کہ وہ کم عمری میں مر گیا۔

موت کی یاد سب سے بڑی حقیقت کی یاد ہے۔ موت کی یاد آدمی کے اندر انقلاب برپا کر دیتی ہے۔ لیکن موت کی یاد کے لیے ایک دھماکہ درکار ہے۔ موت کی فراموشی کو توڑنے کے لیے دھماکہ سے کم کوئی چیز کارآمد نہیں۔ یہ دھماکہ مادی بھی ہو سکتا ہے اور فکری بھی۔

وہ انسان بلاشبہہ ایک خوش قسمت انسان ہے جس کی زندگی میں اِس طرح کا کوئی دھماکہ پیش آئے اور وہ موت کو یاد کرنے والا بن جائے۔

سب سے بڑی کنڈیشننگ

ہر انسان کو آخر کار مرنا ہے، لیکن ہر انسان موت کو بھولا ہوا ہے۔ حقیقی معنوں میں، موت کو یاد کرنے والا کوئی نہیں۔ اِس کا سبب کیا ہے۔ ہر عورت اور مرد موت کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں، لیکن ہر عورت اور مرد موت سے بے خبری کی زندگی گزارتے ہیں۔

اِس ظاہرہ (phenomenon) کا اصل سبب کنڈیشننگ (conditioning) ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ ایک دنیا کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ پیدا ہوتے ہی اس کو ایک مکمل دنیا مل جاتی ہے۔ یہ دنیا ہر لمحہ اس کے ساتھ رہتی ہے۔ انسان خواہ اپنے مقام پر ہو یا وہ سفر میں ہو، ہر حال میں وہ ایک دنیا کے اندر زندگی گزارتا ہے۔ دنیا سے یہ غیر منقطع اور مسلسل تعلق ہر لمحہ اس کی کنڈیشننگ کرتا رہتا ہے۔ آدمی غیر شعوری طور پر یہ یقین کر لیتا ہے کہ میں اور دنیا دونوں ایک دوسرے کا لازمی حصہ ہیں۔ میں دنیا سے جدا ہونے والا نہیں، اور دنیا مجھ سے جدا ہونے والی نہیں۔

یہ پورا معاملہ غیر شعوری طور پر ہوتا ہے۔ اِسی غیر شعوری معالے کا نام کنڈیشننگ ہے۔ مسلسل عمل کی بنا پر یہ کنڈیشننگ آخری حد تک پختہ ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ کوئی عورت یا مرد یہ سوچ نہیں پاتے کہ اُن کے اوپر وہ وقت بھی آ سکتا ہے جب کہ وہ موجودہ دنیا سے الگ ہو جائیں گے اور موجودہ دنیا اُن سے الگ ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ موت کے کنارے کھڑے ہو کر بھی وہ کامل طور پر موت کی حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ موت کو بہت زیادہ یاد کرو (**أكثروا ذكر هادم اللذات، الموت**)۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زبان سے موت موت کہتے رہو۔ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ بہت زیادہ سوچ کر موت کے بارے میں اپنی کنڈیشننگ کو توڑو، موت کے بارے میں اپنی ڈی کنڈیشننگ (de-conditioning) کرو۔ موت کے معاملے میں یہ ڈی کنڈیشننگ صرف اُس وقت ہو سکتی ہے جب کہ آدمی اِس معاملے میں غور وفکر کی آخری حد تک پہنچ جائے۔

موت کا واقعہ

موت بلاشبہہ سب سے زیادہ معلوم واقعہ ہے۔ مگر موت کا واقعہ عملاً سب سے زیادہ غیر معلوم واقعہ بنا ہوا ہے۔ آپ کسی بھی شخص سے ملئے، وہ موت کا سنجیدہ ذکر کرتے ہوئے نہیں ملے گا۔ اِس کا سبب کیا ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ موت لوگوں کے لیے صرف ایک خارجی خبر ہے، وہ لوگوں کا ذاتی تجربہ (personal experience) نہیں۔

مرنے والے روزانہ مر رہے ہیں۔ اِن مرنے والوں کے لیے موت یقیناً ایک ذاتی تجربہ ہوتا ہے، لیکن عملاً یہ ہوتا ہے کہ موت کا ذاتی تجربہ پیش آتے ہی آدمی اِس دنیا کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے تجربے کو بتانے کے لیے دوبارہ اِس دنیا میں واپس نہیں آتا۔ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر خبر کو صرف دور کی ایک چیز سمجھتا ہے۔ وہ کسی خبر کو ذاتی تجربہ کے طور پر نہیں لیتا۔ مثال کے طور پر سگرٹ نوشی (smoking) کے نقصان کی خبر آدمی کو سگرٹ سے روکنے والی نہیں بنتی۔ وہ سگرٹ نوشی چھوڑنے کا ارادہ صرف اُس وقت کرتا ہے جب کہ اس کو سگرٹ نوشی کے نقصان کا ذاتی تجربہ ہو جائے۔

یہ ایک مہلک کمزوری ہے۔ ہر عورت اور مرد کو چاہیے کہ وہ اپنے کو اِس مہلک کمزوری کا شکار ہونے سے بچائیں۔ عقل مند وہ ہے جو اپنے شعور کو اتنا زیادہ بیدار کرے کہ دوسرے کی موت اس کو اپنی موت نظر آنے لگے۔ موت کی خبر اس کو اُسی طرح ہلانے والی ثابت ہو جس طرح موت کا ذاتی تجربہ آدمی کو آخری حد تک ہلا دیتا ہے۔

جس آدمی کو موت کا حقیقی شعور ہو جائے، وہ زندگی سے زیادہ موت کے بارے میں سوچے گا۔ وہ زندگی سے زیادہ موت کے معاملے میں سنجیدہ ہو جائے گا۔ زندگی سے متعلق کوئی غلطی صرف وقتی نقصان پہنچاتی ہے، لیکن موت کے بارے میں غلطی کرنا، آدمی کے لیے ابدی نقصان کا سبب بن جائے گا۔ جو شخص اِس حقیقت کو جان لے، وہ موت کے بارے میں آخری حد تک سنجیدہ ہو جائے گا۔

موت ایک مستقل رِمائنڈر

موت کیا ہے، موت عجز اور قدرت کے درمیان ملاقات کا دن ہے۔ موت وہ لمحہ ہے جب کہ عاجزِ مطلق کا سامنا قادرِ مطلق سے پیش آتا ہے۔ موت سے پہلے جو انسان اپنے آپ کو آزاد سمجھتا تھا، موت کے بعد اچانک وہ دیکھے گا کہ اس کی آزادی خود اپنی نہ تھی، بلکہ وہ ایک اور ہستی کی دی ہوئی آزادی تھی۔ موت اچانک آدمی کو یہ بتائے گی کہ موت سے پہلے کی زندگی عمل کرنے کی زندگی تھی اور موت کے بعد کی زندگی اپنے عمل کا انجام پانے کی زندگی۔

موت ایک ایسا گیٹ ہے جس کے اندر آدمی داخل ہونے کے لئے مجبور ہے۔ اور داخل ہونے کے بعد اس کو خالقِ کائنات کا آخری فیصلہ (final judgement) سننا ہے۔ اِس فیصلے کے خلاف اپیل کے لئے کوئی اور عدالت موجود نہیں۔

موت کا مطلب ہے—ایک دنیا کو چھوڑ کر دوسری دنیا میں چلے جانا۔ پہلی دنیا میں سب کچھ اسبابِ امتحان کے طور پر ملا ہوا تھا، دوسری دنیا میں جو کچھ ملے گا، وہ صرف نتیجۂ امتحان کے طور پر ملے گا۔ پہلی دنیا میں ہر چیز بلا استحقاق ملی ہوئی تھی، دوسری دنیا میں کوئی چیز صرف اُس وقت ملے گی جب کہ آدمی نے اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کیا ہو۔

حدیث میں آیا ہے کہ موت کو بہت زیادہ یاد کرو (**أكثروا ذكر هادم اللذات، الموت**)۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ موت کو اپنے لیے ایک مستقل رمائنڈر (permanent reminder) بنالو۔ اگر کسی آدمی کو ایسی جسمانی چوٹ لگ جائے جس کا درد (pain) وہ ہر وقت محسوس کرتا ہے تو یہ درد اُس چوٹ کے لیے گویا ایک مستقل رمائنڈر بن جائے گا۔

اِسی طرح جو شخص موت کے معاملے کو حقیقی طور پر جان لے تو وہ ہر وقت اُس کو یاد کرنے لگے گا۔ موت کی یاد اُس کو آخرت کی یاد دلائے گی۔ اور آخرت کی یاد اُس کو وہ تمام چیزیں یاد دلاتی رہے گی جن کا تعلق موت کے بعد والی زندگی سے ہے۔

موت کا سفر

انسان ایک سیارے پر آباد ہے جس کو سیارۂ زمین (planet earth) کہا جاتا ہے۔ یہ سیارۂ زمین مسلسل طور پر متحرک ہے۔ وہ ہر لمحہ ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا ہے۔ اس کے ساتھ گویا کہ انسان بھی ہر لمحہ حالتِ سفر میں ہے۔ یہ واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ انسان ایک مسافر ہے۔ انسان کا یہ سفر لازمی طور پر جاری رہتا ہے، خواہ وہ اس کو چاہے یا وہ اس کو نہ چاہے۔

یہ سفر آدمی کو کہاں سے کہاں لے جا رہا ہے۔ قرآن کے مطابق، ہر پیدا ہونے والا زندگی سے موت کی طرف جا رہا ہے، موت سے میدانِ حشر کی طرف، میدانِ حشر سے خدا کی عدالت کی حاضری کی طرف، خدا کی عدالت کی حاضری کے بعد اپنے آخری ٹھکانے کی طرف۔ یہ آخری ٹھکانہ یا تو ابدی جنت ہوگی یا ابدی جہنم۔

اِس سفر میں آدمی کو یہ اختیار تو ہے کہ وہ اپنا چہرہ مشرق کی طرف کرلے یا مغرب کی طرف، وہ اپنا چہرہ شمال کی طرف کرلے یا جنوب کی طرف۔ اپنے رخ کے معاملے میں آدمی کو اِس قسم کا اختیار حاصل ہے، لیکن سفر کے مراحل اور سفر کے آخری انجام کے معاملے میں اس کو کوئی ذاتی اختیار حاصل نہیں۔ سفر کے مراحل اور سفر کے آخری انجام کو طے کرنے والا خود خداوند عالم ہے۔

موت کا یہ تصور، موت کو ایک نیا انقلابی مفہوم دے دیتا ہے۔ اِسی طرح موت کا یہ تصور زندگی کو بھی ایک نیا انقلابی مفہوم عطا کرتا ہے۔ موت سادہ طور پر خاتمۂ حیات نہیں۔ موت کا تصور گویا کہ ایک فکری بھونچال ہے۔ موت کا تصور آدمی کو اِس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے بارے میں آخری حد تک محتاط اور ذمے دار بن جائے۔

اِس طرح موت کا تصور آدمی کو اِس قابل بناتا ہے کہ وہ موت کے بعد کے مرحلے کے بارے میں آخری حد تک سنجیدہ ہوجائے۔ یہ گویا کہ موت کا ایک اصلاحی رول ہے۔ اِس اعتبار سے، موت بلاشبہہ ہر آدمی کے لیے ایک مصلحِ اعظم کی حیثیت رکھتی ہے۔

آنے والا وقت

ہر آدمی پر وہ وقت آنے والا ہے جب کہ وہ خود تو ہوگا، مگر یہ دنیا اس کے ساتھ نہ ہوگی۔ جب کہ وہ ہوگا، مگر اس کے گھر والے، اس کے جاننے والے اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہوں گے۔ جب کہ وہ ہوگا، مگر وہ سب کچھ اس کے پاس نہ ہوگا جن کے درمیان وہ زندگی گزار رہا تھا۔

یہ آنے والا لمحہ موت کا لمحہ ہے۔ موت آدمی کو اُس دنیا سے نکال دے گی جہاں وہ سب کچھ پائے ہوئے تھا، اور اُس دنیا میں پہنچا دے گی جہاں اُس کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ اُس دن امیر آدمی ایک مفلس آدمی نظر آئے گا۔ اس دن طاقت والا آدمی بے طاقت ہو چکا ہوگا۔ اس دن موجودہ دنیا میں اس کے تمام ساتھی اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہوں گے۔

موت کا فرشتہ کبھی اپائنٹمنٹ (appointment) لے کر نہیں آتا، وہ بتائے بغیر اچانک آدمی کے پاس آجاتا ہے۔ عقل مند انسان وہ ہے جو ہر دن کو اپنا آخری دن سمجھے۔

یہ آنے والا وقت تیزی سے ہر آدمی کی طرف چلا آرہا ہے۔ کسی آدمی کے اوپر وہ آج شام کو آجائے گا اور کسی آدمی کے اوپر کل صبح کو، کسی کے اوپر اس کے بعد اور کسی کے اوپر اس کے بعد۔

یہ زندگی کے خاتمہ کا وقت نہیں ہوگا، بلکہ وہ ایک نئے دورِ حیات میں داخلے کا وقت ہوگا۔ یہ بلاشبہہ ہر آدمی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ہر عورت اور مرد کو سب سے زیادہ اسی کے بارے میں سوچنا چاہیے، ہر عورت اور مرد کو سب سے زیادہ اِسی کی فکر کرنا چاہیے۔ آنے والے دورِ حیات (life span) میں جو انسان کامیاب ہوا، وہی کامیاب ہے۔ اور جو انسان وہاں ناکام ہوا، وہی ناکام۔ کامیابی اور ناکامی کا حقیقی مدار موت کے بعد والے دورِ حیات پر ہے، نہ کہ موت کے پہلے والے دورِ حیات پر۔

موت کا تصور کوئی منفی تصور نہیں، وہ انتہائی حد تک ایک مثبت تصور ہے۔ موت کا تصور آدمی کو یہ محرک (incentive) دیتا ہے کہ وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنی آخرت کی تیاری کرے۔ وہ آخرت کے معاملے کو اپنا واحد کنسرن بنالے۔

موت سے غفلت کیوں

میں نے ایک نوجوان طالب علم کو دیکھا۔ اس کے امتحان کا زمانہ قریب آ گیا تھا، مگر اس کی تیاری نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ماں باپ روزانہ اس کو امتحان کی یاد دلاتے رہتے تھے۔ وہ سخت انداز میں اس سے کہتے تھے کہ — اگر تم امتحان میں فیل ہو گئے تو تمھارا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ تم کسی کام کے نہیں رہو گے۔ ماں باپ کی اِس یاددہانی کا اُس طالب علم پر اتنا اثر ہوا کہ وہ اپنے کمرہ میں بند ہو گیا اور ہر وقت بس امتحان کی تیاری کرنے لگا۔

اس واقعہ سے میں نے سمجھا کہ لوگ موت سے غافل کیوں رہتے ہیں۔ موت سے غفلت کا سبب دراصل آخرت سے غفلت ہے۔ ہر عورت اور مرد رات دن صرف اپنی دنیا کے تقاضوں میں مشغول رہتے ہیں، وہ ہر وقت بس دنیا کے نفع ونقصان پر سوچتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موت کا تصور ان کی زندہ یادداشت میں موجود نہیں رہتا۔ اگر ایسا ہو کہ ان کا ذہن روزانہ موت کے بعد آنے والے حالات پر سوچے، موت کے بعد خدا کی عدالت میں حاضری کو وہ ایک سنگین مسئلہ کے طور پر اپنے ذہن میں تازہ کرتے رہیں تو وہ کبھی موت سے غافل نہ ہوں۔ وہ موت کے بارے میں اس سے زیادہ سنجیدہ ہو جائیں جتنا کہ مذکورہ طالب علم اپنے امتحان کے بارے میں سنجیدہ ہو گیا تھا۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ موت سے پہلے کی زندگی کے بارے میں خوب سوچتے ہیں، لیکن وہ موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں بالکل نہیں سوچتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر وقت دنیا کی چیزوں کا تذکرہ کرتے ہیں، لیکن وہ آخرت کے معاملے کا کبھی تذکرہ نہیں کرتے۔ یہی وہ مزاج ہے جس نے لوگوں کو موت کے معاملے میں غیر سنجیدہ بنا رکھا ہے۔ کوئی بھی واقعہ ان کو موت کی یاد دلانے والا نہیں بنتا۔ وہ دوسرے کو مرتے ہوئے دیکھتے ہیں، لیکن وہ اپنی موت کو یاد نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت سے فراموشی خود اپنے مستقبل سے فراموشی ہے۔ موت ایک زلزلہ ہے، آدمی کے لیے جو کچھ کرنے کا موقع ہے، وہ صرف زلزلے سے پہلے ہے، زلزلے کے بعد کسی کے لیے کچھ کرنے کا موقع نہیں۔

موت کی یاد

موت کی یاد کیا ہے۔ موت کی یاد یہ ہے کہ آپ کامل شعور کے ساتھ یہ سوچ سکیں کہ آپ کا یہی زندہ وجود اچانک ایک دن موجودہ دنیا سے نکال کر ایک اور دنیا میں ڈال دیا جائے گا، جہاں آپ کی ہر چیز چھن چکی ہوگی، حتی کہ آپ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے دوبارہ بات بھی نہ کرسکیں گے۔ آپ اُس دنیا میں اکیلے ہوں گے اور پوری طرح بے سروسامان بھی۔ یہ احساس جب زندہ شعور کی حیثیت سے آپ کے اوپر طاری ہوجائے، تب سمجھئے کہ آپ نے موت کو یاد کیا۔

موت کی یاد دور کے ایک واقعہ کی یاد نہیں ہے۔ موت کی یاد ایک ایسے بھیانک تجربہ کی یاد ہے جو بہر حال آپ کی زندگی میں پیش آنے والا ہے۔ موت کی یاد اگر اس طرح آپ کے دماغ میں سما جائے کہ دنیا سے آپ کی دلچسپی باقی نہ رہے۔ ہر رات آپ کو ایسی معلوم ہو جیسے کہ اگلی صبح آپ کے لیے قیامت کی صبح ہوگی۔ اور ہر صبح آپ کو ایسی معلوم ہو جیسے کہ آنے والی شام آپ کے لیے قیامت کی شام ثابت ہوگی۔ جب آپ کا حال یہ ہوجائے کہ آپ کو یہ محسوس ہونے لگے کہ ہر لمحہ آپ موت کے دروازے پر کھڑے ہوئے ہیں۔ جب ہر مرنے والا شخص آپ کے لئے اپنی موت کی یاد دہانی بن جائے، اُس وقت سمجھئے کہ آپ نے موت کو یاد کیا۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو حدیث میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **أکثروا ذکر هادم اللذات، الموت (الترمذي، کتاب الزهد)** یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کرو جو لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے۔ اس حدیث میں لذت ایک جامع لفظ ہے۔ اِس میں انسان کی تمام خواہشات اور تمام جذبات شامل ہیں۔ کوئی شخص موت کو حقیقی طور پر یاد کرے تو بلاشبہہ اس کی زندگی میں بھونچال آجائے گا۔ اس کی شخصیت ہر اعتبار سے ایک نئی شخصیت بن جائے گی۔ اس کی سوچ مکمل طور پر آخرت رخی سوچ (akhirat-oriented thinking) بن جائے گی۔ موت کی یاد کے بعد اگر کوئی شخص ویسا بنا رہے، جیسا کہ وہ پہلے تھا تو یہ اِس بات کا ثبوت ہوگا کہ اس نے موت کو یاد ہی نہیں کیا۔

موت کی آہٹ

جو شخص موت کے بارے میں حساس ہو، جو موت کو بہت زیادہ یاد کرے، ایسے شخص کو موت کی آہٹ پہلے سے معلوم ہو جاتی ہے۔ وہ مزید اضافہ کے ساتھ موت کی تیاری میں لگ جاتا ہے۔ ایسے شخص کے ساتھ یہ اللہ کی خاص نصرت ہوتی ہے۔

مگر جو لوگ موت سے غافل ہوں، جن کی زندگی موت کی یاد سے خالی ہو، ان کے ساتھ یہ حادثہ پیش آتا ہے کہ موت ان کو اچانک دبوچ لیتی ہے۔ اس کے بعد وہ اُن کو زمین کے موافقِ حیات سیارے سے اٹھا کر ایک ایسے غیر موافق مقام پر پہنچا دیتی ہے جہاں سے واپسی ان کے لئے ممکن نہیں ہوتی۔ اب اچانک ان کو معلوم ہوتا ہے کہ اس غیر موافق مقام پر ان کو ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔

وہ یہاں پکاریں گے، لیکن وہاں کوئی نہ ہوگا جو ان کی پکار پر دوڑے۔ وہ آنکھ کھول کر دیکھیں گے، لیکن وہاں کوئی قابل دید منظر ان کے دیکھنے کے لیے موجود نہ ہوگا۔ وہ روئیں گے اور تڑپیں گے، لیکن وہاں کوئی نہ ہوگا جو ان کے آنسو پوچھے اور ان کو تسکین دلائے۔ وہ بھاگنا چاہیں گے، لیکن وہاں کوئی منزل نہ ہوگی جدھر وہ بھاگ کر جا سکیں۔ وہ اپنے دائیں دیکھیں گے اور بائیں دیکھیں گے وہ اپنے آگے دیکھیں گے اور پیچھے دیکھیں گے، لیکن ان لوگوں میں سے کوئی بھی وہاں موجود نہ ہوگا جن کو دنیا میں وہ اپنا ساتھی سمجھتے تھے۔ وہ بھوک سے تڑپیں گے، لیکن وہاں ان کے لئے کھانے کا کوئی انتظام نہ ہوگا۔ وہ محسوس کریں گے کہ دنیا میں جو کچھ ان کے پاس تھا وہ ان سے چھوٹ چکا۔ اب نئے مقام پر اس کا کوئی امکان نہیں کہ وہ دوبارہ اپنی ایک نئی دنیا بنا سکیں۔

یہ بھیانک صورتِ حال ہر عورت اور مرد کے سامنے آنے والی ہے۔ ہر عورت اور مرد اچانک ایک ایسے مقام پر پہنچنے والا ہے، جہاں سے واپسی اس کے لیے ممکن نہ ہوگی۔ عقل مند انسان وہ ہے جو موت کے معاملے میں اتنا زیادہ حساس (sensitive) ہو کہ موت سے پہلے وہ اس کی آہٹ (inkling) محسوس کرلے۔ وہ موت سے پہلے، موت کی تیاری کرلے۔

زندگی اور موت

زندگی کیا ہے، موت کی طرف سفر۔ موت کیا ہے، غیر یقینی مستقبل کی طرف چھلانگ — جو انسان اِس حقیقت کو جان لے، اس کے اندر ایک انقلاب آجائے گا۔ اس کی زندگی بھی بامعنیٰ ہو جائے گی اور اس کی موت بھی بامعنیٰ۔ اس کی رات اور دن اپنی خواہشوں کے تابع نہ رہیں گے، بلکہ وہ اُس خالق کی مرضی کے تابع ہو جائیں گے جس نے زندگی اور موت کا یہ نظام قائم کیا ہے۔ وہ اپنے لیے جینے کے بجائے، خدا کے لیے جینے لگے گا۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کی مخلوق بن جائے گا۔

جس آدمی نے صرف زندگی کو جانا، اس نے کچھ نہیں جانا۔ جس آدمی نے زندگی کے بعد آنے والے موت کے مرحلے کو جانا، وہی دراصل جاننے والا ہے۔ اِس لیے کہ زندگی کا لمحہ ایک مختصر لمحہ ہے۔ آخر کار جو تجربہ انسان کے ساتھ پیش آنے والا ہے، وہ موت کا تجربہ ہے۔ زندگی ایک ایسا سفر ہے جو آخر کار موت کے مرحلے تک پہنچنے والا ہے۔ موت، زندگی کا خاتمہ نہیں، بلکہ موت زندگی کے طویل تر مرحلے کا آغاز ہے۔

زندگی کی اصل اہمیت یہ ہے کہ وہ موت کے مرحلے کے لیے پیشگی تیاری کا ایک وقفہ ہے۔ زندگی کا صحیح استعمال یہ ہے کہ آدمی زندگی کی اِس حقیقت کو سمجھے۔ وہ ایسا نہ کرے کہ زندگی کے معاملات میں مشغول ہو کر وہ موت اور موت کے بعد والے مراحل کو بھول جائے۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ دنیا میں اِس طرح رہے کہ موت اس کے لیے ایک معلوم واقعہ بن کر آئے، نہ کہ ایک ایسا واقعہ جو اس کے لیے صرف ایک حادثہ ہو، جو اچانک اس کو دبوچ لے جس کے لیے اس نے پہلے سے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔

عقل مند وہ ہے جو اپنے ذہن کو موت کے بارے میں بیدار رکھے، جو اپنے عمل کا منصوبہ یہ سوچ کر بنائے کہ موت کے بعد آنے والے دورِ حیات میں وہ اس کے لیے مفید ثابت ہو، جس کی زندگی آخرت رخی زندگی ہو، نہ کہ صرف دنیا رخی زندگی۔

اچانک موت، اچانک قیامت

دو چیزیں ہر انسان پر اچانک آنے والی ہیں— اچانک موت، اور اچانک قیامت۔ یہ بات ہر عورت اور ہر مرد کا سب سے زیادہ بھیانک مسئلہ ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے لیے ہر انسان کو سب سے زیادہ سوچنا چاہیے اور جس کے لیے سب سے زیادہ فکرمند ہونا چاہیے۔

دنیا کا یہ رواج ہے کہ جب کوئی شخص باہر سے کسی کے یہاں آتا ہے تو وہ پہلے اُس شخص سے اپائنمینٹ (appointment) لیتا ہے، یا دروازے پر آکر دستک (knock) دیتا ہے اور پھر باہر سے پوچھتا ہے— کیا میں اندر آسکتا ہوں۔ لیکن موت کو اور قیامت کو اس کی ضرورت نہیں۔ موت کا فرشتہ ایک ایسا آنے والا فرشتہ ہے جو کسی بھی شخص کے پاس کسی بھی وقت اچانک آجاتا ہے۔ وہ انسان سے پوچھے بغیر اس کے پاس آتا ہے اور اس سے پوچھے بغیر اس کی روح قبض کر کے اُس کو ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں سے واپسی کبھی ممکن نہ ہوگی۔

موت کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے— سب کچھ چھوڑ کر ایک ایسی دنیا میں چلا جانا جہاں آدمی کے پاس کچھ بھی نہیں۔ اپنے لوگوں کے درمیان رہنے والا انسان اچانک ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں اپنے لوگوں میں سے کوئی بھی شخص اس کے پاس موجود نہیں۔

موت گویا کہ انفرادی (individual) قیامت ہے۔ آخر میں وہ بڑی قیامت آئے گی جو موجودہ دنیا کے تمام حالات کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گی۔ موجودہ دنیا اچانک ساری کی ساری کھنڈر بن جائے گی۔ اچانک ہر عورت اور مرد اپنے آپ کو اِس حال میں پائیں گے کہ نہ ان کے پیچھے کچھ ہے اور نہ ان کے آگے کچھ ہے۔ ہر انسان کا اپنا وجود تو پوری طرح باقی رہے گا، لیکن اپنے وجود کے سوا جو کچھ اس کے پاس تھا، وہ سب کچھ اُس سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ چکا ہوگا— ہر عورت اور مرد کو سب سے زیادہ اِسی حقیقت کے بارے میں سوچنا چاہیے، ہر عورت اور مرد کو سب سے زیادہ اِسی آنے والے دن کی تیاری کرنا چاہیے۔

موت: بریک اِن ہسٹری

گورنمنٹ محکموں میں ایک قانون ہے جس کو بریک ان سروس (break in service) کہا جاتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص گورنمنٹ سروس میں ہے۔ اس کی سروس پر دس سال ہو چکے ہیں۔ اب اگر وہ باقاعدہ چھٹی لئے بغیر دفتر نہ جائے تو اس کو بریک ان سروس کہا جاتا ہے۔ اب اس کی سروس کا شمار دس سال پیچھے سے کیا جائے گا اور وہ دس سالہ حقوقِ ملازمت سے محروم ہو جائے گا۔ اِسی قسم کا ایک اور زیادہ بڑا معاملہ آدمی کے ساتھ پیش آنے والا ہے۔ اِس کو بریک اِن ہسٹری (break in history) کہا جا سکتا ہے۔ یہ موت کا معاملہ ہے۔

ایک شخص پیدا ہو کر اِس دنیا میں آتا ہے۔ وہ عمر بھر جدوجہد کی زندگی گزارتا ہے۔ اِس طرح وہ اپنی ایک دنیا کی تعمیر کرتا ہے۔ وہ اپنی ایک تاریخ بناتا ہے جو اس کی پہچان ہوتی ہے۔ اِس تاریخ کے بل پر وہ موجودہ دنیا میں اپنے لیے ایک درجہ حاصل کرتا ہے۔ یہ تاریخ ہر انسان کا سب سے بڑا سرمایہ (asset) ہے۔ اِسی تاریخ کے زور پر وہ موجودہ دنیا میں اپنے حقوق حاصل کرتا ہے۔

اس کے بعد سو سال سے بھی کم مدت میں اچانک اس کی موت آتی ہے۔ موت اس کو اس کی تاریخ سے پوری طرح جدا کر دیتی ہے۔ اب وہ اپنی تاریخ کو مکمل طور پر اپنے پیچھے چھوڑ کر ایک ایسی دنیا میں چلا جاتا ہے جہاں اس کی کوئی تاریخ نہیں ہوتی۔ جہاں وہ اکیلا ہوتا ہے اور اِسی کے ساتھ اپنی سابقہ تاریخ سے پوری طرح محروم۔

یہی وہ آنے والا سنگین تجربہ ہے جس کی فکر ہر ایک کو کرنا چاہیے۔ ہر عورت اور مرد کو چاہیے کہ وہ سب سے زیادہ اِس آنے والے دن کے بارے میں سوچے۔ وہ موت کے بعد آنے والے حالات کو سوچ کر موت سے پہلے کے دنوں میں اس کی تیاری کرے۔ بریک ان سروس کی تلافی ہو سکتی ہے، لیکن مذکورہ قسم کے بریک ان ہسٹری کی کوئی تلافی ممکن نہیں، سوا اُس شخص کے جو اپنے آپ کو اِس کا مستحق بنائے کہ اس کا خالق دوبارہ اس کو اپنی رحمتوں کے سائے میں لے لے۔

بڑھاپا، موت

انسان ایک بچہ کی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ جوان ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کے اوپر بڑھاپا آتا ہے۔ اور آخر میں 100 سال کے اندر وہ مر جاتا ہے۔ یہ انجام ہر عورت اور مرد کا ہوتا ہے— جوانی کے بعد پہلے جبری بڑھاپا (compulsory aging) اور پھر جبری موت (compulsory death)۔

یہی ہر انسان کی کہانی ہے، خواہ وہ امیر ہو یا غریب، خواہ وہ حاکم ہو یا محکوم۔ انسان بظاہر با اختیار معلوم ہوتا ہے، لیکن موت کے معاملے میں وہ مکمل طور پر بے اختیار رہے۔ جس طرح زلزلہ بالکل اچانک یک طرفہ قانونِ فطرت کے تحت آتا ہے، اُسی طرح موت بھی یک طرفہ طور پر خالق کی طرف سے آتی ہے۔ اِس میں کسی بھی انسان کو کوئی دخل نہیں۔

اِس صورت حال کا تقاضا ہے کہ آدمی ہر وقت موت کو یاد کرے۔ وہ ہر وقت موت کے لیے تیار رہے۔ وہ ہر وقت اپنا محاسبہ کر کے یہ سوچتا رہے کہ اُس نے موت کے بعد کے لیے کیا تیاری کی ہے۔ موت کے بعد کے حالات کے لیے اس کے پاس کیا سرمایہ ہے۔ لوگ زندگی کی ڈائری لکھتے ہیں۔ مگر زیادہ اہم یہ ہے کہ ہر ایک موت کی ڈائری لکھے۔ ہر ایک اپنی ڈائری میں یہ ریکارڈ کرے کہ میں نے آج موت کے بارے میں کیا سوچا۔

مثلاً یہ کہ کسی کی موت کی خبر سن کر مجھے یاد آیا کہ مجھے بھی ایک دن اِسی طرح مرنا ہے۔ میں فلاں شخص کی آخری رسوم کی ادائیگی میں وہاں پہنچا اور جب میں نے دیکھا کہ ایک شخص کا جسم قبر کے گڑھے میں اتارا جا رہا ہے تو میں نے یاد کیا کہ مجھے بھی اِسی طرح قبر کے ایک گڑھے میں دفن ہونا ہے۔

جو آدمی دوسروں کی موت کے واقعے میں خود اپنی موت کو دیکھے، وہی زندہ انسان ہے۔ زندہ انسان اِس کا انتظار نہیں کرتا کہ خود اُس پر ایک مہلک تجربہ گزرے، اس کے بعد وہ اُس سے سبق لے۔ زندہ انسان وہ ہے جو دوسروں پر گزرنے والے تجربات سے نصیحت حاصل کرے۔

موت کی طرف سفر

ہر آدمی جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے بعد ہی اس کا ایک سفر شروع ہو جاتا ہے۔ یہ سفر مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا آخر کار جہاں پہنچتا ہے، وہ موت کا دروازہ ہے۔ موت کے دروازے کے دوسری طرف اس کے لیے کیا ہے، یہ کسی بھی شخص کو پیشگی طور پر معلوم نہیں۔ یہ ایک ایسا لا معلوم انجام ہے جو صرف موت کے دروازے کے اندر داخل ہونے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے۔

ہر شخص جو زندہ ہے اور زمین پر چل پھر رہا ہے، وہ آخر کار ایک دن موت کے دروازے کے اندر داخل ہونے والا ہے، مگر یہ داخلہ ہر ایک کے لیے اندھیرے میں چھلانگ کے ہم معنیٰ ہے۔ کسی کو یہ معلوم نہیں کہ موت کے بعد اس کے ساتھ کیا پیش آئے گا۔ جو لوگ آخرت کے معاملے کو نہیں مانتے، وہ بھی اس سے بے خبر ہیں اور جو لوگ آخرت کے معاملے پر عقیدہ رکھتے ہیں، وہ بھی اِس سے تقریباً بے خبر ہیں۔ پہلا گروہ اگر نظری طور پر بے خبر ہے تو دوسرا گروہ وہ غلط مفروضات کی بنا پر بے خبر۔

مگر کسی عورت یا مرد کا سب سے زیادہ نازک معاملہ یہی ہے۔ کیوں کہ موت سے پہلے کی زندگی کا عرصہ حیات (life span) بہت مختصر ہے اور موت کے بعد کی زندگی کا عرصہ حیات لامتناہی طور پر طویل ہے۔ اِس لیے ہر شخص جو اپنا خیر خواہ ہے، اس کو سب سے زیادہ اِس مسئلے پر سوچنا چاہیے۔ یہی اس کے سوچنے کا سب سے بڑا موضوع ہونا چاہیے۔

موت کے دروازے کے اندر داخلے کا سب سے زیادہ بھیانک پہلو یہ ہے کہ داخلے کے بعد اُس سے باہر نکلنا کسی کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ یہ تمام تر یک طرفہ سفر کا معاملہ ہے، نہ کہ دوطرفہ سفر کا معاملہ۔ موت کا یہ پہلو موت کے معاملے کو بے حد سنگین بنا دیتا ہے۔

موت کی اس سنگینی کا تقاضا ہے کہ آدمی زندگی سے زیادہ موت کے بارے میں سوچے۔ وہ زندگی کے معاملے سے زیادہ موت کے معاملے پر سنجیدہ (sincere) ہو جائے، خواہ اس مقصد کے لیے اُس کو مرنے سے پہلے مرجانا پڑے۔

کیسا عجیب پانا، کیسا عجیب کھونا

بیسویں صدی کے ربع اول میں انڈیا میں انگریزوں کی حکومت اپنے عروج پر تھی۔ اس زمانے میں انھوں نے دہلی کے اندر ایک نئی دہلی بنائی۔ اِس میں وائس ریگل لاج، پالیمنٹ ہاؤس، انڈیا گیٹ، بڑی بڑی سرکاری عمارتیں، سڑکوں اور پارکوں کا ایک نیا جال بچھایا گیا۔ نئی دہلی کی یہ دنیا اپنے زمانے کے لحاظ سے اتنی ممتاز تھی کہ اس کو سیاسی تاج محل سمجھا جاتا تھا۔

جب یہ سیاسی تاج محل تیار ہوا تو اس زمانے میں فرانس کا ایک لیڈر ہندستان آیا تھا۔ وہ بہت پڑھا لکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا میں جمہوری انقلاب آ چکا ہے۔ اور دوسری بادشاہتوں کی طرح برٹش بادشاہت بھی یقینی طور پر ایک دن ختم ہونے والی ہے۔ چناں چہ اس نے اپنا تاثر ان الفاظ میں بیان کیا — انھوں نے کیسی شان دار دنیا بنائی ہے صرف اس لئے کہ وہ اس کو چھوڑ کر چلے جائیں:

What a magnificent world they built to leave!

یہی اس دنیا میں ہر انسان کی کہانی ہے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ کوئی چھوٹا محل بناتا ہے اور کوئی بڑا محل۔ برٹش حکومت کے بنائے ہوئے شان دار سیاسی تاج محل کا انجام آخرکار یہ ہوا کہ برٹش حکمراں 15 اگست 1947 کو اسے چھوڑ کر چلے گئے۔

یہی انجام ہر عورت اور ہر مرد کے لیے مقدر ہے۔ ہر ایک کے لیے لازماً وہ وقت آنے والا ہے جب کہ وہ اپنے بنائے ہوئے محل کو چھوڑ کر تنہا اِس دنیا سے چلا جائے۔ یہ واقعہ ہر روز ہمارے سامنے گزرتا ہے، مگر کوئی شخص اس سے نصیحت نہیں لیتا۔ ہر شخص اِس طرح جی رہا ہے جیسے کہ جو کچھ ہوا، وہ دوسرے کے ساتھ ہوا، میرے ساتھ ایسا ہونے والا نہیں۔

کوئی شخص منھ سے بولے یا نہ بولے، یہ ایک حقیقت ہے کہ اِس معاملے میں ہر عورت اور مرد اپنے آپ کو مستثنیٰ سمجھے ہوئے ہے۔ حالاں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اِس معاملے میں کسی بھی عورت یا مرد کا کوئی استثنا (exception) نہیں۔

موت ہر ایک کے لیے

میرے لیے زندگی اب صرف موت کا انتظار بن کر رہ گئی ہے— ایک بوڑھے آدمی نے کہا۔ میں نے جواب دیا کہ زندگی ہر ایک کے لیے موت کا انتظار ہے۔ اگر چہ اکثر لوگ اِس حقیقت کو نہیں جانتے۔ اِس معاملے میں ایک بوڑھے کمزور آدمی اور ایک جوان تندرست آدمی میں صرف یہ فرق ہے کہ بوڑھا آدمی جس حقیقت کو مجبورانہ طور پر مانتا ہے، اس کو ایک تندرست آدمی صرف اُس وقت جانے گا جب کہ وہ اُس پر غور کرے۔ بوڑھے آدمی کے لیے موت ایک مجبورانہ دریافت ہے اور جوان آدمی کے لیے موت ایک شعوری دریافت۔

ایک امریکی تاجر نے ساری زندگی تجارت کی۔ اس نے بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ آخر کار وہ 90 سال سے زیادہ عمر تک پہنچ گیا۔ اب اس کو محسوس ہوا کہ اس کا جسم اور اس کا دماغ دونوں کام کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ اب اس کے لیے اگلا مرحلہ صرف یہ ہے کہ وہ ایک دن مر جائے۔ اپنے اِس احساس کو اس نے ایک شخص سے اِن الفاظ میں بیان کیا— میں اب نامعلوم دنیا کی طرف ایک فیصلہ کن چھلانگ لگانے والا ہوں:

I am going to take a fateful leap into the unknown.

یہی انجام ہر پیدا ہونے والے کے لیے مقدر ہے، خواہ وہ بظاہر کمزور ہو یا تندرست، خواہ وہ امیر ہو یا غریب، خواہ وہ سفید فام ہو یا سیاہ فام، خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، خواہ وہ بے زور ہو یا طاقت ور، ہر ایک کے لیے وہ وقت آنے والا ہے جب کہ وہ موت کے دوسری طرف چھلانگ لگائے، حتی کہ وہ شخص بھی جو موت کا یا موت کے بعد آنے والی زندگی کا انکار کرتا ہو۔

دانش مند انسان وہ ہے جو اِس حقیقت کو پیشگی طور پر جان لے۔ اِسی حقیقت کو ایک حدیثِ رسول میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: الکیّس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت، والعاجز من أتبع نفسه هواه وتمنّى على الله۔

سب سے بڑی بے خبری

مرنے والے مر گئے — یہ سب کو معلوم ہے۔ مگر ایک اور خبر ایسی ہے جو کسی کو معلوم نہیں، وہ یہ کہ مجھے بھی ایک دن مرنا ہے۔ ایک دن میرا بھی وہی انجام ہونے والا ہے جو انجام دوسروں کا ہو چکا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ لوگ دوسروں کو ہر روز مرتا ہوا دیکھتے ہیں، لیکن خود اپنے آپ کو وہ اُس سے الگ (exempt) کر لیتے ہیں۔ گویا کہ ہر آدمی بلا اعلان اپنی زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ — دوسروں کو مرنا تھا، وہ مر گئے، لیکن میں تو مرنے والا نہیں۔

یہ بے خبری ایک ہلاکت خیز بے خبری ہے۔ یہ وہ انوکھی بے خبری ہے جس کو شتر مرغ کی عادت (ostrich habit) کہا جاتا ہے۔ کوئی شخص اپنی موت کے بارے میں سوچے یا نہ سوچے، موت بہر حال اس کی طرف دوڑی چلی آ رہی ہے۔

موت گویا کہ ایک انفرادی زلزلہ ہے۔ زلزلہ اعلان کے بغیر آتا ہے۔ اِسی طرح موت بھی اعلان کے بغیر آتی ہے۔ زلزلے کے مقابلے میں ہر آدمی بے بس ہے۔ اِسی طرح موت کے مقابلے میں بھی ہر آدمی بالکل بے بس ہے۔ موت اچانک آتی ہے اور وہ آدمی کے خیالی محل کو مکمل طور پر ڈھا دیتی ہے۔ انسان اگر یہ چاہے کہ وہ موت کو روک دے تو ایسا ہونے والا نہیں۔ موت کا اپنا قانون ہے، جو انسان کی مرضی کے بغیر اپنا کام کرتا ہے۔

اس صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ ہر آدمی موت کے بارے میں بے حد حساس ہو۔ وہ ہر لمحہ موت کو یاد کرتا رہے۔ ہر روز جب شام آئے تو وہ محسوس کرے کہ اب اس کے لیے اگلی صبح مقدر نہیں۔ ہر روز جب وہ اپنے بستر پر سوئے تو اس کا احساس یہ ہو کہ اب دوبارہ اِس دنیا میں میری نیند کھلنے والی نہیں۔ یہ احساس اگر آدمی کو ہو جائے تو وہ آخری حد تک ہل جائے گا۔ اس کے لیے جینا سادہ معنوں میں صرف جینا نہ رہے گا، بلکہ وہ موت کا انتظار بن جائے گا — خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو موت کے اچانک حملے سے پہلے موت سے باخبر ہو جائیں، وہ موت کے آنے سے پہلے اس کے لیے تیاری کر لیں۔

سب سے بڑا سوال

انسان بہترین جسم اور اعلیٰ دماغ کے ساتھ اِس دنیا میں آتا ہے۔ اُس کے لیے سوچنے کی سب سے پہلی بات یہ ہے کہ وہ کیسے بنا۔ پھر وہ جس دنیا میں آتا ہے، وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ دنیا استثنائی طور پر اس کے لیے ایک انتہائی موافق دنیا ہے۔ یہاں وہ ایک ایسی زمین کو پاتا ہے جس پر وہ پُر راحت طور پر رہے۔ یہاں سورج ہے جو مسلسل طور پر اُس کو روشنی اور انرجی دے رہا ہے۔ یہاں زرخیز مٹی ہے جو اُس کے لیے مختلف قسم کی غذائیں اُگاتی ہے۔ یہاں وافر مقدار میں پانی ہے جو زندگی کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔ یہاں ہوا ہے جو مسلسل طور پر اس کو آکسیجن سپلائی کر رہی ہے۔

یہ سیارۂ زمین جس پر انسان آباد ہے، وہ بے شمار طریقوں سے اس کا مددگار بنا ہوا ہے۔ یہاں نہایت اعلیٰ قسم کا لائف سپورٹ سسٹم ہے، جس کے بغیر انسان کے لیے یہاں زندہ رہنا اور ترقی کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اِس دنیا میں اتنی زیادہ نعمتیں ملی ہوئی ہیں جن کا شمار کرنا ممکن نہیں۔ اِن نعمتوں میں سے صرف کچھ نعمتوں کو سائنس نے دریافت کیا ہے۔ یہ دریافت کردہ نعمتیں بھی اتنی زیادہ ہیں کہ کوئی انسان ساری عمر مطالعہ کرے، تب بھی وہ کامل طور پر اُن سے واقف نہیں ہوسکتا۔

یہ صورتِ حال اپنے آپ میں ایک سوال ہے، اتنا بڑا سوال کہ کوئی بھی عورت یا مرد اُن کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ انسان کا اپنا حیرت ناک وجود اور آس پاس کی حسین دنیا مجبور کر رہی ہے کہ ہر انسان اِن سوالات پر غور کرے اور ان کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کرے۔

یہ سوالات گویا ایک خاموش پکار ہیں — مجھ کو کس نے بنایا۔ اِس دنیا کا بنانے والا کون ہے۔ وہ کون ہے جس نے مجھ کو اتنا زیادہ بامعنیٰ قسم کا لائف سپورٹ سسٹم پیدا کر کے دے دیا ہے۔ اِس دنیا میں ہر چیز ایک عظیم نعمت ہے، اور ہر نعمت زبانِ حال سے پکار رہی ہے اور دعوت دے رہی ہے کہ اِس معاملے پر غور کرو اور دریافت کرو کہ اِن نعمتوں (blessings) کا مُنعم (giver) کون ہے۔

اِسی کے ساتھ ایک اور نہایت سنگین سوال ہے جو اِن سوالات کے ساتھ جُڑا ہوا ہے، وہ یہ

کہ انسان انتہائی قیمتی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اُس کا دماغ معجزاتی صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے۔ وہ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے لامحدود ترقی حاصل کرنا چاہتا ہے، بظاہر یہ سب کچھ ابدی معلوم ہوتا ہے، لیکن ابھی وہ اپنے سفرِ حیات کے درمیان میں ہوتا ہے کہ سو سال سے بھی کم عرصے میں کوئی نامعلوم طاقت مداخلت کرتی ہے۔ وہ اُس پر موت وارد کرکے اُس کو موجودہ دنیا سے اٹھا کر کسی اور دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔

یہ تمام سوالات نہایت گمبھیر سوالات ہیں، وہ لازمی طور پر اپنا ایک جواب چاہتے ہیں۔ کوئی عورت یا مرد جو اپنی زندگی کے بارے میں سنجیدہ ہو، وہ اِن سوالات کا جواب معلوم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اِن سوالات کا صحیح جواب ہی ہماری موجودہ زندگی کی درست توجیہہ کرتا ہے، اور اسی کے ساتھ اِن سوالات کا جواب ہی ہم کو یہ بتاتا ہے کہ حقیقی طور پر زندگی کو بامعنیٰ اور کامیاب بنانے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

اِن سوالات پر پوری تاریخ میں غور وفکر کیا جاتا رہا ہے۔ انتہائی بڑے بڑے دماغ اِن سوالات کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہمیشہ سرگرم طور پر کوشش کرتے رہے ہیں۔ سب سے زیادہ جس جواب نے عالمی دماغوں کو مطمئن کیا ہے، وہ یہ کہ اِس دنیا کا ایک خدا ہے، وہی اِس کا خالق ہے، وہی اس کا مالک ہے، وہی اس کا انتظام کررہا ہے، وہی اپنی عظیم طاقتوں کے ساتھ اِس پوری دنیا کو سنبھالے ہوئے ہے۔

پھر یہ کہ اِس دنیا کو خدا نے ایک خصوصی تخلیقی پلان (creation plan) کے تحت پیدا کیا ہے۔ اِس پلان کے مطابق، انسان ایک ابدی مخلوق کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن انسان کو پیدا کرنے والے نے اس کی زندگی کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ اس کا بہت تھوڑا حصہ موت سے قبل کے مرحلۂ حیات میں ہے، اور اس کا زیادہ بڑا حصہ موت کے بعد کے مرحلۂ حیات میں۔ آدمی جب اِس دنیا میں مرتا ہے تو وہ ختم نہیں ہوتا، بلکہ وہ اگلی دنیا میں داخل ہوجاتا ہے، تاکہ وہ اپنی بقیہ زندگی وہاں کے ابدی ماحول میں گزارے۔

کامیاب زندگی، ناکام خاتمہ

ایک مغربی ملک کے ایک آدمی کو دولت کمانے کا شوق تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دولت کے ذریعے وہ زندگی کی تمام خوشیاں حاصل کرسکتا ہے۔ اُس نے کافی دولت کمائی۔ اس نے اپنے لیے ایک شان دار گھر بنایا۔ ہر طرح کی راحت اور عیش کے سامان اپنے گرد اکھٹا کیے، لیکن حقیقی خوشی اس کو حاصل نہ ہوسکی، یہاں تک کہ وہ بوڑھا ہوگیا۔ اس کی جسمانی طاقت ختم ہوگئی، وہ بستر پر پڑ گیا۔ اپنی زندگی کے اِس آخری زمانے میں اُس نے اپنی ڈائری میں یہ الفاظ لکھے:

Now, I am 90 plus, bedridden. My story can be sum up in these two words— successful life, unsuccessful end.

یہی اُن تمام لوگوں کی کہانی ہے جن کو لوگ اچیور، یا سُپر اچیور کہتے ہیں۔ بڑی بڑی کامیابیوں والے اِس دنیا میں صرف چھوٹی خوشی حاصل کرتے ہیں اور آخر کار مایوسی کے ساتھ وہ اِس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ یہ معاملہ اتنا عام ہے کہ اِس میں کسی بھی عورت یا مرد کا کوئی استثنا نہیں۔

انڈیا میں اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے والوں میں سے ایک مشہور نام لتا منگیشکر کا ہے۔ وہ اب 80 سال کی ہوچکی ہیں۔ ان کو اپنی زندگی میں وہ تمام چیزیں ملیں جن کی لوگ حرص کرتے ہیں۔ دولت، شہرت، مقبولیت اور اعلیٰ خطابات، وغیرہ۔ انھوں نے عالمی سطح پر شاپنگ کی۔ بہت زیادہ جیولری اور جواہرات حاصل کیے۔ ہر وہ چیز اُن کے پاس ہے جس کی دنیا پرست لوگ تمنا کرتے ہیں۔ لیکن عمر کے آخری حصے میں پہنچ کر وہ محسوس کرتی ہیں کہ انھوں نے جو کچھ چاہا تھا، وہ اُن کو نہیں ملا۔

نئی دہلی کے انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا (30 ستمبر 2007) میں لتا منگیشکر کا ایک انٹرویو چھپا ہے۔ انٹرویور کا نام سُدیشنا (Sudeshna Chatterjee) ہے۔ اِس انٹرویو کے مطابق، لتا منگیشکر تمام ظاہری کامیابیوں کے باوجود افسردگی کے احساس (dejected feeling) میں جیتی ہیں۔ یہ انٹرویو اخبار کے ضمیمہ (Times Life) میں

اِس عنوان کے تحت چھپا ہے— میرے خواب کبھی پورے نہیں ہوئے:

'My dreams have never got fulfilled'.

انٹرویور نے لتا منگیشکر سے پوچھا کہ اگر خدا اُن سے پوچھے کہ عمر کے اِس حصے میں پہنچ کران کی سب سے بڑی خواہش کیا ہوگی۔ انھوں نے کسی وقفے کے بغیر فوراً جواب دیا کہ— میری صرف یہ خواہش ہوگی کہ میں اِس دنیا کو چھوڑ کر چلی جاؤں:

I would like to leave this world. (p. 3)

کامیاب انسانوں کی اِس ناکام کہانی میں ہر عورت اور مرد کے لیے بہت بڑا سبق ہے۔ وہ یہ کہ جس پُر مسرت زندگی کو حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی ساری عمر لگا دیتے ہیں، وہ اِس دنیا میں سِرے سے قابلِ حصول (achievable) ہی نہیں۔

تمنّا کا ہونا، مگر تمنا کے حصول کا فُقدان ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کررہا ہے، وہ یہ کہ آدمی جس چیز کو قبل ازموت (pre-death period) دنیا میں پانا چاہتا ہے، اس کو خالقِ کائنات نے بعد از موت (post-death period) دنیا میں رکھ دیا ہے۔

ایسی حالت میں سب سے بڑی عقل مندی یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بعد ازموت دنیا میں کامیابی کا مستحق بنائے۔ وہ موجودہ عارضی زندگی کو بعد کی ابدی زندگی کی تیاری میں لگا دے۔

انسان پیدائشی طور پر معیار پسند (idealist) ہے، لیکن موجودہ دنیا میں ہر چیز معیار سے کم (less than ideal) حالت میں پائی جاتی ہے۔ یہی لوگوں کے ٹنشن (tension) کا اصل سبب ہے۔ انسان اپنی پوری توانائی صرف کرکے جو کچھ حاصل کرتا ہے، وہ ہمیشہ اس کے اپنے مطلوب معیار سے کم ہوتا ہے۔

طلب اور مطلوب کے درمیان اِس فرق کو جاننا ہی سب سے بڑی دانش مندی ہے۔ جو آدمی اِس فرق کو جانے، وہ اپنے عمل کی حقیقت پسندانہ منصوبہ بندی کرے گا، اور پھر کامیابی کی منزل تک پہنچ جائے گا۔ ایسا انسان کبھی ٹنشن میں جینے ولا انسان نہیں ہوگا۔

سوچیے، سوچیے، سوچیے

اگر پہاڑ کی کھوہ (cave) سے کسی دن ایک زندہ انسان نکل آئے، تو سارے دیکھنے اور جاننے والے لوگ اس کو حیرت ناک واقعہ سمجھیں گے۔ تمام لوگ یہ سوچنے لگیں گے کہ ایسا کیوں کر ہوا۔ ماں کے پیٹ سے ایک انسان کا پیدا ہونا بھی اسی قسم کا ایک واقعہ ہے جو دہشت ناک حد تک عجیب ہے۔ لوگ ماں کے پیٹ سے زندہ انسان کو پیدا ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں، لیکن وہ اس کے متعلق کچھ نہیں سوچتے۔

یہ فرق کیوں ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ ماں کے پیٹ سے انسان کا پیدا ہونا روزانہ کا ایک واقعہ ہے۔ بار بار دیکھنے کی وجہ سے لوگ اس واقعے کے عادی (used to) ہو گئے ہیں، اِس لیے وہ اس کا کو فار گرانٹیڈ (for granted) طور پر لیے رہتے ہیں۔ وہ اس معاملے میں سوچنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ لوگ اگر اِس معاملے میں سنجیدگی کے ساتھ سوچیں تو وہ انسان کی پیدائش کے واقعے میں خالق کے وجود کو دریافت کرلیں۔ جب وہ دیکھیں کہ ایک زندہ اور باشعور انسان پیدا ہو کر زمین پر چل پھر رہا ہے، وہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے اور بولتا ہے، تو ان کو محسوس ہو کہ ہر انسان خالق کے وجود کا ایک چلتا پھرتا نشان (sign) ہے۔ ہر انسان لوگوں کو اپنے خالق کا ایک زندہ تعارف معلوم ہونے لگے۔

اِسی طرح انسان جب پیدا ہو کر موجودہ زمین (planet earth) پر آتا ہے، تو وہ پاتا ہے کہ یہاں اس کے لیے ایک پورا لائف سپورٹ سسٹم موجود ہے۔ یہ لائف سپورٹ سسٹم اتنا مکمل ہے کہ کوئی قیمت دیے بغیر وہ انسان کی ہر چھوٹی اور بڑی ضرورت کو نہایت اعلیٰ صورت میں پورا کررہا ہے۔ زمین سے لے کر سورج تک پوری دنیا استثنائی طور پر انسان کی خدمت میں لگی ہوئی ہے۔

اس کے بعد وہ دن آتا ہے جب کہ انسان اچانک مر جاتا ہے۔ انسان اپنے مزاج کے اعتبار سے ابدی زندگی چاہتا ہے، لیکن سو سال کے اندر ہی یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ ہر عورت اور مرد اپنی مرضی کے خلاف اِس دنیا کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

زمین پر پیدا ہونے والا ہر انسان دو چیزوں کا تجربہ کرتا ہے۔ پہلے زندگی کا تجربہ، اور اس کے بعد

موت کا تجربہ۔ اگر انسان سنجیدگی کے ساتھ ان واقعات پر سوچے تو وہ یقینی طور پر ایک بہت بڑی حقیقت کو دریافت کرے گا، وہ یہ کہ انسان کو پیدا کر کے اِس زمین پر آباد کرنا بطور انعام نہیں ہے، بلکہ وہ بطور امتحان ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتا ہے۔

یہ آزادی اِس لیے ہے تا کہ یہ معلوم کیا جائے کہ کون شخص اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرتا ہے اور کون شخص اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے۔ کون شخص بااصول زندگی گزارتا ہے اور کون شخص بے اصول زندگی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔

آدمی اگر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے تو وہ اِس حقیقت کو پالے گا کہ موت دراصل خالق کے سامنے حاضری کا دن ہے۔ انسان اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ابدی مخلوق ہے، لیکن اس کی مدتِ حیات (life span) کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے — موت سے قبل کی مدتِ حیات (pre-death period)، اور موت کے بعد کی مدتِ حیات (post-death period)۔ موت سے پہلے کی مدتِ حیات امتحان (test) کے لیے ہے، اور موت کے بعد کی مدتِ حیات اُس کے سابقہ ریکارڈ کے مطابق، انعام یا سزا پانے کے لیے۔

انسان آج اپنے آپ کو اِس دنیا میں ایک زندہ اور باشعور وجود کی صورت میں پاتا ہے۔ یہ زندہ اور باشعور وجود ایک مستقل وجود ہے۔ موت وہ دن ہے جب کہ یہ زندہ اور باشعور وجود اپنی اِسی موجودہ صورت میں عارضی دنیا سے نکالا جاتا ہے اور اس کو اِسی زندہ اور باشعور وجود کی حالت میں اگلی مستقل دنیا کی طرف منتقل (transfer) کر دیا جاتا ہے۔

یہ لمحہ ہر عورت اور مرد پر لازماً آنے والا ہے۔ وہ ناقابلِ قیاس حد تک سنگین لمحہ ہوگا۔ موت کے بعد آنے والے اِس دورِ حیات میں یہی موجودہ انسان ہوگا، لیکن اس کے تمام اسباب اس سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ چکے ہوں گے۔ اس کے پیچھے وہ دنیا ہوگی جو اس سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئی، اور اس کے آگے وہ دنیا ہوگی جہاں اس کو کامل بے سروسامانی کے ساتھ ابدی طور پر رہنا ہے — دانش مند وہ ہے جو اِس آنے والے دن کے لیے اپنے آپ کو تیار کرے۔

ابدی انجام

موجودہ دنیا میں ہر آدمی غلطیاں کرتا ہے، پھر وہ دیکھتا ہے کہ ہر غلطی کے بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ اس نے اپنی غلطی کو درست کرلیا اور غلطی کرنے کے باوجود وہ غلطی کے بُرے انجام سے بچ گیا۔ یہ واقعہ ہر آدمی کے ساتھ پیش آرہا ہے۔ ہر آدمی اِس کو اپنی زندگی میں، یا دوسروں کی زندگی میں روزانہ دیکھتا ہے۔

اِس عمومی تجربے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی غلطی کو ایک قابلِ تلافی خطا (compensating error) سمجھ لیتا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ حتمی معنوں میں غلطی کوئی مہلک (fatal) چیز نہیں۔ غلطی وقتی طور پر ضرور نقصان پہنچاتی ہے، لیکن جلد ہی کسی نہ کسی طور پر غلطی کی تلافی ہوجاتی ہے، اور پھر زندگی اپنے معمول پر آجاتی ہے۔

اِس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان آخرت کے معاملے کو بھی دنیا کے معاملے پر قیاس کرنے لگتا ہے۔ وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ غلطی کے انجام کے معاملے میں جو کچھ دنیا میں پیش آرہا ہے، وہی آخرت میں بھی پیش آئے گا۔ اِسی نفسیات کا یہ نتیجہ تھا کہ کچھ لوگوں نے آخرت کو مانتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ: **لن تمسّنا النّار إلاّ أيّاماً معدودة** (2:80)۔

یہ صورتِ حال ہر عورت اور مرد کے لیے سخت آزمائش ہے۔ اِس دنیا میں ہر عورت اور رمرد کو یہ کرنا ہے کہ وہ کھلے ذہن کے تحت سوچے اور آخرت کی پکڑ کے معاملے کو اُس کی اصل نوعیت کے اعتبار سے دریافت کرے۔ ہر عورت اور مرد کو یہ جاننا چاہیے کہ آخرت کا معاملہ دنیا کے معاملے سے بالکل مختلف ہے۔ موت کے بعد ہر ایک کو ایک ایسی ابدی دنیا میں داخل ہونا ہے، جہاں سے واپسی ممکن نہ ہوگی، جہاں ہر آدمی اکیلا ہوگا، جہاں تلافیٔ مافات کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ آخرت کی دنیا میں داخل ہونے کے بعد ہر آدمی کو بہر حال اپنے عمل کے انجام کو بھگتنا ہے۔ آخرت کی دنیا میں داخل ہونے کے بعد ہر آدمی اپنے آپ کو یا تو ابدی جنت میں پائے گا، یا ابدی جہنم میں۔

دولت کافی نہیں

امریکا کے بل گیٹس (Bill Gates) کو سافٹ ویر جائنٹ (software giant) کہا جاتا ہے۔اُن کے پاس کوئی بڑی تعلیمی ڈگری نہیں۔ وہ امریکا کی ہارورڈ یونی ورسٹی میں پڑھ رہے تھے، پھر انھوں نے فراغت سے پہلے تعلیم چھوڑ دی، مگر جلد ہی وہ کرۂ ارض کے سب سے زیادہ دولت مند انسان بن گئے۔ 1999 میں ان کی دولت کا اندازہ ایک سو بلین ڈالر سے زیادہ تھا:

The Harvard dropout was the wealthiest person on the planet for years worth more than $ 100 billion in 1999.

کمپیوٹر ٹکنالوجی میں انھوں نے نئی ترقیاں کیں۔ ان کا کاروبار ساری دنیا میں اتنا بڑھا کہ وہ کمپیوٹر کنگ کہے جانے لگے۔ لیکن یہ ترقیاں ان کو قلبی سکون نہ دے سکیں۔ اب انھوں نے انسانی مواسات (philanthropy) کو اپنا میدان بنانے کا فیصلہ کیا۔ اِس سلسلے میں انھوں نے ایک ادارہ قائم کیا اور اپنی دولت کا تقریباً آدھا حصہ اس میں دے دیا۔ اِس ادارے کا نام یہ ہے:

Bill and Melinda Gates Foundation

27 جون 2008 کو جب کہ ان کی عمر 52 سال تھی، انھوں نے کمپیوٹر بزنس سے رٹائر ہونے کا اعلان کر دیا۔ اب وہ اپنی بقیہ زندگی زیادہ تر، صحت اور تعلیم کے میدان میں صرف کریں گے اور اپنی کمپنی سے صرف رسمی تعلق باقی رکھیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی مادّی سامان یا مادّی ترقی، انسان کو حقیقی سکون نہیں دے سکتی۔ موجودہ دنیا کو اس کے بنانے والے نے اِس لیے نہیں بنایا کہ یہاں انسان اپنی تمام خواہشیں پوری کرے اور پورے معنوں میں وہ فل فل مینٹ (fulfillment) حاصل کرے۔

موجودہ دنیا ایک محدود دنیا ہے۔ وہ صرف اِس لیے ہے کہ انسان اپنی ضرورتوں کو پورا کرتے ہوئے اعلیٰ ربانی مقصد میں اپنی توانائی صرف کرے، تاکہ وہ آخرت میں خدا کے ابدی انعام (reward) کا مستحق ٹھہرے۔

عارضی دورِ حیات، ابدی دورِ حیات

ایک طالب علم جب اپنی زندگی کے تعلیمی مرحلے میں ہوتو اُس کی سوچ اُس سے مختلف ہوتی ہے جب کہ وہ اپنی تعلیم کو مکمل کر کے اپنے لیے ایک اچھا جاب حاصل کر لے۔ پہلے مرحلے میں وہ اِس طرح رہتا ہے جیسے کہ وہ ایک مسافر ہے۔ جب کہ دوسرے مرحلے میں وہ اِس طرح رہتا ہے جیسے کہ وہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گیا ہو۔ پہلے مرحلے میں وہ ہر چیز کو ایک وقتی چیز سمجھتا ہے۔ جب کہ دوسرے مرحلے میں وہ ہر چیز کو اس حیثیت سے لیتا ہے جیسے کہ وہ اس کی زندگی کا مستقل حصہ ہو۔

یہی معاملہ وسیع تر معنوں میں، انسانی زندگی کا ہے۔ انسان کو ہمیشہ کی عمر دی گئی ہے۔ اس عمر کے دو حصے ہیں، قبل از موت، اور بعد از موت۔ قبل از موت، آدمی اپنے عارضی دَورِ حیات میں رہتا ہے۔ بعد از موت وہ اپنے ابدی دَورحیات میں پہنچ جاتا ہے۔ اگر یہ حقیقت آدمی کے اندر زندہ شعور کے طور پر موجود ہو تو یہی اس کی مکمل اصلاح کے لیے کافی ہوجائے۔

موجودہ دنیا کو مذہبی اصطلاح میں فتنے کی دنیا کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا ایک مغالطے کی دنیا (deceptive world) ہے۔ یہاں کی ہر چیز کسی نہ کسی اعتبار سے مغالطے کا رول (deceptive role) ادا کر رہی ہے۔ یعنی موجودہ عارضی دنیا کو مستقل دنیا کے روپ میں دکھانا۔ موجودہ دنیا کی وقتی چیز کو مستقل چیز کی حیثیت سے متعارف کرنا۔ فانی بدایونی ایک اردو شاعر تھے۔ انھیں اپنی زندگی میں کچھ ایسے تجربات پیش آئے جس نے انھیں بتایا کہ موجودہ دنیا ایک بے حقیقت دنیا ہے۔ یہاں کی ہر خوش نُمائی صرف ظاہری اور وقتی خوش نمائی ہے۔ اپنے اِس تجربے کو انھوں نے اِن الفاظ میں نظم کیا تھا:

فریبِ جلوہ اور کتنا مکمل، اے معاذ اللہ! ‏ ‏ بڑی مشکل سے دل کو بزمِ عالم سے اٹھا پایا

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا کی ہر چیز مغالطہ آمیز ہے۔ وہ وقتی چیز کو مصنوعی طور پر ابدی رنگ میں دکھاتی ہے۔ کامیاب وہ ہے جو موجودہ دنیا کو عارضی دورِ حیات سمجھے، اور ناکام وہ ہے جو اِس دنیا کو ابدی دورِ حیات سمجھ لے۔

دردناک انجام

ہر آدمی اپنی ساری توانائی خرچ کرکے زیادہ سے زیادہ پیسہ کماتا ہے، صرف اِس لیے تاکہ وہ جہنم کا مہنگا ٹکٹ خرید سکے — یہ جملہ اکثر نہایت درد کے ساتھ میری زبان سے نکل جاتا ہے۔

آج کل کے لوگوں کو میں دیکھتا ہوں کہ وہ اپنا سارا وقت اور اپنی ساری طاقت پیسہ کمانے میں لگائے ہوئے ہیں۔ اُن کو رات دن بس ایک ہی دُھن لگی رہتی ہے، وہ یہ کہ کس طرح وہ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمائیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن کی سورہ نمبر 102 میں تکاثر کہا گیا ہے، یعنی کماتے کماتے قبر میں پہنچ جانا اور پھر جہنم کا سامنا کرنا۔

آج کل یہ حال ہے کہ سیکولر لوگ اور نام نہاد مذہبی لوگ، دونوں ایک ہی چیز کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ اور وہ ہے ہر ممکن ذرائع سے زیادہ سے زیادہ دولت کمانا۔

پھر اِس دولت کا استعمال بھی صرف ایک ہے اور وہ ہے اپنی مادّی خوش حالی میں اضافہ کرنا۔ مکان اور سواری اور کپڑے جیسی چیزوں میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرنا۔ اگر کوئی شخص بظاہر مذہبی ہے، تو وہ صرف رسمی معنوں میں مذہبی ہے۔ مقصدِ زندگی کے اعتبار سے ہر ایک کا نشانہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے مادّی ترقی۔

ہر آدمی کی زندگی ایک تلخ انجام پر ختم ہورہی ہے اور وہ ہے تمام مادّی ترقیوں کو چھوڑ کر اِس دنیا سے چلا جانا۔ یہ بے حد سنگین صورتِ حال ہے۔ اِس میں دنیا کے تقریباً تمام لوگ مبتلا ہیں۔ اپنے خیال کے مطابق، وہ ترقی کی طرف جارہے ہیں، مگر موت ہر ایک کو بتا رہی ہے کہ تمھارا سفر صرف تباہی کے گڑھے کی طرف تھا، نہ کہ ترقی کی منزل کی طرف۔

کیسا عجیب ہے انسان کا یہ انجام کہ وہ اپنے بہترین وقت اور اپنی بہترین توانائی کو خرچ کرکے **لتروُن الجحیم** (102:6) کا مصداق بن رہا ہے، یعنی جنت کا خواب دیکھنے والا، آخر کار اپنے آپ کو جہنم کے گڑھے میں گرا ہوا پائے۔

انسان کی منزل

انسان اپنے لیے ایک محفوظ دنیا چاہتا ہے، مگر سنامی (دسمبر 2004) کا واقعہ بتاتا ہے کہ انسان کو صرف ایک غیر محفوظ دنیا ملی ہے۔ انسان لامحدود زندگی چاہتا ہے، مگر موت کا واقعہ اس کو یاد دلاتا ہے کہ اس کو یہاں جینے کے لیے صرف ایک محدود مدت ملی ہے۔

انسان آئڈیل خوشی چاہتا ہے، مگر مختلف قسم کے حادثات یہ بتاتے ہیں کہ انسان کو اس دنیا میں صرف ایسی خوشی مل سکتی ہے جو اس کے مطلوب آئڈیل سے بہت کم ہے۔ انسان استثنائی طور پر کل (tomorrow) کا تصور رکھتا ہے، مگر اس کو عملاً آج (today) کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ انسان کے اندر اتھاہ پوٹینشیل موجود ہے، مگر ہر انسان اپنے پوٹینشیل کا صرف ایک فیصد استعمال کرتا ہے اور اس کے بعد اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔

ایسا کیوں ہے۔ اس سوال کا جواب خود انسان کی فطری ساخت کے اندر موجود ہے۔ استثنائی طور پر انسان کل (tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔ تمام حیوانات صرف آج (today) کے تصور میں جیتے ہیں۔ کرۂ ارض پر انسان واحد ایسی مخلوق ہے جو اپنے اندر کل کا تصور رکھتا ہے۔ یہی فطرت کی طرف سے مذکورہ سوال کا جواب ہے۔

وہ جواب یہ ہے کہ انسان جو چیز اپنے آج میں ڈھونڈ رہا ہے وہ اس کے کل میں موجود ہے۔ وہ اپنے جس مطلوب کو پرزنٹ میں پانا چاہتا ہے وہ خالق کے تخلیقی نقشہ (creation plan) کے مطابق، اس کے مستقبل میں رکھ دیا گیا ہے۔

خالق کے تخلیقی نقشے کے مطابق، انسان کی عمر کے دو حصے ہیں۔ ایک ماقبل موت دَور (pre-death period) اور دوسرا مابعد موت دَور (post-death period)۔ انسان کی مطلوب دنیا (desired world) اس کے مابعد موت دَور (post-death period) میں رکھی گئی ہے۔ ماقبل موت دَور کی حیثیت امتحان گاہ (selective ground) کی ہے۔ جو عورت یا مرد ماقبل موت

دَور میں خود کو اہل (qualify) ثابت کریں گے، وہ مابعد موت دَور میں اپنی مطلوب دنیا (desired world) میں بسائے جانے کے مستحق قرار پائیں گے۔ اسی مطلوب دنیا کا نام جنت ہے۔

سنامی جیسے واقعات ایک وارننگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس بات کی وارننگ کہ موجودہ دنیا میں انسان اپنی جنت نہیں بنا سکتا۔ ہماری زمین اگر چہ بہت خوب صورت ہے، مگر وہ اتنا زیادہ پُر خطر (vulnerable) ہے اور یہاں اتنی محدودیتیں (limitations) ہیں کہ وہ جنت کا مسکن (abode) نہیں بن سکتی۔

ہماری زمین جنت کا ایک ابتدائی تعارف ہے مگر وہ خود جنت نہیں۔ جنت کی تعمیر کے لیے ہم کو ایک اور دنیا چاہیے، ایک ایسی دنیا جو کہ لامحدود (unlimited) ہو۔ جو ہر قسم کے خوف سے پاک ہو۔ جنت ایک کامل (perfect) دنیا چاہتی ہے، جب کہ موجودہ دنیا ہر اعتبار سے غیر کامل (imperfect) ہے۔ اور غیر کامل زمین پر کامل جنت نہیں بنائی جا سکتی۔

انسان اپنی فطری ساخت کے اعتبار سے جنت کا طالب ہے، مگر انسان کے اندر استثنائی طور پر کل (tomorrow) کا تصور (concept) بتاتا ہے کہ جنت ورلڈ ٹومارو (world-tomorrow) میں قابلِ حصول ہے، ورلڈ ٹوڈے (world-today) میں وہ قابلِ حصول نہیں۔

اس حقیقت کو جاننا بلاشبہہ سب سے بڑا وزڈم (wisdom) ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو جان کر 'کل' پر مبنی لائف بنا سکیں وہ کامیاب ہیں اور جو لوگ اپنی زندگی صرف 'آج' پر مبنی کر کے بنائیں، وہ ناکام ہیں۔ موجودہ دنیا انسان کی گزرگاہ ہے، وہ انسان کی آخری منزل نہیں۔ انسان موجودہ دنیا میں اپنا راستہ طے کرتے ہوئے آخر کار جہاں پہنچتا ہے، وہ موت کا دروازہ ہے۔ انسان کو لازماً موت کے دروازے میں داخل ہونا ہے۔ موت کے اُس پار یا ابدی جنت ہے یا ابدی جہنم (وإنّها لجنة أبداً، أو لنار أبداً)، اِن دو کے سوا کوئی تیسرا مقام نہیں جہاں انسان موت کے بعد پہنچنے والا ہو۔ یہ صورتِ حال اتنی زیادہ سنگین ہے کہ آدمی کو اگر اُس کا احساس ہو جائے تو وہ زندگی سے زیادہ موت کے بارے میں سوچے، وہ دنیا سے زیادہ آخرت کے لیے فکرمند ہو جائے۔

تعمیرِ دنیا، تیاریٔ آخرت

موجودہ زمانے میں لوگوں کو دیکھئے تو ہر عورت اور ہر مرد مشغول (busy) نظر آئیں گے۔ لوگوں کی یہ مشغولیت اتنی زیادہ ہے کہ کسی کے پاس کوئی اور بات سننے کے لیے فرصت نہیں۔ لوگوں کے پاس اپنے وقت اور اپنے پیسے کا ایک ہی استعمال ہے، یہ کہ وہ اپنے وقت اور اپنے پیسے کو اپنی مطلوب منزل تک پہنچنے کے لیے پوری طرح لگا دیں۔

لوگوں کی یہ مشغولیت کس کام کے لیے ہے، وہ کام صرف ایک ہے — اپنی دنیا کی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانا، اپنے دنیوی مستقبل کی تعمیر کرنا۔ لیکن موت اس نظریۂ حیات کی تردید ہے۔ ہر آدمی کا آخری انجام یہ ہے کہ وہ بہت جلد مر جاتا ہے۔ وہ اپنی بنائی ہوئی دنیا کو مکمل طور پر چھوڑ دیتا ہے۔ اب وہ تنہا ایک ایسے عالم کی طرف چلا جاتا ہے، جہاں کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔

ہر عورت اور مرد کا یہ حال ہے کہ پیدا ہونے کے بعد جب وہ موجودہ دنیا میں آتے ہیں تو وہ بھی اُسی طرح دنیوی اصطلاحوں میں سوچنے لگتے ہیں، جس طرح اُن کے آس پاس کے لوگ سوچ رہے ہیں۔ وہ بھی اُنھیں مادّی کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں جن میں اُن سے پہلے کے لوگ مشغول چلے آ رہے تھے۔ اِسی صورت حال کا یہ نتیجہ ہے کہ مادّی سوچ، تاریخی تسلسل کا حصہ بن گئی ہے۔ مادی سوچ اِس طرح کلچرل روایت میں شامل ہو گئی ہے کہ اِس سے الگ ہو کر سوچنا بظاہر کسی عورت یا مرد کے لیے ممکن نہیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کا اصل امتحان ہے۔ انسان کو حقیقی کامیابی حاصل کرنے کے لیے یہ کرنا ہے کہ وہ اس تاریخی تسلسل سے باہر آ کر سوچے۔ وہ رواجی کلچر سے الگ ہو کر حقیقت کی بنیاد پر اپنی رائے بنائے۔ جو لوگ ایسا کریں، وہ فوراً یہ دریافت کر لیں گے کہ اصل معاملہ تعمیر دنیا کا نہیں، بلکہ اصل معاملہ تیاریٔ آخرت کا معاملہ ہے۔ ہر عورت اور مرد کا اصل کام یہ ہے کہ وہ موت سے پہلے کے دورِ حیات میں، موت کے بعد کے مرحلۂ حیات کی تیاری کرے۔ وہ اپنے آپ کو اِس قابل بنائے کہ وہ موت کے بعد آنے والے ابدی دورِ حیات میں کامیاب انسان قرار پا سکے۔

موت کی طرف سفر

ماسٹر عبدالوحید سہارن پوری دہلی کے علاقہ یمنا وہار میں 45 سال سے رہتے تھے۔ وہ مدرسہ تعلیم الاسلام (چوڑی والان، دہلی) میں استاد تھے۔ 18 فروری 2009 کی صبح کو وہ حسب معمول اپنے گھر سے مدرسے کے لیے روانہ ہوئے۔ اُس وقت ان کی صحت بظاہر بالکل ٹھیک تھی۔ ابھی وہ مدرسے میں تھے کہ دوپہر کے وقت اُنھیں سانس کی تکلیف محسوس ہوئی۔ تکلیف بڑھی تو مدرسے کے طلبا اُن کو رکشے پر بٹھا کر اسپتال کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں اُن پر بے ہوشی جیسی حالت طاری ہوگئی۔ اسپتال پہنچے تو ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ بوقت وفات ان کی عمر تقریباً 75 سال تھی۔

یہ صرف ایک شخص کا واقعہ نہیں، یہی ہر عورت اور ہر مرد کا واقعہ ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی سفر میں ہے۔ اس کے ذہن میں ایک منزل ہوتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی مطلوب منزل کی طرف جا رہا ہوں۔ مگر ہر ایک کے لیے مقدر ہے کہ وہ اِس دنیا میں صرف ''75 سال'' رہے، اور اس کے بعد اُس کو اُس دوسری دنیا میں پہنچا دیا جائے جہاں سے دوبارہ وہ لوٹنے والا نہیں۔ ہر سفر اپنی حقیقت کے اعتبار سے موت کا سفر ہے، خواہ بظاہر وہ دیکھنے والوں کو کوئی اور سفر دکھائی دیتا ہو۔

یہی اِس دنیا میں آنے والے ہر انسان کی کہانی ہے۔ ہر زندہ انسان پر وہ وقت آنے والا ہے جب کہ اس کی سانس بند ہو جائے، جب اُس کے چلتے ہوئے قدم رک جائیں، جب وہ سوچنے کے قابل نہ رہے، جب کہ اس کی آنکھ اور اس کے کان اپنا کام کرنا بند کر دیں، جب کہ وہ اپنا تمام اثاثہ چھوڑ کر بالکل تنہا اگلے دورِ حیات میں داخل ہو جائے۔

یہی وہ سنگین حقیقت ہے جس کو ہر عورت اور ہر مرد کو سب سے زیادہ جاننا چاہیے۔ یہی وہ انجام ہے جس کی ہر ایک کو سب سے زیادہ تیاری کرنا چاہیے۔ یہی وہ معاملہ ہے جس کے بارے میں ہر ایک کو سب سے زیادہ سنجیدہ ہونا چاہیے۔ جو لوگ اِس سوچ کے ساتھ زندگی گزاریں، وہی وہ لوگ ہیں جو آخرکار کامیاب ہوں گے۔

اپنی نمازِ جنازہ

دہلی میں ایک مسلمان کی موت ہوئی۔ نمازِ جنازہ پڑھانے کے بعد ان کو ایک مقامی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ مولانا محمد ذکوان ندوی نے بتایا کہ وہ اس نماز میں شریک تھے۔ نماز شروع ہونے والی تھی تو ان کے پاس کھڑے ہوئے ایک مسلمان نے پوچھا — فرض کی نیت کروں یا سنت کی نیت کروں۔ انھوں نے کہا کہ خود اپنی نمازِ جنازہ کی نیت کرو۔ اُس آدمی کو حیرانی ہوئی۔ بعد کو انھوں نے اس آدمی سے کہا کہ کسی کے مرنے پر جنازہ کی نماز پڑھنا محض ایک رسم نہیں، وہ ایک سنگین حقیقت کی یاد دہانی ہے، یہ حقیقت کہ مرنے والے کی جس طرح موت ہوئی ہے، اُسی طرح میری موت بھی ہونے والی ہے۔ با جماعت نمازِ جنازہ دراصل اِسی حقیقت کی یاد دہانی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سچی نماز جنازہ اُسی انسان کی ہے جو دوسرے کی موت میں اپنی موت کو یاد کرے۔ وہ سوچے کہ آج جو کچھ مرنے والے کے ساتھ پیش آیا ہے، وہی خود میرے ساتھ پیش آنے والا ہے۔ موت کو دیکھ کر جو آدمی اس طرح سوچے، وہ جب جنازہ کی نماز کے لئے کھڑا ہوگا تو اس کا احساس یہ ہوگا کہ میں خود اپنے جنازہ کی نماز پڑھ رہا ہوں۔ جو کچھ دوسرے کے ساتھ آج پیش آیا ہے، وہی میرے ساتھ کل پیش آنے والا ہے۔

موت کسی ایک انسان کا معاملہ نہیں، موت کا واقعہ ہر عورت اور ہر مرد کے ساتھ لازمی طور پر پیش آنے والا ہے۔ مزید یہ کہ موت کسی سے پوچھ کر نہیں آتی، موت اچانک آجاتی ہے۔ اور موت جب آجاتی ہے تو کوئی بھی انسان اس کو واپس کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے، ایک انسان کے لئے بھی اور دوسرے انسان کے لیے بھی۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ ہر لمحہ اپنی موت کو یاد کرے، جو شخص اتنا زیادہ غافل ہو کہ دوسرے کی موت کو دیکھ کر بھی اس کو اپنی موت یاد نہ آئے، وہ گویا کہ بے حس پتھر ہے۔ وہ بظاہر انسان ہے، لیکن وہ انسانی صفات سے اُسی طرح خالی ہے جس طرح پتھر کا کوئی مجسمہ انسانی صفات سے خالی ہوتا ہے۔ موت کو یاد کرنا حساس (sensitive) انسان کی صفت ہے، اور موت کو یاد نہ کرنا بے حس (insensitive) انسان کی صفت ہے۔

وقت ختم ہوگیا

اسکول میں طالب علموں کا امتحان ہورہا تھا۔طلبہ میز پر جھکے ہوئے اپنا اپنا سوال حل کررہے تھے، یہاں تک کہ امتحان کا مقرر وقت پورا ہوگیا۔فوراً ہی امتحان حال میں موجود ذمّے داروں کی طرف سے اعلان کیا گیا— لکھنا بند کرو، وقت ختم ہوگیا:

Stop writing, time is over.

یہ معاملہ جو امتحان ہال میں پیش آیا، وہی وسیع تر زندگی کا معاملہ بھی ہے۔اِس دنیا میں ہر عورت اور ہر مرد ایک بڑے امتحان ہال میں ہیں۔یہاں ہر ایک اپنا اپنا امتحان دے رہا ہے۔ہر ایک کی ایک مدت مقرر ہے۔یہ مدت پوری ہوتے ہی خدا کا فرشتہ آتا ہے اور خاموش زبان میں اعلان کرتا ہے کہ تمھارے عمل کا وقت ختم ہوگیا۔اب تم کو مرنا ہے اور مرنے کے بعد اپنے خالق ومالک کے سامنے جواب دہی کے لیے حاضر ہونا ہے۔تعلیمی امتحان کا معاملہ جو ہر طالب علم کے ساتھ پیش آتا ہے، وہ ایک مثال ہے جس سے ہر عورت اور ہر مرد وسیع تر معنوں میں زندگی کے امتحان کے معاملے کو سمجھ سکتے ہیں۔زندگی حالتِ امتحان کا نام ہے، اور موت اِس کا نام ہے کہ آدمی کو اپنے عمل کا انجام پانے کے لیے اگلی دنیا میں بھیج دیا جائے۔موت سے قبل کی زندگی دراصل امتحان کا دور ہے اور موت کے بعد کی زندگی امتحان کا رزلٹ نکلنے کا دور۔جو شخص امتحانی دورِ حیات میں ہوش مندی کے ساتھ زندگی گزارے گا، وہی اگلے دورِ حیات میں بہتر انجام کو پائے گا۔جو لوگ اِس معاملے میں غافل ثابت ہوں، اُن کو بعد کے دورِ حیات میں حسرت اور مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا۔

امتحان ہال کے اندر ایک طالب علم جس نفسیات کے ساتھ رہتا ہے، اُسی نفسیات کے ساتھ ہم کو اپنی پوری زندگی میں رہنا ہے۔ہر ایک کو یہ کوشش کرنا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے دیے ہوئے پرچے کو درست طور پر حل کرے، تاکہ امتحان کی مدت پوری ہونے کے بعد جب اُس کا رزلٹ سامنے آئے تو وہ اُس کے لیے کامیابی کی خوش خبری ہو، نہ کہ ناکامی کا اعلان۔

عمر اور صحت

ڈاکٹر شہزاد علی میرٹھ (یوپی) کے رہنے والے تھے۔ 6 فروری 2009 کو تقریباً 45 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ پہلی بار جب میں اُن سے ملا تھا تو بظاہر وہ بالکل تندرست اور صحت مند نظر آتے تھے۔ بعد کو اُنھیں کینسر کی بیماری ہوگئی۔ علاج کے باوجود مرض بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وہ صاحب فراش ہوگئے۔ آخری زمانے میں اُن کا حال یہ تھا کہ وہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ بن چکے تھے۔ ان کا نظامِ ہضم اتنا زیادہ بگڑ چکا تھا کہ سادہ غذا بھی وہ نہیں لے سکتے تھے، حتی کہ پانی پینا بھی اُن کے لیے سخت مشکل ہوگیا تھا۔ اُس زمانے میں کوئی شخص ان کی عیادت کے لیے آتا تو وہ اُس سے کہتے کہ تم میرے بارے میں نہ سوچو، بلکہ خود اپنے بارے میں سوچو۔ تم شکر کرو کہ تم کو صحت مند جسم حاصل ہے۔ تم کھانا کھاتے ہو اور پانی پیتے ہو اور زمین پر چلتے ہو۔ یہ سب چیزیں خدا کا عطیہ ہیں۔ وہ جب چاہے، اِس عطیہ کو چھین لے اور پھر تمھارے پاس کچھ بھی باقی نہ رہے۔

انسان کو ایک صحت مند جسم ملا ہوا ہے۔ انسان کو پیدا ہونے کے بعد یہ صحت مند جسم بظاہر اپنے آپ مل جاتا ہے، اِس لیے وہ اُس کو فار گرانٹیڈ (for granted) طور پر لے لیتا ہے۔ وہ کبھی سوچتا نہیں کہ یہ صحت مند جسم سرتاسر خدا کا عطیہ ہے۔ اِس عطیہ کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے خدا کے آگے جھک جانا چاہیے۔ یہی معاملہ عمر کا ہے۔ آدمی جب تک زندہ ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اس کی یہ زندگی ہمیشہ باقی رہے گی۔ وہ کبھی اپنی موت کے بارے میں نہیں سوچتا۔ یہ بلاشبہہ سب سے بڑی بھول ہے۔

یہی ہر عورت اور ہر مرد کا امتحان (test) ہے۔ کامیاب شخص وہ ہے جو زندگی سے زیادہ موت کے بارے میں سوچے، جو ہر ملی ہوئی چیز کو خداوندِ عالم کا عطیہ سمجھے۔ یہی وہ انسان ہے جو امتحان میں کامیاب ہوا۔ اِس کے برعکس، جو انسان خدا کا اعتراف نہ کرے اور موت کو بھلائے ہوئے ہو، وہی وہ شخص ہے جو امتحان میں ناکام ہوگیا۔ پہلے انسان کے لیے ابدی جنت ہے اور دوسرے انسان کے لیے ابدی جہنم۔

موت کی خبر

ایک شخص کی عمر 75 سال ہوگئی۔ ابتدائی عمر میں اس کی صحت اچھی تھی۔ اب اُس کو بیماریاں لگ گئیں۔ یہ بیماری اس کے لیے موت کی خبر تھی۔ لیکن اس نے بیماری کو صرف علاج کا معاملہ سمجھا۔ اس نے مختلف ڈاکٹروں اور اسپتالوں سے رجوع کرنا شروع کر دیا۔ جب اس کا ذاتی سرمایہ ختم ہوگیا تو اس نے قرض لے کر اپنا مہنگا علاج شروع کر دیا۔ لیکن اس کو دوبارہ صحت حاصل نہ ہوسکی۔ چند سال بیمار رہ کر وہ مر گیا — یہ ایک انسان کی کہانی نہیں ہے، بلکہ یہی تقریباً تمام عورت اور مرد کی کہانی ہے۔

بڑھاپا ہر آدمی کے لیے اِس بات کی خبر ہوتا ہے کہ موت قریب آ گئی۔ اِس کے بعد جب اس کو بیماریاں لگتی ہیں تو وہ آدمی کو مزید جھنجھوڑنے کے لیے ہوتی ہیں۔ وہ اِس لیے ہوتی ہیں کہ آدمی اگر سو رہا ہے تو وہ جاگ جائے۔ اور اگر وہ جاگ گیا ہے تو وہ اٹھ جائے۔ اور اگر وہ اٹھ گیا ہے تو وہ چلنے لگے۔ بڑھاپا اور بڑھاپے کے بعد آنے والی کمزوری اور بیماری ہمیشہ اِس لیے آتی ہے کہ آدمی چونک اُٹھے۔ وہ موت سے پہلے موت کی تیاری کرنے لگے۔ وہ موت کے بعد آنے والے حالات پر سوچے اور اس کے مطابق، اپنی زندگی کی آخری منصوبہ بندی کرے۔

لیکن انسان واقعات سے سبق نہیں لیتا۔ بڑھاپا اور بیماری اُس کو موت کی خبر دیتے ہیں، لیکن وہ موت کے بارے میں سوچنے کے بجائے صرف علاج کے بارے میں سوچتا ہے۔ وہ ڈاکٹروں اور اسپتالوں کے پیچھے دوڑتا ہے، یہاں تک کہ وہ ناامیدی کے ساتھ مر جاتا ہے۔ دوبارہ جو چیز اُس کو ملتی ہے، وہ تندرستی نہیں ہے، بلکہ موت ہے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر آدمی روزانہ اپنے آس پاس کے ماحول میں دیکھتا ہے، لیکن کوئی آدمی اُس سے سبق نہیں لیتا۔ اِس معاملے میں ہر آدمی اندھا بنا ہوا ہے۔ وہ صرف اِس انتظار میں ہے کہ موت اس کی آنکھ کھولے۔ لیکن موت کے بعد آنکھ کھلنا، کسی عورت یا مرد کے کچھ کام آنے والا نہیں۔

زندگی کی حقیقت

26 ستمبر 2008 کی شام کو نئی دہلی کے پارلیمنٹ انیکسی میں ایک خاص فنکشن تھا۔ یہ فنکشن فاؤنڈیشن فار امیٹی اینڈ نیشنل سالیڈریٹی نے پارلیمنٹ ہاؤس انکسی کے مین کمیٹی روم میں آرگنائز کیا تھا۔ یہ وسیع ہال بھرا ہوا تھا۔ دہلی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ یہاں موجود تھے۔

پروگرام کے مطابق مشہور جرنلسٹ مسٹر خشونت سنگھ (پیدائش 1915) کو ان کی خدمات پر اوارڈ دیا گیا۔ یہ اوارڈ لوک سبھا کے اسپیکر مسٹر سوم ناتھ چٹرجی کے ذریعہ دیا گیا۔ اِس موقع پر مسٹر شندے نے کہا کہ مسٹر خوشونت سنگھ کا نظریۂ حیات یہ ہے کہ — زندگی کی اچھی چیزوں سے انجوائے کرو:

Enjoy the good things in life.

اِس موقع پر ان کی دعوت پر راقم الحروف نے اس میں شرکت کی۔ الرسالہ مشن کے تقریباً 10 افراد بھی میرے ساتھ وہاں گئے۔ ان لوگوں نے انگریزی میں چھپا ہوا دعوتی لٹریچر تمام لوگوں کو دیا۔ ان میں وہ پمفلٹ بھی شامل تھا جو ریلٹی آف لائف (Reality of Life) کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اِس پمفلٹ میں زندگی کا بالکل برعکس نظریہ پیش کیا گیا تھا۔ اس دوسرے نظریہ کو مختصر طور پر ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے — زندگی میں اچھے کام کرو:

Do good things in life.

اِس پروگرام کے چیف گیسٹ مسٹر خوشونت سنگھ تھے۔ ان کی عمر تقریباً 95 سال ہوچکی ہے۔ وہ سیدھے نہیں چل سکتے تھے۔ دو آدمیوں کے سہارے دھیرے دھیرے چل کر وہ اسٹیج پر پہنچے۔ وہ اس طرح وہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کے چہرے پر کوئی خوشی نہ تھی۔ وہ افسردگی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ جس وقت ان کے تعارف میں ان کا مذکورہ فارمولا بتایا گیا، اس وقت وہ اسٹیج پر اس طرح دکھائی دیتے تھے جیسے کہ وہ کہہ رہے ہوں کہ — زندگی کا یہ فارمولا اِس دنیا میں قابلِ عمل نہیں:

Enjoy good things in life only to become so weak that you are unable to enjoy at all.

جنت یا سراب

کرینا کپور انڈیا کی ایک مشہور فلم اسٹار ہیں۔ ان کو اپنی اداکاری کا معاوضہ کروروں میں ملتا ہے۔ ان کے بارے میں ایک رپورٹ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (29 مارچ 2009) میں چھپی ہے۔ اس میں اس فلم اسٹار کے بارے میں مختلف قسم کی باتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک اشتہار (Ad) کے کنٹریکٹ پر ان کو 6 کرور روپئے ملے۔ ان سے پوچھا گیا کہ اتنی زیادہ دولت کو وہ کہاں استعمال کریں گی۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں یونان میں اپنے لئے ایک گھر خریدوں گی:

I will buy myself a home in Greece.

رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ کرینا نے حال میں اپنا ایک ذاتی گھر بمبئی میں خریدا ہے۔ مگر انھوں نے کہا کہ میرا زیادہ وقت اسٹوڈیو میں گزرتا ہے، اس لئے میرے پاس وقت نہیں ہے کہ میں اپنے گھر میں ٹھہروں اور اس سے انجوائے کرسکوں:

But I spend most of my time in the studio.
So I've no time to enjoy my new home.

موجودہ زمانے میں نئے نئے مواقع کھلے تو ہر ایک نے ان مواقع کو زیادہ دولت کمانے کے لئے استعمال کیا۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ زیادہ دولت صرف زیادہ مسائل لاتی ہے۔ آدمی حاصل شدہ دولت کو انجوائے نہیں کر پاتا۔ وہ اور زیادہ اور زیادہ کے لئے اپنی ساری زندگی لگا دیتا ہے، یہاں تک کہ اس کے لئے وہ وقت آجاتا ہے جب کہ وہ تمام چیزوں کو چھوڑ کر ایک ایسی دنیا میں چلا جائے جہاں اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ حتی کہ ایسے مواقع بھی نہ ہوں جن کو استعمال کرکے دوبارہ وہ اپنے لئے ایک پرعیش زندگی کی تعمیر کرسکے۔ اس کے پیچھے بھی محرومی ہوتی ہے اور اس کے آگے بھی محرومی۔

کیسا عجیب ہے انسان کا آغاز، اور کیسا عجیب ہے انسان کا انجام۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن کی سورہ نمبر 102 میں اس طرح بیان کی گئی ہے: ألهاكم التكاثر، حتى زُرتم المقابر (102:1-2) یعنی بہتات کی حرص نے تم کو غفلت میں رکھا، یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچے۔

آخرت کا ائرپورٹ

ایک بار میں ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہوئے ایک ائرپورٹ پر اترا۔ میں اور دوسرے اکثر مسافرضروری مراحل سے گزرتے ہوئے باہر آ گئے، لیکن چند مسافر ایسے تھے جن کو ائرپورٹ پر روک لیا گیا۔ اُن سے کہا گیا کہ آپ لوگ یہاں ٹھہریے، آپ لوگوں کی خصوصی چیکنگ ہوگی۔ ان افراد کے بارے میں کوئی خفیہ اطلاع ملی تھی، جس کی وجہ سے ائرپورٹ کے عملہ نے اُن کے ساتھ ایسا کیا۔ ائرپورٹ پر یہ منظر دیکھ کر مجھے قرآن کی ایک آیت یاد آئی۔ وہ آیت یہ تھی: **وقفوهم، إنهم مسئولون** (37:24) یعنی ان لوگوں کو ٹھہراؤ، ان سے کچھ پوچھنا ہے۔

غور کیجئے تو زندگی کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ انسان جس زمین پر آباد ہے، وہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مسلسل گھوم رہی ہے۔ گویا کہ ہم ایک ایسے ہوائی جہاز پر سوار ہیں جو تیز رفتاری کے ساتھ ایک ائرپورٹ کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ ائرپورٹ آخرت کا ائرپورٹ ہے۔ ایک وقت آئے گا، جب کہ تمام انسان آخرت کے ائرپورٹ پر اتار دئے جائیں گے۔ یہاں یہ واقعہ ہوگا کہ کچھ لوگوں سے کہا جائے گا کہ تم یہاں ٹھہرو، تم سے ابھی پوچھ گچھ ہونے والی ہے۔ دوسری طرف، کچھ ایسے خوش نصیب لوگ ہوں گے جن کا استقبال فرشتے یہ کہہ کر کریں گے: **سلام عليكم، طبتم، فادخلوها خالدين** (39:73) یعنی تم پر سلامتی ہو، تم شاد رہو، پس ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل ہو جاؤ۔

یہ صورتِ حال سارے انسانوں کے ساتھ پیش آنے والی ہے۔ دنیا کے سفروں کا وقت مقرر رہتا ہے، لیکن آخرت کے اس سفر کا وقت مقرر نہیں۔ کسی بھی لمحہ انسان کے اوپر وہ وقت آ سکتا ہے، جب کہ زندگی کا جہاز آخرت کے ائرپورٹ پر اتر جائے اور پھر وہاں کچھ لوگ پوچھ گچھ کے لیے روک لئے جائیں اور کچھ لوگوں کو فرشتے خوش آمدید کہتے ہوئے جنت میں داخل کر دیں۔ بلاشبہہ یہی وہ سب سے بڑی بات ہے جس پر ہر عورت اور مرد کو سوچنا چاہئے، اور جس کے مطابق اپنی زندگی گزارنا چاہیے۔ آنے والا وقت اعلان کے بغیر کسی بھی وقت آ جائے گا اور پھر کسی کے لیے یہ موقع نہ ہوگا کہ وہ لوٹ کر دوبارہ پیچھے کی طرف جا سکے۔

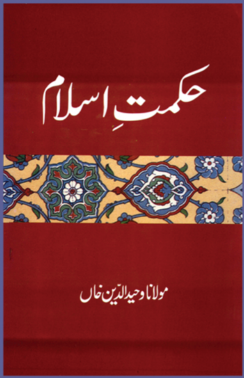
رفیقِ اعلیٰ کی طرف

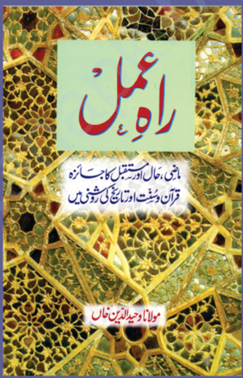
قرآن کی سورہ التحریم میں بتایا گیا ہے کہ قدیم شاہ مصر کی مومن بیوی آسیہ کے لیے جب بادشاہ نے موت کا حکم صادر کیا تو اس وقت ان کی زبان سے یہ دعا نکلی: **ربّ ابن لی عندك بيتاً فی الجنة** (66:11) یعنی اے میرے رب، تو میرے لیے جنت میں اپنے پاس ایک گھر بنادے۔ یہ عام مومن کے الفاظ میں کی ہوئی ایک دعا ہے۔ یہی دعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے آخر وقت میں پیغمبرانہ انداز میں اِس طرح نکلی: **اللهم الرفيق الأعلىٰ**۔ (**صحيح البخاري، رقم الحديث**: 4463) یعنی اے اللہ، رفیق اعلیٰ۔

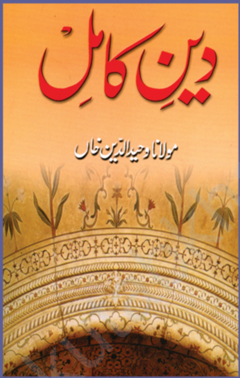
یہ دونوں دعائیں اپنی حقیقت کے اعتبار سے ہم معنیٰ ہیں۔ پہلی دعا عام مومن کے الفاظ میں کی ہوئی دعا ہے، اور دوسری دعا پیغمبرانہ سطح پر ایک نبی کی زبان سے نکلی ہوئی دعا۔

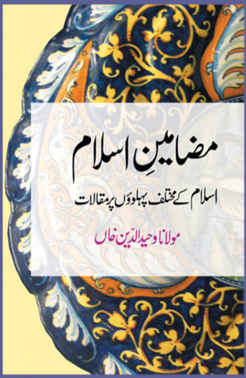
یہ دونوں دعائیں دراصل موت کی نسبت سے مومنانہ جذبات کا اظہار ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مومن پر جب موت کا لمحہ آئے تو اس کا احساس مذکورہ قسم کی دعا میں ڈھل جائے۔ اس وقت مومن کا احساس یہ ہونا چاہیے کہ — جب اہل دنیا سے میرا ساتھ چھوٹے تو مجھے خداوندِ ذوالجلال کی قربت حاصل ہو جائے۔ مجھے انسانوں کی مجلس سے اٹھنا پڑے تو مجھے فرشتوں کی مجلس میں شامل ہونا نصیب ہو جائے۔ جب موت مجھے اپنے لوگوں سے منقطع کر دے تو میں اکیلا نہ ہو جاؤں، بلکہ مجھے اعلیٰ تر مجلس میں خدا کی معیت کی نعمت حاصل ہو جائے۔ میرا سفرِ موت میرے لیے رفاقتِ ادنیٰ سے رفاقتِ اعلیٰ کی طرف سفر بن جائے۔ مذکورہ دعا کی حیثیت محض دعائیہ الفاظ کی نہیں ہے۔ وہ سچے مومن کی داخلی تڑپ کا لفظی اظہار ہے۔ ایک سچے مومن کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ موجودہ مرحلۂ حیات کے مقابلے میں اگلا مرحلۂ حیات اس کے لیے زیادہ بہتر ثابت ہو۔ موجودہ دارالامتحان میں اس کو خدا کی جو نعمتیں عارضی طور پر ملی ہوئی ہیں، وہ نعمتیں اس کو موت کے بعد کی دنیا میں زیادہ اعلیٰ طور پر خدا کے ابدی انعامات کی صورت میں عطا ہو جائیں۔ موت میرے لئے ناقص دنیا (imperfect world) سے نکل کر، کامل دنیا (perfect world) میں داخلے کا ذریعہ بن جائے۔

معرفت، دین کا خلاصہ ہے۔ معرفت، دین کا آغاز ہے اور معرفت، دین کا اختتام ہے۔ دین خداوندی میں معرفت کی حیثیت بیج کی ہے۔ جس طرح ایک بیج سے پورا درخت بنتا ہے، اِسی طرح معرفت سے انسان کی پوری زندگی تشکیل پاتی ہے۔ معرفت کے بغیر دین صرف ایک بے روح فارم بن جاتا ہے۔ معرفت کے ساتھ دین گویا کہ ہرا بھرا درخت ہے اور معرفت کے بغیر دین صرف ایک سوکھا درخت۔ دین اگر جسم ہے تو معرفت اس کی روح ہے۔









ISLAMIC STUDIES
GOODWORD
www.goodwordbooks.com
ISBN 978-81-7898-759-0
9 788178 987590
₹ 125